دُنیا میرا گاؤں

(سفر نامے)

از

خواجہ غلام السیّدین

مُرتّب

ڈاکٹر سیّد فرحت حسین

سیّدین میموریل ٹرسٹ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵

DUNIYA MERA GAON

(TRAVELOGUES)

BY

DR. K. G. SAIYIDAIN

EDT. BY

DR. S. FARHAT HUSAIN

تقسیم کار:
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

جامعہ نگر، نئی دہلی 110025، اُردو بازار، دہلی 110006
پرنسس بلڈنگ، بمبئی 400003، یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ 202001

پہلا ایڈیشن ۱۹۸۵ء | تعداد ۵۰۰ | قیمت =/60

لبرٹی آرٹ پریس (پروپرائٹرز مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی میں طبع ہوئی

کتابت ــــــــ نفیس دھلوی

فہرست

پیش لفظ

از

صالحہ عابد حسین

"دنیا میرا گاؤں" خواجہ غلام السیدین نے اپنی خود نوشت سوانح حیات کے ایک باب کا نام رکھا تھا۔ وہ اپنے سفروں، روزنامچوں اور یادداشتوں سے، جو اُن کے پاس نوٹ تھیں، اِس نام کے باب کو مکمل صورت میں اور تفصیل سے لکھنا چاہتے تھے۔ انھوں نے بہت سے سفر کیے تھے، خود اپنے ملک کے اور دنیا کے بیشتر دوسرے ملکوں کے۔ اُن کے دل و دماغ میں جو لامحدود وسعت تھی اُس میں ان سفروں کا بھی بڑا حصّہ تھا اور "دنیا میرا گاؤں" یعنی "ساری دنیا میری اپنی ہے" اُن کی دل کی آواز تھی۔ انھیں ساری دنیا اور دنیائے انسانیت بہت عزیز تھی جیسے اپنا گاؤں یا وطنِ مالوف اور اُس کے لوگ ہوتے ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے یہ سوانح مکمل نہ ہو سکی۔ چونکہ انھوں نے فہرست میں پورے بابوں کے عنوان دیے تھے اس لیے ہم نے اُن کے اُس باب کا نام اس کتاب کو دے دیا ہے

سیّدین صاحب کے ان سفرناموں، روزنامچوں اور یادداشتوں میں تسلسل تو ہے لیکن عراق و ایران کے پہلے سفرنامے کے سوا، جو بڑی حد تک مکمل ہے، اور کوئی پورا نہیں ہے۔ بعد کے سفروں میں ہر جگہ اُن کی مصروفیات اتنی زیادہ رہیں کہ باوجود دلی خواہش کے اور کوشش کے، وہ اپنے سفرناموں یا روزنامچوں کو

پورا نہ کر سکے۔ مگر ان کو یہ امید رہی کہ جب "فرصت ہوگی" وہ ان کو مکمل کریں گے لیکن اِن جیسے لوگوں کے لیے جن کی زندگی کا ہر لمحہ تعلیمی، علمی، ادبی، اور انسانی خدمت میں گزرتا ہو، لفظ "فرصت" بے معنی ہو جاتا ہے۔ وہ ٹرین اور ہوائی جہاز کے سفر میں بھی لکھتے تھے۔ بیماریوں میں بھی اُن کے ہاتھ سے قلم کم چھوٹتا تھا اور ذہن تو مصروف رہتا ہی تھا۔ سب سے کم اہمیت انھوں نے اپنی سوانح عمری ہی کو دی کہ ہزاروں لاکھوں صفحے لکھنے والی ہستی اس کو آدھا بھی مکمل نہ کر سکی۔

لیکن سیّدین صاحب نے جو لکھا ہے، کم یا زیادہ، مکمل یا نامکمل، روزنامچے یا سفر نامے، کہانی یا مضامین، ریڈیو تقاریر یا تو سیعی خطبات، خطوط یا محبت بھرے مزاحیہ نوٹ، اُن کا ایک ایک لفظ محفوظ کر لینے کے قابل ہے۔ آج شاید اِس کی اہمیت لوگ اتنی نہ سمجھ سکیں کہ سورج کی تیز روشنی آنکھوں کو چکا چوند بھی کر دیتی ہے، لیکن جیسے جیسے زمانہ گزرے گا اُن کی تحریروں کی اہمیت کا اندازہ ہوتا جائے گا۔

کام بہت بڑا ہے۔ بکھرا ہوا ہے۔ کرنے والے فی الحال بہت کم نظر آتے ہیں، جو ہیں وہ یا تو بے نیاز ہیں یا حد سے زیادہ مصروف یا میری طرح عمر اور صحت کی اس منزل میں، جب کوئی نیا اور بکھرا ہوا کام ہاتھ میں لینا محال تر ہو جاتا ہے۔

بہر حال سیّدین میموریل ٹرسٹ نے یہ عزم کیا ہے کہ سیّدین صاحب کی غیر مطبوعہ تحریریں شائع کرے۔ اس کی پہلی کڑی "مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں" اُن کی نامکمل سوانح عمری ہے جس کو میں نے اپنی کم مائیگی کے باوجود مرتب کیا اور ٹرسٹ سے شائع کرایا۔ دوسری کتاب "سخنِ دلنواز" ان کے کچھ خطوط کا دلکش مجموعہ ہے جسے ڈاکٹر صغرا مہدی نے بہت محنت سے مرتب کیا اور سیّدین میموریل ٹرسٹ نے شائع کیا۔ سیّدین صاحب کی تیسری کتاب "دنیا میرا گاؤں" یعنی یہی زیرِ نظر کتاب ڈاکٹر سید فرحت جبین نے محنت اور جانفشانی سے مرتب کی ہے (انھوں نے سیّدین صاحب کے بکھرے اور منتشر کاغذات وغیرہ کی ترتیب کا مشکل کام بھی بہت محنت سے انجام دیا تھا)۔ یہ کام اگرچہ دیر میں مکمل ہوا مگر خدا کا شکر ہے کہ ہو گیا۔ ڈاکٹر فرحت حسین نے اپنا تحقیقی

مقالہ بھی سیّدین صاحب پر لکھا ہے اور اِس سے اُنھیں سیّدین کو سمجھنے اور ان پر کام کرنے میں یقیناً مدد ملی ہے۔

"دنیا میرا گاؤں" اگرچہ مکمل سفرناموں یا روزناموں کی صف میں نہیں آتا، پھر بھی مجھے پوری امید ہے کہ پسند کیا جائے گا اور ڈاکٹر فرحت حسین کی کوشش کو سراہا جائے گا۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ کو سیّدین صاحب سے جو عقیدت اور محبت ہے اس کی بنا پر خود انھوں نے بھی اس میں دل چسپی لی ہے جس کے لیے میں ان کی شکر گزار ہوں۔

میری دعا، تمنا اور التجا یہ ہے کہ جن دوسرے حضرات نے سیّدین صاحب کے مختلف کام ہاتھ میں لے رکھے ہیں یا لینے کا وعدہ کیا ہے، وہ بھی اس کی طرف توجہ دیں۔ سیّدین پر کام کرنا سیّدین کی اہمیت کو منوانا نہیں ـــــ وہ تو پہلے ہی سے مانی ہوئی ہے ـــــ در اصل اُس خدمت کا اعتراف کرنا ہے جو اُس شخص نے علم و ادب و تعلیم کی، عمر بھر کی ہے۔

ہمیشہ کی طرح مکتبہ جامعہ نے کتاب کی اشاعت میں مدد اور محنت کی ہے جس کے لیے ہم مکتبہ کے مشکور ہیں۔

۲۹؍ فروری ۱۹۸۴ء

مقدمہ

اُردو زبان کے ہمہ جہتی ارتقا میں سفرناموں کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔ موجودہ دور میں جیسے جیسے سائنس اور ٹیکنالوجی کا احاطہ وسیع ہوتا گیا، فاصلوں پر انسان کی گرفت بھی بڑھتی گئی اور آمد و رفت کے ذرائع بھی سہل سے سہل تر ہوتے گئے۔ سائنس کی اس دین سے فائدہ اُٹھاکر زندگی کو معنویت سے بھرپور بنانے کے لیے ربط و ضبط بڑھانے، بقائے باہمی کے لیے ایک دوسرے کو سمجھنے اور تہذیبی و اقتصادی رشتے استوار کرنے کے نقطۂ نظر سے، بیرونِ ممالک آمد و رفت کے رجحان کو کافی ترقی ملی۔ خیرسگالی اور بقائے باہمی کی ضرورت کے تحت بین الممالک تہذیبی اور علمی رشتے قائم کرنے میں اُردو دانوں نے بھی دل کھول کر حصّہ لیا اور اپنے مشاہدات و تجربات کو قلم بند کر کے ادبی سرمائے کو متنوع بنانے کی کوشش کی۔ اس کے نتیجے میں سیاسی، علمی اور ادبی سفرناموں کا اچھا خاصا ذخیرہ اردو میں جمع ہوگیا۔ ان میں عبدالحلیم شررؔ کا سفرنامہ ہستی یعنی نیرنگیِ دنیا، خواجہ حسن نظامی کا روزنامہ باتصویر سفرِ مصر و شام و حجاز، حاجی احمد حسین کا سفرنامہ حجاز و مصر، قاضی ولی محمد کا سفرنامۂ شرف الدین کا مرقعِ عالم، عبیداللہ سندھی کا کابل میں سات سال، مہاراجہ کشن پرشاد کا سفرنامہ ابوالحسن علی ندوی کا شرقِ اوسط کی ڈائری اور دریائے کابل سے دریائے یرموک تک، محمد حمزہ

فاروقی کا زمان و مکاں اور بھی ہیں، حق نواز کا مرتبہ سفر نامۂ اقبال، خواجہ غلام الثقلین کا سیاحت نامہ، قاضی عبدالغفار کا نقشِ فرنگ، عبدالماجد دریا بادی کا سفرِ حجاز، سید عابد حسین کا رہ نوردِ شوق، احتشام حسین کا ساحل اور سمندر، ابنِ انشا کا چلتے ہو تو چین کو چلیے، خواجہ احمد عباس کا مسافر کی ڈائری، گوپی چند نارنگ کا سفر آشنا، صالحہ عابد حسین کا سفر زندگی کے لیے سوز و ساز، شکیل الرحمٰن کا قصہ میرے سفر کا، ادبی لحاظ سے قابلِ ذکر سفر نامے ہیں. اس دور میں دوسری زبانوں سے تراجم میں شیخ ابنِ بطوطہ، حکیم ناصر خسرو اور خالدہ ادیب خانم کے سفر ناموں کے ترجمے بھی شامل ہیں. بیسویں صدی میں لکھے گئے سفر ناموں سے واقعات و حالات کی دل چسپی، مصنف کی ذاتی رائے اور مشاہدہ، شخصی قابلیت اور معاملہ فہمی کی وجہ سے سیاحت کی دل کشی میں بھی اضافہ ہوتا ہے اور سیاسی معاملات اور ملک کی ترقی سے مصنف کی دل چسپی کا بھی اندازہ ہوتا ہے. دورِ جدید کے سفر ناموں کی خاص بات یہ ہے کہ ان سے مصنف کی شخصیت، وسعتِ نظر اور اس کے اندازِ بیان پر تنقیدی نظر ڈالنے میں مدد ملتی ہے. یہ سفر نامے تاریخی و نیم تاریخی اشخاص کے حالات، تہذیبی و معاشرتی اور جغرافیائی و علمی معلومات کا بیش بہا خزانہ ہیں. مولانا عبدالماجد دریا بادی کا "سفر نامہ"، قاضی عبدالغفار کا "نقشِ فرنگ"، اور سید عابد حسین کا رہ نوردِ شوق، دل کش، رنگین اور دل چسپ ہونے کے علاوہ ان کی شخصیتوں کو اُجاگر کرتے ہیں. سید احتشام حسین کا سفر نامہ" ساحل اور سمندر" اور خواجہ احمد عباس کی" مسافر کی ڈائری" اور حال میں اشاعت پزیر صالحہ عابد حسین کا" سفر زندگی کے لیے سوز و ساز" زبان و بیان، خاکہ نویسی اور قابلِ قدر معلومات کے لحاظ سے خاصے اہم ہیں. جدید ترین سفر ناموں میں گوپی چند نارنگ کا" سفر آشنا" اُردو سفر ناموں کی تاریخ میں اہم اضافہ ہے. اس میں نہ صرف حالات و حوادث کی پردہ کشائی ہی کی گئی ہے بلکہ اُردو کے بین الاقوامی رشتوں کا تعارف بھی کرایا گیا ہے. بقول آل احمد سرور" تاثر اور تصور دونوں دل کش ہیں، اُسلوب شگفتہ، جا بجا معنی خیز اشارے بہت سی پُرانی یادیں تازہ ہو جاتی ہیں اور بہت سے منظر نظر میں پھر جاتے ہیں."

خواجہ غلام السیدین کا شمار بیسویں صدی کی نثر کے قافلہ سالاروں میں ہوتا ہے. میں جن دنوں خواجہ غلام السیدین کی شخصیت اور کارناموں پر اپنے تحقیقی مقالے کی تیاری کر رہا تھا، اسی دوران خواجہ غلام السیدین کی

ہمشیرہ محترمہ بیگم صالحہ عابد حسین صاحبہ کی عنایت اور شفقت کی بدولت مجھے خواجہ غلام السیدین کے تحریری اثاثے کو دیکھنے اور کاغذات کو ترتیب دینے کا موقع ملا۔ اس زمانے میں مجھے بہت سے مسودات اور نوٹس ایسے ملے جن کا بڑا حصہ ابھی تک شائع نہیں ہوا۔ ان ہی میں سیدین کے وہ مسودات بھی نظر سے گزرے جن میں انھوں نے اپنے مختلف سفروں کے حالات اور روز مرہ کے مشاہدات اُردو میں قلم بند کیے تھے جو چار ڈائریوں میں بکھرے ہوئے ہیں۔ ان میں روز نامچے بھی ہیں اور اندرونِ ملک دوروں کے حالات اور بیرونِ ملک سفروں کے مشاہدات و تجربات بھی ہیں۔

خواجہ غلام السیدین نے بیرونِ ملک سب سے پہلا سفر ۱۹۲۳ء میں کیا تھا جب وہ اعلا تعلیم کے لیے انگلستان گئے تھے۔ اس وقت ان کی حیثیت طالب علم کی تھی اس لیے طالب علمانہ ذہن میں اس سفر کی یادداشت کو محفوظ کرنے کا خیال پیدا نہیں ہوا۔ اس کے بعد علی گڑھ میں ٹریننگ کالج سے بحیثیت معلم وابستہ ہونے کے بعد انھوں نے پہلا غیر ممالک کا سفر ۱۹۲۹ء میں عراق اور ایران کے مقدس مقامات کی زیارت کے لیے کیا۔ اس سفر سے متعلق ڈائری دیکھنے سے خیال ہوتا ہے کہ سیدین صاحب نے اس سفر کے حالات قلم بند کرنے کا ارادہ آغازِ سفر سے ہی کر لیا تھا اسی لیے اس کے بیان میں بہت ہی جزئیات و تفصیلات سے کام لیا گیا ہے۔ اس سفر سے سات سال کے وقفے کے بعد بیرونی ملکوں کے سفروں کا جو سلسلہ شروع ہوا تو ۱۹۴۵ء سے ۱۹۷۰ء تک شاید ہی کوئی سال ایسا گزرا ہو جس میں سیدین صاحب کو ہندوستان سے باہر اور اندرونِ ملک سفر درپیش نہ رہا ہو۔ ان پچیس۲۵ سالوں کے دوران سیدین ایک بار آسٹریلیا گئے، متعدد بار یورپ، امریکہ اور کینیڈا گئے۔ یورپ میں جرمنی، فرانس، ہالینڈ، اسپین، ناروے، سوئیڈن، ڈنمارک، بلجیم اور اٹلی وغیرہ کا دورہ کیا۔ اسلامی ملکوں میں مصر، سوڈان، عراق، ایران، لبنان، دمشق، سعودی عرب اور مشرقی ایشیا میں چین، جاپان، فلپائن، تھائی لینڈ، ملیشیا، انڈونیشیا، سنگاپور وغیرہ کا سفر کیا۔

خواجہ غلام السیدین کو قدرتی مناظر اور تاریخی آثار دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ اس کے علاوہ وہ ہر جگہ کے لوگوں سے ملنے، ان کے مزاج سے واقفیت حاصل کرنے اور ان کے خیالات جاننے کا خاص اہتمام کرتے تھے جو ان کے معلمانہ مزاج کے عین مطابق تھا۔ رہن سہن اور

طرزِ معاشرت پر ان کی خاص نظر رہتی تھی اور اس جگہ کی خصوصیات اور لوگوں کے اخلاق و برتاؤ کا مشاہدہ کرنے میں دل چسپی لیتے تھے۔ ان چیزوں کا ان کے افکار سے گہرا ربط ہے اور اسی نقطۂ نظر سے وہ ان ملکوں کے سفروں کے حالات مختلف کاپیوں میں قلم بند کرتے رہے تھے اور اسی کے تحت انھوں نے روز نامچے کے طور پر مختلف تاریخوں میں روز مرّہ کے کچھ حالات و واقعات بھی درمیان درمیان میں ان کاپیوں میں درج کیے ہیں جن میں اہلِ ملک کے تہذیبی، معاشرتی اور انسانی پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ بیس سفروں پر مشتمل یہ سفرنامے اور دس روز نامچے آزادی سے قبل اور بعد کے زمانے میں ہندستان اور دوسرے ممالک کے سماجی، سیاسی اور تہذیبی حالات اور مشہور مقامات سے متعلق مفید اور دل چسپ معلومات کا سرمایہ فراہم کرتے ہیں۔ ان کی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں صرف تہذیبی، معاشرتی اور دیگر معلوماتی جھلکیاں ہی نہیں ہیں بلکہ ان میں اپنی قوم اور دوسری قوموں کے فکری اور ذہنی رجحان اور معیار کی تصویریں بھی نظر آتی ہیں۔ سیدین صاحب کے زیادہ تر سفر تعلیم کے سلسلے میں ہوئے لیکن انھوں نے زندگی کے ہر پہلو کو دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ وہ جہاں بھی گئے، وہاں کے لوگوں میں شرافت، انسانیت اور ہمدردی کے جذبات تلاش کیے۔ عجیب اتفاق یہ ہے کہ انھیں یہ اقدار ملتی بھی رہیں۔ ان سفرناموں میں غیر ملکوں کی چلتی پھرتی زندگی بھی ہے اور غور و فکر کرتے دماغ بھی نظر آتے ہیں۔ ان میں جغرافیائی اور تاریخی معلومات اور سفر میں پیش آنے والی دوسری معلومات سبھی کچھ ہے۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کا فاصلہ، وقت اور ذرائع وغیرہ کی تفصیل بھی ان میں مل جاتی ہے۔ سیدین صاحب ہمیں اپنے وقت کے پانی پر سے پرواز کرنے والے ہوائی جہاز بھی دکھاتے ہیں، بازاروں میں بھی گھماتے ہیں اور کانفرنس ہال میں مفکروں سے بھی ملواتے ہیں۔ ان سفرناموں میں وہ ہمہ گیری، جامعیت اور معنویت ہے جسے اُردو کے جدید دور میں وسعتِ فکر، وسعتِ نظر اور وسعتِ مشاہدہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ سفرنامے سیدین صاحب کی شخصیت پر بھی روشنی ڈالتے ہیں اور ان کے افکار و خیالات کو سمجھنے میں بھی مدد دیتے ہیں۔ یہ ایسی دستاویز ہیں جن سے دوسرے ملکوں کے تہذیبی، معاشرتی اور تمدنی آثار و کوائف کے بارے میں معلومات فراہم ہوتی ہیں۔

ان سفرناموں کا ایک خاص امتیاز وہ اُسلوبِ بیان ہے جس کے بارے میں مالک رام کا خیال ہے" ان کی اُردو نثر بڑی جاندار اور شگفتہ ہے۔ بظاہر ایسی سہلِ ممتنع کہ قاری خیال کرے کہ ایسی نثر لکھ لینا کیا مشکل ہے، لیکن لکھنے بیٹھے تو دانتوں پسینہ آجائے اور اسے معلوم ہو کہ یہ کتنا مشکل کام ہے"۔ سادہ نگاری کی یہ روایت سیدین نے حالی کے یہاں دیکھی اور سرسید کی تعلیمی تحریک میں پائی تھی۔ حالی کے اُسلوب کی بیشتر خصوصیات سیدین صاحب کے یہاں پائی جاتی ہیں۔ سیدین صاحب کا موضوع تعلیم بھی تھا جس کی بنیاد انھوں نے ان قدروں پر قائم کی تھی جو تعلیم، زندگی اور زبان کے امتزاج سے نشوونما پاتی ہیں۔ ان اقدار ہی کی تبلیغ و اشاعت ان کا مقصد تھا جو ان کی تمام تحریروں کا مرکزی خیال ہے۔ اسی وجہ سے ان کے اُسلوب میں وضاحتی کیفیت، جزئیات نگاری، فکری رعنائی اور جذبات کی روانی پائی جاتی ہے۔ قاری کی دل چسپی برقرار رکھنے کے لیے تشبیہات اور اشعار سے بھی کام لیتے ہیں اور قرآنی آیات سے بات کو اثر انگیز بنا دیتے ہیں۔ سیدین صاحب کی نثر میں ان کی طبیعت کی معصومیت، مزاج کی سادگی، دل گدازی و شگفتگی اور فکر و نظر کی بلندی و وسعت پائی جاتی ہے جس کا اظہار ان کے سفرناموں میں جگہ جگہ ملتا ہے۔ سفرناموں کے اُسلوب کا امتیاز یہ ہے کہ سیدین صاحب نے ایک سچی تصویرکشی سے بیان میں واقعیت کا رنگ بھر کر معنویت اور دل کشی پیدا کی ہے۔ عبارت کی سادگی و سلاست اور دل کشی قابلِ دید ہے۔ سفر کی تمام جزئیات کو حقیقت کے روپ میں سمیٹنے کی کوشش کی گئی ہے جس کی وجہ سے بیان کی روانی، رعنائی اور اثر آفرینی میں قدم بہ قدم اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ ان سفرناموں میں جو وضاحتی احساس پایا جاتا ہے اس سے کسی رُکاوٹ کا احساس نہیں ہوتا بلکہ آگے بڑھنے کی کشش محسوس ہوتی ہے۔ شروع سے آخر تک یہی کیفیت اور دل چسپی برقرار رہتی ہے۔ سفرناموں کی سادہ اور عام فہم زبان اور فطری اندازِ بیان بڑا دل کش اور پُرتاثیر ہے۔ سیدین صاحب نے اپنے اُسلوبِ بیان کے ذریعے سفرناموں میں محویت کی وہ فضا پیدا کی ہے کہ قاری خود کو اسی فضا میں محسوس کرتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے جملے، صاف شفاف عبارت، عام فہم الفاظ اور سیدھے سادے اندازِ بیان کے اعتبار سے سفرناموں میں اُسلوبی یکسانیت پائی جاتی ہے۔ ان کی ایک خاص بات بیان کا

دھیماپن ہے جو سیّدین کی دوسری تحریروں میں نہیں۔ سفرناموں سے یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ سیّدین فطرت کے حُسن سے اتنے متاثر نہیں ہوتے جتنے سیرت کے حُسن سے۔ ان کی جمالیاتی حِس پر تہذیب وتمدن اور انسانی اقدار کا پہرہ تھا۔ وہ ناپائیدار حُسن کے لیے صرف خیال کے بجائے صرفِ نگاہ کو کافی سمجھتے تھے۔ اسی لیے ان سفرناموں میں تاثرات کا رنگ اتنا گہرا نہیں ہے جتنا کہ واقعات کے بے کم وکاست بیان کی لطافت کا حظ ہے۔ حالات وواقعات اور نثری اُسلوب کے اعتبار سے یقین ہے کہ یہ سفرنامے، اُردو سفرناموں کے سرمائے میں ایک اہم اضافہ ثابت ہوں گے۔

سیّدین کے سفرناموں کا یہ مجموعہ "دنیا میرا گاؤں" کے نام سے شائع کیا جارہا ہے۔ یہ عنوان خود سیّدین کا قائم کردہ ہے۔ ان کا خیال تھا کہ ان سفرناموں کو اپنی خود نوشت سوانح حیات کا ایک باب بنائیں۔ لیکن موت نے انھیں اپنی سوانح حیات بھی ترتیب دینے کی مہلت نہیں دی۔ ان کے انتقال کے بعد سیّدین کی ہمشیرہ بیگم صالحہ عابد حسین صاحبہ نے سوانح حیات مرتب کرکے شائع کرادی لیکن سفرناموں والا حصّہ منتشر حالت میں ہونے کی وجہ سے شامل نہیں کیا جاسکا۔ خود نوشت سوانح حیات کے مسودے میں ابواب کی جو فہرست ملی اس میں ایک باب کا عنوان "دنیا میرا گاؤں" ہے جس میں سیّدین صاحب اپنے مختلف سفروں کے حالات شامل کرتے۔ چناں چہ سوانح حیات کا یہ باب اسی نام سے الگ کتابی شکل میں پیش کیا جارہا ہے۔

کتاب کے آخر میں ان تمام ناموں کا اشاریہ شامل کردیا گیا ہے جن کا ذکر سفرناموں میں آیا ہے۔ نیز اشاریے میں جہاں ضروری تھا، ناموں کے سامنے قوسین میں خواجہ غلام السیّدین سے قرابت داری کی وضاحت بھی کردی گئی۔

سیّدین میموریل ٹرسٹ کے کارپردازان تعریف کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اس علمی اثاثے کو شائع کرنے کا فیصلہ کیا، خاص طور پر بیگم صالحہ عابد حسین صاحبہ، جن کی سرپرستی اور رہنمائی میں یہ ٹرسٹ سیّدین کے علمی کارناموں سے دنیائے علم وادب کے خزانے بھر رہا ہے۔ بیگم صاحبہ کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں، ان کی زندگی کا مقصد ہی علم کے تِشنہ کاموں کو سرفراز کرنا

ہے۔ میں ان کا ممنون و مشکور ہوں کہ انھوں نے سفرناموں کی ترتیب کے لیے میرا انتخاب فرمایا اور اس ذمّہ داری سے عہدہ برآ ہونے میں پورا پورا تعاون دیا۔ میں عالی مرتبت کرنل بشیر حسین زیدی صاحب کا بھی بدل ممنون ہوں اور سیّدین میموریل ٹرسٹ اور اس کے عہدے داران و اراکین کا بھی جنھوں نے محترمہ بیگم صالحہ عابد حسین صاحبہ کی تجویز پر صاد کیا اور یہ خدمت میرے سپرد فرمائی۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ اُردو کے ریسرچ اسکالر محمد فاضل صاحب کا شکریہ بھی ضروری ہے کہ انھوں نے مسودے کی تیاری سے اس کے پریس جانے تک میری ہر ممکنہ مدد کی۔

آخر میں اس کا اعتراف کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ میری کاوشوں کو ثمر خیز بنانے میں میرے اُستاد محترم پروفیسر گوپی چند نارنگ کی مشفقانہ رہنمائی اور حوصلہ مندانہ کرم فرمائی کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے جنرل منیجر جناب شاہد علی خاں صاحب کا شکریہ بھی واجب ہے جن کی توجہ اور عنایت سے یہ کتاب سیّدین میموریل ٹرسٹ کی جانب سے اشاعت پذیر ہو رہی ہے۔

۱۲؍ فروری ۱۹۸۳ء

سیّد فرحت حسین
E-2۔ ترکمان گیٹ
دہلی ۶

سفرِ ایران

۱۹۲۹

۸ جولائی

تمام عزیزوں سے رخصت ہوکر اور دعاؤں کی فرمائشیں ساتھ لے کر آج نو بجے کی گاڑی سے روانہ ہوا۔ عمِ محترم خواجہ غلام الحسنین صاحب اسٹیشن پر چھوڑنے آتے تھے۔ ان کو ایک پرانے ہندو دوست مل گئے جو اب پانی پت اسٹیشن کے ڈاکٹر ہیں۔ وہ گلستاں بوستاں اور فارسی ادب اور مسلمانوں ہندوؤں کے پرانے تعلقات کا ذکر کرتے رہے۔ اکثر "پرانے زمانے" کے ہندوؤں کی گفتگو سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اور مسلمانوں کے خوشگوار تعلقات کا باعث بہت کچھ شیخ سعدی رہے ہیں! مخلص آدمی معلوم ہوتے ہیں۔

اظہر اور احمد میرے ساتھ ہیں۔ دونوں کو ہم سفرِ ایران نہ ہونے کا افسوس ہے۔ لیکن اپنی جرأت اور دل سوزی کی وجہ سے اس کو ظاہر نہیں کرتے۔ بعض موقعوں پر جب ایثار کی آزمایش ہوتی ہے تو ان کی کامیابی سے خوشی ہوتی ہے۔

۹ جولائی

دو روز سے زیدی صاحب کے انتظار میں دہلی پڑے ہوئے ہیں۔ ان کا کچھ پتا نہیں اور بہت فکر ہے۔ اگر وہ کل صبح تک نہیں پہنچے تو جمعہ کو جانے والی گاڑی نہیں ملے گی اور کوئٹہ میں تین روز قیام کرنا پڑے گا تار بھی دیا ہے۔ دیکھیے ان کا رام پور سے چھٹکارا ہوتا ہے یا نہیں۔ علی گڑھ سے خواجہ سجاد حسین صاحب بھی کورٹ کی میٹنگ میں

شرکت کر کے واپس آگئے ہیں۔ ان سے معلوم ہوا کہ نئے پرو وائس چانسلر کا تقرر ہو گیا۔ اور ڈپٹی حبیب اللہ خاں صاحب کے معاملے کے سلجھ جانے کی امید ہے۔

۱۰ جولائی

زیدی صاحب آگئے ہیں اور ہم لوگ آج بارہ بجے روانہ ہوں گے۔ کوئٹہ تک جانے کا وقت نہیں۔ اس لیے سپنزند ہی سے گاڑی بدل کر روانہ ہو جائیں گے۔ ہمیں جگہ اچھی مل گئی ہے۔ اسٹیشن پر خواجہ صاحب، عابد صاحب اور بہت سے صاحبان چھوڑنے آئے ہیں۔ اگرچہ اس سفر کے معنی ہیں دو مہینے کے لیے اپنے ملک اور وطن سے جدائی۔ لیکن طبیعت کچھ ایسی بھی ہوئی ہے کہ نہ تو اس خیال سے کوئی خاص جوش اور توقعات پیدا ہوتی ہیں اور نہ ہی دل بہت بھرا ہوا اور بے چین معلوم ہوتا ہے۔ یہ عمر کی زیادتی کا اثر ہے یا ٹھیس پر ٹھیس لگنے سے دل کے تار ڈھیلے پڑ جاتے ہیں اور صدا نہیں دیتے؟

میں نے جامعہ کے بک ڈپو سے ممالکِ مقدسہ کا ایک نقشہ خرید لیا ہے۔ جو بمبئی کے ایک تاجر نے شائع کیا ہے۔ اچھے بڑے سائز کا ہے اور ایک سخت پٹھے کے اندر ملفوف ہے۔ اس میں تمام ممالکِ اسلامی دکھائے ہیں۔ اور راستوں اور ریلوں کے نشان بنے ہوئے ہیں۔ ہم تینوں کو اس کے مطالعے میں بہت دلچسپی معلوم ہوتی ہے اور ہم نے سفر کا راستہ اس میں دیکھ کر معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ کوئٹہ سے ہم بلوچستان کے شمال مغرب کی طرف افغانستان کی سرحد کے متوازی جائیں گے اور دزداب پہنچیں گے جو ایرانی سرحد پر واقع ہے اور افغانستان کی سرحد سے دور نہیں۔ شاید پچاس میل ہو۔ اس کے بعد ہم بالکل شمال کی طرف جائیں گے۔ پھر افغانستان کی سرحد کے ساتھ۔ شاید کوئی چھوٹا پہاڑوں کا سلسلہ بیچ میں حائل ہو۔ اور دشتِ لوط کو عبور کر کے، ہرمک، بیرجند، تربتِ حیدری ہوتے ہوئے مشہدِ مقدس پہنچیں گے۔ یہ فاصلہ اندازاً چھ سو میل ہوگا۔ وہاں سے طہران مغرب کو تقریباً اتنے ہی فاصلے پر ہے۔ قصد یہ ہے کہ طہران وغیرہ کو دیکھنے کے بعد جنوب کی طرف بقصدِ عراق روانہ ہوں۔ خانقین تک موٹر کا سفر ہے جو شاید چار سو یا پانچ سو میل ہوگا۔ اور وہاں

سے بغداد تک ریل ہے جو تقریباً تمام مقاماتِ مقدسہ تک جاتی ہے۔ خدا ارادہ کو پورا کرے۔ ایران میں آج کل موسم بہت خوش گوار ہوگا لیکن عراق میں گرمی کا اندیشہ ہے۔

ہم راستے میں بہت دل چسپی کے ساتھ یہ غور کرتے رہے اور گفتگو کرتے رہے کہ خشکی کے راستے سے یورپ کس طرح جا سکتے ہیں۔ اور ہم نے تقریباً طے بھی کر لیا ہے کہ یہ ریل (نقشے پر) کس راستے سے جائے گی۔ افغانستان کی سرحد پر چمن تک ریل اب بھی جاتی ہے۔ تجویز یہ ہے کہ چمن کو ہرات کے راستے مشہدِ مقدس سے ملا دیا جاتے اور مشہد سے طہران اور طہران سے عاشق آباد تک جو روسی اور ترکی سرحد پر ہے ریل بن جائے۔ عاشق آباد سے پھر ریل ہے جس کے ذریعے قسطنطنیہ تک پہنچ سکتے ہیں اور وہاں سے گرینڈ کونٹی نینٹل ایکسپریس کے ذریعے فرانس کی بندرگاہ کے لیے۔ گویا اس طرح کلکتے سے کیلے تک مسلسل اور نہایت دل چسپ خشکی کا راستہ ہو جائے گا۔ جس سے مسافت آدھے وقت میں طے ہوگی۔ اور ایشیا کے تمام مغربی ممالک سیاحوں اور زائرین اور مسافرین کے لئے کھل جائیں گے۔ اور پہلے سے بہت زیادہ لوگ ان ملکوں کو جانے لگیں گے۔ اور باہمی تعلقات مستحکم ہوں گے۔ اگر یہ راستے اس طرح بن جائیں اور اسی کے ساتھ مختلف ملکوں ایران، افغانستان، حجاز، شام وغیرہ میں اور بڑے بڑے شہر برانچ لائنوں کے ذریعے اس مرکزی لائن سے ملا دیے جائیں تو مسافروں اور زائروں کو بہت آرام اور آسانی ہو جائے گی۔ مثلاً عاشق آباد سے لوگ چند روز کے لیے بطور سیاحت و تفریح کاکیشیا جا سکیں گے۔ طہران سے شیراز اور بوشہر تک آسانی سے سفر ہوگا۔ اور ہندوستان کے مسلمان ان دیرینہ مراسم اور یادگاروں کو تازہ کر سکیں گے جو ان کو اس علاقے سے ہے۔

راستے میں سخت گرمی اور لو کی تکلیف اُٹھائی۔ یہ غنیمت ہے کہ درجہ تقریباً تمام سفر میں خالی ملا۔ سپزند سے ذرداب جانے والی گاڑی میں روانہ ہوئے۔ اس گاڑی پر بابو شاہ محمد صاحب نے جو کوئٹہ میں ریلوے کے دفتر میں CHIEF GOODS CLERK ہیں ہمارے تار کے بموجب کھانا وغیرہ بھیج دیا تھا۔ لیکن سپزند سے اگلے اسٹیشن یعنی ستونگ روڈ

جاکر معلوم ہوا کہ ہمارے پاسپورٹ کا VISA (قونصلِ ایران کا اجازت نامہ) کوئٹہ سے حاصل ہوسکتا ہے وزداب میں اس کا کوئی انتظام نہیں۔ چنانچہ وہاں سے اُتر کر ہم کو واپس کوئٹہ جانا پڑا۔ گاڑی کے انتظار میں دو گھنٹے اسٹیشن پر رہے۔ اس اثنا میں پاسپورٹ آفیسر بابو تلسی داس (سب انسپکٹر پولیس کوئٹہ) سے ملاقات رہی جو بہت خوش مزاج اور خلیق آدمی ہیں۔ انھوں نے ہمارے ساتھ ہی کھانا کھایا۔ ہندو مسلم نفاق کو گالیاں دیں۔ مسلمانوں کی یعنی ہندوستان کے مسلمانوں کی، تعریف کی اور ایرانیوں کو بہت بُرا بھلا کہا۔ یہ بھی ہندی مسلمانوں سے محبت کے اظہار میں! انھوں نے یہ بڑی عنایت کی کہ تار دے کر زیدی صاحب کا اٹاچی کیس اگلے اسٹیشن سے واپس منگوا دیا۔ ورنہ وہ گم ہوجاتا۔

کوئٹہ ۱۲ جولائی

کوئٹہ میں ہم بابو شاہ محمد صاحب کے ہاں مقیم ہیں۔ یہاں ۱۳ تک ٹھہرنا ہوگا کیونکہ وزداب گاڑی ہفتے میں دو روز جاتی ہے۔ پیر کو اور جمعہ کو۔ بابو صاحب نہایت معقول اور شریف اور خوش خلق مردِ مومن ہیں۔ شہر کے لوگوں میں بہت اچھی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہندو اور مسلمان اور انگریز سب ان سے خوش ہیں۔ مگر باوجود اس کے ایماندار آدمی ہیں۔ انھوں نے ہماری بہت خاطر مدارات کی۔ چچا ابا صاحب کی ملاقات ان سے اس زمانے کی ہے جب وہ کوئٹہ میں نواب صاحب خیرپور کے صاحبزادے کے ساتھ مقیم تھے۔

کوئٹہ میں ایک انجمن امامیہ قائم ہے جس کے سرگرم اور کارکن ممبر بابو صاحب، بابو فرمان علی صاحب جو (؟) ہیں اور چودھری اللہ دتا عرب ٹھیکے دار ہیں۔ ان لوگوں نے اپنی محنت اور خلوص و ایثار سے یہاں ایک مسافر خانہ بنایا ہے جس میں زائرین مشہدِ مقدس قیام کرتے ہیں۔ اسی مسافر خانے میں ایک بڑا کمرہ بطور عزاخانہ کے ہے۔ مردوں اور عورتوں دونوں کی نشست کا معقول انتظام ہے۔ مسافر خانے میں بھی عورتوں کے قیام کے لیے علیحدہ دو کمرے ہیں جو بیگم صاحبہ خیرپور کے عطیے سے بنے ہیں۔ اس انجمن کی کارکردگی کی وجہ سے نہ صرف زائرین کو بہت سہولت ہوگئی ہے بلکہ کوئٹہ میں عزاداری کو بہت ترقی

ہوئی ہے۔ اور تین سال کے اندر اندر محترم کی رونق زیادہ ہوگئی ہے۔ خدا ان کی کوششوں کو کامیاب کرے!

کوئٹہ میں بہت سے صاحبان سے ملاقات ہوئی۔ ان میں سے خاص طور پر قابلِ ذکر خان بہادر علاؤ الدین صاحب ہیں جو ڈاکخانوں کے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ تھے اور اب ملازمت سے سبکدوش ہوکر کوئٹہ میں رہتے ہیں اور میونسپل کمشنر وغیرہ ہیں۔ تجارت کا سلسلہ جاری کر رکھا ہے۔ اور ایک نہایت عمدہ باغ بھی لگایا ہے۔ اصل وطن قندھار ہے۔ لیکن وہاں سے چلے آئے تھے اور انھوں نے تمام ترقی اور تحصیل محض اپنی کوشش اور محنت اور یارا تے بخت سے کی ہے۔ ایران اور دیگر ممالک کی سیاحت کی ہے۔ وہاں ڈاکخانے کی ملازمت کے سلسلے میں SURVEY وغیرہ بھی کیا۔ اور اپنا کام اس قدر خوش اسلوبی سے انجام دیا کہ بہت جلد ترقی کر گئے اور خطاب پایا۔ انھوں نے مدرسے کی تعلیم صرف پانچویں جماعت تک پائی ہے لیکن وہ گراں تر اور مفید تر تعلیم جو تجربے سے حاصل ہوتی ہے جو دنیا دیکھ کر میسر ہوتی ہے ان کو حاصل ہے۔ گفتگو نہایت دل چسپ کرتے ہیں۔ اور اس قدر بلند آہنگی کے ساتھ کرتے ہیں کہ اگر مجمع میں سے کوئی شخص ان کی گفتگو کی طرف ملتفت نہ بھی ہو تب بھی ان کو سننے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں۔ سیاسی اور معاشرتی مسائل پر نہایت انوکھے اور انفرادی انداز سے رائے دیتے ہیں۔ نہ کسی "اصول" کے قائل ہیں نہ کسی "شخصیت" کا رعب مانتے ہیں۔ ہر چیز اور ہر مسئلے کو عملی تجربے کے معیار پر جانچتے ہیں اور اس کی بنا پر رائے قائم کرتے ہیں۔ سیاست میں قوت اور زورِ بازو کے قائل ہیں۔ انگریزوں کی ذہنیت اور سیاسی چالوں کی تشریح بڑے مزے سے کرتے ہیں۔ گاندھی جی کے فلسفۂ عدمِ تشدد کو مہمل اور مجذوب کی بڑ سمجھتے ہیں......

ہم نے وائس قونصل ایران مقیم کوئٹہ جناب مرزا مہدی اعتصام سے بھی ملاقات کی۔ خاصے نوجوان آدمی ہیں اور بہت خلیق۔ ایرانی معلوم ہوتا ہے، بالعموم خلیق ہوتے ہیں۔ اور ان کا طرزِ گفتگو اور حرکات و سکنات جس میں قدرتی اور بے ساختہ تکلف پایا جاتا ہے اس اثر کو اور زیادہ نمایاں کرتے ہیں۔ انھوں نے ہم کو وزارتِ معارفِ طہران کے نام ایک

خط دیا تاکہ ہم وہاں مدرسوں وغیرہ کو بخوبی دیکھ سکیں۔

سفر از کوئٹہ بہ دزداب

ہم ۱۵ کو صبح کی گاڑی سے دزداب کے لیے روانہ ہوئے۔ کھانا وغیرہ دو روز کے لیے ساتھ لے لیا تھا اور پانی کے لیے تین مشکیزے ساتھ رکھے تھے۔ کیونکہ کہا جاتا ہے کہ راستے میں پانی تک دستیاب نہیں ہوتا۔ لیکن توفیقِ الٰہی اور فیضِ امام رضا علیہ السلام ہمارا دستگیر رہا اور ہم کو راستے بھر کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ بابو شاہ محمد صاحب کی ہدایات کی وجہ سے جو انھوں نے گارڈ کو دی تھیں اور ہمارے ہم سفر قاضی عبدالوحید صاحب پانی پتی کی محبت اور عنایت سے تمام راستے تازہ کھانا اور پانی ملتا رہا۔ قاضی صاحب نوشکی میں E.A.C. کے ہیڈ کلرک ہیں۔ انھوں نے اگلے اسٹیشنوں پر تار دے کر ہمارے لیے کھانا تیار کرایا۔ اور خود احمد دال پر اتر کر ہم کو ایک اور ڈاکٹر صاحب کے سپرد کر گئے جو اسی لائن پر ریلوے میں ملازم ہیں اور انھیں کی طرح ہم کو مدد دیتے رہے۔

دزداب کا راستہ نہایت خشک اور بنجر اور چٹیل ہے۔ اگرچہ سارا علاقہ پہاڑی ہے۔ لیکن سینکڑوں میل میں ایک سرسبز درخت بھی نظر نہیں آتا۔ سفر کرتے کرتے طبیعت اُکتا جاتی ہے اور منظر کی تبدیلی اور نظر فریبی کو تلاش کرتی ہے لیکن نہیں پاتی۔ اسٹیشن بہت دور دور پر ہیں بعض دفعہ چھ سات گھنٹے کے بعد اسٹیشن آتا ہے۔ اور وہاں بھی کچھ کھانے کو نہیں ملتا۔ کھانا ساتھ ہونا ضروری ہے۔

۱۶ جولائی دزداب

ہم دزداب شام کو چار بجے پہنچ گئے اور ایک ہوٹل میں مقیم ہوئے جو منشی سلطان احمد صاحب پنجابی کی ملکیت ہے۔ ہم کو بابو شاہ محمد صاحب نے دزداب کے کسٹم آفیسر خان بہادر مرزا شیر محمد خاں صاحب کے نام (خط) دیا تھا لیکن چونکہ ان کے ہاں مہمان آئے ہوئے تھے وہ ہم کو ٹھہرا نہیں سکے۔ اور انھوں نے اس صاف ستھرے اور عمدہ ہوٹل کا پتہ دیا۔ یہاں

کا انتظام ہندوستانیوں کا ہے۔ اگرچہ ملازم ایرانی ہیں۔ منشی سلطان احمد نے جو ایک عرصے سے ایران میں موٹروں وغیرہ کی تجارت بھی کرتے رہے ہیں ہماری نہایت پُر تکلف دعوت بھی کی۔ ہوٹل میں تین آدمیوں کے ایک شب و روز کے قیام کے ہم نے عنہ (بیس روپے) دیئے۔ معمول نرخ زیادہ ہے لیکن ہمارے متعلق مالک ہوٹل کی یہ ہدایات تھیں کہ ہم جو کچھ مناسب سمجھیں وہ لے لیا جائے۔

شام کو خان بہادر صاحب سے ملاقات کی۔ یہ ایک بلوچ بلکہ بروہی بزرگ ہیں۔ انھوں نے کراچی میں تعلیم پائی ہے اور زیادہ عرصے تک افغانستان وغیرہ کی سرحد پر کام کیا ہے۔ اب دو سال سے بلوچستان کی سرحد پر کام کرتے ہیں۔ نہایت متدین، خدا ترس اور مہمان نواز بزرگ ہیں۔ ہم سے بہت خُلق و مروّت سے پیش آتے۔ اور اس بات کا سخت افسوس کرتے رہے کہ ہم کو اپنے ہاں نہ ٹھہرا سکے کیونکہ ان کے مکان میں مطلق جگہ نہ تھی۔ ان سے ایران کی حالت اور انگریزی سیاسیات کے متعلق بہت دل چسپ گفتگو ہوتی رہی۔ برخلاف بعض اور لوگوں کے جو ایرانیوں کے دورِ جدید کی مخالفت اور مذمت کرتے ہیں وہ ایرانیوں کے بہت مدّاح ہیں۔ کہتے تھے کہ میں نے کسی ملک میں اس قدر امن نہیں دیکھا جس قدر آج کل ایران میں ہے۔ چوری اور ڈاکہ تقریباً مفقود ہیں۔ لاکھوں روپے کا مال اور ہزاروں آدمی ہر ہفتے موٹروں کے ذریعے آتے جاتے ہیں اور بالکل غیر آباد اور بظاہر غیر محفوظ علاقوں سے گزرتے ہیں لیکن کوئی تعارض نہیں کرتا۔ اگر روپوں کی تھیلی بھی گر جائے تو کوئی شخص اس کو نہیں اُٹھاتا۔ ایک مرتبہ چوری میں چھ شخص حال ہی میں گرفتار ہوئے تھے۔ دولت نے مشہدِ مقدس میں ان پر آرہ چلا دیا کہ تم لوگ دولتِ ایران اور امنِ ایران کو بدنام کرنا چاہتے ہو۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ ایرانی دراصل نہایت متانت اور خموشی کے ساتھ اپنے ملک و ملت کی تعمیر میں لگے ہوئے ہیں ——

"بہت آہستہ آہستہ بولتے ہیں۔ اپنے کام سے کام ہے اور بس۔"

انھوں نے دزداب کو انگریزوں سے نہایت خوش اسلوبی اور حکمت عملی کے ساتھ خالی کرایا۔ نہ کوئی لڑائی لڑنی پڑی نہ طویل گفت و شنید کرنی پڑی۔ بلکہ آہستہ آہستہ ان

کو پیچھے ہٹاتے گئے۔ یہاں تک کہ ان کا قبضہ جو ایک زمانے میں تمام سیستان اور خوراسان پر ہوگیا تھا (بوجہ دزداب مشہد کی راہ کے) ہٹ کر دزداب کے بجائے میرجاوا تک پہنچ گیا۔ " ایرانیوں نے ان سے کہا کہ اپنا بستر اُٹھائیے۔ کھانا یہاں کھائیے، پانی یہاں پیجیے لیکن سوئیے میرجاوا جاکر" اور" اپنا جھنڈا خاکِ ایران سے اُٹھائیے۔ اس کو اگر گاڑنا ہے تو دو اینٹیں رکھ کر اس پر لگائیے۔" ملک کا یہ علاقہ آپ کو دے دیا گیا تھا؟ نہ خیر، ملک کو کوئی طاقت یا حاکم کسی اور کو نہیں دے سکتا۔" اب آپ یہاں سے تشریف لے جائیے!" غرض اس طرح سے انگریزوں اور روسیوں وغیرہ نے نہ صرف اپنا قبضہ اُٹھا لیا بلکہ اپنے مخصوص اختیارات بھی ان کو چھوڑنے پڑے۔ اب بالعموم ایران میں یہ معلوم نہیں ہوتا کہ غیر ملکیوں کا اثر یا اقتدار ہے۔

دزداب ایک نو آباد گاؤں ہے۔ بہت صاف ستھرا اور باقاعدہ بسا ہوا ہے۔ یہاں کے مکان سب کچے بنے ہوتے ہیں۔ اور ہندوستانی گاؤں کے مکانوں سے بہت زیادہ صاف ستھرے اور خوشنما معلوم ہوتے ہیں۔ ہر مکان کے اُوپر مٹی سے لپے ہوئے گنبد بنے ہوئے ہیں جو تمام گاؤں کو مخصوص اور ہمارے ہاں سے مختلف بنا دیتے ہیں۔ سڑکوں پر پانی، کوڑا کرکٹ بالکل نہیں۔ یہ گاؤں انگریزوں نے آباد کیا تھا۔ اس لیے اس سے ایرانی گاؤں کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم گزشتہ دس سال میں ایرانیوں نے اس کو اگر بہتر نہیں بنایا تو صاف ستھرا ضرور رکھا ہے۔ گاؤں کی پولیس کو یہاں " امنیہ" اور شہر کی پولیس کو "نظمیہ" کہتے ہیں۔ ان کی وردیاں اچھی معلوم ہوتی ہیں۔ اور وہ نہایت مستعدی اور خاموشی کے ساتھ اپنا کام انجام دیتے معلوم ہوتے ہیں۔ بحیثیت مجموعی ایرانیوں کا اب تک اچھا اثر پڑا ہے۔ لوگوں کا اخلاق یعنی ظاہری برتاؤ پسندیدہ ہے۔ ہر بات پر نہایت عمدگی کے ساتھ "چشم" کہتے ہیں جو بہت بھلا معلوم ہوتا ہے۔ سامان کو دیکھنے کے لئے دزداب کے اسٹیشن پر کوئی اچھی جگہ نہیں ہے۔ ہر چیز کو زمین پر ڈال کر دکھانا پڑتا ہے۔ لیکن لوگوں کو تکلیف نہیں دیتے۔ البتہ تمباکو کی تلاش سختی کے ساتھ کرتے ہیں۔

معلوم ہوا ہے کہ موٹر کا ملنا بہت مشکل ہے۔ تمام موٹروں کو دولت نے پکڑ لیا ہے

اور اس میں فوج بھر کر غالباً کرمان کے راستے بوشہر کی طرف بھیج رہے ہیں۔ اس لیے نہ صرف نرخ گراں ہوگیا ہے بلکہ موٹروں کو اجازہ ہی نہیں ملتا۔ خان بہادر صاحب اور سلطان احمد صاحب سے مل کر کوشش کی ہے۔ خدا کرے کامیابی ہو۔

موٹر کا انتظام ہوگیا۔ بہت تلاش اور قیل و قال کے بعد حاجی عبداللہ جان نے جو مسافر خانہ رضویہ کے مہتمم ہیں ایک موٹر دوسو روپے میں دیا ہے۔ CHEVROLET ہے اور بالکل نیا ہے۔ اس کو فروخت کرنے کے لیے مشہدِ مقدس بھیج رہے ہیں۔ ہم اسی میں جائیں گے۔ البتہ نئی موٹر میں اسباب کا جانا ممکن نہیں۔ اس لئے اسباب بعد میں آئے گا۔ ہم آج شب کو (بتاریخ ۱۷ جولائی) وزداب میں صرف ایک روز ٹھیر کر بارہ بجے روانہ ہوں گے۔ کیونکہ راستے میں دشتِ لوط پڑتا ہے۔ اس لیے اس گرم حصّے کو رات میں طے کرتے ہیں۔ دن کو نہیں چلتے۔

۱۸ جولائی، وزداب سے مشہد کا سفر

راستہ ابتدا میں بیس پچیس میل بہت خراب ہے۔ باقاعدہ اور مرمت شدہ سڑک نہیں، بہت جھٹکے لگتے ہیں۔ دشتِ لوط شاید سو میل لمبا ہے یا اس سے زیادہ۔ اس میں گرمی ہے لیکن ریت ہونے کی وجہ سے رات کا وقت ناگوار معلوم نہیں ہوتا اور سڑک بھی زیادہ تکلیف دہ نہیں ہے۔ ہماری موٹر بہت عمدہ ہے اور ڈرائیور ہوشیار اور اپنے کام سے واقف ہے، تمام رات وہ نہایت احتیاط اور تیزی کے ساتھ موٹر چلاتا رہا۔ علی الصّباح ہم سفید آدا کے گاؤں میں پہنچے۔ وہاں کچھ دیر آرام کیا۔ گاؤں میں دس پندرہ آدمی رہتے ہیں پہلے انگریزوں کی چھاؤنی تھی۔ اب صرف یہی چند آدمی رہتے ہیں۔ لیکن ایک مکان پر جو امنیہ کا دفتر ہے ایرانی جھنڈا اُڑ رہا ہے۔ ایک بوڑھے ایرانی نے جو گاؤں کا رہنے والا ہے چائے بنا کر دی۔ اس سے تکان کم ہوئی۔

راستے میں جا بجا چھوٹے چھوٹے آباد یا غیر آباد گاؤں ملتے ہیں جن میں سے بیشتر انگریزی فوجوں کی چھاؤنیوں کی یادگار ہیں۔ معلوم ہوتا ہے جنگ کے زمانے میں جب انگریزوں نے مشہد تک برابر اپنی فوجیں ڈال رکھی تھیں انھوں نے غریب ہندوستان کا کروڑوں روپیہ بے تحاشہ صرف کیا اور آمد و رفت کے وسائل اور فوجوں کی رہائش اور خوراک رسانی

کے انتظام میں سعی بلیغ کی۔ کیونکہ دزداب سے بیر جند تک کم از کم تین سو میل کا علاقہ بالکل چٹیل اور بنجر صحرا ہے یا پتھریلی چٹانیں جن میں کوئی پیداوار نہیں ہوتی۔نہ پانی ملتا ہے۔ نہ کوئی درخت دکھائی دیتا ہے بلکہ زمین پر گھاس کا تنکا بھی نظر نہیں پڑتا۔ موٹر میں بیٹھے ہوتے گھنٹوں سفر کرنے میں اُوپر آسمان اور نیچے بنجر زمین نظر پڑتی ہے۔اور کچھ عرصے کے بعد موٹر کا سفر ایسا معلوم ہوتا ہے گویا ہمیشہ سے اسی طرح ایک عالمِ خواب و یکسانیت میں سفر کرتے رہے ہیں!

دوپہر کو ایک گاؤں میں پہنچے جس کا نام شوصف ہے۔ یہاں لوگ ہمارے شوفر رمضانی کو جانتے ہیں۔ان میں سے ایک شخص ہم کو اپنے مکان میں لے گیا جس کا غالباً ایک کمرہ مہمانوں یعنی مسافروں کے لیے مخصوص ہے۔ یہاں اکثر گاؤں میں لوگوں نے موٹروں کی آمد و رفت کی وجہ سے ایسا انتظام کیا ہے۔ یہ مکان ایران کے گاؤں اور شہروں کے اکثر مکانوں کی طرح کچا تھا لیکن صاف۔اس میں اس نے پلنگ وغیرہ بچھا دیے اور دوپہر کو چند گھنٹے ہم نے وہاں آرام کیا۔ روٹی، انڈے، مکھن چائے وغیرہ مل گئی۔ایک بہت دل چسپ بات ہم نے یہ دیکھی کہ گاؤں میں بہت سے لوگ کم کم اُردو جانتے ہیں لیکن وہ اُردو پنجابی اُردو ہے! ہمارے میزبان نے جو ایک نوجوان ہے دورانِ گفتگو میں کہا "یہ جڑا ہمارا گام ہے" میں پہلے کچھ نہ سمجھا کہ یہ کیا زبان ہوئی۔لیکن دفعتاً دماغ میں روشنی پیدا ہوگئی کہ اہلِ ہمّت اور مستعد پنجابیوں نے جو انگریزی فوجوں میں تھے اپنی تہذیب اور زبان کا جھنڈا یہاں تک گاڑ دیا ہے۔ آفریں ہے ان کی ہمّت اور حوصلے پر! یہاں ہم کو کھانے اور ٹھیرنے کے کُل پانچ قِران دینے پڑے اور وہ اس سے مطمئن ہوگیا۔ شام کے قریب ایک اور ذرا بڑے گاؤں میں پہنچے جس کا نام "سردی شاہ" تھا۔ یہاں قریب قریب کچھ کھیتی بھی تھی لیکن گاؤں میں آدمی بہت کم نظر پڑتے تھے۔شاید کھیت میں کام کر رہے تھے۔ہم نے یہاں سے تار دینے کی کوشش کی تاکہ بیر جند میں برٹش قونصل کو جو ایک میرٹھ کے مسلمان ہیں ہمارے آنے کی اطلاع ہوجائے۔لیکن دفتر بند تھا اور "رئیسِ تلغراف خانہ" کھیت پر گئے ہوئے تھے۔ یہاں بھی سب مکان کچے تھے اور ان میں سے ہر ایک کے اُوپر وہی گول گنبد بنے ہوتے جو

ایرانی گاؤں کی خصوصیت ہیں اور ان کو ہندوستان کے گاؤں سے زیادہ خوبصورت بناتے ہیں۔ گندگی یا کیچڑ کہیں نظر نہیں آیا۔ شام کو سات بجے کے قریب ہم بیرجند پہنچے۔ سردی شاہ اور بیرجند کے بیچ میں منظر بہت بہتر ہو جاتا ہے۔ پہاڑوں پر چڑھنا اور اُترنا پڑتا ہے۔ اور بجائے چٹیل زمین اور پہاڑوں کے چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں اور کہیں کہیں درخت راستے میں نظر پڑتے ہیں۔ ان جھاڑیوں کو .... کہتے ہیں اور دور سے ان سے ڈھکی ہوئی زمین ایسی معلوم ہوتی ہے جیسے دھان کے کھیت۔ پہاڑیاں بھی شام کی ہلکی ہلکی روشنی میں نیلے رنگ میں رنگی ہوئی بہت بھلی معلوم ہوتی تھیں۔ دزداب سے بیرجند تک کا سفر گرم اور خشک اور بنجر علاقے میں سے ہوتا ہے اور اس کے بعد یہ حصہ بہت خوبصورت معلوم ہوتا ہے۔

بیرجند

بیرجند پہاڑی پر واقع ہے۔ اس کی بلندی شاید پانچ ہزار فیٹ کے قریب ہے۔ ایرانیوں کا خیال ہے کہ اس کی آب و ہوا بہت اچھی نہیں ہے لیکن ہم کو اچھی معلوم ہوئی۔ ہم سیدھے برٹش قونصل ڈاکٹر ایم۔ اے رحیم کے مکان پر پہنچے اور سامان وغیرہ وہاں اُتروایا۔ وہ خود اس وقت موجود نہیں تھے۔ مکان قلعہ نما ہے۔ دروازے کے سامنے وسط میں ایک خوبصورت دالان نما عمارت ہے جس کے ستون گول اور عمدہ ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے دربار میں رئیس کے بیٹھنے کی جگہ ہو۔ دونوں طرف کمرے ہیں جو اندر سے کافی بڑے ہیں لیکن دروازے بہت چھوٹے چھوٹے۔ ہم کو تعجب ہوا لیکن بعد میں ایران میں ہر جگہ ہم نے چھوٹے دروازے پائے۔

کچھ دیر کے بعد ڈاکٹر صاحب خود آ گئے۔ ان سے ملاقات کی، اپنا تعارف کرایا۔ اعلان کر ہم ناخواندہ مہمان آپ پر عائد ہیں۔ انھوں نے بہت خندہ پیشانی سے اس بار کو منظور کیا۔ معلوم ہوا کہ وہ پندرہ بیس سال سے ہندوستان سے باہر مختلف حصص ملک سفارت کی خدمت پر لگے ہوئے ہیں۔ ان سے یہ بھی معلوم ہوا کہ انگریزوں کے سفارت خانے ایران میں شاید بیس شہروں میں ہیں اور اب حکومتِ ایران اس بات پر زور دے

رہی ہے کہ یہ سفارت خانے اُٹھا لئے جائیں۔ روس یہ چاہتا ہے کہ انگریز شمال کے شہروں سے سفارت خانے اُٹھالیں اور روسی اس کے بدلے میں جنوب سے اپنے سفارت خانے اُٹھالیں۔غالباً اب صورتِ حال ایسی ہے کہ دیر سویر انگریزوں کو یہ بات ماننی پڑے گی۔ لیکن ان کے سر پر روس کا اس قدر خوف اور بھوت سوار ہے کہ وہ اس پر مشکل اور مجبوری سے راضی ہوں گے۔ ایک زمانہ تو ایسا تھا کہ ان میں سے ہر سفارت خانہ انگریزی سیاسی اقتدار کا ایک مرکز تھا اور یہ لوگ جو چاہتے تھے کرتے تھے۔ دولتِ ایران کچھ نہ کرسکتی تھی۔اگر کسی انگریز یا انگریزی رعایا کو ایرانی سے ذرا سا نقصان پہنچ جاتا تھا تو وہ اس سے دس گنا جرمانہ حکومت سے وصول کرتے تھے اور ملزم کو سخت سزا دلواتے تھے۔ لیکن اب ان کو جنگ کے بعد اس قدر اختیار اور عزہ نہیں رہا۔ ڈاکٹر صاحب کے ہاں اس شب حُسنِ اتفاق سے بہت سے ہندوستانیوں اور علی گڑھ کے اولڈ بوائز سے ملاقات ہوئی۔ایک صاحب سید رضی،وہاں موجود تھے جو شاید دہلی کی طرف کے رہنے والے ہیں۔ زیدی اور چچا ابّا سے پہلے سے واقف تھے۔ مدّت سے ایران میں ہیں۔ یہاں شادی بھی کی ہے۔ پہلے بوشہر میں ایک اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ اس کے بعد بیرجند میں مدرّس رہے۔ لیکن اب کاروبار کرتے ہیں اور کلکتہ ان کا مرکز ہے۔ یہاں شاید اپنی بیوی کو لے کر آتے تھے۔ اچھے دل چسپ اور باخبر آدمی ہیں۔ انھوں نے مشہد اور طہران کے متعلق چچا ابّا کو بہت سی ہدایات کیں۔ جس وقت وہ ان سے باتیں کر رہے تھے زیدی صاحب کا کان ایک اور صاحب کی گفتگو کے لیے وقف تھا۔ یہ صاحب "نواب" محمد مظفر حیدر آباد کے رہنے والے ہیں۔شاید سالار جنگ کے عزیز بھی ہیں۔ علی گڑھ میں دس سال سے زیادہ ۱۹۱۸ء تک تعلیم پائی اور میرے بہت سے ہم عصروں، ذاکر صاحب، نوراللہ، حبیب الرحمٰن، خدا بخش، ابن حسن وغیرہ سے واقف ہیں۔اس کے بعد مانچسٹر میں کئی سال تک سول انجینیرنگ کی تعلیم پاتے رہے۔ میں جس زمانے میں لیڈز میں تھا یہ مانچسٹر میں تھے اور شاید لیڈز میں ہاکی کھیلنے بھی آتے تھے۔ لیکن مجھ سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔علی گڑھ میں بھی اچھے کھلاڑی تھے۔

یہ فارسی اچھے لہجے سے اور کافی بے تکان بولتے ہیں۔ اور انھوں نے اپنے دورانِ قیام

میں ایران کے متعلق کافی معلومات حاصل کیں اور مختلف قسم کے مسائل مثلاً اقتصادی حالت، سیاسی امور، لوگوں کی معاشرت وغیرہ سب میں دل چسپی لی اور چیزوں کو غور سے دیکھا اور مطالعہ کیا۔ یہ رضا شاہ کی حکومت اور ایران کی موجودہ حالت سے مطمئن ہیں اور اس کی تعریف کرتے ہیں۔ ان سے اور چچا ابا سے بعض امور پر بہت بحث ہوئی مثلاً یہ کہ حکومت لوگوں کو ایک خاص ٹوپی یا لباس اختیار کرنے پر کیوں مجبور کرے۔ انھوں نے کہا کہ اصولاً یہ بات بے شک بہت بری ہے۔ لیکن جن حالات میں اور جس خیال سے حکومت نے ایسا کیا ہے اس کی اب حمایت اور اطاعت کرنی چاہیے۔ انھوں نے بھی زیدی کو بہت سی ہدایات کیں کہ مشہد اور طہران میں کیا دیکھیں اور کیا کریں جن میں سے اکثر کو زیدی نے ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دیا (وہی کان جو بعد میں طہران پہنچ کر آما جگاہِ مصیبت بنا!) آدمی خاصے باخبر اور دل چسپ ہیں۔ کسی قدر جماتے بھی ہیں لیکن اس طرح نہیں کہ دوسرے کو برا معلوم ہو یا آورد ظاہر ہو۔ بلکہ اس طرح سے کہ " میں جس قدر بظاہر معلوم ہوتا ہوں اس سے بہت زیادہ گہرا اور دور رس ہوں لیکن شیخی کرنے اور ظاہر کرنے سے کیا فائدہ؟" بہرحال میں نے ان کو بحیثیت مجموعی پسند کیا۔

ان کے ساتھ حیدر آباد کے ایک فارسی کے پروفیسر آغا مفتون یزدی تھے جو ایرانی ہیں اور اب وزارتِ معارف حیدر آباد میں ملازم ہیں وہ بھی مجھ کو بہت سی ہدایات دیتے رہے۔ ان کو اردو بولنے پر اصرار تھا اور مجھ کو فارسی بولنے کی خواہش۔ خوب گزری! ان کے علاوہ اور کئی صاحب رات کے کھانے پر مدعو تھے۔ سید امین اور ان کے ایک ہم جماعت .... دونوں بیر جند کے رہنے والے ہیں اور علی گڑھ میں پڑھتے ہیں۔ سید امین نے اس سال احمد عباس کے ساتھ انٹرنس پاس کیا ہے اور دوسرا طالب علم اس سال دسویں جماعت میں ہے۔ دونوں مجھ کو پہلے سے جانتے تھے۔ میں ان سے واقف نہ تھا۔ بہت تپاک سے ملے۔ اور اگلے روز نمبر ۲ کے والد نے جو بیر جند میں تاجر ہیں (آغا سید محمد علی) اپنے کیلات " ایوان کیف" میں ہماری دعوت بھی کی۔ "کیلات" یہاں اس چھوٹے یا بڑے COUNTRY HOME کو کہتے ہیں جو شہر سے دور پہاڑ کے دامن

میں، یا جنگل میں پانی کے کنارے لوگ بنا لیتے ہیں۔ یہ مکان بہت صاف اور ستھرا لیکن کچا تھا۔ اس میں تین کمرے تھے ہر طرف سے کھلے ہوئے اور ایک بیٹھک۔ ایک چھوٹا سا چشمہ اس کے احاطے میں سے گزرتا تھا اور اس پر درخت لگائے ہوئے تھے۔ کمروں میں قالینوں کا فرش تھا اور سونے کے لئے دو کمروں میں بہت خوبصورت، موٹے موٹے CUSHIONS یا گیتے دیواروں سے لگے ہوتے رکھے تھے۔ ان پر آرام سے بیٹھ بھی سکتے ہیں اور تین چار کو جوڑ کر بہت نرم اور گرم بستر بنا کر سو بھی سکتے ہیں۔

پہلے چائے اور شربت وغیرہ سے ہماری خاطر کی گئی یہ بار بار پینا پڑتا ہے۔ اس کے بعد کھانا لایا گیا جس میں چلاؤ، پلاؤ، کئی طرح کی خورش، ایک قسم کی سویاں اور کھچڑی ملی ہوئی، مرغ، حلوا، مربہ، انگور، تربوز، خربوزہ وغیرہ بہت سی چیزیں تھیں اور سب نہایت عمدہ اور لذیذ۔ اگر ایرانی کھانا ایسا ہی ہوتا ہے تو خوب ہوتا ہے۔ (بعد کے تجربے نے اس کی تصدیق نہیں کی!) کھانے کے بعد ہم نے شام تک دوسرے آرام کمرے میں آرام کیا یعنی سب لوگ وہاں گدّوں وغیرہ پر بیٹھے حقّہ پیتے رہے باتیں کرتے رہے — شیخ مفتون اور ہمارے میزبان نے کئی دل چسپ قصّے سنائے جو اچھی طرح سمجھ میں نہیں آتے۔ جلد جلد فارسی بولتے ہیں تو سمجھ میں نہیں آتی۔

۱۹ راگست

بیر جند میں ڈاکٹر صاحب اور دوسرے لوگوں کے اصرار سے ہم ایک رات اور ایک دن ٹھیرے۔ یعنی ۱۹ ر کی شام کو وہاں سے روانہ ہوئے۔ وہاں وقت بہت اچھی طرح کٹا۔ ایک صاحب سے ملاقات ہوئی جو ذرا موٹے اور ہنس مکھ قسم کے آدمی ہیں۔ ان کا نام حاجی آغا ہے اور وہ بیر جند کے ملک التجار حاجی محمد حسین کے بیٹے ہیں۔ وہ اپنا تعارف بھی اسی طرح کراتے ہیں۔ ایک صاحب وہاں اور تھے جن کا نام شیخ ایوب تھا۔ یہ برٹش قونصل جنرل سیستان کے ملٹری اٹاچی ہیں۔ شاید بمبئی کے رہنے والے ہیں۔

بیر جند سے چل کر رات بھر سفر کرتے رہے۔ ہمارا شوفر رمضانی بہت ہی ان تھک اور

کارکن آدمی ہے۔ اور طبیعت میں بہت استغنا اور آزادی ہے ۔ اس نے کبھی اس بات کا خیال بھی نہیں کیا کہ مثلاً ہمارے کھانے میں شریک ہو۔ ہر جگہ اپنے کھانے کے لیے خود علیحدہ ہم سے پہلے ہدایات دیتا تھا۔ اور جس وقت اس سے کہا جائے چلنے کو تیار تھا۔ دوپہر کو تربتِ حیدری پہنچے۔ یہ اچھا بڑا قصبہ ہے لیکن چونکہ اکثر یہاں زلزلے آتے رہتے ہیں اس سے مکانات وغیرہ اور شہر کے باہر باغوں کی دیواریں جا بجا شکستہ ہیں۔ یہاں عام دستور ہے کہ باغوں کے گرد اُونچی اُونچی کچّی دیواریں بناتے ہیں جس سے صرف درختوں کی چوٹیاں دکھائی دیتی ہیں۔ دوپہر کے وقت ہم نے ایک گاراژ کے بالاخانے میں آرام کیا۔ شہر کو دیکھنے کا موقع نہیں ملا اور نہ ہی اس کے نام کی وجہ معلوم ہوئی۔ خواجہ انور حسن مرحوم جب کئی سال ہوئے ایران آئے تھے تو تربتِ حیدری میں ٹھیرے تھے۔ ان کے وہاں سے روانہ ہونے کے دو گھنٹے بعد ہی وہاں سخت زلزلہ آیا تھا جس سے وہ مکان جس میں وہ ٹھیرے تھے بالکل تباہ ہوگیا تھا۔ جب خدا کو بچانا ہوتا ہے تو اس طرح بچالیتا ہے اور جب موت آنی ہوتی ہے تو ذرا سی جُست یا جھٹکے سے آدمی کا خاتمہ ہوجاتا ہے!

راستے میں ہم نے کئی جگہ کچے کمرے سے دیکھے جن کے اُوپر چھت ہوتی ہے اور ان کا دروازہ نیچے زمین میں اُتر کر بنایا جاتا ہے۔ معلوم ہوا کہ یہ برف کے "انبار" ہیں۔ جاڑے میں برف پڑتا ہے تو اس کو جمع کر کے یہاں لے آتے ہیں اور سال بھر اسی کو استعمال کرتے ہیں۔ تمام ایران میں یہی قدرتی برف استعمال ہوتی ہے اور بہت سستی ملتی ہے۔ برخلاف ہندوستان کی کچی برف کے (جو مشین ہی میں بنتی ہے) اس کی وجہ سے پانی کا مزا خراب نہیں ہوتا۔ اب تک ہم کو جو کچھ تجربہ ہوا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایران میں کھانے کی چیزیں مہنگی نہیں ہیں۔ ہندوستان سے سستی ہیں۔ پھل اور برف اور انڈے اور روٹی ارزاں ہیں۔ البتہ چائے مہنگی ہے۔ یعنی ایک چھوٹا فنجان ۲ یا ۳ پیسے کا ملتا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ چائے اور شکر پر بھاری محصول لگا دیا گیا ہے جس کی آمدنی سے ریل بنائی جا رہی ہے۔

مشہدِ مقدس، ۲۰ جولائی

آج شام کے چار بجے مشہدِ مقدس پہنچے۔ دور سے پہاڑ کے اتار پر روضۂ مقدس کا کلس اور گنبد دکھائی دیتا ہے۔ سورج کی روشنی میں اس کا سونا چمکتا ہے۔ شہر سے کئی میل پہلے باغات شروع ہو جاتے ہیں۔ یہ بھی راستے کے باغات کی طرح اونچی کچی چہار دیواری سے گھرے ہوئے ہیں لیکن نہایت سرسبز معلوم ہوتے ہیں۔ راستے میں کاریز اور نہریں بھی ملتی ہیں۔ شہر کے دروازے پر پاسپورٹ ہم سے لے لیے گئے۔ نظمیہ کے دفتر میں تیسرے روز ملیں گے۔

شہر میں اکثر سڑکیں خوبصورت اور دل چسپ ہیں۔ "خیابانِ ارگ" اور "خیابانِ پہلوی" حال ہی میں بنائے گئے ہیں۔ دونوں طرف وسیع پیادہ راستے ہیں جن پر بڑی بڑی موجودہ طرز کی دکانیں بنی ہوئی ہیں اور سامنے درخت لگے ہوئے ہیں۔ بیچ میں گاڑیوں اور موٹروں کے لیے سڑک ہے جو کافی وسیع ہے۔ بجلی کی روشنی ہے لیکن علی گڑھ کی طرح بہت کم! "خیابانِ بالا" جو روضۂ مقدسہ کے سامنے سے شروع ہوتا ہے ڈیڑھ دو میل تک چلا گیا ہے۔ اس کے بیچ سے نہر بہتی ہے جس کے دونوں طرف گھنے درخت لگے ہوتے ہیں۔ اور دو طرفہ کناروں پر چھوٹے چھوٹے دکاندار اور اہلِ حرفہ بیٹھے ہیں اور اپنے شیریں اور موسیقی دار لہجے میں صدا لگاتے ہیں۔ لوگوں کی رونق، نہر اور درختوں کا نظارہ، ان کا گھریلو پن اور سامنے روضۂ مبارک کی عظیم الشان اور زبردست عمارت، یہ سارا سماں بہت بھلا معلوم ہوتا ہے۔ یہاں بھی سڑکیں عموماً صاف ہیں۔ ہندوستان کے بازاروں کی طرح کوڑا کرکٹ نہیں ہوتا البتہ سوائے نئے خیابان کے اور سب سڑکوں پر اینٹوں اور پتھروں کا فرش ہے جو بہت ناہموار ہے، جیسا کہ مثلاً پانی پت میں بعض جگہ ہے۔ جب اس پر پانی چھڑکا جاتا ہے (اور ایرانیوں کو اس کا شوق ہے خواہ ضرورت نہ ہو) تو پاؤں پھسلتا ہے۔

ہمارا قیام شیخ مہدی ہندی خادم کے مکان پر ہے جو حرم کے قریب ہے۔ اچھا آرام دہ مکان ہے۔ یہاں کی خاص سفید اینٹوں کا بنا ہوا ہے۔ دو منزلہ عمارت ہے۔

ہمارے پاس اُوپر کی منزل کا سب سے اچھا اور بڑا کمرہ ہے اس کے آگے ایک کھُلا ہوا صحن ہے جہاں شام کو بیٹھ سکتے ہیں۔ موسم یہاں آج کل بہت سرد نہیں۔ دن میں دھوپ گرم معلوم ہوتی ہے لیکن ہوا گرم نہیں ہوتی۔ رات کو البتہ سردی ہوتی ہے۔ ہم پہلے دو تین رات تک باہر صحن میں سوتے لیکن بعد میں کمرے کے اندر کواڑ کھول کر سوتے رہے۔ شیخ مہدی کی منزل کا پتہ ایک ایرانی آغا غلام رضا نے دیا جو اُردو بھی جانتے ہیں اور ہمارے ساتھ بہت دیر تک مکان کی تلاش میں پھرتے رہے۔

شام کو قریب ہی ایک حمام میں غسل کیا۔ باہر کا حصہ خاصی شاندار عمارت ہے۔ ہر طرف لنگیاں اور تولیے لٹکے ہوئے ہیں یا الماریوں میں لگے ہیں۔ بیچ میں حوض بنا ہوا ہے۔ اندر بھی جہاں نہانے کی جگہ ہے کئی حوض ہیں ٹھنڈے اور گرم پانی کے۔ لیکن اس بات سے کراہت معلوم ہوتی ہے کہ سب لوگ ایک ہی پانی میں نہاتے ہیں اور اپنا میل اس میں چھوڑتے ہیں۔ گو پانی کی مقدار ہر حوض میں اتنی کافی ہے کہ شرعاً وہ پانی پاک ہے۔ یعنی اس میں بوقتِ ضرورت وضو بھی کر سکتے ہیں لیکن اس پانی کو صاف نہیں کہہ سکتے۔ یہاں اور تقریباً تمام اسلامی ممالک میں یہ تکلیف ہے کہ گھروں میں غسل خانے نہیں ہوتے جہاں آرام سے نہا سکیں اور "سراب" کے انتظام سے بھی طبیعت بہت پریشان اور مکدر ہوتی ہے اور اس کو بہتر بنانے کی خاص طور پر ضرورت ہے۔ بعد حمام زیارت روضۂ اقدس سے مشرف ہوئے۔ روضے کی عمارت بہت شاندار ہے۔ دو طرف بڑے بڑے صحن ہیں جن میں کئی کئی ہزار آدمی سما سکتے ہیں۔ تیسری طرف مسجد گوہر شاد ہے۔ صحنِ جدید میں سے نہر بہتی ہے جس میں پانی کافی ہے لیکن کیونکہ وہ تمام شہر میں سے ہو کر آتا ہے اس لیے صاف نہیں ہوتا۔ لوگ اسی سے منہ ہاتھ دھوتے وضو کرتے اور کپڑے صاف کرتے ہیں۔ اور میرا خیال ہے کہ یہاں آنکھوں اور بالوں کی خرابی جو عام ہے اسی طرح پھیلتی ہے۔

روضۂ مقدس میں اندر اور باہر نہایت خوبصورت چینی کا کام ہے اور شیشے کا کام ہے۔

مشہدِ مقدس میں مندرجہ ذیل مقامات قابلِ دید ہیں:۔

(۱) روضۂ اقدس کے گرد جس قدر رواق وغیرہ ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کی دل چسپ تاریخ ہے اور بڑے بڑے تاریخی ناموں سے تعلق ہے۔ مثلاً مسجد گوہر شاد امیر تیمور کی بہو کی بنائی ہوئی ہے۔ اس کے بیچ میں مسجد "پیرزن" ہے جو اس بڑھیا کی یادگار ہے جس نے اپنے مکان کو گوہر شاد کے ہاتھ فروخت کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

(۲) مقبرہ نادری۔ خیابانِ بالا ہی میں روضے سے تقریباً نصف میل کے فاصلے پر ایک خوش سلیقہ باغ میں واقع ہے۔ پہلے شاید یونہی پڑا ہوا تھا۔ اب اس کی مرمت کی جارہی ہے۔

(۳) باغِ ملی۔ خیابانِ ارگ میں واقع ہے۔ خوبصورت باغ ہے۔ اس میں شمشاد کی روشیں، پھولوں کی کیاریاں وغیرہ بہت بھلی معلوم ہوتی ہیں۔ بیچ میں حوض بنا ہوا ہے۔ ایک طرف ریستوراں ہے جہاں شام کو لوگ آکر بیٹھتے ہیں اور چائے وغیرہ پیتے ہیں۔

(۴) مریض خانہ امریکائی۔ امریکن مشن کا اسپتال ہے۔ کافی بڑا میدان اس نے گھیر رکھا ہے۔ پہلے یہاں کسی قسم کے مشن کی اجازت نہ تھی لیکن کہا جاتا ہے کہ حال ہی میں روپیہ دے کر انھوں نے کسی نہ کسی طرح اجازت حاصل کر لی ہے کہ شفاخانے کے احاطے ہی میں اپنا مشن بھی قائم کریں۔ تقریباً پچاس مریضوں کے لیے انتظام ہے۔ بیرونی مریض کافی تعداد میں آتے ہیں۔ ان سے فیس بھی لی جاتی ہے جس سے خرچ کا کافی حصہ نکل آتا ہے۔

(۵) یہاں کا ڈاک خانہ بھی اچھی، خاموش اور عمدہ بنی ہوئی عمارت ہے۔ دو منزلہ ہے۔

(۶) بازارِ بزرگ اور بازارِ سرشور مسقف ہیں۔ ان میں بڑی بڑی دکانیں کپڑوں، جوتوں اور چینی کے کام کی ہیں۔

(۷) شمرانات (پہاڑی گاؤں اور آبادیاں) میں سے ہم نے دو کو دیکھا یعنی "ترغبہ" جہاں تک موٹر جاتی ہے اور راستہ بہت ہی خراب ہے اور "جاقرق" جو ترغبہ سے ایک فرسخ کے فاصلے پر ہے اور پہاڑوں میں سے پیدل راستہ ہے۔ دونوں چھوٹے چھوٹے گاؤں ہیں اور پہاڑوں کے بیچ میں واقع ہیں۔ ترغبہ میں بجائے خود کوئی خاص بات نہیں

ہے لیکن اس کے چاروں طرف بہت خوبصورت باغ ہیں جہاں لوگ مکان لے کر رہتے ہیں۔ ان مکانوں کو یہ لوگ "کیلات" کہتے ہیں اور اکثر جمعہ کے روز یا اگر ممکن ہوتا ہے تو چند ہفتوں کے لیے کسی فرحت بخش مقام پر ان "کیلات" میں آکر رہتے ہیں۔ پانی اور سبزے سے انھیں محبت ہے اور اس سے ہر جگہ پورا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ "جاقرق" کا راستہ بجائے خود بہت دل چسپ اور خوش منظر ہے۔ راستے میں شمشاد کے جنگل، پہاڑی چشمے، پھلوں کے بڑے بڑے باغ، باغوں میں کوٹھیاں، لوگ جوق در جوق آتے جاتے اور راستے میں کھاتے پیتے آرام کرتے بہت بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ "جاقرق" کا گاؤں ایک پہاڑی ندی کے کنارے بسا ہوا ہے۔ اس کا طول ہی طول ہے عرض کچھ نہیں۔ ایک طرف پہاڑ کھڑا ہے دوسری طرف گاؤں کے مکان، کچے لیکن صاف اور باسلیقہ اور بیچ میں سے ندی پیچ کھاتی ہوئی گزرتی ہے۔ لوگ اس میں نہاتے ہیں۔ چاروں طرف شادابی ہے۔ ایک خاص بات یہ ہے کہ برخلاف ہندوستان کے ایران میں ایسے مقامات سے امیر و غریب سب فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ہمیں جو پارٹیاں لوگوں کی آتی جاتی ملیں ان میں سے زیادہ تر معمولی اور متوسط طبقے کے لوگ تھے جو اپنی فرصت کا وقت (اور ان کی فرصت کا وقت کتنا کچھ نہیں ہوتا) اس طرح گزارنے آئے تھے۔ مرد اور عورتیں دونوں جمعہ کے روز اس طرح سیرگاہوں کو نکل جاتے ہیں۔ یہ دن عصر کے بعد سے تفریح کے لیے مخصوص ہے۔

مشہدِ مقدس باوجود زیارت گاہ ہونے کے، برخلاف دوسری زیارت گاہوں کے صاف جگہ ہے اور بعض حصے کافی خوبصورت ہیں۔ ابھی شہر کو گویا زیرِ تعمیر سمجھنا چاہیے۔ اس میں نئے نئے خیابان بنائے جا رہے ہیں۔ خیابانِ ارگ، جس میں موٹر وغیرہ کی بڑی بڑی دوکانیں ہیں اور اس کے گرد کا کوچہ زیادہ تر روسی، ارمنی اور دوسری اقوام کے اجانب کے لیے مخصوص ہے۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ زیادہ تر وہ لوگ شہر کے اس حصے میں رہتے ہیں۔ خیابانِ ارگ کے بعد ایک نیا خیابان بنایا گیا ہے "خیابانِ پہلوی" ہے جو کافی وسیع ہے۔ دونوں طرف بڑے بڑے پیادہ راستے، دوکانیں اور درخت ہیں۔ یہ "خیابانِ بالا" تک چلا گیا ہے۔ جو روضۂ مقدس تک پہنچتا ہے۔ اس میں سے وہ نہر بہتی ہے جس کا پانی حرم میں سے گزرتا

ہے۔ اس کے دونوں طرف درخت لگے ہوئے ہیں اور دوکاندار ان کے نیچے بیٹھ کر سودا بیچتے ہیں۔ بہت رونق رہتی ہے۔ ارگ سے روضۂ مقدس تک موٹر لاری چلتی ہے جو صبح سے شام تک آتی جاتی رہتی ہے۔ ہمارا قیام مشہدِ مقدس میں نو روز تک رہا۔ اس عرصے میں ہم نے شہر کا تمام قابلِ دید حصہ دیکھا۔ لوگوں سے ملاقات کی۔ ہر روز دو مرتبہ زیارت سے مشرف ہوئے۔ گرد و نواح کے دو پہاڑی مقام دیکھے اور بحیثیت مجموعی اس ہفتے بھر وہاں کے قیام سے خاصے مستفید ہوئے۔

کھانے کا کوئی عمدہ انتظام نہیں۔ بازار سے کھانا منگا کر کھاتے تھے اور وہاں صرف چند ہی چیزیں ملتی ہیں انھیں کو اُلٹ پلٹ کر کھانا پڑا یعنی چلاؤ، پلاؤ، خورش (دال گوشت اور بینگن [بادنجان] کا سالن)، آب گوشت (یخنی) وغیرہ جن میں سے ہر چیز سے طبیعت جلد مکدّر ہوگئی مگر بہر حال کھانا پڑتا تھا۔ پھل البتہ بہت سستے اور کثرت سے ملتے تھے۔ آج کل خربوزہ، تربوز، سیب، انگور (جو ابھی پختہ نہیں ہوتے ہیں)، "گلابیاں" خوبانیاں وغیرہ ملتی ہیں۔ تقریباً ۲/ میں ایک بڑا اور شیریں خربوزہ یا "ہندوانہ" (تربوز) مل جاتا ہے۔ اور ۴/ میں ایک من یعنی ہمارے یہاں کے ساڑھے تین سیر انگور مل جاتے ہیں جو تین آدمی صبح و شام کھا کر ختم نہیں کر سکتے۔

یہاں چائے خانے جابجا بنے ہوتے ہیں جہاں لوگ صبح سے شام تک چھوٹے چھوٹے "استکانوں" میں بغیر دودھ کی چائے پیتے ہیں، "چپق" (بڑا سا ڈیڑھ فٹ کا موٹا پائپ) پیتے ہیں اور وقت ضائع کرتے ہیں۔

باغِ ملی اور مقبرۂ نادری کے باغ میں بہت خوبصورت طریقے سے پھولوں اور چمن کے بیچ میں "رستوراں" بنے ہوتے ہیں۔ جہاں شام کو لوگ آکر بیٹھتے ہیں اور دوستوں کے ساتھ بات چیت کرتے ہیں اور چائے وغیرہ پیتے ہیں۔ یہاں اریا ۱/ میں بہت عمدہ "بستنی" (بالائی کا برف) ملتی ہے جسے لوگ شوق سے کھاتے ہیں۔ اس سلسلے میں بھی یہ بات خاص طور پر قابلِ ذکر ہے کہ یہاں یہ جگہیں امرا یا کھاتے پیتے لوگوں کے لیے مخصوص نہیں بلکہ مزدور اور کاریگر بھی یہاں آتے ہیں اور دوسروں کی طرح بہت سلیقے اور صفائی

سے بیٹھ کر کھاتے پیتے ہیں۔

ہم نے ایک خط جناب متولی باشی آغا میرزا محمد ولی اسدی کو لکھا جو وقف روضۂ مبارک کے متولی ہیں اور آج کل تقی زادہ (سابق گورنر مشہد و مشہور ڈماکرات لیڈر) کے بدل جانے کی وجہ سے قائم مقام گورنر بھی ہیں۔ تقی زادہ کا تقرر بطور سفیر لندن ہو گیا ہے۔ اسدی صاحب بیر جند کے رہنے والے ہیں اور بعد میں معلوم ہوا کہ ان کا ایک بیٹا علی گڑھ میں پڑھتا تھا اور ایک بیٹا کیمبرج میں زیدیؔ کا ہم عصر تھا۔ ہم نے ان سے ملاقات کی خواہش کی۔ ان کا جواب آیا کہ کل دس بجے ملوں گا۔ چنانچہ ہم آستانۂ ادارۂ تولیت میں جو خیابانِ پہلوی میں ہے ان سے ملنے گئے۔ وہ وہاں موجود نہ تھے۔ دفتر کی تعطیل تھی اس کے قریب ہی ان کا مکان ہے۔ وہاں ملاقات ہوئی۔ وہ ایک چھوٹے لیکن خوش سلیقہ اور آراستہ کمرے میں بیٹھے تھے اور ان کے قریب ہی ایک میز پر ان کے سیکریٹری بیٹھے ہوئے تھے۔ بہت اخلاق اور خاطر داری سے ملے اور گرم چائے اور یخ زدہ شربت سے ہماری تواضع کی۔

ہم نے ان سے ایران کی ترقی کا ذکر کیا کہ ہر طرف آثارِ حیات نظر آتے ہیں اور مبارکباد دی۔ انھوں نے کہا کہ ہاں ہم لوگ کوشش کر رہے ہیں۔ ہمیں وقت اور مہلت اور امنیت کی ضرورت ہے۔ رضا شاہ پہلوی کے زمانے میں ہر شعبۂ ملک میں ترقی اور بہتری کی صورت پیدا ہو رہی ہے۔ فوج اور پولیس کا انتظام مکمل کر دیا گیا ہے۔ دیہات میں اور راستوں کی حفاظت کے لیے "امنیہ" تمام ملک میں پھیلی ہوئی ہے (جیسا کہ ہم نے خود دزداب سے مشہدِ مقدس تک دیکھا)۔ شہروں میں "نظمیہ" (شہروں کی پولیس) موجود ہے (جن کی وردی وغیرہ اچھی ہے اور وہ اپنا کام کافی مستعدی اور خوش اخلاقی سے کرتے ہیں۔ ہم کو اپنے قیام میں پولیس کی شکایت کا کوئی موقع نہیں ملا۔ اسی "نظمیہ" کے سپاہی سڑکوں پر گاڑیوں اور موٹروں کی آمد و رفت کا انتظام کرتے ہیں اور بالکل موجودہ مغربی طریقے کے مطابق گاڑیوں کو چلانے اور روکنے کے لیے حرکات مقرر ہیں۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ یوروپ میں پولیس مین بالعموم ہاتھ دکھاتا ہے اور یہاں اس کے پاس ایک تلوار یا چھوٹی سی لکڑی ہوتی ہے)۔ فوج یعنی "قشون" بھی اب باقاعدہ مرتب اور منظم ہو گئی ہے۔ اور سرحدوں وغیرہ پر چھاؤنیوں میں مجتمع ہیں۔

حال ہی میں ایران میں "اجباری" کا سلسلہ قائم ہوا ہے یعنی ۲۰ اور ۲۵ برس کے درمیان کی عمر کے تمام لوگوں کے واسطے دو سال تک فوجی تربیت حاصل کرنا قانوناً فرض ہے۔ اس سے کوئی مستثنیٰ نہیں سوائے ان لوگوں کے جن کو علماء ہونے کی سند حاصل ہے یا جو مدارسِ دینی یا اعلا دنیوی مدارس میں تعلیم پا رہے ہیں۔ لیکن ان کو بھی (شاید) بعد میں کچھ عرصے کے لئے کیمپ میں رہنا ضروری ہے۔ (بعد میں ہم نے یہ بھی سُنا کہ متموّل لوگ روپیہ وغیرہ دے کر اپنے لڑکوں کو اس "اجباری" سے بچا لیتے ہیں۔ مگر ممکن ہے کہ چند سال کے اندر جب نظام مکمّل ہو جائے تو یہ بے انصافی ممکن نہ رہے)۔ ایران میں آج تک مردم شماری نہیں ہوئی لیکن اب "اجباری" کی وجہ سے "متجل احوالِ کل مملکتی" کیا جا رہا ہے۔ اسی سے یہ اندازہ بھی ہوا کہ مشہدِ مقدّس کی آبادی ایک لاکھ اور ڈیڑھ لاکھ کے درمیان ہے۔

طلبا کو یورپ بھیجنے کے سلسلے میں میں نے برسبیلِ تذکرہ دریافت کیا کہ آیا کچھ طلبا ٹرکی بھی بھیجے جاتے ہیں یا نہیں خصوصاً فوجی تعلیم کے لئے۔ اس سوال پر ان کے اور چند اور اصحاب کے، جو ان سے ملنے آئے ہوئے تھے، احساسِ خودداری کو بہت ٹھیس لگی اور انھوں نے بہت زور شور سے اس بات سے انکار کیا اور کہا کہ ہم ترکوں سے گئے گزرے نہیں ہیں۔ وہ اپنے ملک کا انتظام تو کر لیں اس وقت دوسروں کو سکھائیں۔ ان کی اپنی افواج ہی مرتّب نہیں لیکن میرا خیال ہے کہ یہ ان کی رقیبانہ چشمک ہے یا تعصّب۔ ورنہ ٹرک ان سے بہت بہتر اور زیادہ بہادر اور منظّم سپاہی ہیں۔ ان کے افسروں نے اپنی کمزوری اور بے ایمانی سے شکستیں کھائی ہیں لیکن سپاہیوں نے ہمیشہ اپنی شجاعت کا سکّہ جمایا ہے۔

ہم نے ان سے کہا کہ اگرچہ حرمِ روضۂ مبارک میں فقیروں کی اس قدر کثرت نہیں جس قدر دوسرے مقاماتِ مقدّسہ پر بیان کی جاتی ہے تاہم بہت ہیں اور زائرین کو تنگ کرتے ہیں۔ اس لیے مناسب ہے کہ ایک دار الفقراء روضۂ مقدّس کی آمدنی سے کھولا جائے اور اس میں تمام مستحقین کو رکھا جائے۔ اور غیر مستحق فقیروں کی سختی کے ساتھ بندی کی جائے تاکہ روضے کے گرد و نواح میں فقیروں کی ناگوار کثرت جاتی رہے۔ انھوں نے کہا کہ ایک دار العجزہ بنانے کی تحریک اور تجویز پیش ہے اور امید ہے کہ چھ مہینے میں یہ تیار ہو جائے گا اور روضے

میں ایک بھی فقیر یا محتاج نہیں ملے گا۔

انھوں نے یہ بھی بتایا کہ مشہدِ مقدس میں ایک بہت بڑا سرکاری اسپتال اور ایک دارالرضاعۃ ہے جہاں غرباء کا علاج مفت کیا جاتا ہے۔ ہم نے ان سے درخواست کی کہ ہم کو ان تمام اداروں اور مدرسوں وغیرہ کے دیکھنے کی اجازت دی جائے۔ انھوں نے بہ خندہ پیشانی اس کو قبول کیا اور اپنے سیکریٹری کو ہدایت کی کہ ان کے منتظمین کو ان کی طرف سے لکھ کر ہمارے لیے وقت مقرر کر لیا جائے۔ لیکن بعد میں باوجود یاد دہانی کے سیکریٹری نے کچھ کارروائی نہ کی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یا تو کوئی خاص کام پیش آگیا یا یہ ادارے ایسی حالت میں نہ تھے کہ ہم کو دکھائے جاتے اور ہم ان کو دیکھ کر متاثر ہوتے یا محض سیکریٹری کی کام چوری ہے۔ بہرحال۔۔۔

ہم نے ان سے روضۂ مبارک کی لائبریری دیکھنے کی درخواست کی۔ انھوں نے اس کے لیے اجازت نامہ لکھ دیا۔ چنانچہ ہم اگلے روز وہاں گئے۔ لائبریری حرم کی عمارت ہی کی منزلِ بالائی میں واقع ہے۔ تین ہزار سے زیادہ کتابیں ہیں جن میں سے بیشتر قلمی ہیں۔ سب شیشے کی الماریوں میں بند ہیں۔ کمروں میں قالین بچھے ہوئے ہیں اور کئی بڑی بڑی تصویریں جو امام رضا علیہ السلام اور امام حسن اور امام حسین علیہما السلام وغیرہ سے منسوب کی جاتی ہیں وہاں لٹکی ہوئی ہیں۔ تعجب ہے کہ ان پر کوئی اعتراض نہیں کرتا۔ چند شیوخ نما لوگ وہاں بیٹھے کتابوں کا مطالعہ کر رہے تھے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ لائبریری کو تمام مدارس کے طالب علم بااجازت استعمال کر سکتے ہیں۔ ہم نے عام کتابوں کو نہیں دیکھا بلکہ درخواست کی کہ جو خاص اور قیمتی نسخے موجود ہیں ان کو دکھایا جائے۔ چنانچہ چند نہایت ہی نادر اور نایاب چیزیں دیکھنے میں آئیں۔ یعنی قرآن شریف جناب امیرالمومنین علی مرتضیٰ کے ہاتھ کا لکھا ہوا۔ وہ موٹے کوفی خط میں لکھا ہوا ہے اور کوشش سے بعض بعض الفاظ پڑھے بھی جاتے ہیں۔ اصل کاغذ (یا باریک اور نرم چمڑہ جس پر وہ لکھا گیا تھا) بوسیدہ ہوگیا تھا اس لیے اس کو بڑے سائز کے کاغذ پر چڑھا لیا گیا ہے اور اس کی بہت خوبصورت موٹے چمڑے کی جلد باندھی گئی ہے۔ آخر میں جناب امیرالمومنین کے دستخط ہیں "کتبہ علی ابن ابی طالب"

جو بوسوں کی کثرت کی وجہ سے ذرا مدھم پڑ گئے ہیں۔ ان کی حفاظت کی ضرورت ہے۔ ورنہ یہ نعمت عزیز جاتی رہے گی۔

ایک کلام مجید جناب امام زین العابدینؑ کا ہے۔ اس کا خط بھی کوفی ہے لیکن وہ زیادہ باریک اور خوبصورت ہے اور قدرے زیادہ پڑھا جاتا ہے۔ اس کی جلد بھی بہت خوبصورت ہے اور حاشیے پر نہایت خوبصورت مطلا کام ہے۔ اس کے علاوہ اور کئی نسخے کلام مجید کے دیکھے جو مشہور خوشنویسوں کے لکھے ہوئے تھے اور جن پر اس قدر خوبصورت متناسب اور متنوع طلاکاری اور نقش نگاری کی گئی تھی کہ نظر حیران ہوتی تھی۔ آیتوں اور رکوع کے نشانات، حاشیے کا کام اور ہر سورت کے ابتدا کے نقش ونگار میں علاوہ خوبصورتی اور موزونی کے یہ بات خاص طور پر قابل تعجب تھی کہ اس قدر خوشنما اور پختہ رنگ انھوں نے کس طرح بھرے ہیں کہ باوجود صدیاں گزر جانے کے ان کی چمک تک ماند نہیں پڑی۔

کتب خانے کے دیکھنے میں ہم جناب متولی باشی کے ممنون ہیں جن کا ذکر اوپر آیا ہے۔ ممدوح ایک سنجیدہ، خوش صورت اور شستہ و تجربہ کار آدمی ہیں۔ اور انھوں نے ہمارے ساتھ بہت اخلاق کا سلوک کیا اور ایک خط اپنے بھتیجے مرزا محسن اسدی کے نام دیا جو ناظم مدرسہ دارالفنون طہران ہیں۔ ان سے ملاقات کر کے معلوم ہوا کہ طہران میں کچھ لوگ ایسے ضرور ہیں جو دل سے ملک کی ترقی چاہتے ہیں اور اس کے لیے کام کرنے کو آمادہ ہیں۔ لیکن سب کی بڑی آرزو جیسا کہ بعد کی گفتگو سے بھی معلوم ہوا ہی ہے کہ ملک کو کچھ عرصے کے لئے برکت امن واطمینان حاصل ہوجائے تاکہ تعمیری کام جو شروع کیا گیا ہے وہ ختم ہوجائے۔ ان سے یہ بھی معلوم ہوا (اور مابعد امریکی ڈاکٹر سے اس کی تصدیق ہوئی) کہ ملک میں رشوت ستانی پہلے سے کم ہے۔ گو اب بھی بہت زیادہ ہے۔ ان کا عذر یہ ہے کہ مدتوں کی پڑی ہوئی رسم اور عادت رفتہ رفتہ کم ہوگی۔ شاہ البتہ خیانت کرنے والوں پر ("ایک خاص قسم کی خیانت" بقول امریکی ڈاکٹر یعنی وہ خیانت جس سے خود ان کو کوئی فائدہ نہ پہنچے!) نہایت سخت ہے۔ چنانچہ آج کل سابق وزیر مال طہران میں محبوس ہیں۔ اور اس پر مقدمہ چلایا جارہا ہے۔ مگر بالعموم ایرانیوں کی عادت

میں یہ بات داخل ہے کہ رشوت لیں۔ چناں چہ اعلاترین افرادِ ملک سے لے کر معمولی عمّال تک میں زیادہ تر تعداد ایسے ہی لوگوں کی ہے۔ مثلاً مشہد میں آج کل شہر کی مرمت اور تعمیرِ نو کا کام جاری ہے۔ پُرانے کوچے اور مکانات گرائے جا رہے ہیں اور ان کی جگہ نئے اور چوڑے خیابان اور بڑی بڑی دکانیں بن رہی ہیں۔ اس پھیر میں بہت سے غریب بے گھر ہو گئے اور ان کو کچھ بھی معاوضہ اپنے برباد کردہ مکانوں کا نہ ملا۔ چوں کہ وہ پیروی کرنے یا رشوت دینے پر قادر نہ تھے۔ برخلاف اس کے بعض روپوں والوں نے روپیہ دے کر یا تو راستے میں ذرا سا تغیّر کرا کر اپنا مکان بچا لیا یا اس کی خاطر خواہ قیمت وصول کر لی۔ یہ میں سنی ہوئی بات لکھ رہا ہوں۔ خود اس کی ذاتی تصدیق نہیں کر سکتا البتہ راوی معتبر ہے۔

اڈیٹر مہرِ منیر جناب مرزا اسماعیل صاحب سے ملاقات ہوئی جو نسلاً اور اصلاً کشمیری ہیں لیکن اب چالیس برس سے مشہدِ مقدّس میں مقیم ہیں۔ دُبلے پتلے ضعیف آدمی ہیں۔ لیکن گفتگو میں جان اور زندگی ہے۔ کافی جہاں دیدہ اور تجربہ کار ہیں۔ ہم سے بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔ اور ایران کی خارجی سیاست، ان کے اور روسیوں اور ترکوں اور انگریزوں کے باہمی تعلقات پر اظہارِ خیال کرتے رہے۔ ان کی گفتگو بہت بے تکان اور طرزِ اظہار کے لحاظ سے توجّہ کش تھی۔ بار بار اس جملے کو دہراتے تھے "سیاست دوستی ندارد"۔ امان اللہ خان کو بالکل خر اور احمق سمجھتے ہیں جس کو انگریزوں اور مغرب کی سیاحت نے بالکل پاگل بنا دیا تھا۔ وہ ترکوں سے رابطۂ اتحاد قائم کرنا چاہتا تھا اور ایرانیوں سے قلبی تعلق نہ رکھتا تھا۔ اگرچہ ظاہر میں اس نے بہت محبت کا اظہار کیا اور ایرانیوں نے بھی پزیرائی کی۔ صاحبِ موصوف موجودہ شاہِ ایران کے مدّاحوں میں سے ہیں اور ایرانی سیاست اور مدبّروں کے قائل ہیں۔ کہتے ہیں ان کو امان اللہ خان اور ترکی کے باہمی معاہدے اور چالوں کی پوری خبر تھی اور وہ بھی ان کو سمجھ کر چوگان بازی کر رہے تھے۔ لیکن اپنے مصالح سے باخبر تھے۔ انھوں نے شاہ کو تمام عرصہ سرکاری مہمان رکھا۔ اس کی خواہش کے مطابق اس کو چند روز کے لیے شخصی حیثیت سے ملک میں پھرنے اور لوگوں سے ملنے جلنے نہیں دیا۔۔ ان کا رسالہ ہفتہ وار ہے لیکن اس میں مثل مشہد کے دوسرے رسالوں کے سوائے "اعلان بنتِ اسناد و املاک" کے جو سرکاری اشتہارات ہیں، سیاسی خبریں وغیرہ ایک صفحے سے زیادہ نہیں ہوتیں۔ اخبار یہاں ایک بھی معقول نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ CENSORSHIP کافی زبردست ہے

اور چونکہ اخباروں کو زیادہ آزادی حاصل نہیں اس لیے لوگوں کو بھی ان میں دل چسپی نہیں رہی اور اخبار بے جان ہو کر رہ گئے ہیں۔

انھوں نے اس نمبر میں (جو ہمیں پڑھنے کے لیے دیا) ایک مقالہ سپردِ قلم کیا ہے جس میں انھوں نے اصلی اور نقلی علماء کے مسئلے سے بحث کی ہے۔ اس کی شانِ نزول جو خود ان کی زبانی معلوم ہوئی دل چسپ ہے۔

دولت نے منجملہ اور اقدامات کے جو گزشتہ چند سال میں کیے ہیں ایک قانون یہ بھی پاس کیا ہے کہ اخوند یا مولوی یا مجتہد ہونے کے لیے سند یافتہ ہونا ضروری ہے۔ اس تجویز کی ضرورت اس وجہ سے ہوئی کہ اب تک جو شخص چاہتا تھا عمامہ و عبا پہن کر مولوی بن جاتا تھا اور بغیر کوئی کام کیے دوسروں کی آمدنی پر گزارہ کرتا تھا۔ لہٰذا دولت نے ایک کمیٹی مقرر کی جس میں جناب شیخ عبدالکریم قمیؒ ایک دو مجتہدینِ عظام ایران کے اور ایک دو مجتہدینِ عظام عراق کے شامل تھے۔ اور تمام مدعیانِ علم دین کو حکم دیا کہ وہ ان میں سے کسی مجتہد کے پاس جا کر امتحان دیں اور ان سے سند حاصل کریں۔ اس وقت دولت ان کا عالم دین ہونا تسلیم کرے گی اور ان کو پہلوی کلاہ اور خدمتِ اجباری وغیرہ سے سبکدوش کرے گی۔ اور ان کو وہ حقوق حاصل ہوں گے جن کا وہ دعویٰ کرتے ہیں۔ اس مقالے میں مدیر موصوف نے لکھا ہے کہ شیخ قمیؒ اور چند صاحبان نے اس جواز کے دینے میں کافی احتیاط اور دیانت سے کام لیا اور بہت سے جھوٹے مدعیوں کو سند دینے سے انکار کر دیا۔ لیکن مجتہدینِ عراق نے احتیاط اور دیانت کو بالائے طاق رکھ کر ہر کس و ناکس کو جو ان کی خدمت میں حاضر ہوا سندیں دے دیں۔ چنانچہ انھوں نے ایک بزرگ کی مثال دی ہے جو مشہدِ مقدس میں عراق سے سند لے کر آئے ہوئے ہیں وہ رمضان کو ز اور عبا کو الف سے اور غصے کو س سے لکھتے ہیں! انھوں نے دولت کو مشورہ دیا ہے کہ چونکہ علمائے عراق نے دولت کے اس COMPLIMENT کا احترام نہیں کیا لہٰذا ان کو اس کمیٹی میں شامل نہ کیا جائے۔

مرزا اسماعیل صاحب نے ایک خط مدیر ستارۂ ایران طہران کے نام دیا۔ اور ہم سے کہا کہ ان سے ضرور ملنا۔ جس روز ہم مشہدِ مقدس سے رخصت ہونے لگے وہ موٹر پر ہم کو

رخصت کرنے آئے اور بہت تپاک و محبت سے الوداع کہا۔ بہت اچھے اور دل چسپ آدمی ہیں۔ ایک روز بازار میں ان کے بھائی سے بھی ملاقات ہوئی تھی وہ بھی معتبر آدمی ہیں اور معلوم ہوا کہ مشہد کی ڈماکرات پارٹی کے لیڈر ہیں۔ کہنے لگے افسوس ہے کہ آپ سے اخیر وقت میں ملاقات ہوئی ورنہ آپ کی دعوت کرتے۔ خدا دوسروں کو ان کی آرزوئے ناکام کے پورا کرنے کی توفیق دے!

۲۴ جولائی

آج چار بجے کے قریب ٹہلتے ٹہلتے امریکن اسپتال پہنچے۔ یہاں امریکہ کو "ینگی دنیا" کہتے ہیں اچھا دل چسپ نام ہے۔ یہ "مریض خانہ ینگی دنیا" ایک وسیع عمارت ہے۔ ہم کسی سے واقف نہ تھے۔ اس لیے ایک شخص سے "رئیس مریض خانہ" کا پتہ پوچھ کر ان کے پاس کارڈ بھیجا۔ وہ شاید کہیں جانے کو تیار تھے لیکن جانا ملتوی کر دیا۔ ان کا نام DR. LICHBOERD ہے۔ غالباً جرمن نسل کے ہیں۔ مشہد میں گزشتہ پندرہ سال سے مقیم ہیں۔ پہلے اسپتال چھوٹی عمارت میں تھا۔ اب انھوں نے نئی اور بڑی عمارت بنالی ہے۔ بہت دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ معلوم ہوا کہ اسپتال علاوہ مشنری ڈاکٹروں کی تنخواہ کے تقریباً اپنا خرچ خود نکال لیتا ہے۔ مریضوں سے فیس لی جاتی ہے INDOOR PATIENTS کے لیے بھی انتظام ہے۔ شاید پچاس بستر ہیں۔ ہم نے پوچھا کہ امراض مشہد میں زیادہ تر کیا ہیں۔ معلوم ہوا کہ سر اور آنکھوں کی خرابی عام ہیں۔ VENEREAL DISEASES بہت عام ہیں اور دق اور سل بھی لوگوں میں موجود ہیں۔ ہندوستان کے مقابلے میں وہ تعداد نہیں بتا سکتے تھے کیونکہ وہاں کے حالات سے واقف نہیں لیکن میرا خیال ہے کہ سوائے مؤخر الذکر امراض کے باقی امراض ہندوستان کے اوسط سے زیادہ یہاں پائے جاتے ہیں۔ پانی کی صفائی کا انتظام نہیں ہے اور متعدی امراض اس وجہ سے جلد پھیل جاتے ہیں۔ دولت کی طرف سے بھی ایک بڑا اور عمدہ منتظم شفاخانہ موجود ہے۔ چونکہ چچا ابا کا تعلق طبیہ کالج سے ہے اس لیے وہ (اور ان کے ایک اور دوست جو وہاں آگئے تھے) طبیہ سسٹم کے متعلق بہت دل چسپی

سے گفتگو کرتے رہے۔ ان کی بیوی نے ہم کو چائے وغیرہ بھی پلائی۔

میں نے ان سے دریافت کیا کہ ان کے تجربے کے مطابق ملک میں دیانت داری کا معیار کیا ہے۔ کہنے لگے کہ پہلے کی نسبت بہتر ہے۔ اس معاملے میں رضا شاہ سختی کرتے ہیں۔ لیکن پھر بھی رشوت ستانی بہت کافی ہے۔ چنانچہ وزیر مال اس وقت بھی زیر الزام ہے اور قید میں پڑا ہوا ہے۔ سنا جاتا ہے کہ پہلے ان امریکہ والوں کو مشہدِ مقدس میں اپنا مشن یا چرچ بنانے کی اجازت نہ تھی۔ لیکن بعد میں کچھ روپیہ وغیرہ صرف کرکے انھوں نے اجازت حاصل کرلی ہے اور اسپتال کے احاطے ہی میں ان کا مشن موجود ہے۔ تعجب ہوتا ہے کہ یہ لوگ بھی کس طرح سالہا سال تک بے نفسی اور استقلال کے ساتھ کام کرتے ہیں خواہ ان کو بظاہر کچھ بھی نتائج حاصل نہ ہوں۔ اگر تبلیغ کا موقع نہیں ملتا یا اجازت نہیں ہوتی تو مدرسے اور اسپتال قائم کرتے ہیں اور اس طرح اپنا رسوخ اور اثر اور نیک نامی بڑھاتے ہیں۔ مسلمانوں میں ان کے ایثار اور استقلال کا عشرِ عشیر بھی موجود نہیں اور ایرانی اس معاملے میں خاص طور پر کمزور ہیں۔ اتحادِ عمل اور مستقل مزاجی دونوں سے بے گانہ ہیں۔ ڈاکٹر موصوف نے ہم کو طہران کے امریکن کالج کے دیکھنے کا مشورہ دیا۔

۲۶ جولائی

منشی فرمان علی صاحب (کوئٹہ) نے ایک خط ہم کو منشی مولا بخش ہیڈ کلرک قونصل انگریزی مشہد کے نام دیا تھا۔ ہم نے دو مرتبہ ان سے ملنے کی کوشش کی لیکن اتفاق سے وہ نہیں ملے۔ ان کو جب معلوم ہوا تو وہ خود تلاش کرتے ہوئے شیخ مہدی کے مکان پر ہم سے ملنے آئے۔ یہ صاحب خوش مزاج، موٹے اور منصوری نما آدمی ہیں۔ شاید بیس سال سے زیادہ کا عرصہ ہوا کہ مشہد ہی میں متعین ہیں۔ جس زمانے میں یہ آئے تھے کہتے تھے چھ مہینے راستے کے سفر میں طے ہوئے تھے۔ اب چھ دن بھی نہیں لگتے۔ ان سے دو تین مرتبہ ملاقات رہی۔ ان کو مقامی حالات سے کافی واقفیت ہے اور خاصے دلچسپ آدمی ہیں۔ انھوں نے یہ بھی ذکر کیا کہ جب والد مرحوم ایران آئے تھے تو ان کی ڈاک

کے متعلق ان کی ہدایات برٹش قونصل خانے میں آئی تھیں لیکن بعد میں جنگ کی وجہ سے وہ نہیں آ سکے۔ روسیوں کے قبضۂ مشہد کے متعلق بتاتے تھے کہ اس وقت انھوں نے کس قدر زیادتیاں اور بے حرمتی کی تھی۔ وہ پہلا موقع تھا کہ غیر مذہب کے لوگ (روسی فوجی وغیرہ اور اس وقت کا قونصل انگریزی) روضۂ مقدس میں گھسے تھے۔ لیکن ان کو بھی روضے کے جواہر وغیرہ لوٹنے کی ہمت نہیں ہوئی اور تین دن کے بعد انھوں نے متولی کو بلاکر کنجیاں اس کے سپرد کر دیں۔ غالباً ان کو روضے کے متعلق لوگوں کے شدتِ اعتقاد کا احساس تھا۔ ان کے یہاں علی گڑھ کے ایک اولڈ بوائے فضل الرحمٰن صاحب سے بھی ملاقات ہوئی جو آج کل قونصل خانے میں سٹینو گرافر ہیں۔ نوجوان آدمی ہیں۔ گفتگو اور شخصیت دل چسپ رکھتے ہیں۔ صاف گو ہیں۔ نہ اپنی کمزوریاں چھپاتے ہیں نہ ان کے لیے عذر تراشتے ہیں۔ چچا ابا صاحب ان سے بہت دیر تک سگریٹ نوشی کے متعلق گفتگو اور اس عادت کے خلاف پروپیگنڈہ کرتے رہے۔ وہ سگریٹ بہت پیتے ہیں اور اس کی خرابیوں کا صدقِ دل سے اعتراف کرتے ہیں۔ لیکن پیتے رہتے ہیں! کہتے ہیں کہ دنیا میں سب لوگوں کی اصلاح ممکن نہیں! زندہ دل اور پُر خلوص آدمی ہیں۔ بلند شہر ان کا وطن ہے اور اپنے زمانۂ علی گڑھ میں (یعنی ۳۱ء) تک خاصے اچھی قسم کے "کھلنڈرے" یا "باتونی" رہے ہوں گے۔

سفرِ طہران

ہم نے گاراژ خان کی معرفت للعہ (تومان) میں موٹر کرایہ کیا اور ۲۹ کو شام کے تین بجے روانہ ہوئے۔ شیخ مہدی صاحب، مدیر مہر منیر، منشی اللہ بخش صاحب اور چند دیگر صاحبان نے بہت تپاک سے رخصت کیا۔ خان صاحب جن کی معرفت ہم نے موٹر کی پشاور کے رہنے والے ہیں۔ ان کی گاراژ کا کاروبار کافی پھیلا ہوا ہے اور مشہد میں وہ خاصے با اثر و بارسوخ آدمی ہیں۔ مگر کچھ طبعاً گھبرائے ہوئے اور جلد باز واقع ہوئے ہیں۔ اطمینان اور سکون مزاج میں نہیں۔ نہ معلوم کاروبار کو باوجود اس کمزوری کے کس طرح فروغ دیا؟ مجھے یہ ذکر کرنا یاد نہیں رہا کہ مشہد میں بہت سے ہندوستانی ہیں جو موٹر کا کام کرتے ہیں۔ دو تین صاحب

گاراژ ہیں اور باقی شوفر ہیں یا اپنی موٹریں شہر میں بطور "بس" کے چلاتے ہیں۔ ان میں سے ایک محمد اکبر خان پشاوری ہیں جو پشاور کے ایک مشہور خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ علی گڑھ میں تعلیم پائی ہے۔ فٹ بال کے بہت اچھے کھلاڑی رہے ہیں۔ ہجرت کے زمانے میں ہندوستان سے چلے آئے تھے۔ اب گزر اوقات کے لیے موٹر کا کام کرتے ہیں اور "بھائی محمد علی شوکت علی" کو دعائیں دیتے ہیں۔ کام خاصا چلتا ہے۔

مشہد سے چند میل جانے کے بعد اسی راستے پر جس سے مشہد کی طرف سے آتے ہیں ایک چڑھائی آتی ہے جس کو آبا دکی چڑھائی کہتے ہیں۔ یہ چڑھائی تقریباً سولہ میل تک ہے۔ راستے کے اُتار چڑھاؤ دونوں بعض جگہ بہت سخت ہیں ہماری موٹر نے ابتدا ہی سے تکلیف دینی شروع کی۔ موٹر فورڈ تھی اور پُرانی اس کا انجن سخت چڑھائی پر کھینچ نہیں کرتا تھا۔ اس لیے آٹھ دس مرتبہ موٹر سے اُترنا پڑا اور شوفر بہت دقت اور ترکیبوں سے موٹر کو اُوپر چڑھاکر لے گیا۔ ایک دو جگہ خود موٹر کو ڈھکیلنا بھی پڑا۔ مجھ کو اوّل مرتبہ تو غصّہ آیا کہ اس قدر خراب اور کمزور موٹر ہم کو کیوں ملا۔ لیکن بعد میں جب یہ خیال ہوا کہ یہ قصور شوفر کا نہیں ہے خان صاحب کا ہے تو میرا غصّہ جاتا رہا اور بیچارے شوفر سے ہمدردی پیدا ہوگئی جس کو ایک طرف موٹر چلانے کی دقّت اور دوسری طرف ہم سے خجالت کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ زیدی اور چچا ابّا اس سے ناراض ہی رہے اور زیدی نے فقرے بھی چست کیے۔ لیکن مجھ میں یہ بُری عادت ہے کہ میں اکثر ایسے موقوں پر اپنا اور اپنے ساتھیوں کا نقطۂ نظر بھول کر دوسری پارٹی کے نقطۂ نظر کو سمجھ کر ان سے ہمدردی کرنے لگتا ہوں۔

رات کو دس بجے کے قریب ہم نیشاپور پہنچے جو عمر خیام کا وطن ہے اور ایک پُرانا شہر ہے۔ یہاں ہر گاراژ کے ساتھ اوپر کمرے بنے ہوتے ہیں جن میں مسافر قیام کرتے ہیں۔ دو قران (۸ ر) کے قریب کرایہ دینا ہوتا ہے۔ اکثر گاراژوں میں ایک قسم کا ہوٹل سا ہوتا ہے۔ جہاں کھانے پینے کی چیزیں روٹی، چائے، کباب، پھل، چاول وغیرہ مل جاتے ہیں۔ ان کو حسبِ ضرورت خرید کر کھا سکتے ہیں۔ ہمارے پاس ایک چھوٹا سا صاف کمرہ تھا جس میں ملازم نے دو تین قالین بچھا دیئے تھے۔ اور بھی بہت سے لوگ، مرد، عورتیں، بچے قریب کے کمروں

میں مُھیرے ہوئے تھے ۔ چاروں طرف چہل پہل اور رونق تھی۔ عورتیں سیاہ چادر پیچھے پہنے آزادی سے اوپر نیچے آتی جاتی تھیں۔ کھانا ہوٹل سے لے آتی ہیں پھلوں وغیرہ کی قیمتیں ہمارے یہاں سے کم ہیں البتہ چائے کی ایک چھوٹی پیالی (استکان) کے دو یا تین پیسے لیتے ہیں۔

نیشاپور پر پہنچ کر چچا ابا صاحب نے موٹر کی خرابی کی شکایت ایک شخص آغا سعید سے کی ۔جو موٹر کرایہ کرنے کے وقت خاں صاحب کے یہاں موجود تھا اور جس کے متعلق نہ معلوم کیوں ہم کو یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ موٹر اس کی ملکیت ہے اور اس کا شوفر آغا ہاشم اس کا داماد ہے ! موٹر کی ملکیت کا تو وہ خود بھی دعویٰ کرتا رہا لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ اس دعوے میں تخیّل کو بہت دخل تھا۔ یہ شخص آغا سعید اس لاری کو چھوڑ کر جس میں وہ ہماری موٹر کے ساتھ ساتھ سفر کر رہا تھا سمنان تک ہمارے ساتھ آیا۔ یہ اصلاً حبشی ہے لیکن اس کا دادا سو برس سے زیادہ ہوئے ایران میں آکر بس گیا تھا۔ چنانچہ اب یہ ایرانی رعایا ہے ۔ فارسی نہایت خوبصورتی اور شستگی کے ساتھ بولتا ہے اور حرکات وسکنات، معلومات بہت عمدہ اور وسیع ہیں۔ اس نے اس تمام سفر کے دوران میں ہم پر نہایت اچھا اثر پیدا کیا اور موٹر کا سفر جو کل محض راستے کی تکلیف اور شکایت میں بسر ہوا تھا اس کا معیار ہی بالکل بدل گیا۔ اس نے بیان کیا کہ اس کے دو بھائی اور چند اور عزیز مشروطہ کی حمایت میں مارے جا چکے ہیں۔ وہ خود مشروطہ کا سخت حامی رہا ہے اور اس کی حمایت میں جنگوں میں شریک ہوا ہے۔ روس میں بھی رہا ہے اور وہاں کی فوج میں کام کیا ہے۔ اس کے ساتھ لاری میں اس کا ایک روسی دوست ہے جس کو وہ بہت عزیز رکھتا ہے۔ کہتا ہے کہ وہ دونوں فوج میں ساتھ تھے۔ اب جب وہ طہران آیا تو حکومت نے اس کو گرفتار کر لیا لیکن اس نے اپنا اثر استعمال کیا، اس کی ضمانت دی اور اس کو اپنے ساتھ موٹر میں مشہد لے آیا تھا۔ اب واپس طہران لے جا رہا ہے۔ آغا سعید کا محبوب جملہ اور خیال یہ ہے کہ دنیائ انسان میں ایک ہی زندگی ہے۔ ضرورت ہے کہ اس زندگی کو ایثار و خدمتِ قوم کے لیے وقف کریں۔ اس کی آنکھوں میں ایک قسم کی چمک ہے۔ جو مدّتوں کی جدوجہد اور قربانیوں سے پیدا ہوتی ہے اور عزم ہے جو شاید اس تجربے کا نتیجہ ہے جو اس کو اور اس کے خاندان کو مشروطہ کی جدوجہد میں حاصل ہوا ہے۔ اور دلیے بھی

حبشیوں کی تاریخ ظلم وستم کی داستان ہے۔ اس میں سرکردگی اور کارکردگی دونوں کی صلاحیت ہے۔ راستے میں ایک جگہ کیچڑ میں تین چار موٹریں پھنس گئی تھیں اور شوفر بیچارے سعی نامرام کررہے تھے۔ اس نے فوراً ساری SITUATION کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ خود کیچڑ میں بلاتکلف موٹر کے نیچے لیٹ گیا۔ دوسروں کو ہدایات دینی شروع کیں اور تھوڑی سی دیر میں موٹروں کی خلاصی ہوگئی۔

بہرحال راستہ اس کی وجہ سے کافی دل چسپی سے کٹا اور منزلوں پر آرام بھی ملا۔اس کی طرف سے شکایت صرف ایک تھی اور وہ یہ کہ آغا ہاشم ہمارا شوفر اور وہ دونوں جہاں کہیں راستے میں ٹھیر جاتے تھے کھانا کھانے یا چائے پینے،تو وہاں بہت دیر لگادیتے تھے اور ہمارا وقت ضائع ہوجاتا تھا۔ اس نے ہم سے یہ بھی وعدہ کیاکہ طہران میں ہمارے قیام کے لیے عمدہ بندوبست کرے گا اور ہم کو بہت سے لوگوں سے ملائے گا۔ اس کے بیان سے معلوم ہوتا تھاکہ طہران کے اکثر بڑے آدمیوں، شعرا، ماہرینِ سیاست وغیرہ سے اس کی شناسائی اور دوستی ہے۔ خصوصاً وہ ایک نوجوان شاعر عشقی کا بہت ذکر کرتا تھا۔جو مشروطہ کا زبردست حامی تھا اور لوگوں پر اس کا اتنا ہی اثر تھا (بلکہ زیادہ) جتنا بادشاہ کا۔اس کے شعروں نے ایرانیوں میں ہل چل پیداکردی تھی۔ بعد میں اس کو نہ معلوم کس مصلحت پر گولی ماردی گئی اور تمام طہران اس روز ماتم پوش ہوگیا تھا۔۔سمنان پر آغا سعید ہم سے علیحدہ ہوگیا اور اگلی منزل پر ملنے کا وعدہ کیا۔لیکن اس روز کے بعد اس کی شکل نہیں دکھائی دی۔ (آغا ہاشم سے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ بہت جھوٹا اور مبالغہ آمیز شخص ہے کسی چوری کی سزا میں قید بھگت چکا ہے۔ اور اس روسی کے پچاس تومان اس نے چرا لئے جو اس کے ساتھ تھا! اس ANTI CLIMAX نے اس کے علو روح کے متعلق جو خوبصورت فرضیے تھے ان کو ختم کردیا اور ایک عمدہ افسانے کے نوزائیدہ پلاٹ کا بھی خاتمہ ہوگیا۔تاہم اتنا ماننا پڑے گاکہ اس شخص میں اپنے وسیع تجربے اور سیاحت اور زندگی کے مختلف پہلوؤں کو دیکھنے کی وجہ سے کافی جاذبیت ہے اور اس میں کم ازکم اس بات کی صلاحیت ضرور ہے کہ وہ مفید اور دور رس کام کرسکے)

۱۶ر اگست

آج صبح زیدی کے ساتھ ڈاکٹر مقتدر کے یہاں گیا۔ انھوں نے حسبِ معمول دیکھا، دوا لگائی اور حالت کو قابلِ اطمینان بتایا اور فیس وصول کی۔ جلاّب دینے کی وجہ سے دن بھر زیدی کو اجابتیں ہوئیں۔ بخار بھی نہیں اترا اور ان کی اور سب کی طبیعت پژمردہ اور مکدّر رہی اور جب ایک وجہ سے دل افسردہ یا پریشان ہو تو اور بہت سے متعلق اور غیر متعلق خیالات آکر دماغ کو پراگندہ کرتے ہیں اور زندگی بے معنی مہمل اور بے مزہ معلوم ہوتی ہے۔ اور اپنا دل و دماغ آج کل اس قسم کے خیالات کے لیئے ایسا سازگار ماحول بنا ہوا ہے کہ ذرا سی بات دل کے سکون کو متزلزل کر دیتی ہے۔

گیارہ بجے کے قریب آغا مترجم نظام مع اپنے بھتیجے اور چھوٹے بیٹے خیرالدّین کے ساتھ آئے اور مجھ کو اور خواجہ صاحب کو اپنے ساتھ مولانا سیّد اسد اللہ خارقانی کے ہاں لے گئے۔ ان سے ڈیڑھ گھنٹے تک گفتگو رہی۔ کافی روشن خیال اور ضروریاتِ زمانہ سے باخبر معلوم ہوتے ہیں لیکن علمی قابلیت کی کمی ہے۔ کہنے لگے کہ مسلمانوں کو ضرورت ہے دوبارہ قرآن اور اسوۂ رسول کی طرف رجوع کرنے کی اور اس اسلام کو زندہ اور تازہ کرنے کی جو قرونِ اولیٰ کے چالیس سال تک رائج رہا۔ آج جو اسلام رائج ہے وہ رسول اللہ اور علی ابن ابی طالب کا اسلام نہیں، معاویہ ابن ابی سفیان کا اسلام ہے جس میں استبداد اور دولت پرستی کا دور دورہ ہے اور غریب و امیر کے درمیان عدل و انصاف و مساوات ممکن نہیں۔ (اس سلسلے میں آغا مترجم نظام نے مثنوی اسرارِ خودی میں سے وہ حکایت پڑھ کر سنائی جس میں قاضی نے سلطان مراد اور ایک معمولی معمار کے درمیان از روئے قانونِ اسلام انصاف کیا تھا۔ اور خود مولانا نے دوسرا قصّہ سنایا جس میں خلیفۂ ثانی نے ایک نومسلم امیر اور ایک سوقی کے درمیان موافق احکامِ اسلامی سلوک کرنا چاہا تھا اور وہ امیر اسلام چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ مترجم نظام نے جب سے اس کتاب کو پڑھا ہے وہ اقبال کے بہت معترف اور مدّاح ہو گئے ہیں اور وجد آمیز کیفیت کے ساتھ اس کی تعریف کرتے ہیں اور اس کے فکر و دماغ

کے قائل ہیں)۔ان کو اسلام کے فرقوں، سنّیوں، شیعوں وغیرہ سے کوئی دل چسپی نہیں۔وہ ہر مسلم کے لیے اپنا یہ پیغام ضروری سمجھتے ہیں کہ غیر قوموں کی بندگی اور بے چارگی سے آزاد ہونے کے لیے اسلام کی اصلیت کی طرف رجوع کیا جائے۔اس معاملے میں میں نے ان کو دوسرے علمائے اہلِ سنّت و اہلِ تشیع دونوں سے بہت زیادہ روادار اور فراخ دل پایا۔ لیکن اس مہم عظیم کو انجام دینے کے لیے ان کا اپنا مجوّزہ طریقہ یہ ہے کہ وہ ایک رسالہ لکھیں (یا لکھ رہے ہیں) اور واعظین و مبلّغین اس رسالے کو اپنے اپنے حلقوں میں منّ وعن پڑھ کر سنا دیں! خواجہ صاحب نے ان کو بتایا کہ یہ طریقہ کامیاب نہیں ہو سکتا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ایران میں، عراق میں، ہندوستان میں جہاں کہیں ہو سکے اوّل علماء کو جمع کر کے ان سے گفتگو اور تبادلۂ خیال ہو اور ان کو مسلمان کیا جائے اس کے بعد ایک منتظم مشن کی بنیاد ڈالی جائے جس کے مبلّغین گاؤں گاؤں اور شہر شہر استقلال کے ساتھ ایک عرصۂ دراز تک ان مطالب کو عملی طور پر مسلمانوں کے سامنے پیش کریں۔ تب جاکر اثر ہو سکتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ایران میں تو یہ ممکن نہیں کہ علماء کا اجتماع ہو سکے۔ ان میں آپس میں اتحاد و مفاہمت نہیں ہے۔عراق و ہندوستان میں شاید ممکن ہو۔ پھر مجھ سے پوچھنے لگے کہ آیا ہندوستان میں اگر میں آؤں تو علماء کا اجتماع ہوگا اور لوگ توجہ و التفات سے بات سنیں گے یا نہیں۔میں نے جرأت کر کے عرض کیا کہ جناب والا خدا کے کام اور قوم کی خدمت میں کوئی شخص ضمانت نہیں دے سکتا۔ممکن ہے کامیابی ہو ممکن ہے نہ ہو۔ انسان کا کام فقط جد و جہد کرنا ہے اور راستی کا پیغام پہنچا ‘‘اور بالخصوص علماء کا فرض یہی ہے۔

وہ اسلامیت کے لحاظ سے ایران کی موجودہ حالت سے بالکل مطمئن نہیں ہیں بلکہ اس کو بہت بُرا سمجھتے ہیں۔شاید ان میں اور آغائی مترجم نظام میں یہی قدر مشترک ہو جس نے موخرالذکر کو ان کا اس قدر مدّاح اور گرویدہ بنا دیا ہے۔ انھوں نے جب اخبار وطن میں ہمارے طہران آنے کی خبر پڑھی تھی تو دو چار جگہ ٹیلی فون کر کے ہمارا پتہ دریافت کیا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ ہم سے ملیں اور ہندوستان کے مسلمانوں کے حالات پوچھیں آیا ان میں اسوۂ رسول اور کتاب خدا سے تمسّک باقی ہے یا نہیں۔میں نے عـــرض کیا کہ عمل تو

قرونِ اولیٰ جیسا تو کہیں بھی نہیں ہے۔ لیکن ہندوستان کے مسلمانوں اور مثلاً آج کل کے ترکوں اور بعض لحاظ سے ایرانیوں کے حال میں یہ فرق ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں میں زبان سے اور ظاہری طور پر شعائرِ اسلامی کا احترام ہے اور ان ممالک میں بعض شعائر کو ظاہر طور پر رد کیا گیا ہے۔ اس پر انھوں نے کہا کہ نہیں، قول اور عمل دو نہیں ہو سکتے۔ اگر کسی شخص کا عقیدہ صحیح ہے اور اس کا عمل خراب ہے تو یہ اور بھی بُری بات ہے۔ دنیاوی کاروبار میں جب آدمی اس کام کو نہیں کرتا جس کو اپنے لیے برا سمجھتا ہے تو شریعت کے کاموں میں یہ عجیب تضاد و تخالف کیا معنی رکھتا ہے۔ میں نے کہا کہ ان دونوں حالتوں میں یہ فرق ہے کہ اگر شعائرِ اسلامی کا احترام کم از کم قولاً اور ظاہراً باقی رہے تو اصولِ اسلام کی طرف رجوع مقابلتاً آسان ہے۔ لیکن اگر شعائر کو بھی ترک کر دیا جائے اور ان کا احترام نہ رہے اور چند نسلیں اس حالت میں گزر جائیں تو پھر رجوع بہ اسلام بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ انھوں نے اس بات کو تسلیم کیا اور کہا کہ حق کی تبلیغ بہت مشکل ہے خصوصاً اس لئے کہ روضہ خانوں نے بہشت کے آسان راستے بتا کر (چار آنسو بہانا یا چند مرتبہ سینہ یا پیشانی کو پیٹنا) لوگوں کو ایمان کے زیادہ دشوار گزار راستے سے ایک حد تک ہٹا دیا۔

میں نے کہا کہ لوگوں کے خصوصاً تعلیم یافتہ طبقے کے انحرافِ مذہب کی ذمہ داری زیادہ تر علماء پر وارد ہوتی ہے۔ بالخصوص اس لیے کہ انھوں نے اسلام کو محض عقائد و عبادات تک محدود کر دیا اور عملی دنیا کے کاروبار اور معاملات کے متعلق اس کے احکام و اخلاق کو سہل اور موزوں اور مقتضائے زمانہ کی زبان میں لوگوں تک نہیں پہنچایا۔ اسی وجہ سے باوجود عقیدے کی صحت اور عبادت کی ادائیگی کے بہت سے مسلمان ایسے ہیں جو معاملات میں دیانت اور راستی اور اعتبار اور اشتراکِ عمل اور محنت و ایثار کو عمل میں نہیں لاتے۔ اس لیے دنیاوی حیثیت خراب ہوتی جاتی ہے اور ناواقف تعلیم یافتہ لوگ اس تنزل کو اسلام کی طرف منسوب کرتے ہیں اور اس سے پرے ہٹ جاتے ہیں۔ لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ علماء آج کل کے حالات اور ضروریات کو سمجھ کر اس زمانے کی زبان میں اسلام کی تعلیم کے عملی اور دنیوی پہلو کو واضح کریں کیونکہ عام لوگوں کی زندگی کا ۹۹/۱۰۰ حصہ اسی دنیاوی

زندگی کے مشاغل میں بسر ہوتا ہے اگر یہ تمام حصۂ اسلام کی روشنی سے محروم رہے تو وہ زندگی کے ایک سویں حصّے سے کیا فائدہ اُٹھا سکتے ہیں .. مگر مشکل تو یہ ہے کہ علماء خود ان باتوں کو جن کا تعلق معاشرت، سیاست اور اقتصادیات اور معاملاتِ تجارت وغیرہ سے ہے، نہیں سمجھتے اور اگر کچھ کہتے ہیں تو ایسی زبان میں کہ بدعقیدہ یا بے عقیدہ لوگ اس کی طرف ملتفت ہی نہیں ہوتے اور خوش عقیدہ لوگ اس کو بھی مقدّس الفاظ اور کتابوں کی طرح چوم کر طاق میں رکھ دیتے ہیں۔ ان کی زندگی پر ان کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ والدمرحوم یا جسٹس کرامت حسین یا معدودے چند اور بیدار مغز لوگوں کی طرح کوئی کام نہیں کرتا!

تیسرے پہر کو ایک صاحب ڈاکٹر محمد اکبر آئے جن کو آغائی مترجم نظام نے ہم سے ملنے اور زیدی صاحب کی عیادت کے لیے بلایا تھا۔ کھُلا ہوا رنگ، گول جسم، چھوٹا قد، بھورے بال بظاہر کوئی تیس برس کے جوان معلوم ہوتے تھے۔ انھوں نے آتے کے ساتھ ہی بغیر کسی تمہید یا PROVOCATION کے گفتگو شروع کر دی اور تقریباً دو سو لفظ فی منٹ کی رفتار سے کامل ایک گھنٹے تک گفتگو کرتے رہے۔ دوسرے کو بولنے کا موقع دینا ان کے خیال میں ایرانی تہذیب و اخلاق کے خلاف ہے۔ انھوں نے کہا کہ تیس سال قبل تمام طہران میں صرف ایک دواخانہ تھا اور اس کی طرف بھی لوگ بہت کم توجّہ کرتے تھے۔ لیکن اس عرصے میں بیماریاں اور مریض دونوں بڑھ گئے ہیں اور دواخانوں کی تعداد کئی سو ہوگئی ہے۔ لیکن شہر کی صحت اچھی نہیں۔ طرح طرح کی بیماریاں پھیلی ہوئی ہیں۔ ڈاکٹر محض روپیہ بنانے کو اپنا مقصدِ انتہائی سمجھتے ہیں۔ وہ یہ خیال نہیں کرتے کہ وہ پولیس اور ٹھیکے کی طرح پبلک کے خادم ہیں۔ ان کو چاہیئے کہ از خود شہر اور بلدیہ کی صفائی و صحت کے لیے ہر وقت فکر اور کاوش کریں۔ مکانوں میں جائیں اور لوگوں کو غلاظت اور گندگی کے نقصانات سمجھائیں اور بتائیں کہ جراثیم کہاں کہاں پیدا ہوتے ہیں اور ان کو کس طرح نیست و نابود کیا جاسکتا ہے۔ ہوٹلوں میں، قہوہ خانوں میں، باغوں میں ہر جگہ اسی طرح پروپیگنڈہ کرتے پھریں یہاں تک کہ شہر سے بیماریاں اور MICROBES بالکل جاتے رہیں۔ احتیاط اور صفائی اگر ہو تو آدمی کبھی بیمار نہ ہو اور اپنی عمرِ طبیعی پوری کرے۔ اب اکثر لوگ وقت سے

پہلے مر جاتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ خود ان کی عمر پچاس سال ہے (اس پر ہم کو واقعتاً تعجب ہوا) اور ان کے والد کی نوّے سال لیکن وہ ساٹھ سال کے معلوم ہوتے ہیں ان کی بڑی خواہش اور زندگی کا خواب یہ ہے کہ تمام ممالکِ مشرقی کو بیدار کرنے کے لیے ایک PASHEUR CINEMA کھولا جائے جو ایک زبردست بین الاقوامی آرگن ہو اور اس کا موٹو ہو (مثل ان کی زندگی کے موٹو کے) "الاسلام و النظافۃُ" اس میں صرف اس قسم کے فلم دکھائے جائیں کہ MICROBES کس طرح پیدا ہوتے ہیں، کیا نقصان پہنچاتے ہیں۔ ان کا دفعیہ کس طرح کرنا چاہئے، ان کے مرکز کیا کیا ہیں۔ اور (شاید) حکومت کی طرف سے یہ قانون ہو کہ ہر بچّہ اور بوڑھا اور جوان ان فلموں کو دیکھے اور سبق حاصل کرے۔ یہ باتیں تمام معقول معلوم ہوتی ہیں اور کاغذ پر ان کا خلاصہ لکھنے میں ان کا رنگ اور بو اور مزہ اور تیزی سب جاتی رہتی ہے۔ لیکن جس انداز سے انھوں نے یہ سب باتیں ایک ہی سانس میں کہیں وہ نہایت مضحکہ خیز تھا۔ کیونکہ (خود ان ہی کا دورانِ گفتگو کا ایک جملہ ہے) "ہماری زبان ہی ہماری تلوار ہے اور ہماری توپ ہے اور گولہ انداز ہے" اور نامعلوم کیا کیا مُہیب اور خطرناک آلاتِ جنگ کی قائم مقام ہے! جب ان کو معلوم ہوا کہ خواجہ صاحب خود ایک مدرسۂ طب کے مدبر ہیں تو انھوں نے اپنے خیالات کا خلاصہ اور اپنا فوٹو بھیجنے کی دھمکی دی تاکہ دہلی میں بھی ان کا ذکرِ خیر ہوتا رہے۔ اور اس سے زیادہ یہ کہ ان کے مجوزہ سنیما کا چرچا کیا جائے تاکہ تمام دنیائے مشرق کی متحدہ کوشش سے نجات اور آزادی اور فلاحِ دارین حاصل کرنے کا یہ کم خرچ اور بالانشین ذریعہ مہیا ہو سکے۔

حقیقت یہ ہے کہ وہ خود شہرت اور نام کے چنداں طالب نہیں بلکہ وہ خود تو فدائے PASHEUR CINEMA۔ جس کے وجود میں لانے کی کوشش میں انھوں نے اپنی زندگی اور محنت کو ضم کر دیا ہے۔ میں اس مجوزہ سنیما کے ہونے والے ڈائرکٹروں سے درخواست کروں گا کہ (چونکہ یہ جدید قسم کا سنیما ضرور بولتا ہوا سنیما ہوگا) وہ ان صاحب کو تصویروں کے ساتھ کا بولنے والا مقرر کر دیں!

۱۷ اگست

تمام دن کہیں باہر نہیں گیا۔ زیدی صاحب کی طبیعت خراب ہونے کی وجہ سے نہ کسی سے ملنے کو جی چاہتا ہے نہ سیر کو۔ البتہ صبح کو جا کر چچا ابا کے لئے جواز راہ لایا کیونکہ ان کا ارادہ ہے کہ علیحدہ بغداد چلے جائیں۔ معلوم نہیں ہم کو کب تک یہاں ٹھیرنا پڑے اور ان کی واپسی ۸ ستمبر تک لازمی ہے۔ اس کا ان کو بھی افسوس ہے اور ہم کو بھی۔ لیکن مجبوری ہے کیونکہ ڈاکٹر ابھی کچھ نہیں بتا تا یا بتا سکتا کہ کب تک ٹھیرنا ضروری ہے۔

شام کو نو بجے کے قریب آغائی فیروز آبادی وکیل مجلس ملی کا ٹیلی فون آیا کہ آپ لوگ دعوت میں آج کیوں نہیں آئے! بہت تعجب ہوا کیونکہ ہم کو اس دعوت کی اطلاع نہ تھی۔ بعد میں خیال آیا کہ شاید اس روز جب ہم مجلس میں گئے ہیں تو انھوں نے کہا تھا کہ ہفتے کے روز آپ کی دعوت ہے۔ میں اس وقت یہ سمجھا تھا کہ وہ کہہ رہے ہیں کہ ہفتے کے روز تم سے ملنے آؤں گا۔ بہرحال ان سے معذرت کر دی۔ علاوہ بریں جانا اس لیے بھی ممکن نہ تھا کہ شام کو چچا ابا صاحب کی طبیعت بھی خراب ہوگئی تھی۔ کچھ حرارت تھی اور معدے کی خرابی۔ ان کو انتظار کرانے کا افسوس ہے۔

۱۸ اگست

صبح فیروز آبادی صاحب کو فون کیا۔ معلوم ہوا کہ وہ صبح کو ہی باہر چلے گئے ہیں۔ دوپہر تک آئیں گے۔ ارادہ تھا کہ ان کے ہاں معذرت کے لئے جاؤں۔ آغائی مترجم نظام کی تلاش میں کتاب خانۂ معارف گیا جس کا پتہ مجھ کو یہ بتایا گیا تھا کہ وہ مدرسہ دارالفنون کے متصل ہے۔ معلوم ہوا کہ دو تین مہینے ہوئے وہ کتاب خانہ وہاں سے اٹھا لیا اور وہ عمارت بھی گرائی جا رہی تھی۔ تخریب کا آج کل طہران میں بہت شوق ہے۔ جدھر جا کر دیکھئے گلیاں، بازار، خیابان، مکانات گرائے جا رہے ہیں تاکہ نئے بنائیں۔ اس سے غرباء کو بہت تکلیف ہوئی۔ وہ بے مکان ہوگئے۔ بعض دفعہ دولت کی عمال کی بے انصافی یا بد دیانتی سے ان کو معاوضہ بھی نہیں ملا۔ شہر کو

صاف، وسیع اور خوبصورت بنانے کا خیال بہت اچھا ہے لیکن کام آہستہ آہستہ کرنا چاہیے۔ اس وقت کم از کم طہران کا ایک تہائی حصہ ٹوٹا پڑا ہے۔ اس نئی "تعمیری تحریک" کے متعلق ایک دو دل چسپ قصے جو میں نے سنے یہاں لکھتا ہوں۔ معلوم نہیں ان میں کہاں تک صحت ہے لیکن بالکل صحیح ہوں تو تعجب کی بات نہیں۔ یہ قصے آغا غلام رضا خراسانی کی معرفت معلوم ہوتے۔ اور مجھے جہاں تک اندازہ ہے وہ کافی معلومات رکھنے والا آدمی ہے اور چونکہ خاص طور پر موجودہ بادشاہ کا مدّاح نہیں اس لیے اور زیادہ گمان ہے کہ قصے صحیح ہوں گے۔

باغِ ملّی

جس زمانے میں امیر امان اللہ خاں طہران آنے والے تھے، شہر میں کوئی بڑا اور خوبصورت پبلک باغ نہیں تھا۔ رضا شاہ پہلوی نے ضرورت محسوس کی کہ اس قسم کا باغ ہونا ضروری ہے اور بہتر ہے کہ یہ باغ امیرِ افغانستان کے آنے سے پہلے بن جائے۔ چنانچہ انھوں نے شہر کے تمام مالیوں اور باغبانوں کو بُلایا اور کہا کہ ہم تمہارا امتحان کرنا اور تمہارا کام دیکھنا چاہتے ہیں۔ تم فلاں جگہ (خیابانِ سپہ فوجی کلب کے قریب) ایک باغ بناؤ اور اس میں اپنی جلدی اور کام کی خوبصورتی دکھاؤ۔ اگر تم اتنے روز میں کامیابی کے ساتھ باغ تیار کر لوگے تو ہم تم کو انعام دیں گے ورنہ تمہاری نالائقی ظاہر ہوجائے گی اور ہم اپنے لیے باہر سے مالی بلائیں گے۔ بتایا جاتا ہے کہ چند ہی ہفتے میں باغ تیار ہوگیا جس میں نہایت سلیقے اور خوبصورتی سے روشیں، پھولوں کے تختے، حوض وغیرہ بنے ہوئے ہیں۔ بیچ میں ایک چھوٹی سی خوبصورت گول گنبد دار بارہ دری ہے جس میں باجہ بجایا جاتا ہے اور ایک طرف نہایت صاف اور خوش سلیقہ ریستوراں ہے جو بلدیہ کی ملکیت ہے اور نہایت ہی خوش منظر جگہ واقع ہے۔ شام کو وہاں بہت کثرت سے مرد اور عورتیں آتی ہیں، باغ کی سیر کرتی ہیں یا کرتے ہیں اور ریستوراں میں بیٹھ کر برف وغیرہ کھاتے ہیں۔ میرا اندازہ ہے کہ یہاں کم از کم ڈھائی سو روپے روز کی بکری ہوتی ہے۔ مردوں اور عورتوں کے بیٹھنے کے لیے مختلف روشوں پر انتظام ہے۔ بیچ میں پھولوں کے تختے اور پودے لگے ہوتے ہیں۔ باغ چھوٹا ہے لیکن بہت سلیقے اور خوش مذاقی

سے لگایا گیا ہے۔ ہمارے ہوٹل کے بالکل سامنے ہے۔

بلدیہ

بلدیہ کی عمارت بھی شاہ نے (کہا جاتا ہے) اسی طرح مفت بنوائی۔ اس نے شہر کے تمام معماروں وغیرہ کو جمع کیا، ان کی خاطر کی اور اس کے بعد تقریر میں کہا کہ ہم تمہاری ہنرمندی اور کاریگری کا امتحان کرنا چاہتے ہیں۔ تم بلدیہ کے لیے اس نقشے کے مطابق ایک بہت خوبصورت عمارت تیار کرکے دکھاؤ۔ چنانچہ اب میدان توپ خانہ میں پست و تلغراف خانے کی شاندار عمارت کے مقابل، خیابان لالہ زار اور خیابان علاؤالدولہ کے بیچ میں بلدیہ کی وسیع اور خوش منظر عمارت موجود ہے۔ بہت مضبوط تو نہیں ہے کیونکہ بعض حصے یہاں کے عام دستور کے مطابق کچے ہیں۔ اوپر سفیدی کی گئی ہے۔ لیکن یہاں بارش اس قدر کم ہوتی ہے کہ کچے مکانات سے کوئی خطرہ نہیں ہے اور وہ تمام ملک میں عام ہیں۔

قہوہ خانے

اسی طرح شاہ کے متعلق اور بھی قصے بیان کیے جاتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگوں سے کام لینے میں کافی ہوشیار اور بیدار مغز ہے۔ چند سال ہوئے (شاید دو سال) اس نے تمام ہوٹل اور قہوہ خانے والوں کو اپنے ہاں بلایا، ان کو چائے اور شربت پلایا اور اس کے بعد فلم کے ذریعے ان کو مختلف ملکوں کے حالات دکھائے اور سمجھائے اور اس کے بعد ایران کے متعلق تقریر کی اور کہا کہ دیکھو یورپ اور امریکہ کے ملک اس قدر دولت مند اور ترقی یافتہ ہیں اور تمہارا ملک بہت خراب حالت میں ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ یہ بھی ایسا ہی صاف اور دولت مند اور ترقی یافتہ ہو جائے اور اس کے لیے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ تمہارے یہاں اکثر لوگ عام طور پر شراب پیتے ہیں، افیون کھاتے اور پیتے ہیں اور قہوہ خانے ان چیزوں کے مرکز بن گئے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ تم ان سب کو یک قلم بند کر دو اور کسی کے ہاتھ نہ افیم اور شراب بیچو اور نہ اس کو وہاں پینے دو۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے حکم شاہی کی تعمیل کی اور اب ہوٹلوں اور قہوہ خانوں کی فضا پہلے سے بہت زیادہ بہتر ہو گئی ہے۔ وہاں لوگ افیم خوری نہیں کرتے۔ لڑائی جھگڑے نہیں ہوتے، صفائی زیادہ ہے، لوگ خاموشی

اور تہذیب سے گزر کرتے ہیں۔اور میں نے بھی اگرچہ بہت سے ہوٹلوں اور ریستوراں میں کھانا کھایا لیکن کہیں کسی کو افیم یا شراب پیتے یا شور و غل کرتے نہیں دیکھا۔بعض جگہ یقیناً یہ چیزیں فروخت ہوتی ہیں اور پی جاتی ہیں۔اور میں نہیں کہہ سکتا کہ پہلے کی نسبت ان کا شغل کم ہے یا زیادہ۔لیکن کم از کم ظاہری حالت بہت بہتر ہے۔اسی طرح اس نے کپڑے والوں اور دوسرے تاجروں کو بلا کر ہدایات کیں کہ تم لوگوں کو کس طرح کام کرنا چاہئے اور اپنی سوداگری کو ترقی دے کر ملک کو دولت مند بنانا چاہیے۔

دوپہر کو آغائی مترجم نظام آئے۔وہ بھی کل رات آغائی فیروز آبادی کے ہاں ہمارا انتظار کرتے رہے تھے۔ ان سے معلوم ہوا کہ انھوں نے اقبال کے متعلق ایک تقریظ لکھ کر اخبار وطن کو چھپنے کے لیے دی ہے۔تقریظ انھوں نے پڑھ کر سنائی۔بہت جوش اور خلوص اور عقیدت کے ساتھ لکھی ہے۔میں نے مثنوی اسرار و رموز ان کی خدمت میں ہدیہ کی تھی۔وہ اس کو پڑھ کر اقبال کے بہت مداح اور گرویدہ ہو گئے ہیں اور اس کا ذکر وجد اور الفاظ میں کرتے ہیں۔میں نے ان کو پیام مشرق میں سے چند چیزیں دکھائیں۔ان کو پڑھ کر پھر وجد کی کیفیت طاری ہو گئی۔کہتے ہیں کہ سعدی اور نظامی اور حافظ اور تمام متقدمین اس شخص کے فلسفے اور شاعری کا مقابلہ نہیں کر سکتے کیونکہ اس کا علوِ فکر بے مثال ہے وغیرہ۔البتہ یہ ضرور ہے کہ وہ وجد میں ذرا جلدی آجاتے ہیں اور تعریف بہت آسانی سے بھی کرنے لگتے ہیں۔مثلاً میرے پاس MICHAEL ARLEN کا ناول PIRACY رکھا ہوا تھا۔ تذکرۃً میں نے اس کے متعلق کچھ کہا۔کہنے لگے وہ انگریزوں کی نئی نسل یعنی جنگ کے بعد کے نوجوانوں کے متعلق کیا رائے ظاہر کرتا ہے۔ میں نے کہا کہ اس کی رائے میں ان میں سے زیادہ تر SLACKERS ہیں جو قوم اور ملک کے کام میں حصہ نہیں لیتے اور زمانے کی اہمیت سے ناواقف ہیں۔ بس تعریف کرتے کرتے لوٹ ہو گئے۔کہنے لگے۔بہت ہی عالی دماغ شخص ہے۔ خدا اس پر اور انگریزوں کی قوم پر رحمت کرے۔ زندہ ہے ؟ میں نے کہا، ہاں مقابلتہً نوجوان ہے۔ کہنے لگے تم سے ملاقات ہے، خط و کتابت ہے۔میں نے کہا نہیں۔ کہنے لگے اچھا مجھے اس کا پتہ بتا دو اور اس کو میرا سلام ضرور لکھ دینا !!

تیسرے پہر کو آغا فیروز آبادی خود ملنے آئے۔ بہت خوش اخلاق مخلص اور سیدھے سادے مسلمان آدمی ہیں کہنے لگے کہ تکلیف ہو تو میرا مکان حاضر ہے وغیرہ۔ میں نے بہت بہت شکریہ ادا کیا اور دعوت میں شریک نہ ہو سکنے کی معذرت کی۔

آج طے ہوا کہ بچا ابا کل بغداد روانہ ہوجائیں اور ہم زیدی کے اچھا ہونے تک یہاں ٹھیرے رہیں۔ خدا کرے ان کو جلد صحت ہو جائے کیونکہ اب یہاں سے جی اکتا گیا ہے اور فرصت اور بے کاری کی وجہ سے دماغ سوچ میں پڑ جاتا ہے اور خیال ماضی کو غم کے اندھیرے میں تاریک اور مستقبل کو خالی اور بے معنی کرکے دکھا دیتا ہے۔ اس احساس سے زیادہ تکلیف دہ شاید ہی کوئی احساس ہو؟

۱۹/ اگست

آج صبح بچا ابا صاحب نے سامان وغیرہ باندھا اور جانے کی تیاری کی گاراژ (موٹرخانہ) والے نے ۸ بجے صبح چلنے کا وقت مقرر کیا تھا لیکن تمام دن کی کوفت اور انتظار کرانے کے بعد شام کے چھ بجے روانہ ہوا۔ ایرانیوں کی کاروباری دیانت بھی ہندوستانیوں کی طرح بہت قابل اعتراض اور لائق اصلاح ہے خصوصاً ان گاراژ والوں کی۔ کیونکہ ان کو مسافروں اور اجنبی لوگوں سے سابقہ پڑتا ہے اور ان کو لوٹنے کا موقع کافی ہوتا ہے۔ لہٰذا وہ اس سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ دوسرے اب چونکہ صرف شہر طہران میں شاید پچاس ساٹھ گاراژ ہیں در آپس میں مقابلہ بہت سخت ہے اس لیے حالت اور بھی خراب ہو گئی۔ اکثر خصوصاً اگر اقف کار ایرانی سفر کرتے ہوں، موٹر معقول یا اس سے بھی کم کرانے پر دینی پڑتی ہے اس ہ جب کبھی موقع ملتا ہے وہ ناواقف لوگوں سے کسر نکال لیتے ہیں باوجود کہ ہم ان کے ہتکنڈوں سے واقف تھے ہم کو بھی شاید کل ملا کر تیس روپے کا نقصان اٹھانا پڑا۔ زیدی کی لت کی وجہ سے ایک دفعہ کا لیا ہوا ٹکٹ منسوخ کرنا پڑا اور اس کا تاوان چھ تومان ہوا۔ میں ہم سے چند روز قبل ۲۳ تومان ٹھیرا لیے تین آدمیوں کے لیے۔ حالانکہ آج کہ بچا ابا نہ ہوتے ہیں شاید عام نرخ ۱۶ یا ۱۷ تومان فی کس تھا۔ لہٰذا یہ چار تومان بھی ان کو زیادہ دینے

پڑے۔ دولت کو چاہیئے کہ اس طرف توجہ کرے اور مسافروں کے آرام کا زیادہ خیال کرے۔
آج صبح چچا آبا سے ملنے کے لئے آغا مترجم نظام آئے۔ معلوم ہوا کہ اقبال کے متعلق ان کی تقریظ ابھی شائع نہیں ہوئی۔ شاید کل ہوگی۔ ان کی گفتگو سے یہ بھی پتہ چلا کہ وہ ہمدان سے وکالت مجلسِ ملّی کے لئے کھڑا ہونا چاہتے تھے لیکن وہاں دوستوں نے مدد نہیں دی ممکن ہے دولت کی طرف سے ان کے خلاف اشارہ ہوا ہو یا لوگ ان کی طبیعت اور مزاج سے جو متواتر ناامیدیوں اور تکلیفوں کی وجہ سے کسی قدر تلخ اور MONOMANIOCAL ہوگیا ہے خائف ہوں۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ آدمی مخلص اور کھرے ہیں اور جس بات کو سچّا سمجھتے ہیں اس کے لیے ایثار کرنے کو تیار ہیں۔
ان کے ساتھ میں اور چچا آبا مدیرِ وطن سے ملنے گئے۔ ان سے ایک روز سرسری ملاقات آغا بہجت مدیر دیوسس مجلّہ معارف کے ہاں ہوئی تھی۔ آدمی خوش اخلاق ہیں اور مدیرِ ستارۂ جہاں سے زیادہ بیدار اور جاندار۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ ایران کے ایڈیٹروں کو (بظاہر) ندازہ ہی نہیں کہ اخبار نویسی کا فن دوسرے ممالک میں کس قدر ترقی کر گیا ہے۔ وہ اپنی وجودہ قابلِ افسوس یا کم از کم بہت معمولی جمودی حالت سے خاصے مطمئن معلوم ہوتے یں میں نے ان سے کہا کہ زیادہ تر اخباروں میں آج کل ایک یا دو صفحے خبروں کے ہوتے یں اور باقی محض "اعلانات ثبت اسناد و املاک" کے لیے مخصوص کر دیئے جاتے ہیں۔ یہ ت درست نہیں۔ پہلے تو انھوں نے یہ سمجھانا چاہا کہ ان کو شائع کرنا بھی ملک کی خدمت ہے لیکن جب میں نے اپنے الفاظ اور بشرہ سے یہ ظاہر کیا کہ میں ان باتوں میں نہیں آ سکتا ، وہ کہنے لگے کہ یہ چند روزہ چیز ہے اور دولت کی طرف سے ان اشتہارات کے شائع رنے کا معقول معاوضہ ملتا ہے۔ میں نے اس بات کو تسلیم کیا کہ اخبار کو یقیناً روپے کی ضرورت ہے اور اشتہاروں کے ذریعے روپیہ (خصوصاً ایسے جن کی عوام کو واقعاً ضرورت ہے) بالکل بل اعتراض نہیں۔ لیکن اس کے پیچھے اس طرح نہیں پڑنا چاہیئے کہ اصل مقصد اور مطلب بار نکالنے کا فوت ہو جائے۔ میں نے کہا کہ طہران میں آپ کے لیے بہت سے مواقع ہے کہ آپ بہترین اور باخبر ترین اخبار نکالیں چونکہ یہاں لندن، پیرس، برلن اور ماسکو

چاروں جگہ سے بے تار کی خبریں آتی ہیں۔انھوں نے کہا کہ ہاں ہم اپنے اخبار میں ان سب کو استعمال کرتے ہیں اور ان سے فائدہ اُٹھاتے ہیں!

ایسے قاتل کا کیا کرے کوئی!

گویا محض چند اہم اور غیر اہم خبروں کا جمع کر کے شائع کر دینا کافی ہے۔ان کا روزنامہ پھر بھی بعض اور روزناموں سے غنیمت ہے اس میں کبھی کبھی ہندوستان کی خبریں بھی ہوتی ہیں۔ان کی زبانی معلوم ہوا کہ اہلِ ہزارا کے ہاتھوں بچۂ سقہ نے سخت شکست کھائی۔ اس کا جرنل پکڑا گیا اور اس کو گرم پانی میں ابلوا دیا گیا! توبہ! خبر لندن سے براہِ پیرس موصول ہوئی ہے۔ خدا جانتا ہے۔ انھوں نے اپنے روزنامے میں ہمارے آنے کی خبر بھی درج کی تھی۔ ان کا روزنامہ ہندوستان میں بھی بعض جگہ جاتا ہے اور وہاں سے اخبار وغیرہ تبادلے میں آتے ہیں۔اور وہ اس بات کو بہت پوچھتے رہے کہ ہندوستان میں اخبار پرانے اور وقت طلب سنگی چھپائی سے کیوں چھپتے ہیں مشین سے کیوں نہیں چھاپے جاتے۔انھوں نے یہ بھی بتایا کہ جرمنی میں کسی جگہ نستعلیق کا صحیح اور عمدہ ٹائپ تیار ہو گیا ہے۔ شاید!

۲۰/اگست

آج صبح ہم مہمان خانہ ایران سے PENSION MADAME TREY میں تبدیلِ مکان کر کے آ گئے۔ یہ مکان خیابانِ قوام السلطنتہ میں سفارت خانہ مصر کے قریب ہے۔ بہت صاف، خاموش اور عمدہ مقام ہے اور باہر خیابان میں بھی موٹروں وغیرہ کی آمد ورفت بہت کم ہے۔ صحن میں چھوٹا سا چمن بھی ہے اور حوض بھی۔ گرد و غبار اور مکھیوں وغیرہ سے بالکل پاک ہے۔ ہمیں افسوس ہوا کہ ہم نے اپنی ناواقفیت کی وجہ سے اتنے دن مہمان خانہ ایران کے شور و شغب میں بسر کیے۔ کرایہ یہاں کا دس قران یومیہ ہے اور مہمان خانہ ایران میں ۹ قران۔لہٰذا کوئی فرق نہیں۔اور کیونکہ ڈاکٹر منصور مقتدر کا مکان بالکل قریب ہے اس لیے روز کے ۴ قران آنے جانے کے بچتے ہیں۔آغا غلام رضا نے حسبِ معمول تبدیلِ مکان میں اور ہر طرح بہت مدد دی۔ اگر وہ ساتھ نہ ہوتے تو کھانے وغیرہ

کے انتظام میں یا تو تکلیف بہت ہوتی یا خرچ بہت زیادہ ہوتا۔

دوپہر کے قریب بازار گیا اور وہاں سے ایک روسی ساخت کا (جس کو بالعموم ترکی ساخت کہا جاتا ہے) آفتابہ اور سلاپچی ۳ تومان پانچ قِران یعنی تقریباً پونے نو روپے میں خریدا۔ ہندوستان میں اس کی قیمت دو چند سے زیادہ ہوتی۔ میرزا ہاشم اصفہانی سے ان کے دفتر میں ملاقات کی۔ان کو ہماری موجودگی پر بہت تعجب ہوا کیونکہ ہم ان سے ہفتہ بھر ہوا رخصت ہو چکے تھے۔ زیدی کی علالت پر افسوس کرتے رہے وہاں سرسری سی ملاقات میرزا مہدی مومن زادہ سے بھی ہوئی جو ان کے سکریٹری (؟) ہیں اور جن کے نام سیّد سجّاد حیدر نے خط دیا تھا۔ اب تک ان سے ملنا نہ ہوا تھا۔ شام کو مدیرِ مہرِ منیر (مشہد) اور جمیل ظفر، حبیب بھائی اور مجیب کو خط لکھے۔

آج رات اچھی طرح نیند نہیں آئی بسفری پلنگ پر بستر بہت نرم اور اچھا تھا۔ لیکن اس میں نشیب و فراز پیدا ہو گئے تھے۔ علاوہ اس کے رات بھر بہت مختلف قسم کے اور پریشان کن یا رنج دہ خواب دیکھتا رہا۔ زیدی کی طبیعت دن بھر بہت بہتر رہی۔ البتہ شام کے قریب کچھ دیر کے لیے بخار ذرا بڑھ گیا تھا۔

۱۲/اگست

آج صبح آغا مترجم نظام، ان کے ایک عزیز اور حاجی مرزا حسن رشدیہ ہم سے ملنے کے لیے آئے۔ حاجی صاحب سے پہلے ملا خارقانی کے ہاں ملاقات ہوئی تھی۔ بلند قامت، صاف رنگ، سفید داڑھی اور خاصا بارعب چہرہ ہے۔ پہلے گیلان میں رئیسِ معارف (D.P.I.) تھے۔ مولوی تھے عمامہ پہنتے تھے اب دورِ جدید میں عمامہ ترک کرنا پڑا، لیکن لباس اب بھی پرانی قسم کا پہنتے ہیں اور اس پر سیاہ عبا دولت کے نئے حکام میں چنداں مقبول نہیں ہیں۔ شاید خوشامد اور بقول فرانسیسیوں کے DOUCEUR سے کام نکالنا نہیں جانتے اس لیے اس پہلی خدمت سے سبکدوش کر کے ان کو اب طہران کے ادارۂ وزارتِ معارف میں کوئی جگہ دے دی ہے۔ انھوں نے اپنی ایک اسکیم سنائی

جو آج ہی انھوں نے وزارتِ معارف کو پیش کی ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ ایک جدید طرز کا "مدرسہ رشدیہ" قائم کریں جو پرائمری مدراج کے چھ سال تک کی تعلیم دے۔ جدید اس معنی مین کہ اس کا طریقۂ تعلیم و تدریس جدید ہو اور "اس ایروپلین کے دور میں بیل گاڑی کی رفتار سے بچوں کو نہ پڑھاتے"۔ لیکن اس معنی میں جدید نہ ہو کہ محض یورپ کی تقلید کی جائے اور قدیم اصول و نظمِ تعلیم جو ایران میں رائج رہ چکا ہے اس کو بالکل نظر انداز کر دیا جاتے۔ وہ اسفیار کے طریقۂ تعلیم کے متعلق بہت گفتگو کرتے رہے اور زور دیتے رہے اور پوچھتے رہے کہ ہندوستان میں کس طرح تعلیم دی جاتی ہے پُرانا طریقہ ہے یا جدید؟ (یہاں والوں میں اگر کوئی ہندوستان کے متعلق کچھ پوچھے یا واقفیت رکھتا ہو تو یہ بہت غنیمت ہے کیونکہ اکثر لوگ یا تو وہاں کے معاملات سے بالکل ناواقف ہیں یا مطلق دل چسپی نہیں رکھتے یا بزعمِ خود وہ ہندوستان سے کیا سیکھ سکتے ہیں؟ لیکن یہ ان کی غلطی ہے) ان کا خیال ہے کہ آج کل ایران میں جو طریقۂ تعلیم اسفیار رائج ہے وہ ان کا ہی چلایا ہوا اور شروع کیا ہوا ہے۔ لیکن اس کو اب چالیس سال ہو گئے اور اس عرصے میں ان کی اپنی عقل اور تجربہ میں اضافہ ہو گیا ہے۔ اس لئے اس میں ترمیم و ترقی کی ضرورت ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ وزارتِ معارف اس مکتب کو ان کے شرائط اور لوازم کے ساتھ کھولنے کی اجازت دے اور اس کا انتظام کرے۔ اس میں ایک شرط یہ بھی ہے (اور معقول ہے) کہ وزارت کی طرف سے صرف ایک امتحان ہو اور وہ تعلیم کے ختم پر پہنچ کے پانچ سال میں ان کو آزادی ہو کہ وہ بغیر بیرونی امتحان کی قید کے تعلیم دے سکیں۔ انھوں نے وعدہ کیا ہے کہ اس اسکیم کا مسودہ وہ دیکھنے کے لیے میرے پاس بھیجیں گے۔ لیکن اس کو انھوں نے زبانی ہی اس قدر تفصیل کے ساتھ سنا دیا اور اکثر حصے حفظ، لفظ بہ لفظ ادا کر دیتے کہ شاید اب اصل کو دیکھ کر میری معلومات میں چنداں اضافہ نہ ہو۔

اس قسم کے مکتب کو قائم کرنے کا خیال بہت اچھا ہے۔ اور ایک عمر رسیدہ، تجربہ کار، پرخلوص شخص کے لیے جس کو تمام عمر تعلیم سے کام رہا ہے اس چیز کا خیال کرنا ایک فالِ نیک ہے۔ لیکن اس اسکیم میں جو انھوں نے تیار کی ہے ایک خاص ایرانی بلکہ بدقسمتی سے مشرقی TOUCH

ہے جو قابلِ ذکر ہے اور ایک لحاظ سے مضحک ہے اور دوسرے لحاظ سے قابلِ افسوس یعنی یہ کہ انھوں نے اپنی اسکیم میں پہلے اعلیٰ حضرت کو مخاطب کیا ہے اور ان کو اس کارِ اہم کی عظمت کی طرف توجہ دلائی ہے۔ اس کے بعد وزارتِ معارف کو خطاب کیا ہے اور اس کلیہ کو قائم کرنے کے بعد کہ کسی ملک کی حقیقی عظمت اور ترقی کا معیار اس کے معارف کی حالت ہے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ہمارا ملک تعلیم میں بہت پیچھے ہے اس لیے ترقی میں بھی پس ماندہ ہے۔ اس کے بعد دولِ خارجہ کے سفرا کو خطاب کیا ہے کہ "اے سفیروں جو دوسرے ملکوں اور تہذیبوں کے نمائندے ہو آؤ اور اس مدرسہ کے طریقۂ تعلیم کو دیکھو اور سبق حاصل کرو اور اس کا چرچا کرو" اس کے بعد شاعروں کو خطاب کیا ہے (میرے خدا) کہ تم علم کا نام لیتے ہو اور اس کے گُن گاتے ہو۔ لیکن اس کے اصل مفہوم سے واقف نہیں ہو مدرسہ رشدیہ کو دیکھو اور نور و روشنی حاصل کرو" وغیرہ وغیرہ اور یہ خیال بھی پیش نظر ہے کہ یہ مکتب اس پچاس ہزار روپے کے انعام کو حاصل کر سکتا ہے جس کا اعلان انگلستان کے بورڈ آف ایجوکیشن کی طرف سے .... "حبل المتین" کلکتہ میں (!) اس شخص یا مدرسہ کے لیے ہوا ہے جو ریاضی کے لیے ایک ایسا طریقۂ تدریس ایجاد کرے کہ وہ انگلستان کے موجودہ طریقے سے بہتر ہو۔ میں نے ان سے کہا کہ اگر وزارتِ معارف آپ کی اس اسکیم کو منظور نہ کرے اور گمان یہی ہے کہ وہ کسی قسم کے تجربی مدرسہ کو منظور نہیں کریں گے (کیونکہ وہ اس کا مفہوم ہی نہیں سمجھ سکتے اور وزیرِ معارف کی علمی اور تعلیمی قابلیت بہت واجبی سی بیان کی جاتی ہے) تو آپ کیا کریں گے؟ انھوں نے اس بات کو تسلیم کیا وزارت کا انکار کر دینا قرین قیاس ہے اور اس صورت میں میں اردبیل (آذربائیجان) چلا جاؤں گا جہاں کے لوگ مجھ کو بلا رہے ہیں اور مدرسہ وہاں قائم کروں گا اگرچہ طہران جیسی مرکزی جگہ میں اس کا قیام بہت بہتر ہوتا۔ میں نے ان سے نرم الفاظ میں کہا کہ یہ طریقۂ عمل غلط ہے کہ کسی مفید اور تجربی کام کو شروع کرنے سے پہلے تمام عمائد و باشندگانِ مریخ و مشتری و زمین کو مخاطب کیا جائے۔ اور اس کے انقلاب آفرین اور فلک شگاف نتائج کو مشتہر کیا جائے اور اس کے بعد (جیسا کہ اکثر ہمارے ممالک میں دیکھا جاتا ہے) کچھ بھی نہ ہو۔ بہتر یہ ہے کہ

اوّل اوّل خاموشی اور استقلال کے ساتھ کام کو شروع کیا جاتے جب مشین اچھی طرح چلنے لگے اور اس سے کچھ نتائج مرتب ہونے لگیں تو ان کو ماہرین کی رائے اور عوام کی اطلاع کے لیے سنجیدہ اور مختصر طریقے سے بیان کر دیا جائے۔ اگر حقیقی کامیابی ہے تو لوگ آہستہ آہستہ متوجہ ہوں گے۔ ورنہ محض بلند آہنگ دعادی سے کیا فائدہ ؟

میں ان صاحب کے خلوصِ نیت اور خواہشِ خدمت کا معترف ہوں اور ان کو پسند کرتا ہوں لیکن اس کا کیا علاج کہ یہ اشتہار دینے اور ذرا سے کام کو بہت بڑی پرواز سمجھنے کی کمزوری آج کل تمام مشرقی ممالک میں عام ہے۔ یورپ اور امریکہ وغیرہ میں بھی اشتہار بازی بہت ہے لیکن وہ زیادہ تر تجارت اور کاروبار تک محدود ہے۔ علمی دنیا میں بہت کم ہے۔ ہمارے یہاں اس کا زور اس لیے ہے کہ علمی معیار اور علمی جدوجہد بہت کم اور محدود ہے اور جو شخص ذرا سا کام کرتا ہے وہ خود کو بہت بڑا ماہر سمجھنے لگتا ہے اور رفتہ رفتہ اس کے صدقِ عقیدہ سے متاثر ہو کر دوسرے لوگ بھی اس کو علاّمہ اور ماہرِ فن سمجھنے لگتے ہیں۔ چناں چہ ہمارے ہاں ہندوستان میں "دو بھائی ہیں جو کتابیں لکھتے ہیں" اور دونوں اپنے اپنے فن کے خدا بن گئے ہیں۔ ایک صاحب ہیں جو تاریخ کے ایک نہایت غیر اہم زمانہ پر کتاب لکھ کر مستند مورّخ ہو گئے ہیں یا اقتصادیات یا نفسیات وغیرہ پر محض تالیف و ترجمہ کا کام کر کے مارشل اور ولیم جیمز کا درجہ حاصل کر چکے ہیں۔ یہ چیز ملک کی علمی ترقی اور حیثیت کے لئے بہت بُری ہے ان لوگوں کو پہاڑ کے نیچے سے گزرنے کی ضرورت ہے تاکہ ان کی آنکھیں کھلیں کہ در اصل ان کا علمی قامت کس قدر ہے۔ چند صدی پیشتر کم از کم ہندوستان اور ایران اور عرب وغیرہ میں علم کا معیار اور جھنڈا بہت بلند تھا۔ اور اس کو حاصل کرنے کے لیے عمر بھر کی ریاضت دوسرے مشاغل سے منھ موڑ کر مطالعہ اور فکر اور خدمتِ علم کی زندگی بسر کرنی پڑتی تھی۔ جہاں جہاں کسی فن کے مشہور استاد ہوتے تھے ان کے آگے زانوتے ادب تہہ کرنا پڑتا تھا۔ اس کے بعد اپنی تصنیف و تالیف اور اظہار و اجتہاد سے ان کو عالم کا مرتبہ حاصل ہوتا تھا..... ان کی کوشش اس لحاظ سے البتہ اور قابلِ قدر ہے کہ وہ خود اس کام کو کرنے کے لیے تیار ہیں۔ ورنہ ایران میں آج کل تقریباً ہر کام کے لیے

دولت کی طرف سے ہوتا ہے۔ میرے اپنے علم میں (جو بہت محدود ہے) INITIATIVE صرف ایک چھوٹا سا مدرسہ طہران میں ہے جس کو ہمارے دوست آغا مترجم نظام بغیر دولت کی مدد یا تعارف RECOGNITION کے چھوٹے بچوں کے لیے چلا رہے ہیں اور اپنے بھتیجے کی مدد سے (جو امریکن کالج اصفہان کے پڑھے ہوئے ہیں) اس میں اپنی سمجھ کے مطابق نئے طریقوں سے تعلیم دیتے ہیں۔ ان کے بچوں میں کم از کم یہ بات میں نے دیکھی کہ اگر کوئی اجنبی بھی گزرتا ہو تو اس کو بہت ادب اور معقولیت سے سلام علیکم کرتے ہیں۔ ایک مدرسہ آغام۔ ع بہجت موسس معارف بھی اسی طرح چلا رہے ہیں۔

آغا مترجم نظام سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مدیر وطن نے (نہ معلوم خود اپنی کمزوری یا سنسر کے خوف سے) اقبال کے ان اشعار کو چھاپنے سے انکار کر دیا جو انھوں نے اپنی تقریظ کے خاتمہ پر بطور مثال کے لکھے تھے۔ ان اشعار میں سے جو مثنوی اسرارِ خودی سے لیے گئے تھے سلطان مراد اور معمار کا قصہ تھا۔ افسوس ہے کہ ایک اسلامی ملک میں جس نے مشروطہ اور آزادی اور حریت کے لیے اس قدر جدو جہد کی ہو چند ہی سال میں آزادی فکر و اظہار میں اس قدر بندش میں آجائے کہ ایک ایسی چیز کے شائع کرنے میں بھی لوگ تامل کریں! خود آغا مترجم نظام کا شعر یہاں صادق آتا ہے :-

آزاد تر از جملہ قلم بود آں نیز   ننہاد قدم بملک ماسانسور شد!

آج شام چچا ابا صاحب کا تار کرمان شاہ سے آیا کہ راستہ صاف ہے اور میں خیریت سے پہنچ گیا۔ الحمد اللہ۔

۲۲/ اگست

صبح کو دیر سے اُٹھا۔ رات کو نیند اچھی طرح نہیں آئی تھی۔ کیونکہ آج کل کوئی کام یا مشغلہ نہیں ہے اور مکان بہت خاموش اور سکون دہ ہے (خصوصاً مہمان خانۂ ایران کے شور و غل کے بعد) اس لیے ایک قسم کی آرام دہ سستی غالب رہتی ہے۔ صبح کو مدیرِ وطن کو ٹیلی فون کرکے دریافت کیا کہ آغا مترجم نظام کی تقریظ بابت اقبال شائع ہوگئی یا نہیں۔ جواب آیا کہ

ہوگئی ہے۔ اخبار کو منگاکر پڑھا معلوم ہوا کہ ایڈیٹر نے اس تقریظ کو بہت کم کر دیا ہے اور نصف سے زیادہ حصّہ حذف کر دیا ہے۔ ان کا خیال تھا (جیسا کہ پہلے آغا مترجم نظام نے ذکر کیا تھا) کہ اس میں بے جا تملق ہے۔ حالانکہ ایک ایسے شخص کے لئے یہ بات کہنا ناروا ہے جس نے شاعر کا کلام پڑھا ہی نہیں۔ تقریظ کو بطور یادداشت کے مقابل کے صفحے پر درج کرتا ہوں۔ کچھ دیر بعد آغا مترجم نظام مع ایک ساتھی کے آئے۔ بہت ناراض اور غضب ناک تھے کہ نااہل ایڈیٹر نے اپنی کم علمی کی وجہ سے ان کی تقریظ میں قطع و برید کی۔ اس کی وجہ انھوں نے یہ بتائی کہ ان خود پسندوں کو یہ بات ناگوار گزری کہ انھوں نے اس امر پر زور دیا تھا کہ علماء اور ادیبوں اور شاعروں کو چاہئے کہ اس مقتدر فلسفی سے استفادہ کریں۔ ان کے زعم میں ہندی شاعر سے استفادہ کرنا ایک ایرانی کے لیے بالکل مہمل اور قابلِ شرم بات ہے۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ باوجود اپنی خرابیوں کے ہم ان کو بہت کچھ سکھا سکتے ہیں۔ کہاں تو امیر المومنین کا یہ قول کہ (اُنظر الیٰ ما قال ولا تنظر الیٰ من قال) اور کجا ان کی یہ قومی خود پسندی اور غرور۔ اس کو دور کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ اس کے ہوتے کسی قوم کے لیے تحصیل علم و کمال مشکل ہے۔ علاوہ بریں ایک طرف یہ "خود داری" اور دوسری طرف فرانس وغیرہ کی تقلید اور دریوزہ گری کیا معنی؟

دوسرے صاحب جو صبح ملنے آئے تھے ان کا نام میر سیّد علی کیمیاگر ہے۔ اور انھوں نے طہران، بغداد اور اسلامبول میں تعلیم پائی ہے۔ ان کا خاص مضمون علم کیمیا CHEMISTRY ہے لیکن اسلامبول کے دارالفنون میں انھوں نے علاوہ اس مضمون کے دارالمعلمین اور شعبۂ فلسفہ میں بھی سند حاصل کی ہے۔ اور پانچ سال تک اسلامبول اور بغداد میں مدرّس بھی رہے۔ اس کے بعد ایک اچھی تعلیمی ملازمت چھوڑ کر وطن کی محبت میں طہران آئے۔ لیکن چونکہ سیدھے سادھے مخلص قسم کے مسلمان آدمی ہیں اس لیے کچھ پزیرائی نہیں ہوئی۔ گزشتہ سال مفتشِ مدارس INSPECTOR OF SCHOOLS تھے اور مدرسۂ دارالمعلمین، مدرسۂ دارالفنون اور مدرسۂ طب و دواسازی تینوں میں درس دیتے تھے۔ اس سال ایک مدرسہ متوسط (مدرسۂ ثروت) میں منتقل کر دیے گئے ہیں۔ گزشتہ سال سے انھوں نے ایک مدرسہ حرفہ بھی کھولا

ہے جس میں علاوہ معمولی تعلیم کے نجّاری، آہن گری وغیرہ بھی سکھائی جاتی ہے۔اس میں انھوں نے ابھی نو جماعتیں رکھی ہیں (یہاں متوسطہ کی تعلیم کل بارہ سال کی ہے۔چھ سال ابتدائی تو چھ سال ثانوی)۔ان کی اسکیم یہ ہے کہ پہلے چار سال طالبِ علم معمولی تعلیم حاصل کرے اور تھوڑا تھوڑا ہاتھ کا کام کرے۔اس کے بعد دو سال محض ٹیکنکل تعلیم پائے اور بعد میں اگر چاہے تو ثانوی مدارس میں داخل ہو جائے۔ان کے اس مدرسہ کو چھ ماہ تک سرکاری امداد ملی۔اس کے بعد وزیرِ معارف کے بدل جانے سے امداد بند ہوگئی اور وہ بھی آغا مترجم نظام کی طرح موجودہ حالات سے ناخوش ہیں شاید اسی وجہ سے ان میں دوستی ہے۔کہتے ہیں کہ حکّامِ بالا تعلیم کو سمجھتے نہیں۔قابلیت کی قدر نہیں کرتے۔ جو شخص اور کاموں کے بالکل ناقابل ہو اس کو استاد بنا دیتے ہیں۔بڑی بڑی تنخواہوں پر فرانس وغیرہ سے پروفیسر بلاتے ہیں جن سے کام نہیں چلتا۔" حالانکہ میں ان سے بہتر سند رکھتا ہوں مجھے درد اور سوزِ ملّی زیادہ ہے۔بہتر پڑھاتا ہوں۔لیکن ان سے آدھی تنخواہ دینے پر بھی راضی نہیں ہوتے۔" اسلامبول یونیورسٹی کی تعریف کرتے تھے۔ اور عراق وبغداد کی تعلیمی حالت بھی بہتر بتاتے تھے۔ان کا بیان ہے کہ جب انگریزوں کا وہاں عمل دخل ہوا تو انھوں نے اپنے آنے کے اگلے سال ہی دارُالمعلمین کو تشکیل کیا تاکہ مدرسوں کی مانگ پوری ہو سکے۔ پہلے صرف ساڑھے تین مہینے کا کورس رکھا۔ اس کے بعد اس کو چھ مہینے کا کر دیا۔ پھر ایک سال کا۔ اور اب پورا مدرسی کا کورس پانچ سال کا ہے (اس میں غالباً ان کی معمولی متوسط تعلیم بھی شامل ہوگی۔) انھوں نے اپنی تصویر اور "سیرِ علمی" اور فہرست" مدارس راکہ تدریس نمودہ اند" ایک دو صفحی پیمفلٹ کے طور پر کسی کیمیائی نمائش کے موقع پر چھپوائی تھی۔ اس کی ایک کاپی انھوں نے نذر کی۔ ایشیائی شوقِ نمائش۔ ! علی گڑھ میں سائنس کی تعلیم سے متعلق بہت سے خاصے ذہین اور سمجھ دارانہ سوالات بھی کرتے رہے۔

آج ایک خط ڈاکٹر اقبال کو لکھا اور اس میں ان سے درخواست کی کہ اپنی فارسی تصانیف آغا مترجم نظام کو بھیجدیں تاکہ وہ مفصّل تر تقریظ اس پر لکھیں اور اپنے دار الاشاعت کو ہدایت کریں کہ ان کی فارسی تصانیف کے متعلق طہران کے کتب فروشوں سے خود خط وکتابت کریں۔ میں نے ان کو یہ بھی لکھا کہ ایران میں آج کل بیداری اور ہل چل اور ترقی کی

خواہش ہے لیکن ان کو ترقی کے صحیح معنی معلوم نہیں۔ اور وہ بھی بے راہ روی میں مبتلا ہیں۔ ملت میں خود کام کرنے کی صلاحیت اور ولولۂ عمل نہیں۔ دولت کی طرف سے ہر کام ہوتا ہے۔ اسلام کے اصول و آئین سے واقف نہیں۔ مغرب کی تقلید اور "وطنیت" کا زور ہے۔ ان خیالات میں اصلاح و انقلاب پیدا کرنے کے لیے ضرورت ہے کہ ان کی تصانیف اور خیالات کو کم از کم علمی حلقوں میں پہنچایا جائے۔ اب بھی گزشتہ چند روز میں ایک چھوٹا سا حلقہ ایسا پیدا ہو گیا ہے (زیادہ تر آغا مترجم نظام کی کوشش اور جوش سے جن کو میں نے "اسرار و رموز" کی ایک کاپی دی تھی) جو اقبال کا معتقد اور مدّاح ہے۔

شام کو باغِ ملّی کے سامنے ولادت رسول ؐ کی خوشی میں بہت زور و شور سے آتش بازی چھوڑی گئی۔ لوگوں کا بے حد مجمع تھا۔ وہاں سے لوٹتے ہوئے علی گڑھ کے ایک ایرانی اولڈ بوائے آغا علی احمد حکیمی اور ان کے دو دوستوں سے ملاقات ہوئی یہ ۱۹۴۶ء تک وہاں پڑھتے تھے اور مجھ کو وہاں اکثر دیکھا تھا۔ اب شیراز کے بینک سے منتقل ہو کر چند روز ہوئے خاص طہران میں آ گئے ہیں کل ملنے کے لیے آنے کا وعدہ کیا ہے۔ ہمارے کرم فرما اور کارکن آغا غلام رضا خوب باخبر اور سمجھ دار آدمی ہیں۔ تعلیم بالکل نہیں۔ نوشت و خواند بھی نہیں کر سکتے۔ لیکن عام واقفیت ملک کی سیاسی اور معاشرتی حالت، مذہب، ادب، تاریخ وغیرہ کے متعلق بہت کافی ہے۔ رائے معاملات میں صائب ہوتی ہے چونکہ تمام دنیا کا سفر کیا ہے اس لیے تجربے سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ آج کچھ ذکر تھا کہنے لگے ایرانیوں کی یہ حالت ہے کہ کبھی مل جل کر کام نہیں کر سکتے۔ کوئی شخص فرانس ہو آیا ہے اور وہاں کے "اخلاق" اس کو پسند ہیں تو وہ فرانسیسی نژاد بن جاتا ہے۔ اور سیاست میں بھی فرانس کو دوست رکھتا ہے۔ کوئی روس کا شیدا ہے۔ کوئی جرمنی کا خیر خواہ ہے کوئی انگلستان کا۔ نتیجہ یہ ہے کہ چار پڑھے لکھے آدمی بھی ملک کی باگ کو ایک طرف موڑنا نہیں چاہتے بلکہ ہر شخص اپنی طرف کو کھینچتا ہے۔ یک دلی معدوم ہے۔ کہنے لگے اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسا کہ عوام میں ظہور صاحب العصر کے متعلق مشہور ہے کہ آپ کا ظہور اس وقت ہو گا جب ۳۱۳ جاں نثار بالکل خلوص قلب اور یک دلی سے آپ کے ہم رکاب ہوں گے۔ کہا جاتا ہے کہ ۳۱۰

آدمی آپ کے ہر کاب موجود ہیں لیکن تین آدمیوں کی کسر ہے اگر تمام دنیا سے تین ایسے آدمی پیدا ہوسکیں جو ایک دل ہو کر امامِ زماں کی نصرت اور خدمت کرنے کو تیار ہوں تو آج ظہور ہوجائے مطلب یہ کہ اس قسم کے آدمی ناپید ہیں۔ ہر شخص خود غرض اور خود مطلب ہے اس لیے ترقی نہیں ہوتی۔ شام کو ۲ قِران میں ایک نوجوان اور محبِ وطن ایرانی شاعر عشقی کا دیوان خریدا۔

۲۳/اگست

آج صبح ہی آغا مترجم نظام کا ٹیلی فون آیا کہ تین چار اصحاب آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ کل کی قرارداد کے مطابق آیئے اور کھانا یہاں کھایئے۔ لیکن روانہ ہوتے ہوتے دس بج گئے۔ وہاں آغا...... ادارۂ مخابراتِ تلغراف خانہ اور ایک دو اور اصحاب موجود تھے بعد میں ایک صاحب..... (جو اب شعبۂ مالیات سے تعلق رکھتے ہیں اور نظام کالج میں پروفیسر رہے ہیں اور سولہ سال ہندوستان میں رہے ہیں) آ گئے۔ ان کی ملاقات والد مرحوم سے بھی تھی۔ اور علی گڑھ دہلی وغیرہ بھی وہ گئے ہیں بہت تپاک سے ملے اور اپنے ہاں آنے کی دعوت دی جس کو ہم قبول نہیں کر سکے۔ ایک صاحب...... امرتسر کے رہنے والے بھی وہاں موجود تھے۔ یہ بچارے "ہجرت" کے زمانے میں وہاں سے نکلے تھے۔ پہلے چند ماہ روس رہے اب سات سال سے ایران میں ہیں اور یہیں رہ پڑے ہیں۔ اگرچہ (انھوں نے میرے سوال کے جواب میں کہا) ان کی واپسی میں کوئی سرکاری رکاوٹ نہیں ہے۔ آدمی مخلص اور دردمند معلوم ہوتے ہیں لیکن جوشِ حیات ختم ہو چکا ہے۔ موٹر وغیرہ کی مرمّت کا کام کرتے ہیں۔ طہران میں بیشتر ہندوستانی ہندو، مسلمان، سکھ موٹر کے کاروبار ہی سے تعلق رکھتے ہیں۔

دوپہر تک ہمارے میزبان کے مکان پر پانچ چھ صاحبان اور جمع ہو گئے۔ آغا آرام جو سائنس کے استاد ہیں اور ایک صاحب آغا..... جنھوں نے بلجیم میں فرانسیسی زبان کی تعلیم پائی ہے۔ آغائی بہجت "مدیر موسسِ معارف" جن کی میں کافی قدر کرتا ہوں کیونکہ وہ اپنی دُھن کے پکّے اور پرخلوص آدمی ہیں اور ان کے چہرے پر سہے ہوئے صدموں نے اپنے نقش

قدم چھوڑے ہیں۔ آغائی مولوی، جنھوں نے اپنی نغمہ سرائی سے بھی محظوظ کرنے کی کوشش کی لیکن کامیابی کچھ جزوی سی ہوئی۔ آغائی فرہنگ۔ جو بغیر دعوت کے ایک دوسرے مدعو مہمان آغا علاء السلطنۃ کے ہمراہ نہ صرف خود آئے تھے بلکہ ایک ڈاکٹر صاحب علاء الملک (؟) کو بھی ساتھ لے آتے تھے۔ غرض ایک پورا مجمع تھا جس میں ہم آہنگی نہ تھی۔ آغا مترجم نظام ایک شمشیرِ برّاں ہیں اور اپنی پسند اور ناپسندیدگی کو چھپاتے نہیں۔ دوسرے لوگ جملے تراشنے اور ان کے متعصبانہ جوش اور صاف گوئی سے فائدہ اُٹھانے میں ثر زنگ ہیں۔ وہ ڈاکٹر اور علاء الدولہ خود کو بقول (یادش بخیر) H.G.WELLS ' SOMEONE IN PARTICULAR سمجھتے تھے اور ہمارے میزبان کے ہاں آنے کو ایک طرح اپنی عنایت اور پرورش خیال کرتے تھے جس کو ان کے خیال میں آغا مترجم نظام کو قبول کرنا چاہیے۔ لیکن وہ ایسا کیوں کرنے والے تھے۔ غرض خوب نوک جھونک رہی جو عموماً ایرانی محفلوں کے آداب و اخلاق کے (خصوصاً جب اجنبی مہمان موجود ہوں) خلاف ہے۔ مگر یہ لوگ کھانا کھانے کے بعد چلے گئے۔

زیادہ وقت لوگ پیامِ مشرق اور اسرار و رموز میں سے اشعار پڑھتے رہے۔ اور ان کے مطلب کے متعلق بحث کرتے رہے۔ بالعموم سب بہت متاثر تھے اور اقبال کے علوِ خیال اور رسائی فکر کے قائل۔ البتہ کہیں کہیں زبان کے سمجھنے میں تھوڑی سی دقت ہوتی تھی۔ ممکن ہے بعض مطالب کو سمجھنے کی قابلیت نہ رکھتے ہوں۔ لطف اس وقت آتا تھا جب ہمارے بے درنگ مہمان کسی سلسلے میں (مثلاً حقائقِ اسلامی کی بحث میں جس سے مثنوی اقبال بھری ہوئی ہے) ایران کی بُرائی کر بیٹھتے تھے۔ "میں اس ملک کو مسلمان تھوڑا ہی سمجھتا ہوں۔ یہاں سے زیادہ اسلام تو امریکہ میں ہے اور اس کو محض زبانی دعویٰ نہ سمجھئے میں واقعاً ایران کو اپنا وطن نہیں سمجھتا۔ میرا وطن ہر وہ جگہ ہے جہاں کوئی دیانتدار اور ایماندار آدمی موجود ہے اگر وہ مسلمان ہے تو میرے سر اور آنکھوں پر اس کی جگہ ہے۔" اس پر نوجوان پارٹی کے بعض لوگ (مثلاً وہ سائنس کے استاد) چیں بجبیں ہوتے اور بحث کرتے اور ان پر اپنے ملک کی مخالفت اور بدبینی کا الزام لگاتے۔ نہ معلوم کیوں لوگوں میں وسعتِ نظر

اور رواداری اور احساسِ ظرافت کی اس قدر کمی ہے۔ ہر شخص ذرا سی بات پر عصباتی ہو جاتا ہے اور دوسرے کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا۔ اور یہ نہیں سوچتا کہ نظامِ عالم کی تکمیل کے لیے ہر قسم کے انسان کی ضرورت ہے اگر کسی ملک میں چند آدمی مترجم نظام جیسے نہ ہوں جو وقت بے وقت اپنے ملک کی تنقیص اور اس کے عیوب اور کمزوریوں پر تنقید نہ کرتے رہیں تو جمود مطلق طاری ہو جائے۔ اور اگر سب آدمی ایسے ہوں تو کام کون کرے۔ ان کو تو یہ اصرار۔

ے ملکِ ما این مصر و روم و شام نیست　　　این وطن جائے است کو را نام نیست

اور ان کو یہ ناراضگی کہ یہ اپنے ملک کے ساتھ "غداری" کیوں کرتے ہیں۔

مدیرِ وطن کا قضیہ انھوں نے دوبارہ پیش کیا کہ انھوں نے میری تقریظ کا ستیاناس کر دیا اور مثالیہ اشعار کو درج نہیں کیا۔ اس پر بعض لوگوں نے کہا کہ یہ سیاسی مصلحت کا اقتضا ہوگا۔ میں نے کہا کہ ان اشعار میں کوئی ایسی بات نہیں تھی اور جب ان کو پڑھا گیا تو سب نے اس بات کو تسلیم کیا کہ اشعار کو شائع نہ کرنا ایک ایسی حرکت ہے کہ جس کے کچھ معنی سمجھ میں نہیں آتے۔ ہمارے میزبان نے تین گھنٹے میں اقبال کو اس قدر پڑھ کر سنایا کہ لوگ اکتا گئے میں نے دبے الفاظ میں سمجھایا بھی لیکن وہ تو بقول خود "سرسامی" ہیں۔

شام کو آغا علی احمد حکیمی اور آغا گنجوی ملنے آئے۔ یہ دونوں نوجوان امپریل بینک آف پرشیا میں ملازم ہیں۔ علی احمد علی گڑھ کے بہت مدّاح ہیں اور شیراز کے کہ ایران کا دل ہے۔ اور آغا گنجوی تبریز کی تعریف کرتے تھے۔ ان سے ایران کی تعلیمی حالت پر گفتگو رہی انھوں نے تسلیم کیا کہ تعلیمی حالت قابلِ اطمینان نہیں۔

۲۴ر اگست

آج کی روانگی کے لیے بہت تلاش کے بعد موٹر طے ہو گئی۔ کل صبح دس بجے روانگی ہے اور فی کس ۱۹ تومان علاوہ کرایہ اسباب کے دینے پڑیں گے۔ گاراژ محمدی والا زیادہ مانگتا تھا اس لیے اس کے ہاں سے موٹر نہیں کی اور پیش کرایہ جو اس کو دیا تھا ضبط ہو گیا! آغا غلام رضا

ہمارے جانے سے بہت دل گرفتہ ہیں۔ بہت کام کے اور محبت کے آدمی ہیں۔ ان سے زیدی کی علالت کے سلسلے میں بہت امداد ملی۔ ارادہ ہے کہ ان کی اس قدر امداد کردی جائے کہ وہ مع اپنے عیال کے مشہدِ مقدس واپس پہنچ جائیں۔

شام کو آغا علی احمد اور آغا گنجوی دونوں ملنے آئے اور تصویر کھنچوانے کے لیئے اپنے ہمراہ عکاس کے ہاں لے گئے۔ اس کے بعد حسبِ وعدہ آغائی بہجت مدیر موسسہ مجموعۂ معارف سے ملنے گیا۔ وہاں آغا مترجم نظام اور آغا حمزوی اور آغا آرام اور آغا مدنی رشتی اور چند اور صاحبان ملنے کے لیئے آئے ہوئے تھے۔ آغا بہجت نے اپنی کتاب تربیت کے تین نسخے ہم تینوں کے لیئے پیش کیئے اور تنقید و نکتہ چینی کی درخواست اور تاکید کی۔ آغا آرام نے مجموعۂ آرام کی جلد اوّل "علم ہیئت" کی ایک کاپی نذر کی اور طبع ہونے پر باقی جلدوں کو بھیجنے کی دھمکی دی۔ آغائی مدنی رشتی روز نامہ "پرورش" کے ایڈیٹر ہیں۔ آغا مترجم نظام کے عزیز ہیں۔ نوجوان آدمی ہیں اور خاصے کارکن، باخبر اور سنجیدہ آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ انھوں نے ایران کی موجودہ حالت کو بعض لحاظ سے سعدی کے لکھے ہوئے قصّے سے تشبیہ دی جو برجستہ تشبیہ ہے۔ قصّہ یہ ہے کہ ایک شخص کے پانچ سو روپے تھے اور وہ چاہتا تھا کہ وہ ان کو کسی منافع کے کام میں لگائے تاکہ آمدنی ہو۔ کوئی چھوٹا کام وہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ بڑے پیمانے پر کام کرے چنانچہ اس نے ایک عالی شان دوکان کرایہ کی۔ اس کو خوب آراستہ کیا۔ ایک دفتر کا کمرہ تیار کیا اور جب تجارت شروع کرنے کا خیال آیا تو معلوم ہوا کہ روپیہ ختم ہو کر سود چڑھ گیا ہے۔ بد انجام یہ ہوا کہ سب سامان وغیرہ نیلام کرنا پڑا۔

یہ سب لوگ بہت محبت اور تواضع سے ملے اور پہلے بھی اسی طرح ملے تھے۔ ان کی بہت خواہش ہے کہ ہندوستان اور ایران کے درمیان ایک رابطِ معارف قائم ہو اور ان کا خیال ہے کہ شاید ہم اس میں کچھ مدد کرسکیں۔ خواہش ہماری بھی ہے۔ لیکن اس کی تکمیل اور اس میں کامیابی معلوم نہیں کس حد تک ہوگی۔ اگرچہ ایران میں چنداں علمی شغف اور زور و شور نہیں لیکن پھر بھی اس قسم کے لوگوں کے گروہ موجود ہیں جو اپنی اپنی روشنی کے مطابق کچھ نہ کچھ کام کرتے رہتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں ہمارے ہاں خصوصاً علی گڑھ میں اتنا بھی نہیں

ہوتا۔ میں نے ان کی مہربانی اور احسانات سے کسی قدر سبکدوش ہونے کے لیے ایک چھوٹا سا مضمون رسالہ "معارف" کے لیے ان کی نذر کیا۔ اس میں ایران کی تعلیمی ترقی کے متعلق چند تجاویز پیش کی گئی ہیں۔ مثلاً یہ کہ ایک معقول دارالفنون کی تشکیل جو معارف کو واقعاً معارفِ ملی بنا دے۔ ایک مدرسۂ عالیہ ادبیات و علوم ایران جو تمام اسلامی دنیا کے طلبا کا مرکز ہو وغیرہ وغیرہ۔ اس مضمون کو جو انگریزی میں لکھا گیا ہے آغا مترجم نظام ترجمہ کریں گے۔ انھوں نے اس کا خلاصہ جو دوسرے لوگوں کو سنایا اس کو سب نے بظاہر پسند کیا۔ لیکن بغیر سنے اور سمجھے تعریف کرنا بھی ایرانی اخلاق میں داخل ہے۔

سفرِ عراق

۱۹۲۹

۲۵ اگست

آغا میرزا ہاشم اصفہانی سے ان کے مکان پر جاکر ملے اور خدا حافظی کی۔ آغا غلام رضا نے موٹر پر سوار کرایا۔ ان سے رخصت ہوتے ساڑھے گیارہ بجے کے قریب ہمارا موٹر چلا۔ اگر دس بجے کا وعدہ کرکے بارہ بجے تک یہاں کے شوفر چل سکیں تو اس کو بہت غنیمت سمجھنا چاہیے۔ آغا غلام رضا نے بطور "حکمتِ عملی" کے گاراژ والوں کو ہمارا پتہ قونصل خانۂ انگلیسی دیا تھا۔ اس سے وہ لوگ بہت مرعوب معلوم ہوتے تھے۔ خاصی دل چسپی رہی! ہم ہڈسن موٹر میں سفر کر رہے ہیں جس میں سات آدمیوں کی جگہ ہے۔ میں نے اور زیدی نے آگے کی سیٹ لی۔ پیچھے ایک طہران کے نوجوان تاجر ہیں جو ہمدان تعطیل منانے جارہے ہیں۔ انگریزی اور فرانسیسی جانتے ہیں اور خوش مزاج معلوم ہوتے ہیں۔ ایک بغداد کے استاد ہیں۔ جو ناصریہ کے مدرسہ متوسط میں انگریزی پڑھاتے ہیں۔ اور فرانسیسی اور جرمن بھی جانتے ہیں۔ فارسی ذرا مشکل سے بولتے ہیں۔ اس وقت اپنے کچھ عزیزوں سے مل کر کرمان شاہ جارہے ہیں اور کچھ روز کے بعد بغداد پہنچیں گے۔ وہاں ابھی تعطیلات ہیں۔ ایک اور ایرانی زائر ہیں جن کے ساتھ دو خواتین ہیں۔ ہمارا شوفر عرب ہے۔ اس کا نام گرجی شوعِ نور

ہے۔ مذہب معلوم نہیں۔ انگریزی، اُردو، فارسی، عربی خوب جانتا ہے۔ اپنے کام میں بہت ہوشیار ہے۔ ایرانی گاڑی چلانے والوں کی طرح آرام طلب اور عیش پسند نہیں۔ لیکن ان کی طرح خوش اخلاق اور دوسروں کے آرام کا خیال رکھنے والا بھی نہیں۔ یہ گاڑی اسی کی مِلک ہے۔ یہ یورپ اور ہندوستان میں جنگ کے زمانے میں رہ چکا ہے۔

ہم قزدین کے راستے بغداد جارہے ہیں۔ یہ راستہ بہت صاف اور "شستہ" ہے دھکّے بالکل نہیں لگتے۔ طہران سے رشت تک کی سڑک روسیوں نے بنائی تھی۔ قزدین اسی سڑک پر ہے۔ راستے میں جا بجا گاؤں اور قہوہ خانے ہیں۔ اور باغات بہت ملتے ہیں موٹروں کی آمد و رفت بھی بہت ہے لیکن ہمارا سفر اس قدر تیزی کے ساتھ طے ہو رہا ہے کہ راستے میں مقامات کو دیکھنا ممکن نہیں۔ شام کو چار بجے ہم قزدین پہنچے۔ شہر کی جیسی تعریف سنی تھی ایسا نہیں ہے۔ گرمی اور گرد بہت ہے۔ شاید وقت اور موسم کے سبب سے ہو۔ وہاں تھوڑی سی دیر ٹھیر کر روانہ ہو گئے۔ اور سرِ راہ ایک چھوٹے سے مہمان خانہ میں کھانا کھا کر (جو مقابلتہً گراں تھا) رات کو ساڑھے گیارہ بجے ہمدان پہنچے۔ جو آغا مترجم نظام کا وطن ہے۔ اس کے راستے میں بہت چڑھائی ہے۔ اور شہر بھی پہاڑ کے دامن میں واقع ہے۔ خود اس کی گلیوں وغیرہ میں کافی اُتار چڑھاؤ ہیں۔ گاراژ اطمینان سے متصل "ہوٹل موڈ" میں کمرہ ملا۔ کمرہ اور بستر صاف اور معقول تھے۔ لیکن ایک رات بلکہ آدھی رات کے لیے انھوں نے ہم دونوں سے ۸ قِران لیے۔ یہاں تربوز کھائے۔ جو غیر معمولی طور پر شیریں اور شاداب تھے۔

صبح کو مقبرہ حکیم بو علی سینا کی تلاش میں نکلے۔ بالکل قریب ہی ہے معلوم ہوتا ہے پہلے بالکل کس مپرسی کی حالت میں تھا۔ اب شاید بلدیہ نے توجہ کر کے ایک مختصر سی عمارت بنا دی ہے اور باغیچہ لگا دیا ہے۔ لیکن ایرانیوں کو خوبصورت عمارات بنانی نہیں آتیں۔ اور خصوصاً یہ مختصر تین چار کمروں کی عمارت جو انھوں نے اس مشہور عالم حکیم کے مقبرہ پر بنائی ہے نہ ایران کے شایانِ شان ہے نہ صاحبِ مقبرہ کے۔ اس میں صبح کے وقت قفل پڑا ہوا تھا۔ اس لیے مقبرہ کی اندر سے زیارت نہ کر سکے۔ ایک بہت خوش اخلاق ایرانی صاحب ہم کو مقبرہ میں لے گئے۔ اس کو کھلوانے کی کوشش کی لیکن کامیابی نہ ہوئی چوکیدار موجود نہ تھا۔ اس کے بعد انھوں نے

ہم کو آغا حاجی سیّد محمود صدیق الاشرف (والد مترجم نظام) کے مکان کا پتہ بتایا حاجی صاحب نوّے برس کے ضعیف اور بیمار آدمی ہیں لیکن حواسِ خمسہ ابھی قائم ہیں بلکہ ایک چھٹی حس، حسِ شکایت بھی کام کرتی ہے۔ بیٹوں کی شکایت کرتے تھے کہ روپیہ مانگتے ہیں۔ مجھ سے محبت نہیں۔ میری خبرگیری کے لیے کوئی موجود نہیں۔ ان سے ہمارا تعارف آغا مترجم نظام کی بہن نے کرایا تھا۔ اور وہ ان کا حال بھی پوچھتی رہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ خاندان میں کچھ باہمی ارتباط زیادہ نہیں ہے اور کچھ شاید مالی تنگی بھی ہے۔ آغا مترجم نظام نے بہرحال اپنے عقائد کی پختگی کو قائم رکھا اور ان کی راہ میں قربانی کی ہے۔ خدا ان کو جزا دے۔

۲۶/اگست

نو بجے صبح کے ہم لوگ ہمدان سے روانہ ہوتے اور اچھی خاصی سڑک پر تیسرے پہر تک سفر کرتے رہے۔ راستے میں شاہ آباد کے چھوٹے سے گاؤں میں سے گزرے۔ یہ گاؤں کہا جاتا ہے رضا شاہ نے بسایا ہے اور یہاں کی تمام زمینیں اس کی مِلک ہیں۔ یہاں پانی بہت کثرت سے ہے اور کاشت بہت ہے۔ میلوں تک کھیت پانی سے بھرے ہوئے تھے۔ درختوں وغیرہ کی وجہ سے بہت خوشگوار امن گاہ بن گئی تھی۔ شام کے قریب ہم ایک مقام سے گزرے جس کو "آبِ گرم" کہتے ہیں۔ یہاں سے ایک چھوٹے سے ٹیلے کے اوپر گرم پانی کے دو چشمے پھوٹتے ہیں۔ اوپر دو تالاب بنے ہوتے ہیں۔ اور ایک طرف پانی پتھروں کے اُوپر سے ہوکر گرتا ہے۔ جو غالباً گندھک کے اثر سے سفید ہو گئے ہیں اور ان پر خوشنما چینٹیں پڑ گئی ہیں۔

رات کو کرمان شاہ میں قیام کیا۔ یہاں گاراژ ضیاء کے قریب ایک مسافر خانہ میں ٹھیرے جس کے سب سے بہتر کمرے کا کرایہ انھوں نے ہم سے ۵ قران لیا۔ لیکن یہ کمرہ اتنا اچھا نہ تھا جیسا کہ ہمدان میں ہم کو ملا تھا۔ یہاں بھی ایک حصّہ شہر کا موجودہ مغربی طرز کا ہے اس کو دراصل شہر کا حصّہ نہیں کہنا چاہیے۔ بلکہ بازار کہنا چاہیئے۔ دونوں طرف بڑی بڑی دوکانیں، موٹروں اور پیدل چلنے والوں کے لئے علیحدہ علیحدہ راستے۔ اور بیچ میں کہیں

کہیں SQUARES جہاں چھوٹے چھوٹے چمن لگے ہوتے تھے۔ یہ شہر ہم کو اچھا معلوم ہوا۔ لیکن زیادہ نہیں دیکھ سکے کیونکہ صبح کو روانہ ہو گئے۔ کیونکہ ہمارے ساتھ کے ایک مسافر ہمدان میں اتر گئے تھے اور دوسرے (جو بغداد اور بصرہ کے درمیان ایک مقام نصیر میں انگریزی کے استاد ہیں) کرمان شاہ میں اترے۔ اس لیے شوفر نے کرمان شاہ میں صبح کو دس بجے تک قیام کیا اور ایک نئے مسافر کو ساتھ لے کر آگے سفر شروع کیا۔

عراق کے کچھ حالات ان صاحب سے معلوم ہوتے جو کرمان شاہ تک ہم سفر تھے۔ وہ کہتے تھے پہلے عراق میں ہندوستانیوں کی بہت کثرت تھی۔ نہ صرف تعلیم کے محکمے میں بلکہ تمام محکموں میں ہندوستانی بھرے ہوتے تھے۔ لیکن رفتہ رفتہ عراقیوں نے ان کی جگہ لے لی۔ (لہٰذا بقول شاعر "عراقی را چرا بدنام کردند؟!) انھوں نے انگریزی پڑھ کر انگریزی کے ہندوستانی اُستادوں کو مدرسوں سے نکال دیا۔ انھوں نے بتایا کہ اُستادوں کو عراق میں تنخواہیں بہت کافی ملتی ہیں۔ پرائمری اسکول کے مدرس کو نوّے روپے کی ابتدائی تنخواہ ملتی ہے اور دو سو روپے تک کا گریڈ ہے۔ سیکنڈری اسکولوں میں تنخواہ اور زیادہ ہے اور بقول ان کے نو سو روپے تک ترقی ہو سکتی ہے۔ یہ خود بغداد میں تعلیم پائے ہوئے ہیں۔ انگریزی اچھی جانتے ہیں۔ لیکن کسی دارُالمعلّمین میں تعلیم نہیں پائی۔ گزشتہ سال وزارتِ معارف نے ان کا معلّمی کا امتحان لے کر خود سند دے دی۔ اب چار سال کی ملازمت ہے اور ۱۷۰ روپے تنخواہ پاتے ہیں۔ ان سے یہ معلوم کر کے تعجّب ہوا کہ عراق میں ہندوستانی سکّہ جاری ہے۔

میں نے ان سے دریافت کیا کہ عراق میں انگریز بہت سے ملازم ہیں یا نہیں انھوں نے بتایا کہ تعداد زیادہ نہیں ہے۔ لیکن ہر بڑے عراقی افسر کے ساتھ ایک یا دو انگریزی "مشیر" ہیں جو بہت بیش قرار تنخواہیں پاتے ہیں۔ اوّل تو خود ہائی کمشنر ہے جس کی آدھی تنخواہ (کئی لاکھ روپے سالانہ) عراق کو دینی پڑتی ہے۔ پھر مختلف وزیروں اور سیکریٹریوں کے مشیر اور نائب مشیر ہیں جن میں سے ہر ایک کو ڈھائی ہزار سے ایک ہزار روپیہ ماہوار تک تنخواہ ملتی ہے۔ ان لوگوں نے ایسا انتظام کیا ہے کہ نہ صرف ایک معقول تعداد انگریزی افسروں کی بیش قرار تنخواہیں عراق سے پاتی ہے بلکہ دراصل پالیسی اور انتظامی امور پر قابو انگریزوں ہی کا ہے۔ اگرچہ

بظاہر کام عراقی حکام کے ہاتھوں انجام پاتا ہے۔ سیاست کی کامیابی اسی کا نام ہے۔ عراق میں عام طور پر تنخواہیں بہت زیادہ ہیں۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ اس غریب ملک کے غریب لوگوں اور کاشتکاروں پر بہت سختی اور ظلم ہے۔

۲۷/اگست

دوپہر کو قصرِ شیریں کے ایک مسافر خانے میں کھانا کھایا۔ راستے میں گرمی نہایت سخت تھی۔ اور چوں کہ ہم آگے بیٹھے ہوئے تھے اس لیے دھوپ اور موٹر کے انجن کی تپش اس پر مستزاد تھی۔ آج کے راستے میں پہاڑی اتار اور چڑھاؤ بہت ہیں اور بعض جگہ راستہ واقعاً بہت مخدوش معلوم ہوتا ہے۔ معمولی موٹر ایسی زبردست چڑھائیوں پر نہ چڑھ سکتی ہے نہ ان پر سے اتر سکتی ہے۔ شملہ اور نینی تال کی چڑھائیوں میں جہاں تک مجھ کو معلوم ہے ایسے مقام نہیں آتے۔

قصرِ شیریں سے تین گھنٹے کے سفر کے بعد عراق اور ایران کی سرحد پر پہنچے۔ یہاں سڑک کے بیچ میں ایک لوہے کا جنگلہ سا لگا ہوا تھا۔ اس کے دونوں طرف موٹریں کھڑی ہوئی تھیں اور پاسپورٹ، جوازِ مسافرت اور سامان وغیرہ کا معائنہ ہو رہا تھا۔ یہاں گھنٹہ بھر دھوپ کی سخت گرمی میں کھڑے رہے۔ لیکن گر۔جی کے اثر اور واقفیت کی وجہ سے سامان کے معائنے سے بچ گئے۔ ایران میں پاسپورٹ اور جواز کے معائنہ کرنے کا خبط ہو گیا ہے۔ تمام ملک کے راستوں کو نظمیہ نے اس طرح محصور کر لیا ہے کہ ہر روز چھ سات جگہ جوازِ راہ اور تذکرہ (پاسپورٹ) دکھانا پڑتا تھا۔ اور آج چوں کہ سرحد کو عبور کرنا تھا اس لیے قدم قدم پر بار بار اس مہمل کارروائی کی وجہ سے وقت ضائع ہوتا تھا۔ اس مناسب احتیاط میں مبالغہ کر کے انھوں نے اس کو تکلیف دہ بنا دیا ہے۔

ایرانی سرحد سے تھوڑی سی دور عراقی دفتر ہے۔ اس مقام کا نام (اگرچہ وہاں کوئی گاؤں وغیرہ ہم نے نہیں دیکھا) "کاچل کاچل" ہے۔ یہاں بھی ہم کو شوفر کی بدولت سامان کھولنے باندھنے اور معائنہ کرانے کی کوفت سے نجات مل گئی لیکن ایک گھنٹہ سے زیادہ پاسپورٹ

کے معائنے کی کارروائی میں گزر گیا افسر سب عراقی تھے انگریزی لباس، کھلا ہوا رنگ، نوجوان اور خاصے خلیق لیکن ان کی آپس میں عربی گفتگو فارسی کے مقابلے میں بہت کرخت معلوم ہوتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے گویا آپس میں لڑ رہے ہیں۔ یہاں انگریزی سب سمجھتے ہیں اور انگریزی ATMO-SPHERE شروع ہوجاتا ہے۔ جابجا نوٹس انگریزی زبان میں لگے ہوتے ہیں اور کہیں کہیں اردو بھی لکھی ہے سڑک "کاچل کاچل" سے خانقین تک پکی اسفالٹ کی ہے جو غالباً انگریزی "اقتدار" کا فیض ہے۔ خانقین میں ایک "ادارہ صحیہ" میں گئے جہاں ہم سے بوجہ زائرین ہونے کے عہ/فی کس ٹیکس لیا گیا اور کہا گیا کہ چیچک کے ٹیکے لگواؤ یا ٹیکے پہلے لگوائے ہوں تو سند پیش کرو۔ ہم نے کہا خوب! ٹیکے تو ہم لگوا تیں گے نہیں اور سند ہمارے ملک میں دی نہیں جاتی۔ کر لو کیا کرتے ہو۔ ہمارے ساتھ ایک ایرانی مسافر مع دو خواتین کے تھے وہ بے چارے ایران سے ٹیکے لگوا کر چلے تھے اور سند ان کے پاس تھی۔ خیر وہ ہم کو افسرِ اعلا کے پاس لے گیا اس نے ٹیکوں پر اصرار نہیں کیا اور ہم وہاں سے محفوظ و مامون آگے روانہ ہوئے۔

ہم کو جلدی تھی کہ غروب کے وقت تک خانقین اور بغداد کے درمیان کے مقام "باقوبہ" میں پہنچ جائیں کیوں کہ یہاں یہ قاعدہ ہے کہ بعد غروب موٹروں کو سفر کرنے نہیں دیتے۔ راستے میں جابجا تھوڑے تھوڑے فاصلے پر پہاڑیوں کی چوٹیوں پر پولیس کی چوکیاں ہیں اور جس چوکی پر شام ہوجاتی ہے موٹر کو وہیں روک لیتے ہیں۔ راستے میں ہم کو بعض جگہ پولیس کے سپاہیوں نے دور سے سگنل کیے۔ لیکن شوفر نے اپنی ادھر کی آنکھ بند کر لی اور تیزی کے ساتھ موٹر کو چلا کر لے گیا۔ ایک جگہ جہاں پولیس نے روکا اس نے ان کو یہ اطلاع دی (جو واقعہ تھا) کہ والی باقوبہ اور انسپکٹر پولیس اپنی موٹروں میں پیچھے آرہے ہیں ان کی پذیرائی کا انتظام کرو اور اس طریقے سے ان کی توجہ دوسری طرف منعطف کر کے نکل گیا۔ سڑک کہیں کہیں نئی بنی ہے اور بہت اچھی ہے اور کہیں پرانی ہے اور خراب ہے لیکن بہت زیادہ خراب نہیں۔ پولیس کی اس قدر روک تھام اس لیے ہے کہ یہاں چند سال پہلے ڈاکے بہت پڑتے تھے اور راستے غیر محفوظ تھے لیکن اب امن ہے۔ ہر چوکی پر چار مسلح اور پولیس کے آدمی مع گھوڑوں کے رہتے ہیں اور جب ضرورت ہوتی

سے تمام چوکیوں کو اطلاع دے کر ڈاکوؤں کا پیچھا کر سکتے ہیں۔ ہم مغرب کے بعد باقوبہ پہنچ گئے۔

قیامِ سری نگر

۱۹۴۲

۱۸ ستمبر

زندگی کا بیشتر حصّہ گزر چکا۔ اب مقابلۃً کم مدت باقی ہے۔ میرا عرصے سے خیال ہے کہ ایک مختصر سی ڈائری لکھا کروں جس میں ہر ہفتے کی دل چسپ یا قابلِ ذکر باتیں آجائیں۔ لیکن اب تک مصروفیت (یا سستی) نے اس ارادے کو پورا نہیں ہونے دیا۔ اب ایک دفعہ اس کی کوشش پھر کر دیکھتا ہوں۔ اس قسم کی ڈائری انسان خود بھی بعد میں دل چسپی کے ساتھ پڑھتا ہے اور بعض اوقات دوسرے لوگوں کو بھی اس میں دل چسپی ہوتی ہے۔ معلوم نہیں کیوں ؟ منادی میں حسن نظامی کا روزنامہ چھپتا ہے اور ہزاروں لوگ (خواہ وہ ان سے ذاتی طور پر بدظن ہوں) اسے شوق سے پڑھتے ہیں۔ تہذیب میں حجاب امتیاز اپنی ذہنی اور جسمانی بیماریوں کی رنگ آمیز داستان "لیل و نہار" کے عنوان سے لکھ رہی ہیں۔ لوگ اس پر خوش مزاجی کے ساتھ ہنستے ہیں لیکن ہر ہفتہ اس کا انتظار کرتے ہیں۔ وہ اپنی "ارتعاشِ نظری" کو سرمایۂ ادب بتاتی ہیں اور لوگ اس سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ لیکن اس ذکر سے میرا یہ مقصد نہیں کہ ہر روزنامہ لکھنے والے کا ایسا ہی عبرتناک حشر ہوتا ہے! یہ تو محض لکھنے کے لیے ایک عذر ہے۔ میرا یہ ارادہ نہیں کہ بالالتزام روزانہ ہی لکھوں بلکہ ہر ہفتے کو ایک اکائی مان کر جب کبھی کوئی بات قابلِ ذکر ہو اس

کو درج کر لیا کروں۔

اس ہفتے یہاں اردو کمیٹی کا آخری اجلاس ہوا۔ یہ کمیٹی دو ہفتے کے قریب جولائی میں ہوتی رہی تھی اور اب تین ہفتے تک اس کا اجلاس رہا۔ کام یہ تھا کہ پانچویں جماعت تک کے لیے سادہ اردو کے الفاظ کی ایک ایسی فہرست تیار کی جائے جو نصاب کی کتابیں لکھنے کے لیے کافی ہو۔ اس میں حکومت نے اتفاق یا مصلحت یا نیک نیتی سے مختلف خیال کے لوگ جمع کر دیے تھے اور مسودہ تیار کرنے کا کام ایک ایسے بزرگ (رگھو ویرا نامی) کو دیا گیا تھا جن کی صفات اس کام کے لیے صرف دو تھیں۔ سنسکرت کا علم اور اس کے احیاء کا شوق اور مسلمانوں سے اور ان کی تہذیب کی تمام یادگاروں سے ایک درجہ تعصب! شروع شروع میں بہت بحث و مباحثہ رہا۔ لیکن کمیٹی کے صدر مرزا جعفر علی خاں صاحب نے اس کو بحیثیت مجموعی اچھی طرح سنبھالا۔ ایک فریق یہ چاہتا تھا کہ اس کمیٹی کے قیام سے فائدہ اٹھا کر "سادہ اُردو" کے بہانے سے ریاست میں سنسکرت آمیز ہندی کو رائج کر دے جو نہ اس ریاست میں کسی جماعت کی زبان ہے نہ (بغیر زورِ شمشیر کے!) کسی جماعت کی زبان ہو سکتی ہے۔ ڈاکٹر رگھو ویرا نے اس عجیب اصول پر اپنی فہرست تیار کی تھی کہ ایسے الفاظ جمع کیے جائیں جو ہندوستان کی زیادہ سے زیادہ زبانوں میں مشترک ہوں جس کا عجیب و غریب نتیجہ یہ نکلا کہ بجائے مانوس الفاظ کے غیر مانوس الفاظ چھانٹے جائیں! بریں عقل و دانش بباید گریخت' یا شاید تعصب اور کسی خاص چیز کے شوق میں انسان کی عقل اندھی ہو جاتی ہے۔ مگر مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ مسلمان ممبروں نے عام فہم اور سلیس ہندی الفاظ خندہ پیشانی کے ساتھ قبول کیے اور اخیر میں جو فہرست مرتب ہوئی ہے اس میں ہندی کے بکثرت ایسے الفاظ شامل ہیں جو کسی نہ کسی شکل میں اردو میں راہ پا گئے ہیں اور غیر مانوس عربی فارسی کے بہت سے الفاظ حذف کر دیے گئے ہیں۔ اس کام میں کمیٹی کو صدر کے وسیع ذخیرۂ الفاظ سے بہت مدد ملی اگرچہ ان کی خاطر بعض ایسے الفاظ داخل کرنے پڑے جن کی ضرورت نہ تھی کیوں کہ وہ اودھ میں یا بعض خاص جگہوں میں محض مقامی طور پر استعمال ہوتے ہیں یا اس خاص مقصد کے لیے وہ غیر ضروری ہیں۔ اُردو کی جیت اسی میں ہے کہ وہ الفاظ کے معاملے میں رواداری سے کام لے اور اپنا وسیع دامن اور زیادہ پھیلا ئے۔

البتہ زبان میں نئے الفاظ کے داخل ہونے کے جو اصول ہیں انھیں نظرانداز کر کے کوئی کمیٹی جبراً زبان میں غیر مانوس اور کام میں نہ آنے والے لفظ داخل نہیں کر سکتی۔ اب یہ فہرست حکومت کے سامنے پیش ہوگی۔ دیکھیے سیاسی مصلحتیں اس کا کیا فیصلہ کراتی ہیں۔ ایک فریق کی جانب سے بعض ریشہ دوانیاں شروع ہو گئی ہیں!

ابھی دو تین روز ہوئے علی گڑھ کے اخباروں اور خطوں سے معلوم ہوا کہ وہاں ڈاکٹر ضیاء الدین کی ایک پارٹی نے، جس کے سرکردہ حاجی عبدالرّب صاحب ہیں، زبردستی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن پر قبضہ کرنے کی کوشش کی ہے اور اس کے لیے ایسے ذرائع اختیار کیے ہیں جن میں فاشیت کی بو آتی ہے۔ زبردستی اور بدمزاقی کے ساتھ ایک صاحب کی تجویز پر اپنے آدمی کو صدر بنانا، اس سے خلاف ضابطہ رولنگ دلانا، موجودہ اور غیر موجودہ ممبرانِ کمیٹی پر عدمِ اعتماد کا ووٹ پاس کرنا یہ تمام حرکتیں شرفا کے شایانِ شان نہیں ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ آج کل سیاسی دنیا جن اصولوں پر چل رہی ہے اور جس طرح انصاف اور عقل دونوں کا خون کیا جا رہا ہے اس کے مقابلے میں یہ تو محض ایک تفریحی چھیڑ چھاڑ ہے۔ لیکن مجھ جیسے آدمیوں کو باوجود دنیا کا رنگ دیکھنے کے یہ امید رہتی ہے (شاید دنیا داری کی عقل کا تقاضہ یہ ہے کہ ایسی امید نہ رکھی جائے!) کہ ایک تعلیمی درسگاہ اور علمی ماحول میں اگر سیاست اور کاروبار کی بے راہ روی اور دھاندلی نہ آنے پائے تو مناسب ہے۔ لیکن انسان کو قوّت حاصل کرنے کی ایسی بے پناہ خواہش بلکہ جنون ہے کہ اس کوشش میں حق و باطل، روا اور ناروا کا امتیاز باقی ہی نہیں رہتا۔

صاحب نظراں نشۂ قوّت ہے خطرناک! کیوں کہ

اس سیلِ سبک سیر و زمیں گیر کے آگے علم و ہنر و عقل و خرد ہیں خس و خاشاک!

افسوس ہے کہ میں یہاں ہوں اور (تقاضائے مصلحت کے خلاف) اس "جنگ" میں حصّہ نہیں لے سکتا۔ علی گڑھ میں لوگوں کی حالت اس قدر خوف کی ہو گئی ہے اور یونی ورسٹی پر ایک گروہ نے ایسی بُری طرح قبضہ کر لیا ہے کہ لوگ جرأت کے ساتھ اپنے خیال کا اظہار نہیں کر سکتے اور جو جماعت برسرِ اقتدار ہے اس کے خلاف آوازِ اختلاف بلند نہیں کر سکتے۔ ہماری ضرورتیں اور مجبوریاں اور چھوٹے چھوٹے فائدے ہمیں کس درجہ بزدل اور حق ناشناس

بنا دیتے ہیں!

اس ہفتے چرچل کی ہندوستان پر تقریر ہوئی ہے۔ کس قدر تعصّب، تنگ نظری اور زہر سے بھری ہوئی! تعجب ہے کہ انگریزوں جیسی اقلیم آفریں قوم میں عقل اور موقع شناسی کا اس قدر فقدان ہو جائے اور وہ ایسی حرکتوں پر اُتر آئیں جو صریحاً ان کے اپنے مفاد کے خلاف ہیں۔ کیا وہ یقیناً یہ سمجھتے ہیں کہ ہندوستانیوں کو اس قسم کی ذلیل دھمکیاں دے کر اور واقعات کو جھٹلا کر وہ ان کے دل میں اپنی محبت یا سیاسی تعلقات قائم رکھنے کی خواہش پیدا کر سکتے ہیں۔ کانگرس تو اب ویرانے میں ہے لیکن مسلم لیگ جس کے لیے شاید ملک کی قیادت حاصل کرنے کا ایک نادر موقع آیا تھا جناح صاحب کے ہاتھوں ایک مضحک چیز بنی ہوئی ہے۔ نہ وہ خود کچھ کرتے ہیں نہ چاہتے ہیں کہ کوئی دوسرا کچھ کرے۔ ہر بات کی ممانعت ہے، ہر شخص اور ہر جماعت کو ڈانٹتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اسی لفظی ڈانٹ ڈپٹ سے کام چل جائے گا۔ دنیا کے اور ملک کے جو اصول اور بنیادی مسائل ہیں ان کو غالباً وہ نہیں سمجھتے۔ اقتصادی مسائل سے نہ ان کو دلچسپی ہے نہ واقفیت۔ اسی لیے بعض اوقات جو بیان وہ اخباروں میں شائع کراتے ہیں یا اخباروں کے نمائندوں کو دیتے ہیں انھیں پڑھ کر سر شرم سے جھک جاتا ہے۔ بے شک انھوں نے مسلمانوں میں ایک خاص قسم کا احساس پیدا کیا لیکن اس سے کوئی مفید کام نہ لیا، ان کے سامنے کوئی بلند نصب العین نہیں رکھا۔ ان کے جوش سے کوئی نمایاں قومی یا ملی خدمت انجام دینے میں مدد نہ لی۔ ایسی قیادت کس کام کی؟ لیکن ایک اور مشکل یہ ہے کہ اس قسم کے لیگ کانگرس کے جھگڑوں اور انگریزوں کی حکمتِ عملی کی وجہ سے فضا ایسی پیدا ہو گئی ہے کہ جو لیڈر دوسروں کو گالی نہیں دیتا وہ اپنی خاص جماعت میں اثر پیدا نہیں کر سکتا!

مجھے معلوم ہوا ہے کہ حکومت کے سامنے یہ تجویز ہے کہ محکمۂ تعلیم اور بعض دوسرے محکموں کو مستقل طور پر جموں میں رکھا جائے اور صدر محکمہ کو صرف تین ماہ کے لیے کشمیر آنے کی اجازت ہو۔ یہ تجویز ہر لحاظ سے مہمل ہے۔ میں نے پرائم منسٹر سے اس بارے میں گفتگو کی اور انھیں خط بھی لکھا ہے کہ اگر تعلیم کے محکمے کا کام فائل بازی ہے تو اس تجویز میں کوئی نقصان نہیں۔ لیکن اگر تعلیم کے لیے ذاتی اثر اور شخصیت سے کام لینے کی ضرورت ہے تو دونوں صوبوں

ہیں برابر وقت صرف کرنا ضروری ہے۔ وہ آدمی معقول ہے اس لیے امید بندھتی ہے کہ شاید اس غیر معقول تجویز پر عمل نہ ہو۔

آج میں اور عابد صاحب پرجا سبھا کا اجلاس دیکھنے گئے تھے۔ انفساخ نکاح کا ایک بل زیر غور تھا۔ اس بارے میں بعض سنی اور شیعہ ممبرانِ سبھا کی ایک مشورتی کیٹی بنی تھی جس نے مجھے بھی مشورے کے لیے بُلایا تھا اور میں نے کوشش کی تھی کہ بل کی دفعات میں مناسب ترمیم کر کے اسے سنی اور شیعہ دونوں کے لیے پاس کرایا جائے۔ چناں چہ اس بارے میں سمجھوتا ہو بھی گیا۔ لیکن مولوی جواد صاحب جو یہاں کے "شیعہ میرواعظ" ہیں باوجود تقریباً ہر معاملے میں راضی ہو جانے کے پرجا سبھا میں اس کی مخالفت کرتے رہے۔ مخالفت کا تو زیادہ افسوس نہیں کیوں کہ ہر شخص کو اپنی رائے کا اور اس کے اظہار کا اختیار ہے لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ ان کی تقریر اور بیان نہایت مبہم اور گنجلک تھا جس کا حاضرین پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ جو لوگ مذہب کی خدمت کا دعویٰ کریں انھیں اپنے کاموں میں زیادہ عقل اور محنت کو دخل دینا چاہیے ورنہ مذہب کی تضحیک ہوگی۔

آج اتوار کا دن ہے اور ۲۰ ستمبر ہے۔ صبح کا سارا وقت لوگوں سے ملنے ملانے اور اس کے بعد سستی اور آرام میں گزر گیا۔ اس لیے طبیعت کو انبساط نصیب نہیں ہوا۔ میری طبیعت کی افتاد ایسی ہے کہ اگر کسی دن کوئی خاص کام نہ کیا جائے تو ایک قسم کا بار سا رہتا ہے کہ آج کا دن بالکل ضائع گیا! لیکن اس قسم کے نہ معلوم کتنے دن زندگی بھر میں ضائع ہوئے ہیں اور ہوں گے!۔ تیسرے پہر کو میں نے انیسویں صدی کے ایک نہایت زبردست لیکن شاید ہندوستان میں اَن جانے پولش ادیب اور ڈراما نویس KERENSKY کے ڈرامے THE UNDIVINE COMEDY کا غیر مطبوعہ ترجمہ پڑھا جو اثر نے کیا ہے۔ کس قدر جوش اور تخیل سے لبریز چیز ہے! انسانی روح کی کش مکش، غلط آئیڈیل کی تلاش میں سرگردانی کے نتائج، جماعتی کش مکش اور انقلاب، امرا اور جمہوری گروہوں کی جنگ اور مخالفت، اور دونوں کی زیاں کاریاں اور خود فریبیاں اس قدر باریکی اور قوت کے ساتھ دکھائی ہیں کہ بے اختیار داد دینی پڑتی ہے اور دل پر اثر ہوتا ہے۔ ترجمہ بھی نہایت زور دار اور "پُرشوکت" ہے

اگرچہ کہیں کہیں اختر صاحب نے حسب معمول ذرا نامانوس الفاظ کا استعمال کیا ہے۔ بعض اوقات کسی چیز کی فراوانی بھی ایک ابتلا ہو جاتی ہے!۔

رات کے وقت اخبار مارٹنڈ کے ایڈیٹر مجھ سے "خفیہ طور پر" ملنے آئے۔ یہ وہ اخبار ہے جو سال بھر سے میرے خلاف ایک "محاربۂ عظیم" کرتا رہا ہے۔ یہ اخبار کشمیری پنڈتوں کی ایک جماعت نکالتی ہے اور اخبار کیا ہے تنگِ صحافت ہے۔ نہ صرف ہر معاملے میں انتہائی تعصب کی پالیسی اختیار کی جاتی ہے بلکہ ذاتی معاملات کو جماعتی معاملات پر، اور جماعتی معاملات کو قومی معاملات پر بالالتزام ترجیح دی جاتی ہے۔ اس اخبار اور اس کے تائید کرنے والوں کو یہ بات گوارا نہیں کہ حکومت کا کوئی افسر مسلمانوں کے ساتھ (بلکہ جمّوں کے ہندوؤں کے ساتھ بھی!!) انصاف کا سلوک کرے! بہت سے افسروں کو BLACKMAIL کرکے یا دھمکیاں دے کر اپنا کام نکالتا رہا ہے لیکن میں نے کبھی اس قسم کی چیزوں کی پروا نہیں کی اور الحمد اللہ کہ اس کے تیر سچائی کی ڈھال پر کارگر نہیں ہوئے! اب چوں کہ ان کے اس غلط اور لچر پروپیگنڈے کی وجہ سے حکومت نے اس اخبار کو "سیاہ فہرست" میں ڈال دیا ہے اس لیے انھیں فکر ہوئی کہ کسی طرح مصالحت ہو جائے۔ میں نے انھیں صاف صاف بتا دیا کہ میرا اصول یہ ہے کہ انتظامی معاملات میں اپنی عقل اور انصاف کی رو سے فیصلہ کرتا ہوں اور کسی بیرونی جماعت یا شخص کو اس میں مداخلت کی اجازت نہیں دے سکتا۔ میں نے اڈیٹر کو یہ بھی بتایا کہ ان کی یہ تنگ نظری اور شخصی پالیسی، جو سراسر ایک گروہ کی خود غرضی پر مبنی ہے، نہ صرف ریاست کے لیے بلکہ خود ان کی جماعت کے لیے (جو ایک تعلیم یافتہ جماعت ہے) بہت مضر ہے۔ ان کے سامنے محض اشخاص کا، اور وہ بھی اکثر نا اہل، بد دیانت اور نالائق لوگوں کا مفاد رہتا ہے اور میرے سامنے محکمۂ تعلیم اور اہلِ کشمیر اور ان کے تعلیمی مستقبل کا مفاد ہے۔ وہ بغیر سوچے سمجھے، بغیر تمام باتوں کو جانے ہوئے، اندھے پن سے اعتراض کرتے ہیں لیکن میں ان اعتراضوں اور دھمکیوں میں آکر انصاف اور محکمے کی کامیابی کا خون نہیں کر سکتا۔ شاید انھوں نے کبھی اس طرح کی صاف گوئی کی باتیں نہ سنی تھیں اس لیے میرا خیال ہے کہ وہ نادم اور خفیف ہوا لیکن یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کیوں کہ لوگ کہتے ہیں کہ ان لوگوں کے دل اور زبان اور چہرے کی کیفیتیں کبھی

ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہوتیں!۔

۲۱/تا ۲۸/ستمبر

آج (۲۳/ستمبر) ایک صاحب مجھ سے ملنے دفتر میں تشریف لائے۔ حکومتِ ہند میں افسر رہے، ایک ریاست میں وزیر رہے۔ خان بہادر ہیں۔ دیکھنے میں مردِ معقول معلوم ہوتے ہیں۔ بڑی سی سیاہ داڑھی ہے جو (بقول قائم گنج کے ایک پٹھان کے!) دل کی سیاہی سے سیاہ نہیں بلکہ خضاب کی وجہ سے سیاہ ہے۔ انھوں نے کچھ عرصہ ہوا کراچی میں ایک لکچر دیا تھا جس میں بتایا تھا کہ جنگ میں کامیابی کے لیے ہندو مسلم اتحاد ضروری ہے اور اپنی وفاداری کا ثبوت دینے کے لیے انگریزی قوم اور انگریزی حکومت کی اس درجہ تعریف کی تھی کہ ہر انصاف پسند انگریز کو اس کو پڑھ کر خجالت ہونی چاہیے! خیر، کچھ روز ہوئے یہ اپنا لکچر مجھے دے گئے تھے میں نے شکریہ کے ساتھ اسے قبول کیا۔ آج وہ ان ایڈرسوں کی کاپیاں پڑھنے کے لیے دے گئے جو ان کو ریاست سے مستعفی ہونے پر دیے گئے تھے (بھلا کیوں؟) خیر یہاں تک بھی خیریت تھی لیکن وہ از راہِ عنایت ان تمام خطوں کی ٹائپ شدہ نقل بھی لے کر آئے تھے جو انھیں اس لکچر کی شان میں وصول ہوتے تھے۔ کیا یہ کہ تمام بڑے بڑے انگریز افسروں، گورنروں، انگلستان کے تنگ خیال اور قدامت پسند، ہندوستان سے تعلق لیکن ہندوستان کی آزادی سے بیزاری رکھنے والے انگریزوں کو لکچر کی نقلیں بھیجیں (ان نامور حضرات میں سر مائیکل اوڈوائر کی مساۃ بھی شامل تھیں!) انھوں نے لکچر میں اپنی تعریفیں پڑھیں اور وہ بہت خوش ہوئے اور "اخلاق" کا تقاضہ یہ تھا کہ وہ "انتقاماً" لکچر کی رسید کے ساتھ ہندوستانیوں کی تو نہیں لیکن اس جاں نثار ہندوستانی کی تعریف کریں اور یہ کہیں کہ اگر سب ہندوستانی ایسے بلند خیال اور شریف ہوتے تو یہاں کوئی سیاسی جھگڑے ہی نہ پیدا ہوتے اور ہندوستان میں ہر قسم کا سیاسی امن و امان رہتا...... اور یہ حضرت ان خطوں سے بہت متاثر اور مرعوب تھے اور اب لکچر کے ساتھ ان کو چھپوائیں گے اور اہلِ نظر اور اہلِ مذاق کے لیے بیک وقت افسوس اور تفریح کا سامان مہیا کریں گے! انا للہ و انا الیہ راجعون۔ شے لطیف کی کمی اور اپنی ذات کے متعلق حُسنِ ظن انسان

کو کہاں سے کہاں لے جاتا ہے! یوں وہ ایک فرض شناس، قابل اور غالباً ذاتی طور پر شریف افسر رہے ہیں لیکن سیاسی نظر سے مطلقاً "آزاد" اور تنقیدِ نفس سے بے نیاز ہیں۔ کیا انگریز ایسے ہی لوگوں کو پسند کرتے ہیں اور انھیں کی قدر کرتے ہیں؟۔

۲۶/ستمبر۔ آج میں نے CRONIN کا ایک ڈراما JUPITER LAUGHS پڑھا۔ مجھے اس کے ناول ہمیشہ بہت زور دار اور دل چسپ معلوم ہوتے ہیں۔ یہ ایک ڈاکٹر تھا جس کو انگلستان کی میڈیکل کونسل نے بعض "خلافِ ضابطہ" حرکات کی بنا پر ڈاکٹری کے پیشے سے خارج کردیا تھا۔ اس نے "انتقاماً" ناول نگاری شروع کردی۔ اس کا عام ڈاکٹروں کے خلاف یہ عقیدہ ہے کہ ڈاکٹر کے لیے بنے ہوئے قاعدوں کی رسمی پابندی کے بجائے جرأت، تجرباتی نقطۂ نظر اور انسانیت کی ضرورت ہے اور اگر انسانوں کی خدمت میں ان قاعدوں کی خلاف ورزی کرنی پڑے تو اسے اس کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ چناں چہ اس کی بیشتر کتابوں میں ہیرو کوئی ڈاکٹر ہی ہوتا ہے۔ یہ ڈراما بھی ایک ڈاکٹر کے متعلق ہے جو بظاہر بدمزاج، سنکی، سخت دل اور انسانوں کی طرف سے بے پرواہ ہے اور سوائے اپنے علمی تجربوں کے اور کسی چیز سے دل چسپی نہیں رکھتا۔ "کامیاب" اور "ہر دل عزیز" ڈاکٹروں میں جس قدر صفات ہیں ان سے بالکل معرا ہے۔ جنسی زندگی میں زیادہ احتیاط کا قائل نہیں۔ اس اسپتال میں جس قدر ڈاکٹر ہیں، مع چیف ڈاکٹر کے، وہ سب اس کے خلاف اور متنفر ہیں سوائے ایک بوڑھے ڈاکٹر کے (لیکن وہ بھی اپنی ہمدردی اور محبت کا اظہار بہت رکھائی کے ساتھ کرتا ہے، انگریزوں کی مخصوص ادا!) اور ایک نیک، خوبصورت اور شریف اور نوجوان لیڈی ڈاکٹر کے جو عارضی طور پر وہاں آئی ہے اور در اصل مشن ڈاکٹرنی بن کر چین جانا چاہتی ہے۔ ان دونوں میں محبت ہو جاتی ہے لیکن ایک کو علم کی تلاش اور دوسری کو خدا کا عشق اس درجہ لاحق ہے کہ ابتدا ہی سے اس محبت میں مشکلات اور خرابی کے آثار نظر آتے ہیں۔ خیر، یہاں قصّے کا اعادہ تو مقصود نہیں لیکن مصنف نے نہایت خوبی کے ساتھ یہ بات دکھائی ہے کہ پہلے تو تمام ڈاکٹر وغیرہ اس کے خلاف ہو جاتے ہیں، چیف ڈاکٹر کی بیوی (جو نئی ڈاکٹرنی کے آنے سے پہلے اس سے محبت کرتی تھی) لبریٹری کو جلانے کی کوشش کرتی ہے اور آگ بجھانے کی کوشش میں ڈاکٹر کی محبوبہ اپنی جان دے دیتی ہے لیکن اس کے تجربے کے تمام مسودوں کو بچا لیتی ہے، ادھر ایک

مریض جس کا یہ ایک نئے طریقے اور نئی دوا کے ذریعے علاج کر رہا تھا جاں بر نہیں ہوتا۔ تمام لوگ اس کے مخالف ہو کر اس پر مقدمہ چلانے اور اس کی زندگی تباہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن جس وقت ان کے تمام حربے اس کو تباہ کرنے کے لیے تیار ہوتے ہیں اس کا مقالہ شائع ہو کر ڈاکٹروں کی دنیا میں ہلچل پیدا کر دیتا ہے اور یہی تمام لوگ اس کی جوتیاں چاٹنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ بڑے بڑے دوا ساز اس کو ہزاروں پونڈ کی نوکریاں پیش کرتے ہیں لیکن وہ ان تمام چیزوں کو ٹھکرا کر، اپنا پرانا ٹرنک اور پرانی برساتی لے کر چین روانہ ہو جاتا ہے کہ وہاں جا کر لوگوں کی خدمت کرے گا اور اپنی دوا آزمائے گا اور اس طرح اس کی محبوبہ کی مرنے کے بعد جیت ہوتی ہے کیوں کہ اُس کی زندگی میں اس نے ہمیشہ اس کی خدمت اور ہمدردی اور انسانیت کے IDEALS کی ہنسی اُڑائی تھی۔ لیکن وہ جان دے کر اپنے اصولوں کی صداقت ثابت کر دکھاتی ہے۔

۲۷ ستمبر۔ آج میں سر کیلاش نرائن ہکسر سے ملا تھا۔ یہاں کے اصول اور عمل کے خلاف بالکل یونہی! (یعنی بغیر کسی مقصد کے!) وہ اپنے والد اور چچا کا کچھ کلام سناتے رہے۔ ان کے والد کی چند مناجاتیں سُن کر یہ اندازہ ہوا کہ اب سے پچاس سال پہلے ہندوؤں اور مسلمانوں کے خیالات اور ان کی تہذیب میں کس درجے نزدیکی پیدا ہو چلی تھی اور ایک مشترک زبان اور تمدن کیسی عمدگی کے ساتھ پیدا ہو رہا تھا۔ مناجات میں بالکل اسی طرح خدا کو مخاطب کیا گیا ہے اور اس کی صفات (غفار و رحیم وغیرہ) کو بیان کیا گیا ہے جس طرح کوئی صوفی منش مسلمان کر سکتا ہے۔ اور اس طرح مسلمان شعرا اور صوفی بھی خدا کا نام لینے میں ان صفات اور الفاظ کا استعمال کرنے سے پرہیز نہ کرتے تھے جو ہندوؤں کی مذہبی مصطلحات میں شامل تھے۔ لیکن خدا سمجھے انگریزوں کی حکمتِ عملی اور پنڈت مالوی کی زبان کی جنگ کو، اور آریہ سماج کو اور حال کے زمانے میں مسلم لیگ کو، جنھوں نے وہ نقشہ بالکل پلٹ دیا اور اب ہندو مسلمان نہ صرف دو بالکل مختلف قومیں ہیں بلکہ ایک دوسرے کے ساتھ اظہارِ بیگانگی شدت کے ساتھ کرتے ہیں اور اگر کوئی ہندو یا مسلم ادیب اور شاعر ایک دوسرے کے خیالات، الفاظ اور جذبات وغیرہ سے کام بھی لیتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس میں

ایک مصنوعی کوشش کی جھلک ہے۔ خلوص کا بہت کم اظہار ہوتا ہے۔

۲۹ ستمبر تا ۵ اکتوبر

آج یکم اکتوبر کو صبح ساڑھے آٹھ بجے (مطابق ۱۹ رمضان المبارک) سیدہ خاتون سلمہا پیدا ہوئی۔ اس وقت عابد صاحب بہت استغراق کے عالم میں ہٹلر کی تقریر کا ریکارڈ سُن رہے تھے جس میں اس نے تمام دنیا کو اپنے زیرِ نگیں لانے کی دھمکی دی تھی اور ہم لوگ بہت پریشانی اور انتظار کے عالم میں بیٹھے تھے۔ مصداق اور عزیز جہاں بیگم دونوں حسنِ اتفاق سے اسی تاریخ یعنی رمضان کی ۱۹ تاریخ کو پیدا ہوئی تھیں۔ آج جمعرات کا دن ہے ...... میرے سوا باقی سب لوگوں کو ایک حد تک مایوسی ہوئی کیوں کہ سب لڑکے کی پیدائش کی امید لگائے بیٹھے تھے۔ لیکن محض امید یا خواہش یا دعا کو مصلحت اور حکمِ الٰہی کا بدل سمجھ لینا غلطی ہے۔ معلوم نہیں لوگ اب تک لڑکیوں کی نسبت لڑکوں کی اس درجہ زیادہ قدر کیوں کرتے ہیں۔ شاید پہلے زمانے میں ایک حد تک اس نامساوی جذبے کے لیے دلیل بھی پیش کی جا سکتی ہو کیوں کہ اس زمانے میں عورتوں کی زندگی اور ان کے امکانات بہت محدود تھے اور انھیں پورے انسانی حقوق بھی حاصل نہ ہوتے تھے۔ لیکن اب کم از کم نظری طور پر ان کی حیثیت مردوں کے مساوی ہو گئی ہے۔ اور جب تک یہ بچّی جوان ہوگی ہندوستان کی سماجی زندگی میں یقیناً بڑے بڑے انقلاب ہو چکے ہوں گے اور شاید اسے اپنی ماں اور بڑی بہنوں کے مقابلے میں کام کرنے اور اپنے لیے ایک آزادانہ حیثیت پیدا کرنے کے بہتر اور وسیع تر مواقع ملیں۔ لہٰذا اب تو بچیوں کی پیدائش کو بچوں کے مقابلے میں ایک کم تر چیز سمجھنا محض ایک فرسودہ قسم کی جہالت ہے کہ انا وجدنا اباءنا علیہا جو ایک تعصب ہے عقلی دلیل نہیں ..... جس دنیا اور جس زمانے میں یہ بچی پیدا ہوئی ہے اس میں انسانی بربریت اور بے عقلی کے جو مظاہرے ہو رہے ہیں وہ تو سب کو معلوم ہیں۔ خدا کو معلوم ہے کہ جس دنیا اور زمانے میں اسے زندگی بسر کرنی ہوگی اس کا کیا رنگ ہوگا۔ انسان "ظلوم وجہول" ہی رہے گا یا بہترین انسانوں کی یہ قدیم آرزو کہ دنیا میں "حکومتِ الٰہی" کا نقشہ جمائیں، کس

قدر کامیاب ہوگی ؟ کون کہہ سکتا ہے! لیکن ہر شریف اور حساس اور سماجی درد مند مرد اور عورت کا فرض سوائے اس کے کیا ہے کہ اس مقصد کی تکمیل کے لیے اپنی اپنی قابلیت اور مواقع کے مطابق کوشش کرے۔ قرآن شریف کا وعدہ ہے

ومن اراد الاخرة وسعیٰ لہا سعیہا وہو مومن فاولئک کان سعیہم مشکورۃ

اس ہفتے چین کے مشہور ادیب LIN YUTANG کا ایک ناول A LEAF IN THE STORM پڑھا۔ بہت ہی دل چسپ اور اثر آفریں کتاب ہے اور نہ صرف چینی فلسفۂ حیات پر اس کے مخصوص انداز میں روشنی ڈالی ہے بلکہ موجودہ چین اور چینی جاپانی جنگ کا پس منظر بھی خاصے جیتے جاگتے انداز میں پیش کرتی ہے۔ ابھی چند روز ہوئے میں نے ہرل بک کا ناول DRAGON' S SEED بھی پڑھا تھا۔ وہ بھی چین کے دورِ جنگ ہی کی ایک تصویر ہے اور بہت زور دار تصویر ہے۔ ان لوگوں کی معاشرت، تہذیب، قومی زندگی کی لچک، جس میں اس کے استحکام کا راز پوشیدہ ہے، جاپانیوں کے مظالم جنھوں نے اس ڈھیلی ڈھالی قوم کو ایک منضبط اور منتظم جماعت بنا دیا ہے، یہ تمام چیزیں بک کی کتاب میں بھی بڑی خوبی اور زور کے ساتھ بیان کی گئی ہیں لیکن پھر بھی یہ معلوم ہوتا ہے (اور یہ قدرتی بات ہے!) کہ کوئی بہت واقف کار اور غائر نظر رکھنے والا باہر سے چیزوں کو دیکھ کر انھیں بیان کر رہا ہے۔ لیکن لن یوٹانگ کے صفحات میں چینی تہذیب کی روح جلوہ فرما نظر آتی ہے کیوں کہ وہ اس تہذیب کا نہ صرف ایک بہترین مفسر ہے بلکہ خود اس کی بہترین پیداواروں میں سے ہے۔ اس کی دوسری مشہور کتابوں مثلاً IMPORTANCE OF LIVING اور MY COUNTRY AND MY PEOPLE میں چینی تہذیب کی ایک مخصوص صفت یہ معلوم ہوتی ہے کہ عمل ایک ناگزیر مصیبت ہے۔ انسان کو زندگی کی کامرانی کا راز شانتی، امن اور مناظرِ فطرت اور آرٹ کے شاہکاروں میں اور روز مرہ کی چھوٹی چھوٹی چیزوں کی معنویت پر غور کرنے میں تلاش کرنا چاہیے۔ لیکن اس ناول میں، جب چین کی CONTEMPLATIVE زندگی کی ٹکر جاپان کے ظلم اور زیادتی سے ہوتی ہے اور تلخ حقیقت فکر و خیال کے متین اور خاموش گوشۂ عافیت میں ہلچل بپا کر دیتی ہے تو قوم کی عملی قوتیں اور جدوجہد کی قابلیت بیدار ہو جاتی ہے اور فلسفی ناول

نگار، شانتی کا فلسفہ چھوڑ کر کم از کم اس کو ایک حد تک نظر انداز کر کے عمل کی تلقین اور حمایت کرتا ہے اگرچہ اس کی ذاتی ہمدردی اور حمایت کسی غیر ذاتی، مجرّد عمل کے ساتھ نہیں، کسی تحریک کے ساتھ نہیں بلکہ اس عمل کے ساتھ ہے جس کا مقصد گرد و پیش کے جیتے جاگتے انسانوں، مردوں اور عورتوں کے دکھ اور تکلیف کو دور کرنا ہے۔ بھوکوں کو کھلانا، بے خانماں پناہ ڈھونڈنے والوں کو ٹھیرانا، بچّوں اور عورتوں کے سر پر دستِ شفقت رکھنا ہے۔ ناول کی ہیروئن مس سوئی ملان (TSUI) ایک بہت دل فریب اور دل کش کیرکٹر ہے۔ ابتدائی زندگی امتدادِ زمانہ کی وجہ سے بے یار و مددگار اور "گناہ" کے پھندے میں گزری ہے۔ لیکن اس تجربے نے اس کی سیرت کو مسخ نہیں کیا ہے بلکہ اس کے بعض خوبی کے پہلوؤں کو اور اُجاگر کر دیا ہے، جس طرح سونا آگ میں تپ کر اس کی راکھ اور کوئلے کی سیاہی کو قبول نہیں کرتا بلکہ اور زیادہ صاف ہو جاتا ہے اور دمک اُٹھتا ہے! لوگوں سے میل جول اور مختلف قسم کے تجربات نے اس میں سوشل صلاحیتیں اور اعتمادِ ذات پیدا کر دیا ہے، اس کی دل چسپیوں کو وسیع کر دیا ہے، اس کو انسانوں کی صحیح قدر کرنا سکھا دیا ہے اور جب وہ اتفاقاً چین کے ایک مشہور خاندان والوں کے ہاں مہمان بن کر رہتی ہے تو اس کے دل میں بھی خواہش پیدا ہوتی ہے کہ وہ اپنی ویران زندگی چھوڑ کر اس قسم کی جمی جمائی خاندان کی زندگی بسر کرے۔ قدرت اس کی صورت بھی پیدا کر دیتی ہے کیوں کہ خاندان کے نوجوان وارث کو اس سے محبت ہو جاتی ہے جس کی خاطر وہ اپنی بیوی کو (جو تہی دل اور تہی دماغ ہے اور جس کی تمام AMBITIONS محض اپنے ہم چشموں میں سماجی حیثیت سے محمود بن جانے میں گھر کر رہ گئی ہیں) چھوڑنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ لیکن تقدیر کی گردش ہیروئن کا واسطہ اس نوجوان کے ایک معمّر اور فلسفی اور نوع خواہ دوست کے ساتھ ڈال دیتی ہے۔ اس شخص LAO PENG کی سیرت میں مصنّف نے ایک طرح اپنے خیالی کردار کے خد و خال دکھائے ہیں۔ یہ ہیروئن کے دل میں بے نفسی، ایثار، خدمت، خودی اور خودغرضی کے جذبات اور مطالبات سے بلند ہونے کی خواہش پیدا کرتا ہے کیوں کہ خود ان تمام صفات کا جلوہ اس کی ذات میں نظر آتا ہے۔ وہ اسے قومی جد و جہد اور خدمت کی گرم بازاری میں شامل کر دیتا ہے، اوّل اوّل اس لیے کہ اس کے محبوب کی (مفروضہ) بے پروائی

اور سرد مہری کا علاج اس میں حاصل ہو اور بعد میں وہ کام اس کی زندگی کا جزو بن جاتا ہے اور وہ اپنی شخصیت کی تمام دل فریبیاں خدمتِ خلق میں استعمال کرتی ہے ..... بالآخر نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پہلی محبت پر، جو رومانی اور جذباتی تھی، جس میں محبوب کی جوانی اور دولت اور خاندانی وقار وغیرہ کے اثرات شامل تھے اس محبت پر غریب، کم رو، بے خاندان، بظاہر خشک رو فلسفی کی وہ محبت غالب آجاتی ہے جس کی بنیاد احساسِ رفاقت اور اتحادِ خیال اور باہمی ہمدردی پر قائم ہوتی ہے۔ جس کا تعلق حواس کی کشش اور جذبات کی یورش پر نہیں بلکہ دل اور دماغ کی کشش اور موانست پر ہے۔ اور جب LAO PENG چاہتا ہے کہ اپنے دوست کی محبت کی امانت میں خیانت نہ کرے تو وہ جواب دیتی ہے کہ "چینی نوجوان سے تو TSUI MALIN محبت کرتی ہے۔ لیکن اب وہ کہاں۔ اب تو میں تمہاری بنائی ہوئی TANNI ہوں (اس کا بدلا ہوا نام جو اس نے جاپانیوں سے پوشیدہ رہنے کے لیے PENG کے مشورہ سے اختیار کیا تھا)۔ یہ نئی عورت TANNI تو صرف تم سے محبت کرسکتی ہے!" اس طرح ایک شخصیت کا سحر آفریں اثر دوسری شخصیت میں انقلاب پیدا کرسکتا ہے۔ TANNI کا انجام بخیر ہوا اور ؎

رند از رہِ نیاز بدار الاسلام رفت

۵ر اکتوبر تا ۱۱ر اکتوبر

سیدہ سلمیٰ روز بروز (اگرچہ ابھی روز ہی کتنے ہوئے ہیں!) زیادہ پیاری ہوتی جارہی ہے۔

۸ر اکتوبر۔ آج وزیر ہند ایمری نے ہندوستان کے بارے میں ایک تقریر کی۔ ہندوستان میں اس وقت جو افسوسناک صورتِ حال پیدا ہوئی ہے اس کی تمام تر ذمے داری ہندوستانیوں پر ہے۔ جو فساد ہو رہے ہیں ان سے برطانیہ کا کوئی تعلق نہیں۔ یہ دراصل ہندوستانیوں کا باہمی جھگڑا ہے! ان میں آپس میں اس درجہ نفاق ہے کہ کوئی بیرونی طاقت ان کی سیاسی نجات کا انتظام نہیں کرسکتی۔ ہم ہندوستان کو کسی کے حکم سے نہیں چھوڑیں گے۔ ہم نے اس کی اس قدر خدمت کی ہے، اسے اس قدر فائدہ پہنچایا ہے کہ ہم اپنا سر فخر کے ساتھ بلند کرسکتے ہیں! کانگریس اپنی پارٹی کا راج چاہتی ہے جب تک کانگریس کے لیڈر

اپنی پالیسی کو نہ بدلیں اور قلب ماہیت کا اعلان نہ کریں ہم ہرگز انھیں رہا نہ کریں گے۔ ان سے بات چیت بے کار ہے۔ اگر بالفرض ہم کانگریس سے گفت وشنید کریں تو سارے مسلمان، ہریجن، فوج کے سپاہی، ہندوستانی ریاستیں (غرض سارا ہندوستان جو ہمارا دلی دوست اور بہی خواہ ہے!) ہم سے ناراض ہو جائے گا...... یہی ہے اب انگریزوں کی سیاسی سمجھ بوجھ اور ذہنی قابلیت اور معاملہ فہمی کا معیار! اناللہ وانا الیہ راجعون۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ جب کسی قوم کے بُرے دن آتے ہیں تو اس کی مَت ماری جاتی ہے.....

۸ / اکتوبر۔ CRONIN کی ایک اور کتاب میں نے پڑھ ڈالی ہے، جس کا نام اس وقت ذہن میں نہیں، یہ (خلافِ معمول) ایک ڈاکٹر کی کہانی نہیں ایک پادری کی کہانی ہے جس کی زندگی کا بیشتر حصہ چین میں صرف ہوا تھا اور جو انگلستان (بلکہ اسکاٹ لینڈ) میں اور چین میں بھی ہمیشہ ایک مخصوص انداز کی زندگی بسر کرتا رہا اور ان تمام ریاکاریوں، دنیاسازیوں اور چکنی چپڑی باتوں اور عادتوں کے خلاف بغاوت کرتا رہا جو دنیا کے تمام شعبوں کی طرح دینی کاروبار میں بھی کامیابی کی ضامن ہوتی ہیں۔ اس لیے اس کی زندگی عام لوگوں کی نظر اور دنیاداری کے اصول کے لحاظ سے سراسر ناکامیاب رہی۔ لیکن اس میں ایک ایسی صداقت، دیانت اور اصول پرستی تھی جس پر سینکڑوں دکھاوے کی کامیابیاں نثار ہیں! کرونن کے کیرکٹر زیادہ تر اسی قسم کے ہیں جن کی INTEGRITY دنیا کی مروجہ ریاکاری سے ٹکراتی ہے اور ظاہر میں وہ ہارتے ہیں لیکن حقیقت ہیں نظروں میں جیت انھیں کی ہوتی ہے۔ شاید اس کی اپنی زندگی میں کوئی ایسا مرکزی واقعہ ہوا ہے جس کی وجہ سے اسے خاص کر کے علمِ حیات کا یہ پہلو نمایاں معلوم ہوتا ہے اور سچ تو یہ ہے کہ اس قسم کی کش مکش زندگی کی بنیادی قدروں میں سے ہے........

۹/ اکتوبر۔ آج میں نے آکسفورڈ یونی ورسٹی پریس کے جدید سلسلے PAMPHLETS ON INDIAN AFFAIRS کے لیے ابتدائی تعلیم پر ایک مضمون کا مسودہ تیار کیا ہے۔ اس مضمون کا مطالعہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انگریزوں نے اپنی حکومت کے ابتدائی دور میں تعلیم کی طرف سے کس قدر مجرمانہ غفلت برتی اور بعد کے زمانے میں ان کی پالیسی تحمّل

اور بلند نظری سے کس درجہ عاری رہی ہے۔ جو اپنے ملک میں انھوں نے اور دوسرے ملکوں میں دوسری قوموں نے کیا اور کر دکھایا اسے ہندوستان کے لیے ہمیشہ ناممکن اور ناقابلِ عمل قرار دیا گیا اور مدت تک ہم بھی اسی دھوکے میں رہے اور اب جب کہ یہ دھوکہ دور ہو گیا ہے سیاسی قوت اپنے ہاتھ میں نہیں کہ کوئی زبردست تعلیمی پروگرام ترتیب دے سکیں ...... ڈاکٹر تارا چند جو الہ آباد کے پروفیسر ہیں اور ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد کے سکریٹری تھے آج کل یہاں آئے ہوئے ہیں۔ وہ ان ہندوؤں میں سے ہیں جن کی تعداد بدقسمتی سے کم ہوتی جاتی ہے، جو ہندوستان میں ایک مشترک تہذیب کے قائل ہیں اور اس تہذیب کے بنانے میں مسلمانوں کا جو اہم حصہ ہے اس کا کھلے دل سے اعتراف کرتے ہیں۔ اُردو سے تعصب نہیں کرتے اور ہندوستانی زبان کے مؤید ہیں ...... ان کو میں نے محکمۂ تعلیم کی طرف سے بلایا ہے تاکہ وہ تین "توسیعی خطبات" دیں۔ ان کا موضوع ہے THE MEDIEVAL INDIAN MIND اور اس کے ذیل میں وہ یہ بتائیں گے کہ عہدِ وسطیٰ میں ہندوستانی ذہن نے فلسفہ، مذہب، زبان، ادب اور سماجی اور سیاسی علوم میں کیا ترقی کی اور اس ترقی میں ہندوؤں، مسلمانوں اور دوسری جماعتوں نے کس طرح مل جل کر کام کیا اور اس اشتراکِ عمل سے کیا نتائج مرتب ہوئے ...... ان سے ایک دن گفتگو کے دوران میں یہ ذکر کیا کہ ہندوستان میں علمی فضا اگر نایاب نہیں تو کم یاب ضرور ہے اور یونی ورسٹیوں تک میں، جو علم کا گھر ہیں (یا کم از کم انھیں علم کا گھر ہو جانا چاہیے)، ذہنی دل چسپیاں اور مطالعہ مفقود ہے۔ آخر کیوں؟ میرا خیال یہ ہے کہ جب قوم کی زندگی کا پورا آوا ہی بگڑ جاتا ہے تو اس کا کوئی شعبۂ حیات بھی صحت مند نہیں رہتا اور زندگی "بندگی" میں گھٹ کے رہ جاتی ہے ...... ڈاکٹر تارا چند کہتے تھے کہ انگلستان کی مشہور اور قدیم یونی ورسٹیوں کا بھی ۱۸۵۰ء تک وہی حال تھا جو ہماری یونی ورسٹیوں کا ہے یعنی استادوں کی ذہنی کاہلی، کام نہ کرنا۔ پھر نہ معلوم کیا ہوا کہ وہ نقشہ بدل گیا اور یونی ورسٹیاں قوم کی علمی زندگی کا مرکز اور اس کی راہ بر بن گئیں۔

۱۷؍ اکتوبر

بہت روز سے روزنامچے میں کچھ لکھنے کا موقع نہیں ملا۔ سفر وغیرہ کی وجہ سے مصروفیت رہی۔ اس عرصے میں ڈاکٹر تارا چند نے اپنے لکچر دیے جو بہت مقبول ہوتے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ، باوجود تعصب کے پروپیگنڈے کے لوگ اس بات کا احساس رکھتے ہیں کہ ہندوستان کی تہذیب کے بنانے میں مسلمانوں کا بھی اتنا ہی حصہ ہے جس قدر ہندوؤں کا۔ میرا خیال ہے کہ اگر یہ غیر متعلق مسائل، جو ہندو مسلم اختلافات کو وسیع کرنے کے لیے پیدا کیے گئے ہیں، نہ ہوتے تو ہندوستان کی سیاسی اور تمدنی تاریخ بالکل مختلف ہوتی۔

میں اس عرصے میں جاگیر پونچھ کی تعلیمی حالت کا دورہ کرنے گیا تھا۔ یہ ریاست کشمیر کی ایک ماتحت ریاست ہے جہاں کا راجہ ابھی نابالغ ہے۔ اس لیے وزیر اور ناظم ریاست کا تقرر کشمیر کی طرف سے ہوتا ہے اور حکومت کی طرف سے مختلف سررشتوں کے ڈائرکٹروں کو یہ ہدایت کی گئی ہے کہ وہ جاگیر کے محکموں کا معائنہ کرکے رپورٹ پیش کریں۔ چناں چہ میں وہاں گیا تھا۔ تعلیم کی حالت تو ابھی پسماندہ ہی ہے لیکن لوگوں میں تعلیم کا شوق اور اس کی ضرورت کا احساس بہت شدید ہے۔ اس کی ایک (کسی قدر بعید از قیاس) وجہ یہ ہے کہ یہاں کے لوگ گزشتہ جنگِ یورپ میں فوج میں بہت بھرتی ہوئے تھے اور اس کی وجہ سے ان کو دنیا دیکھنے کا موقع ملا۔ حالات کا اندازہ ہوا۔ کسی قدر خوش حال ہو گئے اور انھیں یہ معلوم ہوا کہ اگر بچے تعلیم پا جائیں گے تو فوج میں ملازمت بھی بہتر ملے گی۔ اس علاقے میں فوجی روایات کافی مستحکم ہو گئی ہیں چناں چہ اس جنگ میں بھی شاید کل چار لاکھ کی آبادی میں سے ستر ہزار کے قریب آدمی فوج کے مختلف شعبوں میں بھرتی ہوئے ہیں اور لوگوں کو آج کل گزشتہ جنگ کی پنشن اور موجودہ جنگ کی تنخواہوں میں سے ایک حصہ ملا کر تقریباً چالیس لاکھ روپیہ سالانہ وصول ہو رہا ہے حالاں کہ کل جاگیر کی آمدنی بمشکل دس لاکھ روپے ہے! لوگوں میں مقابلتاً حوصلہ زیادہ پیدا ہو گیا ہے اور پونچھ کے لوگ بڑی فوج اور بحری فوج اور مختلف ملکوں میں تجارت کے کام میں بہت پائے جاتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ برسات میں چھتری

لگاکر اور برساتی بہن کر کاشتکاری بھی کرتے ہیں! میں نے وہاں تعلیمی اصلاح کے لیے کچھ تجاویز حکومت کے سامنے پیش کی ہیں۔ معلوم نہیں مصارف کی وجہ سے وہ منظور ہوسکیں گی یا نہیں۔ خدا کی شان ہے کہ جنگ کے لیے کہیں بھی روپے کی کمی نہیں لیکن امن اور تہذیب کے کاموں کے لیے ہمیشہ کال ہی ہے!۔

پونچھ سے واپس آکر فوراً ہی یعنی ۲۶ر اکتوبر کو مجھے امر سنگھ کالج میں کنووکیشن ایڈریس دینا تھا۔ چناں چہ میں نے اس کو بہت عجلت میں لکھ کر تقسیمِ اسناد کے جلسے میں پڑھا اگرچہ وہ وقت پر چھپ کر تیار نہ ہوا تھا! موضوع یہ تھا کہ زندگی کوئی بامعنی اور قابلِ قدر چیز ہے یا بقول شیکسپیر کے کسی مخبوط الحواس کی کہی ہوئی کہانی ہے۔ میں نے خطبے میں یہ بتانے کی کوشش کی تھی کہ آج کل ہم پر جو بپتا آئی ہوئی ہے وہ خود اپنے ہی کرتوتوں کا نتیجہ ہے اور جب تک ہم تعلیم اور سماجی اصلاح کے ذریعے افراد اور جماعتوں میں بعض خاص صفات یعنی رواداری، ذہانت، اجتہادِ فکر کی قابلیت اور اس کی قدر اور شانِ فقر پیدا نہ کریں گے اس وقت تک اپنی صنعتی اور سائنٹفک قوتوں سے، جو اپنے معراج کو پہنچ چکی ہیں، پوری طرح فائدہ نہ اُٹھاسکیں گے۔ اس لیے انسانوں کو اخلاقی اور سماجی اعتبار سے اس قابل بنانا ہے کہ وہ اپنی مادّی قوتوں کا صحیح استعمال کرسکیں۔ اس لیے موجودہ سماجی ماحول کو بدلنے کے لیے ایک ایسی جماعت کو پیدا کرنے کی ضرورت ہے جو اپنے گرد و پیش کی مفلوج کن قوتوں کو توڑ کر ایک بہتر جماعت کی بنیاد ڈال سکے۔ لوگ اس خطبے سے بظاہر خاصے متاثر ہوئے۔ لیکن اصل بات نظری تعریف یا زبان کی خوبی کا اعتراف نہیں بلکہ خون کا رگوں میں دوڑنا ہے اور اس کے لیے کوئی لکچر یا خطبہ یا تقریر کافی نہیں۔ یا تو بہت سے ہم خیال لوگوں کی متحدہ کوشش کی ضرورت ہے یا کسی "مردِ فقیر" کی سحر آفریں شخصیت کی۔ وہ کہاں سے آئے؟ مردِ فقیر تو مشیّتِ الٰہی کا تابع ہے اور اسی کے حکم سے ظہور میں آتا ہے اور پر خلوص اہلِ دل لوگوں کی ایک چھوٹی سی جماعت کا فراہم کرنا بھی بہت مشکل ہے کیوں کہ لوگوں کو چھوٹے چھوٹے مقاصد کی حیطۂ غیر ممنوع سے کبھی چھٹکارا نصیب نہیں ہوا۔

یکم نومبر

آج گرونانک صاحب کا جنم دن تھا۔ سری پرتاپ کالج کے سکھ طلبا نے اس کی تقریب میں جلسہ کیا تھا اور مجھے صدارت کے لیے مدعو کیا تھا۔ میں نے ان سے تقریر کے دوران میں کہا کہ اس قسم کی تقریبوں کو مل جل کر منانا چاہیے اور سب طلبا کو اس میں حصہ لینا چاہیے۔ کیوں کہ خدا کا شکر ہے کہ شرافت، دین داری، انسانیت اور رواداری (جن کی گرونانک صاحب اور دوسرے مذہبی پیشواؤں نے تلقین کی ہے) ایسی چیزیں ہیں جن میں سرمایہ داری کا دَور دَورہ نہیں ہے۔ وہ سب کی ملکیت ہیں اور جہاں کہیں ملیں ہمیں ان کی قدر کرنا چاہیے .... چند روز کے بعد اسی قسم کی ایک تقریب دیوالی کے موقع پر پرنس آف ویلز کالج جموّں میں ہوئی جس میں سب مذہبوں کے طلبا شریک تھے اس میں بھی مجھے شرکت کرنی تھی اور میں نے اپنی تقریر میں انھیں اناتول فرانس کی مشہور کہانی "حضرت مریم کا مداری" کا حوالہ دے کر بتایا تھا کہ خدا کے سامنے بندے کی نیت مقبول ہوتی ہے۔ عبادت کا طریقہ اور اس کی زبان ضمنی چیزیں ہیں۔ عبادت کرنے والے کا خلوص اور عقیدت اصل چیز ہیں۔ لہٰذا مذہب کے طریقوں کے اختلاف کی وجہ سے آپس میں لڑنا مذہب اور خدا دونوں کی ہتک ہے۔ علاوہ بریں یہ تقریبیں بہت مفید ہو سکتی ہیں اگر دل کے گہرے جذبات کا اظہار ہوں لیکن اگر محض تصنع اور نمود کے طور پر کی جائیں تو ان سے کوئی دیرپا فائدہ نہیں ہوتا۔ جس طرح وہی پانی زمین اور کھیتی کو سرسبز اور شاداب بناتا ہے جو زمین کے سینے کو چیر کر نکلتا ہے اور جس کے سوتے گہرائیوں میں ہوتے ہیں۔ کسی لوٹے سے پانی سطحِ زمین پر بہا دینا کافی نہیں ہو سکتا۔ اپنی طرف سے تو میری ہمیشہ یہ کوشش رہتی ہے کہ ہندوستان میں ہندو مسلم نفاق اور اختلاف کی جو خوفناک خلیج بڑھتی جا رہی ہے اس کو پاٹا جائے کیوں کہ اس کے اثرات مسلمانوں کے لیے ہندوؤں سے بھی زیادہ خطرناک ثابت ہوتے ہیں۔ اور یہ تو ایک سیاسی مصلحت ہے۔ میرا تو مذہب اور اسلامی اخلاق کی رو سے بھی یہ عقیدہ ہے کہ اسلام اصولی طور پر ہر قسم کی تنگی، تنگ نظری اور تعصب کا دشمن ہے۔

۱۰ نومبر گزشتہ چندروز سے میں خوش اور مطمئن نہیں ہوں۔ اس کی ایک وجہ تو سرکاری ہے اور دوسری ذاتی۔ ایک تو بعض ایسے لوگوں کی ریشہ دوانی سے کوفت ہے جو مختلف طریقے سے میرے مرہونِ منت ہیں اور جن میں اگر کچھ بھی شرافت ہوتی تو وہ میرے کاموں میں روڑا اٹکانے کے بجائے ان میں سہولت پیدا کرتے۔ لیکن خود غرضی اور تنگ نظری انسانوں کو اندھا بنا دیتے ہیں، عقل اور اخلاق دونوں کے لحاظ سے۔ علاوہ اس کے بعض لوگ جو حسنِ اتفاق سے اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں نہ مردم شناسی کا ملکہ رکھتے ہیں، نہ معاملات میں وہ رکھ رکھاؤ اور حزم و احتیاط برتتے ہیں جن کی اس سے توقع ہوسکتی ہے۔ چناں چہ اس کی وجہ سے جو کام انسان کرنا چاہتا ہے اس میں رکاوٹیں پیدا ہوتی ہیں۔ اگر مجھے اپنے منصبی کام اور مقاصد کے حصول میں کوئی ذاتی دل چسپی اور کاوش نہ ہو تو میرے دل پر ان باتوں کی آنچ مطلق نہ آنے پائے۔ لیکن چوں کہ میں اپنی تعلیمی اسکیموں اور مقاصد کو اپنا ذاتی کام ہی سمجھتا ہوں اس لیے اس قسم کی بے اصول اور بے عقل رکاوٹوں سے تکلیف ہونا ناگزیر ہے۔ اور خدا کا شکر ہے کہ ابھی تک میری طبیعت میں اتنی "سمائی" پیدا نہیں ہوئی (جو دراصل بے اعتنائی کا ایک دوسرا ذرا دل خوش کن نام ہے) کہ میں ان کی پروا نہ کروں!

ذاتی وجہ یہ ہے کہ جب سے اس سال سری نگر سے جموّں آئے ہیں مرضی کا مکان نہیں ملا۔ پُرانا مکان کرائے کے لیے خالی نہیں۔ نیا مکان شہر سے باہر اور کسی قدر علاحدہ ہے جس کی وجہ سے پوری طرح محفوظ نہیں اور بعض دوسری مشکلات بھی ہیں۔ لیکن مشکلات اس لیے ہوتی ہیں کہ ان کا مقابلہ معقولیت اور بہادری کے ساتھ کیا جائے۔ جو مشکل دُور ہو سکے اسے دُور کیا جائے، جو دور نہ ہو سکے اس کو جہاں تک ممکن ہو خندہ پیشانی کے ساتھ جھیلا جائے کیوں کہ زندگی کے ساتھ کوئی انسان یہ شرط نہیں کرسکتا کہ وہ ہمیشہ اس کی مرضی کے عین مطابق چلے گی۔ بلکہ میرا خیال تو یہ ہے کہ مشکلات کا پیش آنا نہ صرف ناگزیر ہے بلکہ کیرکٹر کی پختگی اور تکمیل کے لیے ضروری ہے کہ مشکل پڑے اور انسان اس کو برداشت کرے۔ اگر میرے متعلقین میں سے کسی کا ردِ عمل ایسا ہو جس میں حوصلہ اجرأت

یا رفاقت کے اصولوں کی کمی ہو تو مجھے اس سے انتہائی رنج ہوتا ہے۔ شاید وہ بے چارے اپنی غلط فہمی کی وجہ سے یہ سمجھتے ہیں کہ میں اس وجہ سے رنج یا ناراضگی کا اظہار کرتا ہوں کہ وہ میری بات نہیں مانتے حالاں کہ واقعہ یہ ہے کہ میں ان کی مشکلات اور پریشانیوں کو سمجھنے کے بعد (اور دل کی گہرائیوں میں ان کے ساتھ پوری ہمدردی اور بہت کچھ اتفاق کرنے کے بعد بھی) اپنی حماقت سے یہ توقع رکھتا ہوں کہ وہ زندگی کی مشکلات کا مردانہ وار مقابلہ کرنا سیکھیں کیوں کہ ایک تو تقاضائے انسانیت ہی یہ ہے اور دوسرے جو زمانہ آگے چل کر پیش آنے والا ہے اس کے لیے سب کو اپنے تئیں خوگر بنانا چاہیے ناسازگار باتوں اور ماحول کا۔ خدا نہ کرے کہ ایسی کوئی مشکلات آپڑیں جن کے لیے ہم لوگ ذہنی اور جذباتی اعتبار سے بالکل تیار نہ ہوں اور ان کے سامنے بے بسی سے ہتھیار ڈال دیں۔ لیکن وہ یہ نہیں سمجھتے اور میری بے حسی پر کڑھتے ہیں کہ مجھے ان کی تکلیف اور پریشانی کا احساس نہیں! زدل تنگی نمی نالم، دلم تنگ است می نالم! مگر شاید یہ میری غلطی اور بھول ہے۔ خدا نے یا حالات نے یا ابتدائی تربیت نے مختلف لوگوں کو مختلف طبائع دیے ہیں۔ کیا مجھے حق ہے کہ میں ان کو اپنے سانچے کے مطابق ڈھالوں؟ عقل تو کہتی ہے کہ شاید نہیں۔ دل کہتا ہے کہ کیوں نہیں۔ اگر تم بعض عادتیں اور اصول اور باتیں اپنے لیے نہ صرف مفید بلکہ ضروری سمجھتے ہو تو اپنے پیاروں اور عزیزوں کے لیے کیوں ان کو اتنا ہی اہم نہیں سمجھتے؟ حضرت عیسیٰ کا مشہور سوال یہ تھا ''کیا میں اپنے بھائی کا محافظ (KEEPER) ہوں؟ جس کا جواب ان کی طرف سے یہ دیا گیا تھا کہ یقیناً۔ ہم سب ایک دوسرے کے محافظ ہیں...... بہرحال مشکل یہ ہے کہ ؎

ترے عشق کی انتہا چاہتا ہوں
میری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں!

۲۴/ نومبر

بہت دن سے کچھ نہیں لکھا۔ فرصت تو کیا نہیں ملی، دل ہی اس طرف متوجہ نہیں ہوا۔ مکان وغیرہ کا قصہ ابھی تک چل رہا ہے اور نت نئے چولے بدلتا رہتا ہے۔ ایک رائے قائم

ہو جاتی ہے اور پھر وہ بالکل غلط ثابت ہو کر بدل جاتی ہے۔ ماہرینِ نفسیات نے بار بار اس بات پر زور دیا ہے کہ خوف کا جذبہ ہر قسم کی ذہنی اور اخلاقی کمزوریوں کی بنیاد ہو سکتا ہے۔ اقبال نے بھی خاص کر کے اس پر زور دیا ہے بلکہ کلمۂ شہادت کا ایک اہم اور اٹل نتیجہ یہ نکالا ہے کہ انسان خوف ماسوا اللہ سے بے نیاز ہو جائے۔

ہر طلسمِ خوف را خواہی شکست — گر عصائے لاالہ داری بدست

اور

اصل او بیم است اگر بینی درست! — ہر شرِ پنہاں کہ اندر قلبِ تُست

مجھے اس تمام قصے میں اس صداقت کا از سرِ نو احساس ہوا۔ ہماری تعلیم و تربیت جو جرأت پیدا نہیں کرتی اور مختلف قسم کے مادّی اور غیر مادّی خوفوں کے بُت ہمارے سینوں میں بٹھا دیتی ہے ان کی وجہ سے ہم خود اپنی زندگی کو تلخ اور محدود بناتے ہیں۔ ان خوفوں کو دور کرنا تعلیم کے اعلیٰ ترین مقاصد میں شامل سمجھنا چاہیے۔

پچھلے ہفتے لاہور میں یونی ورسٹی کی ایک سب کمیٹی تھی جو اس بات پر غور کر رہی تھی کہ طلبہ میں MENTAL EFFICIENCY کی اس درجہ کمی کیوں ہے۔ میں بھی اس کا ممبر تھا۔ بعض ممبروں کا خیال تھا کہ ذہنی جودت اور بیداری کا ایک "کورس" بنا کر اسے کونین کی گولی (یا چاکلیٹ!) کی طرح کلاس میں کھلایا جا سکتا ہے۔ لیکن میں نے اس خیال کی مخالفت کی۔ ذہنی تربیت کے لیے کوئی براہِ راست اور بلا واسطہ طریقۂ تعلیم، جو مثلاً خاص قسم کی معلومات میں اضافہ کرے، کافی نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے تمام تعلیمی نظم و نسق کی تنظیم درکار ہے۔

گزشتہ دنوں میں مندرجہ ذیل کتابیں پڑھیں (اُردو کی اچھی کتابیں ناپید ہیں اس لیے انگریزی ہی پر اکتفا کرتا ہوں)

JOOD : WHAT IS AT STAKE, WHY NOT SAY SO —— اس میں موجودہ جنگ کے مقاصد سے بحث کی گئی ہے اور LIBERAL TRADITION کی تفسیر کر کے اس کا مقابلہ موجودہ TOTALITARIAN طریقوں سے کیا گیا ہے۔ اچھی خاصی کتاب ہے لیکن تکرار اور اعادہ زیادہ ہے۔

۲ــــــ LASKI : THE STRATEGY OF FREEDOM جس میں طلبہ کو، بالخصوص امریکی طلبہ کو مخاطب کر کے ہٹلر کے نازی نظامِ حکومت کے خطرات سے بہت وضاحت کے ساتھ بحث کی گئی ہے اور ایک سوشلسٹ کے نقطۂ نظر سے سماجِ نو کا خاکہ کھینچا گیا ہے۔ لاسکی بہت اچھا لکھنے والا ہے لیکن وضاحت کی خاطر اس نے بھی تکرارِ خیالات کر کے اس کتاب کو ذرا اُکتانے والی کتاب بنا دیا ہے۔

۳ــــــ UP AT THE VILLA سمرسٹ ماہم کی کتاب ہے۔ اس کے خاص انداز میں لکھی گئی ہے جس میں ایک رندمرد شریف ثابت ہوتا ہے اور ایک بظاہر دنیا بھر کی خوبیاں رکھنے والا انسان (جو ضمناً بنگال کا گورنر بھی ہے!) ظاہر پرست اور سماج سے خائف ثابت ہوتا ہے اور انسانیت کے آخری امتحان میں پورا نہیں اترتا۔ ہیروئن کامیابی کے دیوتا کو چھوڑ کر رند ناکام سے شادی کر لیتی ہے!

۴۔ JAMES HILTON : RANDOM HARVEST بہت ہی اچھا ناول ہے۔ یہ وہی مصنف ہے جس نے GOODBYE, MR. CHIPS وغیرہ کتابیں لکھی ہیں۔ اس کتاب میں ایک شخص کا حال ہے جس کی زندگی کو تین چار سال کے "فقدانِ حافظہ" کے حادثے نے دو مختلف حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ ایک جنگِ عظیم (۱۷ء) تک کا حصہ اور دوسرا چار سال کے بعد کا حصہ جب وہ ایک بہت کامیاب کاروباری اور سیاسی آدمی بن جاتا ہے۔ لیکن اس چار سال کا کھوج لگانے کی اس کو فکر رہتی ہے۔ کوشش ناکام رہتی ہے لیکن اتفاق سے دونوں زندگیوں کا رشتہ مل جاتا ہے۔ کہیں کہیں ایک آدھ بات ذرا FAR FETCHED معلوم ہوتی ہے لیکن بحیثیت مجموعی بہت دل چسپ اور ساتھ ہی معنی آفریں ناول ہے۔ اس مصنف کی تقریباً تمام کتابوں میں ایک انفرادی شان ہے۔ اس کی صرف ایک کتاب SILVER FLAME ایسی ہے جو ذرا مایوس کن ہے ورنہ یہ بہت ہونہار ناول نویس ہے۔

سفرِ بمبئی و رام پور

۱۹۴۲

۴ دسمبر

میں آج بمبئی ہوتا ہوا رامپور پہنچا ہوں۔ بمبئی میں اکبر کی چار سو سالہ برسی منائی گئی تھی اور اس سلسلہ میں انتظامی کمیٹی نے مجھے مدعو کیا تھا۔ اس تقریب سے بمبئی کے دوستوں سے بھی ملاقات ہوگئی اور زبردستی تین چار تقریریں بھی کرنی پڑیں۔ معلوم نہیں لوگوں کو تقریریں کرانے اور سننے سے اس درجہ دل چسپی کیوں ہے؟ میرا خیال تو یہ ہے کہ تقریر دراصل اس وقت کرنی چاہیے جب دل اور دماغ کسی خاص بات کو کہنے کے لیے بے چین ہوں۔ لیکن میرے خیال سے کیا ہوتا ہے؟ دنیا کی ڈگر تو بالکل جداگانہ ہے!......
اکبری جلسے کی تقریر میں میں نے اس بات پر زور دیا تھا کہ ہندوستان کی تاریخ میں ہمیشہ مختلف تہذیبوں کے میل جول اور تعلق کی وجہ سے گہرائی اور وسعت پیدا ہوتی رہی ہے اور موجودہ زمانے کے رجحانات ایسے ہیں کہ ان باہمی تعلقات کی اہمیت اور قوت بہت زیادہ ہوگئی ہے اور اب کسی جماعت کے لیے مادّی یا تہذیبی اعتبار سے دوسروں سے

الگ تھلگ رہنا ممکن ہی نہیں۔ اس لیے ہندوستان میں بھی علاحدگی کی کوشش عقل کے تقاضے اور تاریخ کے دھارے کی مخالفت ہے۔ نہ ہندو مسلمانوں کی تہذیب کے عناصر کو ہندوستانی تہذیب سے نکال سکتے ہیں (ایسا کرنا حماقت اور اندھاپن ہے) نہ مسلمان اپنی تاریخ کو مسترد کر کے کہہ سکتے ہیں کہ ہم اس ملک کی تہذیب سے کوئی واسطہ نہیں رکھیں گے۔ سائنس کے اس دور میں اس قسم کی علاحدگی کا امکان ہی نہیں .... ایک تقریر بمبئی ٹریننگ کالج میں کرنی پڑی جہاں میرے پرانے دوست سید نور اللہ پرنسپل ہیں۔ اس میں میں نے بتایا تھا کہ جب تک تعلیم کا تعلق کسی حیات بخش آئیڈیل سے قایم نہ کیا جائے اس وقت تک اس میں قوت اور حرکت پیدا نہیں ہوسکتی اور اس زمانے کے بعض زبردست رجحانات اور محرکات کا تجزیہ کر کے یہ دکھانے کی کوشش کی تھی کہ تعلیم کے ذریعے ایک تو عقل اور ذہانت کی زیادہ کارگر تربیت کی ضرورت ہے اور دوسرے طلبہ میں "انسانیت" اور انسانی ہمدردی اور انحصارِ باہمی کا احساس زیادہ گہرا اور واقعی کرنے کی۔ اس کے بغیر تعلیم موجودہ زمانے کی ضروریات کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہوسکتی ...... ایک تقریر SILVERFISH CLUB میں کرنی پڑی جو ایک قسم کا ادبی کلب ہے جہاں مصنفین کا مجمع ہوتا ہے۔ اس میں اقبال کو بحیثیت ایک ترقی پسند ادیب کے پیش کرنے کا مطالبہ تھا جس کو جوں توں کر کے پورا کیا۔ میں تو اس سے مطمئن نہ تھا لیکن لوگ ذرا آسانی سے خوش ہو جاتے ہیں......

بمبئی میں بہت سے لوگوں سے ملاقات ہوئی جن میں سے دو خاص کر کے قابلِ ذکر ہیں۔ یک تو کرنل سوکھی جو بمبئی سے دہلی تک ہم سفر تھے۔ یہ ایک مشہور ڈاکٹر ہیں اور ہیفکن سٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ہیں جہاں مختلف بیماریوں کے علاج کے لیے سیرم وغیرہ بنا تے ہیں۔ مجھے ان سے اس لیے دل چسپی تھی کہ لوئیس بروم فیلڈ کے ناول THE RAINS CAM میں مصنف نے ان کا (اور ان کی بیوی کا جو مینا کا کے نام سے ایک مشہور رقاصہ ہ چکی ہیں) کیرکٹر بہت جیتے جاگتے انداز میں پیش کیا ہے (یعنی ایک کیرکٹر ہے جس کی اصل بتاتے جاتے ہیں) بہت دل چسپ اور جیتے جاگتے آدمی ہیں، قوم پرست ہیں، عمر بھر FIGHTI رہے ہیں۔ انھوں نے بعض قصے سنائے جس سے معلوم ہوا کہ حکومتِ ہند باوجود

اپنی انتہائی ضرورت کے بھی کسی طرح اس بات کے لیے آمادہ نہیں کہ ہندوستان میں کوئی صنعتی یا طبی ترقی ہو جو کسی طرح یورپ اور خاص کر انگلستان کے سرمایہ داروں اور اہلِ صنعت کے مفاد پر برابر اثر ڈالے! ایسی باتیں سُن کر منہ کا مزہ تلخ ہو جاتا ہے اور غصہ بھی آتا ہے اور افسوس بھی......

مسز ہتھی سنگھ سے (جو پنڈت جواہرلال کی بہن ہیں) بھی ملاقات ہوئی۔ لیڈی مسعود سے ان کی بہت تعریف سنی تھی۔ اس لیے ملنے کا اشتیاق تھا۔ بہت خوش اخلاق اور ملنساری سے ملیں اور ان سے مل کر یہ اندازہ ہوا کہ اچھے خاندان کی اچھی تربیت کا واقعی بہت گہرا اثر ہوتا ہے۔ گو انھوں نے اپنی بڑی بہن کی طرح سیاست کو اپنا شغل نہیں بنایا لیکن اس میں کافی گہری دل چسپی ہے اور CULTURE کے لیے وسعتِ خیال کی ضرورت ہے وہ موجود ہے۔ گفتگو اور تحریر کا سلیقہ بھی اچھا ہے۔

بمبئی میں اظہر کے ساتھ قیام رہا جو اپنا کام SUPPLY DEPARTMENT کامیابی کے ساتھ کر رہا ہے۔ باچھو (خواجہ احمد عبّاس) کے ناول (انقلاب) کا ایک حصّہ پڑھا جو وہ اب تک لکھ پایا ہے۔ پلاٹ بہت اچھا ہے اور تحریر کامیاب ہے۔ میرا خیال ہے کہ باچھو میں بہت اچھی ادبی صلاحیت ہے اور مجھے یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی کہ اس نے محض اپنی قابلیت اور دیانت داری اور ان تھک محنت سے بمبئی جیسے بڑے اور "زخار" شہر کی ادبی اور علمی زندگی میں اور خصوصاً صحافتی حلقوں میں اپنے لیے ایک خاص نمایاں جگہ پیدا کر لی ہے۔ ہماری موجودہ نسل کے نوجوانوں میں (جن کا ہمارے خاندان سے تعلق ہے) سب سے زیادہ انفرادیت اور اصول و عمل کی پختگی اور سیاسی شعور کا اظہار اس کی شخصیت میں ہوا ہے.........

۱۲/ دسمبر

پھر بہت دن سے روزنامہ لکھنے کا وقت نہیں ملا! خیر۔ اس عرصے میں رام پور کا کام ختم کیا۔ وہاں کی حکومت نے مجھے تعلیمی مشورہ دینے کے لیے بلایا تھا۔ زیدی صاحب کے

ہاں قیام رہا اور یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی کہ انھوں نے اپنی چیف منسٹری کے دوران میں ریاست کی بڑی قابلِ قدر خدمت کی ہے اور ہر اعتبار سے اس کو بہتر بنا دیا ہے۔ کارخانے کھُل گئے ہیں۔ سڑکیں اور عمارتیں بنی ہیں۔ مزدوروں اور کاشتکاروں کی بہتری کے لیے تدابیر اختیار کی گئی ہیں اور آمدنی میں اضافہ ہوا ہے جس کا بیشتر حصّہ (غالباً) رعایا کے فائدے کے لیے صرف کیا جاتا ہے۔ زیدی نے ریاست کی ملازمت اختیار کی تو مجھے ان کے اس انتخاب کی معقولیت میں شک تھا لیکن واقعات نے اس شبہ کو غلط ثابت کر دکھایا ہے۔

کتابیں

اس عرصے میں دو بہت اچھی کتابیں پڑھیں۔ ایک تو اپٹن سنکلز کی DRAGONS TEETH جو اس کے جدید سلسلہ کی تیسری جلد ہے اور جس میں اس نے اپنی مخصوص قابلیت اور ہمہ گیری کے ساتھ تمام مغربی ممالک اور خاص کر کے نازی جرمنی کے حالات کا انکشاف کیا ہے اور دورِ حاضر کے تمام مسائل پر خوب روشنی ڈالی ہے۔ اس کتاب میں بھی تاریخی اور خیالی کیرکٹر ملے جلے ہیں ......

دوسری کتاب ایک ویلز کے مصنف LLEWLYN کی ہے جس کا نام ہے HOW GREEN WAS MY VALLEY رام پور میں مسز سالووے سے مستعار لے کر پڑھی تھی۔ مجھے یہ اندازہ نہ تھا کہ برطانوی نسل کا کوئی مصنّف اس زمانے میں اس قدر شاعرانہ کیف کے ساتھ لکھ سکتا ہے۔ کتاب میں ایک گاؤں کی زندگی کا قصّہ ہے جس کو کوئلہ کی کان کنی رفتہ رفتہ تباہ کر دیتی ہے لیکن کس قدر قوتِ بیان ہے، کس قدر گہری واقفیت ہے، کتنی ہمدردی اور دل سوزی کے ساتھ افراد کی سیرت کشی کی ہے اور پھر اندازِ بیان میں کس قدر شاعرانہ دلکشی ہے۔ وہ تمام باتیں بھی ہیں جو "ترقی پسند" ادیب چاہتے ہیں لیکن وہ CRUDITY اور عریانی نہیں جو بدقسمتی سے ان میں سے بہت سے لکھنے والوں میں راہ پا گئی ہے۔ سب کچھ کہا ہے لیکن ضبط و ادب کے ساتھ اور مصنّف کی "قدریں" بہت معقول ہیں۔

پانی پت میں باچھو کی شادی۔ ار نومبر کو مجی کے ساتھ ہو گئی۔ خدا ان دونوں کی زندگی

کو بلند اور کامیاب بنائے۔ دونوں میں بڑی اچھی انسانی اور ادبی اور علمی صلاحیت ہے اور طبیعت میں شرافت ہے۔ ایک لحاظ سے یہ شادی ایک آزمائش بھی ہے۔ ہمارے خاندان میں دو اعلیٰ تعلیم یافتہ (انگریزی تعلیم کے اعتبار سے) اشخاص میں یہ پہلی شادی ہے۔ دیکھیں یہ زندگی کا بوجھ کس خوش اسلوبی سے اُٹھاتے ہیں۔

رام پور سے فارغ ہوکر میں تنہا جموّں واپس آگیا۔ کام کا بہت ہجوم تھا لیکن وہ کسی نہ کسی طرح ختم ہوگیا لیکن تنہائی کی وجہ سے دل بہت اداس رہا اور عزیزوں کی یاد بہت ستاتی رہی۔ معمول سے بھی زیادہ۔ شاید یہ بڑھاپے کے آغاز کے آثار ہوں ایندہ یہیں (جموّں) ہے اور اچھی ہے اور گو اسے یہ معلوم نہیں کہ وہ اپنی ماں سے الگ ہے لیکن ماں کے احساس اور محبت کا کیا علاج !

سفرِ اندور و علی گڑھ

۱۹۴۲-۴۳

دسمبر

کرسمس کی تعطیلات میں مجھے اندور جانا ہے۔ وہاں اس سال تعلیمی کانفرنس ہے اور لیڈی مسعود ہیں۔ یعنی دوہری کشش ہے۔ مجھے کانفرنس کے "یونی ورسٹی ایجوکیشن" کے شعبہ کی صدارت کے لیے مدعو کیا گیا ہے اور میں نے UNIVERSITIES, INTELLECTUAL FREEDOM کے موضوع پر اپنا خطبۂ صدارت لکھا ہے شاید بعض باتیں سخن گسترانہ سمجھی جائیں!

۵ فروری ۴۳ء

آج بہت دن کے بعد ڈائری لکھنے بیٹھا ہوں۔ اس میں فائدہ تو یہ ہے کہ چند روز کے بعد واقعات زیادہ واضح اور اصلی شکل میں نظر آنے لگتے ہیں اور جذبات کا وقتی زور انھیں زیادہ رنگ نہیں دے سکتا اور نقصان یہ کہ بعض باتیں پوری قوت کے ساتھ بیان نہیں ہو سکتیں یا ضروری تفصیلات فراموش ہو جاتی ہیں ...... بہرحال کرسمس میں اندور کی تعلیمی کانفرنس ہو گئی۔ بحیثیت مجموعی میں زیادہ متاثر نہیں ہوا۔ وہی بہت سی تقریریں جن سے کوئی خاص فائدہ نہیں ہوتا، وہی بندھے ٹکے معمول، ہنگامے، پارٹیاں جن کی تنظیم اچھی نہ تھی۔ صدر کانفرنس مسٹر جیکر (جو سیاسی گفت و شنید کے معاملے میں سر تیج بہادر کا سایہ رہ چکے ہیں!) نے کانفرنس کو ایک تحریر لکھنے کی وقعت بھی نہ دی۔ ایک زبانی تقریر کی جس میں بعض باتیں اچھی

تھیں اور موقع موقع پر لطیفوں کے ذریعہ لوگوں کو ہنسانے کی کوشش اور بس ! ایک تعلیمِ بالغان کی کانفرنس بھی تھی جس کے صدر پروفیسر ہما تھے جنھوں نے اپنے خطبے میں کچھ بھی نہیں کہا لیکن چوں کہ مقامِ اعزاز تھا لہٰذا اس کی عزت افزائی کرنے میں بخل یا انکسار سے بھی کام نہیں لیا۔ ہاں اس میں یہ بات قابلِ ذکر تھی کہ بعض عیسائی مشنریوں نے اپنے کام کا جو حال بیان کیا جو وہ .C.P اور بنگال میں کر رہے ہیں وہ واقعاً قابلِ تعریف تھا۔ ان کے اچھا کام کرنے کی خوشی کے ساتھ اس بات کا افسوس ہے کہ اب بھی استقلال کے ساتھ پتّا مار کر کام کرنے میں ان کی جماعتیں ہماری جماعتوں سے بہتر ہیں ...... اندور میں لیڈی مسعود کے ساتھ قیام رہا۔ ان کے تمام خاندان والوں کے ساتھ یہ دن بہت اچھی طرح گزرے۔ ان لوگوں کی محبت اور خلوص کی جتنی قدر کی جائے کم ہے۔ وہاں ان کی ایک دل چسپ دوست کنول بھگت سے بھی ملاقات ہوئی ان میں سچ بولنے کی اچھی صلاحیت ہے اور جرأت ہے۔ ان دو صفات سے کام لیا جائے تو انسان بہت کچھ کر سکتا ہے۔ اظہر بھی اندور آ گئے تھے۔

واپسی پر چند روز علی گڑھ ٹھیرا۔ عزیز، بچیاں، مصداق، عابد صاحب سب وہاں تھے۔ اس لیے چند روز کے لیے خاندان کا REUNION .. ہو گیا۔ وہاں ٹریننگ کالج میں لوگوں نے پارٹی بھی کی جس میں خلافِ توقع ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب بھی شریک ہوئے اور پروفیسر حلیم بھی۔ اندور کے لیے جو خطبہ میں نے لکھا تھا اسے باصرار وہاں بھی پڑھنا پڑا۔ ڈاکٹر صاحب تو بقول شخصے دھمکی سے مر گیا کہ نہ باب نبرد تھا' پہلے ہی چلے گئے اور حلیم صاحب بھی آخر وقت تک نہ بیٹھے۔ (شاید) کیوں کہ اس میں یونی ورسٹیوں کے بارے میں بعض تلخ لیکن گفتنی باتیں تھیں۔ افسوس ہے کہ ہماری اس محبوب یونی ورسٹی میں کہ مسلمانوں کی پچاس سالہ بلکہ پینسٹھ سالہ کمائی ہے آج ذہنی بے بسی کی ایسی حالت ہو گئی ہے کہ بعض معمولی اور پیش پا افتادہ باتیں لوگوں کو گراں گزرتی ہیں اور ان کو کہنے کے لیے جرأت کی ضرورت محسوس ہوتی ہے جو اکثر لوگ خود میں نہیں پاتے ! خیر یہ خوشی ہے کہ جن لوگوں کی رائے کی کچھ وقعت ہے انھوں نے اس خطبے کو اور کنووکیشن ایڈریس کو پسندیدگی اور اتفاق رائے کی نظر سے دیکھا۔

کتابیں!

اس عرصے میں کئی قابلِ ذکر کتابیں پڑھیں جن میں سے صرف چند کے نام یاد ہیں!
STAMP : LIVE, LEARN تعلیمی خطبات ہیں۔ لکھنے کا انداز پُرزور اور خیالات میں جدّت اور شگفتگی ہے۔ اس میں ایک LAYMAN کے نقطۂ نظر سے تعلیمی مسائل پر اچھا تبصرہ کیا گیا ہے۔
JAMES BARRIE کے ڈراموں کا ایک مجموعہ۔ چھوٹے بڑے ایک ایکٹ کے ڈرامے ہیں اور حسبِ معمول اس کے خیال کی لطافت اور اندازِ بیان کی نزاکت سے مالا مال ہیں اور انسانی فطرت کے کسی نہ کسی پہلو کی نقاب کشائی کرتے ہیں اس میں ایک ڈراما "سات عورتیں" ہیں جس کو پڑھ کر مجھے باچھو کی کہانی "تین عورتیں" یاد آئیں۔ اس پر خیال آیا کہ اس کی کہانیوں کا مجموعہ "ایک لڑکی" کے نام سے شائع ہوگیا ہے اور بحیثیت مجموعی قابلِ مبارکباد ہے۔
DOUGLAS REED کی کتاب ALL OUR TOMORROWS جس میں انگلستان کی موجودہ زندگی اور سیاسی اور سماجی تحریکوں پر ایک بے پناہ تنقید ہے اور ایک ایسے اثر آفریں طنز آمیز ظرافت نما انداز میں تنقید کی گئی ہے کہ انسان اسے پڑھ کر بے حد متاثر ہوتا ہے۔ کتاب کا اصل موضوع یہ ہے کہ انگلستان میں بعض ایسے گروہ اور باا‌ثر افراد ہیں خصوصاً گزشتہ چیمبرلین کی حکومت کے اراکین (جو اب بھی انگلستان کے سر پر مسلط ہیں) جو اپنے ذاتی اقتصادی مفاد کی وجہ سے حکومت کو نہ جنگ جیتنے دیتے ہیں، نہ جرمنی کی ہار اور روس کی واقعی کامیابی کے خواہش مند ہیں، نہ جنگ کے بعد کسی انقلابی پروگرام کے حامی ہیں اور جب تک ان لوگوں کو دور نہ کیا جائے گا اور رائے عامہ کو صحیح قسم کی تنقید سکھانے والی اور اپنے حقوق و فرائض سے آگاہ کرنے والی تعلیم نہ دی جائے گی، ملک کے لیے جنگ اور امن دونوں کا جیتنا ناممکن ہے۔ اس نے بالکل بے خطر ہوکر نہایت مقتدر، دولت مند اور با‌اثر افراد اور جماعتوں پر نہایت زبردست تنقید کی ہے اور اس طرح میرا خیال ہے انگلستان میں کافی اثر پیدا کرلیا ہے۔ ہندوستان میں تو شاید ایسی کتاب لکھنا ممنوع ہی ہو۔ اس میں وہ تمام بے ایمانیاں اور غداریاں اور طرفداریاں NEPTOSIM جو قوم کی بہتری کو روک رہی ہیں

اور اس کے مستقبل کو خطرے میں ڈال رہی ہیں بے نقاب کی گئی ہیں NEPOTISM کے لفظ پر خیال آیا کہ ابھی ریڈیو میں سنا کہ سر سکندر حیات کے صاحبزادے شوکت حیات عمر ۲۷ سال، پیشہ میجر، پبلک زندگی کا تجربہ صفر حکومت پنجاب کے وزیر مقرر ہوئے ہیں۔ خواہ وہ کیسے ہی آدمی ہوں لیکن انا للہ وانا الیہ راجعون۔ تف ہے اس جمہوریت پر جو حکومت کی ذمہ داری کو بیش قرار تنخواہوں اور منصبوں کا ہم معنیٰ سمجھے اور پھر اسے مالِ غنیمت کی طرح اپنے عزیزوں اور دوستوں میں تقسیم کرے۔ اس ملک کی نجات کا خدا ہی مالک ہے! یہ مثال چھوٹی سی ہے لیکن اس میں ایک زبردست اصول کا خون ہے جو اہم ہے...
REED کی کتاب کو پڑھ کر بے اختیار جی چاہا کہ موجودہ کام کو چھوڑ کر لکھنے کا پیشہ اختیار کرلوں۔(لیکن "حالات" کی بیڑی پاؤں میں! "مجبوریوں" کا طوق گردن میں ہے!) اگر کبھی ایسا کیا تو اس میں اس کتاب کا بہت کافی دخل ہوگا۔

WELLS نے ایک تمثیل PARABLE لکھ ڈالی ہے جس کا نام ہے ALL ABOARD FOR ACCURACY یعنی ENCYCLOPAEDIA کا پُرانا خیال ہے (کہ دنیا کے تمام علوم میں سے بہترین چیزوں کو صحیح طریقے پر مرتب کیا جائے اور ان کا باقاعدہ اور منظم طور پر پرچار کیا جائے تاکہ لوگوں کے خیالات کی اصلاح ہو) لیکن اسے ایک نئے انداز میں پیش کیا گیا ہے یعنی اس طوفانِ جنگ وجنون میں کچھ لوگ اس علم کو لے کر ایک کشتی نوح میں سوار ہوجائیں تاکہ یہ تباہی کی دست بُرد سے محفوظ رہے۔ اس پر مجھے رسول اللہ صلعم کی وہ مشہور حدیث یاد آئی "مثل اھل بیتی کمثل سفینۃ نوح من رکب بھا نجیٰ ومن لم یرکب مغرق دھویٰ" دراصل ان کے ارشاد کا مطلب یہی تھا کہ یہ بزرگ میری صحیح قدروں کے حامل اور مبلغ ہیں اور ان سے تمسک کرنا ان قدروں کا احترام اور تحفظ کرنا ہے وہ قدریں کیا ہیں؟ مفسّرین کے لیے لازم ہے کہ وہ ان کو بار بار دنیا کے موجودہ حالات کی روشنی میں کھول کھول کر بیان کریں اور لوگوں کے ذہن نشین کریں۔

ایک اُردو کی کتاب "زمانہ ساز" پڑھی جو مشہور بنگالی مصنف سرت چندر چٹر جی کے ناول کا ترجمہ ہے۔ کتاب اچھی ہے اور بنگالی زندگی کے ایک پہلو کو (جس میں مذہب

کے نام پر ریاکاریاں کی جاتی ہیں اور خدا کا نام لے کر غیر شریفانہ کام کیے جاتے ہیں) اچھی طرح پیش کیا گیا ہے۔ اسی کی وجہ سے اس مصنف کی ایک اور کتاب "پنڈت جی" پڑھی لیکن وہ اتنی اچھی نہ تھی۔

آج کل بہت سی کتابیں پڑھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرے خیالات جو پہلے مختلف خانوں میں بٹے ہوئے تھے ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہو کر ایک نئی شکل یا کم از کم زیادہ منظم شکل اختیار کر رہے ہیں اور تعلیم اور وسیع تر سیاسی اور سماجی تحریکوں کا قریبی تعلق زیادہ واضح ہو جاتا ہے۔ اس کا کچھ اندازہ میرے حال کے کنووکیشن ایڈریس اور اندور والے ایڈریس سے بھی ہوتا ہے جن میں خیال تعلیم کے محدود دائرے کو چھوڑ کر اور اس کے سیاسی اور سماجی حدبندیوں سے گزر کر آگے چلا جاتا ہے اور متعلقہ مسائل سے دوچار ہونا چاہتا ہے۔ گزشتہ دنوں انگلستان کے اہم تعلیمی ہفتہ وار TIMES EDUCATIONAL SUPPLEMENT کے گزشتہ دو سال کے بہت سے پرچوں کا مطالعہ کرنے سے بھی یہ معلوم ہوا کہ وہاں بھی تعلیم کے ترقی پسند مفکر انھیں روشوں پر چل رہے ہیں اور تعلیم کی تنظیم نو پر اس نقطۂ نظر سے غور کر رہے ہیں کہ آئندہ جو سوسائٹی تشکیل پائے گی اس کے بنانے اور سنبھالنے میں تعلیم کیا فرض انجام دے سکتی ہے۔ لیکن جن مسائل پر وہاں لوگ غور کر رہے ہیں ان کی طرف یہاں لوگوں کا دھیان ہی نہیں۔ یہاں ابھی تعلیم کی منزل "کمالِ یار جنگی" منزل ہے جہاں مسلمانوں کی تعلیمی خدمت چند غالباً جائز شکایتوں کے اظہار تک محدود ہے جو مسلمانوں کو ہندوؤں سے ہیں! اور نوکریوں، کمیٹی کے ممبروں کی تعداد اور رسمی مذہبی تعلیم کے مطالبہ پر زور دینا ہی نجات کا ذریعہ ہے!

ہند اُردو

ابھی دو تین روز ہوئے خاصا ایک چھوٹا سا فتنہ بمشکل دبانے میں کامیاب ہوا۔ ہمارے وزیر تعلیم مرزا جعفر علی خان صاحب نے رازدارانہ انداز میں بتایا کہ حکومتِ کشمیر (یعنی پرائم منسٹر) یہ چاہتی ہے کہ ریاست میں تعلیم کا مسئلہ اس طرح طے کیا جائے کہ مہاراجہ صاحب کی طرف سے ایک اعلان شائع کرا دیا جائے کہ ریاست میں وہ لغت کتابیں لکھنے کے لیے استعمال ہو

جو سادہ اُردو کی کمیٹی نے تیار کی ہے لیکن اس زبان کا نام "ہندارُدو" ہوگا اور وہ دونوں رسمِ خط میں لکھی جائے گی۔ انھوں نے کہا کہ یہ بات پرائم منسٹر کو بہت دُور کی سوجھی ہے۔ اس طرح زبان کے متعلق تمام شورش دب جائے گی کیوں کہ فرمانِ شاہی کی مخالفت کون کرے گا چناں چہ (انھوں نے بتایا) انھوں نے اس تجویز کی بہت پرجوش تائید کی ہے اور وہ اور پرائم منسٹر اس بارے میں (غالباً رسمی طور پر) میری رائے بھی معلوم کرنا چاہتے ہیں میں نے فوراً ہی محسوس کیا کہ یہ ایک بہت بڑے باہمی فتنے اور اختلاف کا پیش خیمہ ہوگا کیوں کہ اس ریاست میں نام تبدیل کرنے کے لیے کوئی معقول وجہ نہیں ہے۔ محض بعض لوگوں کے تعصب کی وجہ سے ایک مستند زبان کا مسلمہ نام تبدیل کرنے کا کسی کو حق نہیں۔ علاوہ اس کے انتظامی نقطۂ نظر سے ایک نزاعی معاملہ میں مہاراجہ صاحب کو گھسیٹنا کسی طرح مناسب نہیں۔ اور تیسرے اُصولاً یہ بات غلط ہے کہ کسی بڑے آدمی یا حاکم کے نام کی آڑ لے کر کسی اختلافِ خیال کو دبا دیا جائے۔ یہ تو اُصولِ حکومتِ جمہوری اور اصولِ انسانیت و انصاف کے بالکل خلاف ہے۔ شام کو پرائم منسٹر سے اس بارے میں گفتگو ہوئی۔ گو وزیرِ تعلیم اپنی رائے کی بے وجہ حمایت کرتے رہے لیکن پرائم منسٹر میں معاملہ فہمی کافی ہے اور وہ باوجود اپنی رائے پر سختی کے ساتھ کاربند ہونے کے معاملے کے مالۂ وما علیہ پر غور کر سکتے ہیں۔ چناں چہ جب میں نے انھیں بتایا کہ اس سے ریاست کے اندر اور ریاست کے باہر بہت اختلاف اور مخالفت ہوگی اور اس نام کی تبدیلی سے صرف نقصان ہوگا فائدہ کچھ نہ ہوگا تو وہ میرے نقطۂ نظر کو مان گئے۔ اور غالباً یہ طریقہ اختیار نہ کریں گے .... لیکن لوگ دیانت داری کے ساتھ سوچتے کیوں نہیں ؟

۲ مارچ علی گڑھ کی تعلیمی کانفرنس

اس عرصے کا نہایت اہم، کیوں کہ نہایت سبق آموز تجربہ، آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاسِ علی گڑھ تھا جس میں حکومتِ کشمیر کی طرف سے میں بھی شریک ہوا تھا۔ میں کانفرنس کے جلسوں میں شریک ہوا ہوں اور اس میں خاصا نمایاں حصّہ لیا ہے لیکن افسوس

ہے کہ سال بہ سال کانفرنس بجائے ایک زیادہ علمی اور مفید جماعت ہونے کے بے کار، دولت پرست اور پارٹی باز جماعت ہوتی جاتی ہے۔ بے کار تو اس وجہ سے کہ اس کی نمائشی اور تقریبی پہلو پر زور دیا جاتا ہے اور کام کا پہلو——تقریباً ناپید ہے! اس سشن میں خاص کر کے کمال یار جنگ کمیٹی کی رپورٹ زیرِ غور تھی۔ (اس کے علاوہ باقی اجلاس یا نمائشی تھے یا لوگوں کو ان سے دل چسپی نہ تھی۔ چناں چہ شعبۂ اصلاحِ معاشرت میں صرف ایک مضمون پڑھا گیا، اُردو کے شعبے میں بھی کام تھوڑا ہی ہوا اور مولوی عبدالحق صاحب نے، شاید عمر کے اثر سے، اپنے خطبۂ صدارت میں علی گڑھ کے انھیں لوگوں کو بُرا بھلا کہا جنھوں نے شعبہ کا اجلاس کرایا تھا اور اتفاقاً وہی لوگ کسی قدر کارکن بھی ہیں اور باوجود آج کل کے علی گڑھ کا جزو ہونے کے کچھ حریتِ فکر قائم رکھتے ہیں) لیکن یہ اجلاس بجائے ۹ بجے شب کے شروع ہونے کے ۱۱½ بجے شروع ہوا اور عائدین اس کے بھی بعد تشریف لائے۔ اس سے پہلے تعلیمی شعبے میں ڈاکٹر ضیاء الدین کی صدارت میں رپورٹ پر بحث ہوئی تھی۔ اس موقع پر انھوں نے ایک بے سروپا خطبہ پڑھا تھا جس میں ایک بھی تخلیقی خیال یا تخیل کی چاشنی نہ تھی جس سے معلوم ہوتا تھا کہ انھیں نہ صرف تعلیم کے نصب العین اور حقیقی مسائل سے دور کا لگاؤ بھی نہیں بلکہ انھوں نے اس رپورٹ کی لایعنیت کو بھی نہیں سمجھا۔ میری اور بعض دوسرے لوگوں کی تحریک پر یہ طے پایا تھا کہ یہ رپورٹ ناقص اور نامکمل ہے اور اس کی تکمیل کے لیے ایک اور کمیٹی بنائی جائے۔ اس آخری اجلاس میں اس کمیٹی کی تشکیل ہونی تھی اور شعبے کی سفارش پر رائے زنی۔ کانفرنس کے اس جلسے میں جہاں نام نہاد طور پر مسلمانوں کا تعلیمی مستقبل طے ہو رہا تھا اصل مسئلہ پر کوئی معقول اور مفید تقریریں نہیں ہوئیں البتہ رات کے ۱۲ بجے سے تقریباً صبح کے تین بجے تک کمیٹی کے ممبران کے متعلق بحث ومباحثہ اور توتو میں میں ہوتی رہی اور سارا معاملہ اتنا تھا کہ کانفرنس کے چند معقول لوگ چاہتے تھے کہ کمیٹی میں ذاکر صاحب کا اور میرا نام ضرور ہو اور ڈاکٹر ضیاء الدین کی پارٹی اور سب سے زیادہ وہ خود اس چیز سے گھبراتے تھے کیوں کہ ان کی ہمیشہ یہ پالیسی رہی ہے کہ ہر معاملہ میں غیر جانبدار، آزاد خیال اور اہل الرائے لوگوں کے لینے میں احتیاط کی جائے! چناں چہ کانفرنس کو بھی

انھوں نے اسی طرح بازیچۂ طفلاں بنا دیا ہے اور ہم لوگوں کو لینے کی کھلم کھلا مخالفت تو نا ممکن تھی لیکن ہر قسم کی کوشش اور سازش اور جھوٹ کو استعمال کیا جا رہا ہے تاکہ یہ نہ ہو سکے۔ چنانچہ ووٹوں کو غلط لکھانے کی کوشش کی گئی۔ ووٹ دہندگان پر (رات کے ۲ بجے جب بارہ ووٹ دے چکے تھے) اعتراض کیا گیا کہ یہ ووٹ کا حق نہیں رکھتے۔ یہ دھمکی دی گئی کہ ہم تین چار آدمی استعفا دے دیں گے، یہ کہا گیا کہ ذاکر صاحب چوں کہ بنیادی قومی تعلیم کی اسکیم کے بنانے والے ہیں (اور میرا بھی اس سے تعلق ہے!) اور کانگرس کے لوگوں سے ان کے مراسم ہیں اس لیے ان کے لیے جانے پر قائدِ اعظم کو اعتراض ہوگا۔ میرے پاس پیامبر بھیجے گئے کہ میں ذاکر صاحب کے نام پر اصرار نہ کروں بلکہ خود شریک ہو جاؤں۔ اپنے سے اختلافِ رائے رکھنے والی پارٹی کو یہ "رشوت" دی گئی کہ علی گڑھ سے چار نام وہ خود پیش کر چکے ہیں، تین نام وہ لوگ پیش کریں بشرطیکہ وہ سب حیدر آباد کے ہوں! (گویا علی گڑھ اور حیدر آباد کے سوا کوئی دوسرا صاحب الرائے ہندوستان میں ہو نہیں سکتا) مطلب یہ تھا کہ اس طرح ذاکر صاحب کا اور میرا نام نہ آسکے گا۔ لیکن باوجود ان کی کوشش اور ریشہ دوانی کے یہ بات نہ چلی۔ میں نے اصولاً یہ بات پیش کی کہ اگر یہ کانفرنس اور اس کی کمیٹی کسی شخص کی ذاتی جائداد ہے تو وہ ذاتی مخالفت کی بنا پر کسی نام کی مخالفت کر سکتا ہے۔ یا اگر یہ پارٹی کی ملکیت ہے تو دوسری پارٹی کے لوگوں کے لیے جانے پر اعتراض ہو سکتا ہے۔ لیکن اس طرح گھٹیا قسم کے زمین دوز طریقوں سے معاملہ کو خبطے میں ڈالنا ممکن نہ ہوگا۔ آخر میں اصول کو تسلیم کرا لینے کے بعد میں نے اپنا نام واپس لے لیا اور ذاکر صاحب کمیٹی کے رکن قرار پائے اور اہلِ باطل کو شکست ہوئی۔ ذاکر صاحب کے لیے اس کمیٹی میں کام کرنا کوئی اعزاز نہیں لیکن ان جیسی قابلیت اور شخصیت کے آدمی کو نظر انداز کرنا انتہائی بددیانتی ہوتی اور ملتِ اسلامیہ کی آنکھوں میں دھول جھونکنا!۔ اس لیے خوشی ہے کہ ان لوگوں کو زک ہوئی گو شاید ان کی مخالفت جو میری ذات سے انھیں ہے وہ بڑھ گئی ہوگی۔ لیکن مجھے اس کی پروا نہیں ــــــ

کانفرنس دولت پرست ہے۔ وہ کسی کم و بیش نا اہل دولت مند شخص کو چھانٹ لیتی ہے اور اسے صدر بنا دیتی ہے تاکہ وہ تھوڑے سے روپے کانفرنس کا دفتر اور کاروبار چلانے کے

لیے از راہِ عنایت دیدے۔ چناں چہ سیٹھ عبدالکریم مدراس والے، مقبول قریشی بھاول پور والے، کمال یار جنگ، ظہیر یار جنگ وغیرہ سب اسی بنا پر صدر ہوئے ہیں! اسی وجہ سے کانفرنس کی کوئی علمی قدرو منزلت نہیں ہے اور نہ ہو سکتی ہے وہاں دولت علم کی خادم نہیں، مخدوم ہے! ایک نئی شان یہ ہے کہ ہر مخالفت کے لیے جو کسی معقول تجویز کی کرنی مقصود ہے پاکستان، اسلام، قائدِ اعظم کی آڑ لی جاتی ہے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون.....

پرائم منسٹر کی رخصت

اس ہفتے کا ایک اہم واقعہ جس کا میرے کام پر یقیناً اثر ہوگا یہ ہے کہ ریاست کشمیر کے پرائم منسٹر آئندہ ماہ میں ریٹائر ہو رہے ہیں۔ انھوں نے تعلیمی تجاویز میں بہت دل چسپی لی اور خود میرے ساتھ بہت اچھا ذاتی برتاؤ کیا۔ ان کی وجہ سے مجھے اپنے کام میں بے حد سہولتیں رہیں۔ ان کے جانے کا مجھے افسوس ہے کیوں کہ وہ اپنے خیال کے مطابق دیانت داری اور جرأت کے ساتھ کام کرتے رہے اور ان کی قابلیت مسلّمہ ہے۔ ریاست میں کوئی شخص اس درجہ بیدار مغز، معاملہ فہم اور محنت سے کام کرنے والا نہیں ہے۔ مجھے ان سے اختلافِ رائے بھی ہوا خصوصاً اردو کے اور رسمِ خط کے مسئلے میں لیکن اس کی وجہ سے نہ ہمارے مراسم خراب ہوئے، نہ انھوں نے اختلافِ رائے کو مخالفت سمجھا، حالاں کہ عام طور پر ریاست میں کسی شخص کو ان کی رائے سے اختلاف کرنے کی جرأت نہیں ہوئی اور لوگ سمجھتے ہیں کہ ایسا کرنے سے وہ ناخوش اور مخالف ہو جائیں گے۔ لیکن اگر انسان آزادیٔ رائے کو بیچ ڈالے تو کیا رہ جاتا ہے!۔

یکم اپریل

آج بہت روز کے بعد ڈائری لکھنے کا موقع ملا۔ اس عرصے میں قابلِ ذکر باتیں کم ہوئیں۔ کتابیں تو کئی پڑھنے میں آئیں لیکن ان میں سے زیادہ پُر اثر اور زور دار مارس ہندس کی UNDER THE MOSCOW SKIES ہے جو چند سال ہوئے شائع ہوئی تھی لیکن مجھے اب تک اس کے

پڑھنے کا موقع نہ ملا تھا۔ اس کتاب میں انقلابی روس کے اس زمانے کا نہایت جیتا جاگتا اور ڈرامائی بیان ہے جب پہلا "پانچ سالہ پروگرام" روس میں چل رہا تھا اور اس دورِ پُرآشوب میں، جو بلند امیدوں اور کٹھن آزمائشوں کا زمانہ تھا، انفرادی اور اجتماعی زندگی کی کش مکش کا نہایت دل آویز اور پُرزور نقشہ کھینچا گیا ہے۔ ایک طرف تو افراد کو اجتماعی زندگی کے اعلیٰ مقاصد کے ساتھ وابستہ کر کے ان میں سے کروڑوں کی زندگی میں پہلی مرتبہ معنویت اور مقصد کی جھلک پیدا ہوئی تھی اور قابلیت اور سوشل سروس کی تڑپ رکھنے والے لوگوں کے لیے ترقی کے دروازے پہلے پہل کھلے تھے۔ دوسری طرف سوسائٹی کی اٹل اور جابر ضرورتوں نے ذاتی زندگی کی حدود اور افراد کے جذبات پر یورش کر کے اس کی حدود کو تنگ کر دیا تھا۔ تیسری طرف جہاں مزدوروں اور کاشتکاروں کے لیے خدا کی زمین اور خدا کی دنیا کھلی ہوئی تھی، باقی تمام لوگوں کے لیے جو پیدائش کے اعتبار سے ان جماعتوں سے تعلق نہ رکھتے تھے یا انقلاب کے بنیادی اصولوں بلکہ اس کی فروعات کو بھی بے چون و چرا تسلیم نہ کر لیتے تھے، خدا کی دنیا تنگ ہو گئی تھی اور دورِ عبوری کی جس قدر مصیبتیں اور آزمائشیں ہوتی ہیں وہ ان پر پوری قوت کے ساتھ ٹوٹ پڑی تھیں ان کے لیے نہ صرف اجتماعی زندگی کی چہل پہل اور ترقی میں حصہ لینا ناممکن ہو گیا تھا بلکہ زندگی بسر کرنا دشوار تھا۔ دونوں پہلوؤں کو مصنف نے نہایت وضاحت کے ساتھ دکھایا ہے اور اگرچہ اس کی اپنی ہمدردی انقلاب کے ساتھ ہے لیکن اس نے بیان کی یک طرفگی سے آرٹ کے مطالبات کا خون نہیں کیا کیوں کہ زندگی پروپیگنڈا سے زیادہ اہم اور زیادہ وسیع ہے...... در اصل اس زبردست اور تاریخ ساز انقلاب کا سب سے زیادہ بحث طلب اور متنازع پہلو اس کی عصبیت اور خوں ریزی ہے اور گو اس کی حمایت میں بہت سی عملی مصلحتیں پیش کی گئی ہیں اور پیش کی جا سکتی ہیں لیکن دل میں یہ سوال باقی رہتا ہے کہ کیا انسانیت کو بچانے کے لیے انسانوں کے ساتھ اس درجہ ظلم اور سختی روا ہے؟

اس زمانے میں حکومتِ ہند کی طرف سے بے ضابطہ طور پر سارجنٹ صاحب (ایجوکیشنل کمشنر) نے مجھ سے دریافت کیا کہ آیا میں بلوچستان میں کچھ عرصے کے لیے بحیثیت ناظمِ تعلیمات جانے کو تیار ہوں یا نہیں۔ ذاکر صاحب اور عابد صاحب کا مشورہ تھا کہ ضرور جاؤ لیکن میں

نے بہت غور اور تامل کے بعد یہ طے کیا کہ فی الحال اس پیش کش کو قبول نہ کروں۔ ایک تو وہاں مقابلتاً کام کا میدان یہاں کی نسبت محدود ہے، دوسرے اس وقت شاید یہاں تعلیمی کام چھوڑنے کی وجہ سے جو صورت تعلیمی تنظیم کی پیدا ہوئی ہے وہ خطرے میں پڑ جائے گی۔ تیسرے ایک خیال یہ بھی آتا ہے کہ آج کل حکومتِ ہند کا جو رویہ ملک کی سیاسی جماعتوں اور امنگوں کی طرف سے ہے اس کے پیشِ نظر اس وقت حکومت کے ساتھ منسلک ہونا کہاں تک مناسب ہوگا۔ بہرحال خدا مالک ہے۔ فی الحال تو انکار کر دیا ہے۔

آج اسمبلی میں تعلیم کے بجٹ پر بحث تھی۔ اس میں تمام تحریکوں کا جواب مجھے ہی دینا پڑا۔ ایک بحث ذرا گرم اور دل چسپ رہی۔ مسلمانوں کے بعض ممبروں کی طرف سے یہ تجویز تھی کہ پہلی جماعت سے آٹھویں جماعت تک عربی مسلمان طلبہ کے لیے لازمی کر دی جائے۔ میں نے اس کی مخالفت کی اور اس کے اصولی، نفسیاتی، انتظامی اور امتحانی نتائج اور پہلوؤں کو واضح کیا اور (اسمبلی کی رائے میں) غالباً بہت مدلل اور موثر تقریر کی۔ لیکن ان ناسمجھ ممبروں کو اس بات پر اصرار رہا کہ ہر قسم کے مصالح کو نظر انداز کر کے محض مسلمانوں کو خوش کرنے کے لیے حکومت اس تجویز کو مان لے خواہ اس کی وجہ سے طلبہ کے ذہن پر ناقابلِ برداشت بار پڑے یا وہ سب کے سب دوسرے ضروری مضامین مثلاً سائنس، ڈرائنگ، فارسی، اُردو وغیرہ، پڑھنے سے رُک جائیں!! اور اس مہمل دلیل کے لیے مذہب کی آڑ لی جاتی ہے گویا کہ پانچویں جماعت تک طلبہ عربی پڑھ کر قرآن، حدیث، تفسیر اور مذہبی ادب کے ماہر ہو جائیں گے۔ جب ضد آنکھوں پر پردہ ڈال دیتی ہے تو عقل رخصت ہو جاتی ہے۔ گزشتہ سال یا دو سال ہوئے اسی قسم کی ایک تجویز ہندی کو لازمی اور جبری کرنے کے متعلق پیش ہوئی تھی۔ اس وقت بھی میں نے اس کی مخالفت کی تھی اور کہا تھا کہ اس کو محض ایک اختیاری مضمون کا درجہ دیا جا سکتا۔

۲۱؍ جون

کشمیر آئے بہت دن گزر گئے لیکن اتنے عرصے میں کچھ لکھنے کا موقع نہیں ملا۔ چند باتیں جو اس زمانے میں پیش آئیں بے ترتیب لکھتا ہوں۔

حکومتِ کشمیر کا نیا دور شروع ہو گیا اور نئے پرائم منسٹر کے متعلق اور ان کی پالیسی کے متعلق رائے قائم کرنے کا تھوڑا سا موقع ملا ہے۔ آدمی شریف اور نیک نیت ہیں لیکن جس قدر معاملہ فہمی اور بات کی تہ تک پہنچنے کی صلاحیت ان کے پیش رو میں تھی ان میں نہیں ہے۔ ہر کسی کی بات سے متاثر ہوتے ہیں۔ جلدی رائے قائم کر لیتے ہیں اور جلدی ہی بغیر سوچے سمجھے اسی کا اظہار کر دیتے ہیں۔ "خمِ برخشت کلیا" رکھنے کے قائل نہیں معلوم ہوتے۔ تخفیفِ مصارف کا مسئلہ ان کے پیشِ نظر ہے اور اس نے ان کی نگاہ کو ایک حد تک محدود کر دیا ہے۔ چناں چہ اس محکمہ میں انھیں تعلیمِ بالغان کی تحریک غیر ضروری معلوم ہوتی ہے اور بعض لوگوں سے انھوں نے (پوری طرح صورتِ حال کا مطالعہ کیے بغیر) اس رائے کا اظہار بھی کر دیا ہے۔ میرے پاس اظہارِ رائے کے لیے معاملہ آیا تھا اور میں نے بہت سختی کے ساتھ اس کی مخالفت کی ہے کیوں کہ اس وقت اس کو بند کرنے سے نہ صرف یہ مفید کام (جو باوجود اپنی خامیوں اور نامکمل تنظیم کے نہایت درجہ مفید ہے) آگے نہیں بڑھے گا بلکہ جو وقت، محنت اور روپیہ اس پر اب تک صرف ہوا ہے وہ بھی بے کار جائے گا۔ میں نے حکومت کو آگاہ کر دیا ہے کہ اگر وہ ایسا اقدام کرے گی تو لوگوں کو نقصان ہوگا اور اپنی تعلیمی پالیسی کی شہرت کو بٹہ لگائے گی .... معلوم نہیں ہندوستان میں لوگ اس درجہ تنگ نظر کیوں واقع ہوئے ہیں؟ دوسرے ملکوں میں (خصوصاً انگلستان میں باوجود جنگ کی یورش اور اخراجات کے تعلیمی کاموں پر پہلے سے کہیں زیادہ روپیہ خرچ کیا جا رہا ہے اور ہمارے ہاں جب کبھی تخفیف کا سوال پیش آتا ہے تو سب سے پہلے تعلیم کی طرف نظر اٹھتی ہے!۔ اگر ملک کی سیاست ایسے ہی لوگوں کے ہاتھ میں رہی تو جنگ کے بعد کیا ہوگا اور ہندوستان کا مستقبل کیا شکل اختیار کرے گا .... ایک مشکل کام میں اس وجہ سے بھی پیدا ہوتی ہے کہ فی الحال کوئی شخص کام کو اور محکمہ کے مفاد کو اپنی ذاتی ذمہ داری نہیں سمجھتا بلکہ کاغذی کارروائی اکثر دفتروں کے لیے کافی ہوتی ہے۔ برخلاف اس کے مجھے ہر وہ معاملہ جس کا تعلق محکمہ کے مفاد سے ہو اپنا ذاتی معاملہ معلوم ہوتا ہے اور میں اس کی پیروی اسی طرح کرتا ہوں اور یہاں لوگ ہر چیز سے بے پروا ہوتے ہیں سوائے ان معاملات کے جن کا اثر ان کی ذاتی پوزیشن یا تنخوا

پر پڑتا ہو! اگر بتوں کی خو ایسی ہو تو گزارہ کیوں کر ہو!

صابرہ میرے ساتھ کشمیر آئی ہے۔ اس کا نتیجہ نکل آیا ہے اور اس نے بی اے اول درجے میں پاس کر لیا ہے۔ مجھے اس کی قابلیت اور مزاج کی خوبی، صلاحیت اور شرافت کو دیکھ کر بہت خوشی ہوتی ہے اور امید بندھتی ہے کہ شاید اس کی بدولت اس کے خاندان اور بھائی صاحب مرحوم کا نام روشن ہو۔ کاش اس کی بہنوں میں اس کی صلاحیتوں کا تھوڑا سا شائبہ بھی ہوتا! ساجدہ نے بھی اس سال انٹرنس پاس کر لیا ہے۔

مجھے پوری طرح زہرا، بلقیس، ذکیہ اور بالخصوص ذکیہ کی طرف سے اطمینان نہیں۔ زہرا تو بہت شریف ہے اور بحیثیت مجموعی اور طبیعت کے اعتبار سے اچھی لڑکی ہے اگرچہ اس میں استقلال اور پتّا مار کر کام کرنے کی صلاحیت کم ہے۔ بلقیس زیادہ چونچال اور شوخ ہے۔ لوگوں سے ملنے جلنے میں اچھی ہے لیکن مزاج کی تیز ہے۔ بالخصوص ذکیہ کے ساتھ س کی نہیں بنتی جس کا مجھے بہت افسوس ہوتا ہے۔ یہ نہیں کہ میں اس وقت کے جھگڑوں کو غیر معمولی وقعت دیتا ہوں لیکن بہرحال اتنا ضرور جانتا ہوں کہ اس وقت کی عادتوں اور باتوں کا سیرت کی تشکیل پر بہت گہرا اثر پڑتا ہے۔ ذکیہ کی طبیعت کا مسئلہ ذرا اُلجھا ہوا بن گیا ہے جس کی مختلف وجوہات ہیں اور اس میں اس کے بڑوں کا ہاتھ بھی ہے۔ اس میں محبت کی بہت صلاحیت ہے لکھنے پڑھنے خصوصاً لکھنے کا بہت شوق ہے۔ نماز (جو حال ہی میں شروع کی ہے) نہایت پابندی اور خوشی کے ساتھ پڑھتی ہے لیکن نہ معلوم کیوں (اور یہ میری نفسیاتی واقفیت کی شکست کا ثبوت ہے!) اس کے کاموں میں اور باتور میں صفائی اور صاف گوئی نہیں۔ سچ نہیں بولتی۔ چیزیں چھپ کر کھاتی ہے اپنی خطا کا اعتراف نہیں کرتی! ابھی بہت چھوٹی ہے اور اس سے غیر معمولی توقعات رکھنا فضول ہے لیکن مجھے ار بچیوں سے اس درجہ محبت ہے اور ان کے لیے ذاتی اور خاندانی معیارِ عمل میری نگاہ میں ا قدر بلند ہے کہ چھوٹی چھوٹی باتیں بھی مجھے تکلیف دیتی ہیں!۔ اس بارے میں جب تک عزیز دانش مندانہ انداز اور توجہ نہ ہو کامیابی مشکل ہے ...... رہی سیدہ سلمیٰ تو وہ (بقول ذ "کمال ہی کمال ہے" اور پیاری ہی پیاری ہے!!

کتابیں کئی پڑھیں لیکن زیادہ قابلِ ذکر REED کی کتاب A PROPHET AT HOME اور PIERRE VON LARSIN کی DAYS OF ONE YEARS ہے۔ اوّل الذکر کی ایک کتاب پر تبصرہ کر چکا ہوں۔ یہ بھی اسی انداز میں لکھی گئی ہے۔ اسلوبِ تحریر بہت دل نشیں اور دل کش ہے اور برطانوی سیاست اور معاشرتی زندگی کی کمزوریوں کو (اور بعض خوبیوں کو) نہایت زور کے ساتھ بے نقاب کیا گیا ہے۔ دوسری کتاب ایک DUTCH مصنف اور جرنلسٹ کی ہے۔ کتاب بہت مشہور ہوئی ہے اور اتفاقاً وہ اس شہرت کی مستحق بھی ہے اس میں بھی گزشتہ جنگ سے لے کر اس جنگ کے زمانے تک کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ مصنف ایک ترقی پسند اور باخبر سوشلسٹ ہے اور اپٹن سنکلز وغیرہ کی طرح اس حقیقت سے واقف ہے کہ جب تک سرمایہ داری نظام اور جماعتی ظلم کا سلسلہ جاری ہے نہ جنگ بند ہو سکتی نہ لوگوں کی زندگی میں شرافت، تہذیب، رواداری اور فارغ البالی کے چراغ جل سکتے ہیں۔ وہ ان باتوں سے واقف بھی ہے اور ان کے بیان میں اپنے خلوص، جوش اور تحریر کی خوبی سے ایسا زور پیدا کر دیتا ہے کہ بے اختیار اسے داد دینے اور خود کو نفرین کرنے کو جی چاہتا ہے!

ایک اردو کی کتاب کرشن چندر کی "شکست" پڑھی۔ یہ ایک ناول ہے جس کا پلاٹ کشمیر میں واقع ہوتا ہے۔ سیرت نگاری، کہانی کی دل چسپی، فطرت کا مطالعہ، بحیثیت مجموعی زبان کا زور اور تشبیہ و استعارہ کی لطافت تمام چیزیں قابلِ تعریف ہیں اور ان سب کے ساتھ ساتھ مصنف کی اقدار معقول ہیں اور کسی معاملے میں تعصب یا جنبہ داری کا اظہار نہیں ہوتا۔ میرا خیال ہے کہ کرشن چندر آگے چل کر اردو کا ایک نامور مصنف بنے گا۔

آج ہی ہم لوگ دو روز ڈوڈنگے میں بسر کر کے واپس آئے ہیں۔ نسیم باغ، نشاط، شالیمار وغیرہ گئے۔ سب گھر والے ساتھ تھے اور یہ دو دن خاصے دل چسپ گزرے۔ بارش نے ذرا لطف کرکرا کرنے کی دھمکی دی تھی لیکن زیادہ دقت نہیں ہوئی۔ بچوں نے بھی لطف اُٹھایا..... نفسیاتی نقطۂ نظر سے یہ مطالعہ دل چسپ ہے کہ اگر دس پندرہ آدمی کئی دن تک ایک ہی کمرے میں یا ایک ہی جگہ اکٹھے رہیں تو ان کی طبیعت پر کیا کیا اثر ہوتا ہے۔ بحیثیت مجموعی یہ کہ کرشن کامیاب رہا۔

۹ ستمبر

دو ڈھائی مہینے اور گزر گئے۔ زندگی اسی طرح بیتی جاتی ہے! اس عرصے میں خاصی پریشانی رہی، یعنی محکمانہ کام کے سلسلے میں اور ریاست میں بھی کئی اہم تبدیلیاں ہوئیں۔ سر مہاراج سنگھ کا دورِ حکومت چند ہفتوں میں ختم ہوگیا۔ وہ نہ یہاں کے معاملات کو سمجھ سکے، نہ یہاں کی سازشوں کا مقابلہ کر سکے، نہ ان میں صحیح قسم کی مردم شناسی تھی۔ محض شریف اور نیک نیت آدمی تھے لیکن ظاہر ہے کہ کشمیر جیسی پیچیدہ ریاست کے معاملات کو سنبھالنے کے لیے یہ صفات کافی نہیں۔ چوں کہ علاوہ اور باتوں کے وہ صاف گو بلکہ پُرگو بھی بہت تھے اس لیے ان کے متعلق غلط فہمیاں پھیلانا آسان تھا۔ سب سے زیادہ یہ کہ کشمیری پنڈت پارٹی نے جو برسرِ اقتدار ہے یہ محسوس کیا کہ شاید ان کی وجہ سے ان کے اقتدار اعلا میں کچھ رخنہ پڑ جائے لہٰذا انھوں نے ان کے لیے یہاں کام کرنا مشکل کر دیا اور وہ رخصت ہو گئے۔ اس کی وجہ سے بعض درباری حلقوں کی قوت اور اثر میں اضافہ ہوگیا جس کا غالباً وہ جائز اور ناجائز فائدہ اُٹھا رہے ہیں۔ چناں چہ سر رام ناتھ چوپڑا کے بجائے، جو اب تک ڈائرکٹر میڈیکل سروس تھے اور بحیثیت ایک سائنس داں کے بہت عمدہ شہرت رکھتے تھے ایک کشمیری پنڈت کو D.M.S. بنا دیا گیا اور چوپڑا صاحب کو محض جموں کی دوا ساز لیبریٹری کا چارج دے دیا گیا! اسی طرح طیب جی کو چیف انجینیری سے ریٹائر کر کے ایک خاصے جونیر اور نو عمر آدمی کو چیف انجینیر بنا دیا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اب صرف تعلیم کے محکمہ کی ڈائرکٹری مسلمان کے ہاتھ میں ہے۔ باقی تمام محکموں کے صدر ہندو ہیں۔ اربابِ سازش نے میرے کاموں میں بھی خلل ڈالنے کی کوشش کی ہے لیکن ابھی تک چنداں کامیابی ہوئی کیوں کہ میں نہ انھیں اس کا موقع دیتا ہوں نہ ان کی مداخلت کو گوارا کرتا ہوں خواہ وہ کیسی ہی نقاب پوش کیوں نہ ہو، خواہ اس کے لیے کسی اعلا ترین عہدے دار کو اپنا آلۂ کار کیوں نہ بنائیں! البتہ سر مہاراج سنگھ کی سادگی اور سہل یقینی سے فائدہ اُٹھا کر انھوں نے اس سال کے بجٹ میں سے تعلیمِ بالغان کی رقم حذف کرا دی ہے۔ میں نے اس کی بہت سختی سے مخالفت کی تھی۔ لیکن باوجود اس کے انھوں نے تخفیفِ مصارف کی آڑ لے کر کونسل

سے یہ حکم پاس کرا دیا کہ تحریک فی الحال بالکل بند کر دی جائے۔ لیکن میں اس رائے کو بالکل غلط اور نامعقول سمجھتا ہوں۔ اس سے نہ صرف کام آگے نہیں بڑھے گا بلکہ جو وقت، محنت اور روپیہ صرف ہوا ہے وہ بھی بے کار جائے گا۔ لہٰذا میں نے بحیثیت ناظمِ تعلیمات کے فیصلہ کیا ہے جہاں تک امکان میں ہوگا کام جاری رہے گا گو اسے فی الحال اعزازی طور پر ہی کرنا پڑے گا۔ چناں چہ یہ ایک دل چسپ (اور بعض لحاظ سے افسوس ناک) صورتِ حال پیدا ہو گئی ہے حکومت جس کا فرض ہے کہ وہ عوام کی تعلیم کا انتظام کرے اس فرض سے سبکدوش ہو گئی ہے۔ محکمہ جس کے لیے اس حکمِ امتناعی سے کافی سہولت پیدا ہوتی ہے کام جاری رکھنے پر بضد ہے (کم از کم میں ضرور ہوں!) وقت بتائے گا کہ اس بارے میں حکومت نے قوم کے ساتھ وفا کی یا محکمۂ تعلیم نے اور مجھے یقین ہے کہ تعلیمِ تاریخ کا فیصلہ ہمارے حق میں ہوگا اور حکومت کو اس اقدام کے لیے (جو بعض خاص اثرات اور سازشوں کی وجہ سے کیا گیا ہے) شرم سار ہونا پڑے گا۔ (بات یہ ہے کہ یہاں کے VESTED INTEREST جن میں مختلف قسم کے لوگ شامل ہیں چاہتے ہی نہیں کہ تعلیم عام ہو کر ان کے حلوے مانڈے میں فرق پڑے۔ ظلم اور ناانصافی کے پھلتے میوے کے لیے جہالت کی تاریکی اور بے بسی سازگار ہیں!) ابھی چند روز ہوتے یہاں شمالی ہندوستان کی تعلیمِ بالغان کی کانفرنس کا چوتھا اجلاس ہوا تھا جس کا افتتاح میں نے کیا تھا۔ اپنے خطبے میں میں نے بے لاگ اور "غیر ملفوف" الفاظ میں اس طرزِ خیال پر نفریں کی جو عام لوگوں کی حالت سے بے نیاز ہو کر تہذیب و تمدن کے پھل صرف اپنی ذات کے لیے یا اپنی جماعت کے لیے مخصوص کرنا چاہتا ہے۔ مخالفین چراغ پا ہوئے ہوں گے لیکن کیا کریں۔ بات نہ صرف سچی ہے بلکہ ناقابلِ مخالفت ہے! اسی عرصے میں افسرانِ محکمۂ تعلیم کی سالانہ کانفرنس بھی ہوئی۔ اس میں بھی میں نے صاف صاف کہہ دیا کہ مخالفین کا یہ پروپیگنڈا کہ حکومت محکمۂ تعلیم کے کام کو محدود کرنا چاہتی ہے اور اس کی بڑھتی ہوئی اسکیموں کی طرف سے غافل ہے بالکل غلط اور جھوٹا ہے اور محکمہ کا فرض ہے کہ اسی مستعدی اور وسعتِ نظر سے کام جاری رکھے جس طرح گزشتہ چند سال سے ہوتا رہا ہے..... (اگر یہ خوش فہمی حکومت کے حق میں ناواجب ہے تو خدا میرا

قصور معاف کرے!) یہاں کا ایک خاص حلقہ محکمۂ تعلیم کے اور میرے خلاف علاوہ بعض مقامی رسوا اخباروں کے پنجاب کے ایک دو اخباروں میں بھی پروپیگنڈا کر رہا ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ جنبہ داری کا سلوک ہے اور تعلیم بالقان ایک اسلامی تحریک ہے (کیوں کہ اس میں جامعہ ملّیہ کے تیار کردہ چارٹ استعمال کیے گئے ہیں!!) حالاں کہ واقعہ یہ ہے کہ میں نے ہندوؤں کے ساتھ اس قدر احتیاط کے ساتھ انصاف کیا ہے کہ ایک مثال بھی ایسی ملنی ناممکن ہے جس میں کسی مسلمان کو ناجائز طور پر فائدہ پہنچایا گیا ہو۔ میرے لیے ناانصافی کرنا طبعاً ناممکن ہے۔ البتّہ نالائقی اور سازش کے ساتھ رواداری برتنا یا کسی با اثر جماعت کو خوش کرنے کے لیے نا اہل لوگوں کی سرپرستی بھی اتنی ہی ناممکن ہے اور یہی میرا اصل گناہ ہے..... اور لطف یہ ہے کہ مسلمانوں کے متعصب اخباروں اور بعض افراد کا یہ الزام ہے کہ یہ "کانگریسی" اور قوم پرست ہے" لہٰذا مسلمانوں کے ساتھ محکمہ میں انصاف نہیں ہو سکتا۔

زاہدِ تنگ نظر نے مجھے کافر جانا اور کافر یہ سمجھتا ہے کہ مسلماں ہوں میں!

لیکن ایسے جاہل، عاقبت نا شناس لوگوں کی تحسین سے ان کی ملامت بہتر ہے۔ اصل تحسین انسان کے اپنے ضمیر اور حق شناسی کی ہے۔ اگر وہ حاصل ہے تو کافی ہے۔

گزشتہ دنوں بشیر زیدی مع اپنی بیوی بچوں کے آئے تھے ایک ماہ تک قیام رہا۔ ان کی وجہ سے کافی رونق اور دل چسپی رہی۔ دونوں میاں بیوی بہت سی خوبیوں کے مالک ہیں اور کام کرنے کی عمدہ صلاحیت رکھتے ہیں جو ہندوستان میں ذاتی شرافت سے بھی زیادہ ناپید صفت ہے!۔

حامد (لڈوا) بھی آئے تھے۔ ان کی صفات میں وہم کا اضافہ ہو گیا ہے جس کی وجہ صحت کی خرابی ہے۔ یہ صحت کی خرابی بھی دل چسپ چیز ہے۔ عجیب عجیب نتائج پیدا کرتی ہے۔ عظمت الٰہی زبیری، زاہد حسین (حکومتِ ہند کے فنانس ڈپارٹمنٹ والے) ڈاکٹر عمر حیات ملک وغیرہ سے بھی ملاقات رہی۔ زاہد صاحب سمجھدار اور صاف گو اور معقول آدمی معلوم ہوتے ہیں۔

علی گڑھ میں ڈاکٹر ضیاء الدّین صاحب کا راج ہے۔ چوں کہ ان کا TERM فی الحال ختم

ہو رہا ہے۔ اس لیے اس وقت بعض نئی اسکیمں بنانے کی دُھن ہے۔ ان میں سے ایک اسکیم (یونی ورسٹی میں فیکلٹیوں کا قیام) میرے پاس بھی اظہارِ رائے کے لیے آئی ہے۔

سفرِ پشاور

۱۹۴۳

پشاور کی لٹریری لیگ کا گزشتہ سال سے تقاضہ تھا کہ ان کے کسی جلسے میں آکر تقریر کروں۔ چناں چہ ۱۶؍اکتوبر کو وہاں گیا، دو روز ٹھیرا (اپنے پرانے استاد اور دوست شاہ عالم خاں صاحب کے ہاں) بہت سے دوستوں سے ملاقات کی اور لیگ کے زیرِ اہتمام SHAPE OF THE CULTURE TO COME کے عنوان سے تقریر کی جس میں اس بات پر زور دیا کہ تہذیب کا مسئلہ نہ اقتصادیات سے بے تعلق ہے نہ اخلاقیات سے بلکہ ایک با انصاف اور دیرپا اور شریفانہ تہذیب قائم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ معاشرے کی بنیاد ایسے اصولوں پر رکھی جائے کہ "اچھی زندگی" بسر کرنے کا امکان صرف مخصوص افراد اور جماعتوں ہی کو نہیں بلکہ تمام انسانوں کو حاصل ہو (کیوں کہ تہذیب کے وسائل اور اس کی بیش بہا ذہنی اور جمالی دولت وہی لوگ پیدا کر سکتے ہیں جو محتاجی، بیماری، بے کاری اور اقتصادی پریشانی کی یورش سے محفوظ ہوں) اور "سماجی انصاف" کا اصول زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہو (تاکہ "عوام" اور "خواص" میں میل جول ہو کر سوسائٹی کے تمام طبقوں میں علم اور آرٹ اور سائنس اور تحقیق و دریافت کی جو صلاحیتیں پوشیدہ ہیں وہ ظہور میں آجائیں)۔

لوگوں نے لکچر کو بہت پسند کیا۔ بعد میں لوگوں نے سوالات بھی پوچھے اور ایک دو مسائل پر بحث بھی ہوئی جس سے لوگ بظاہر مطمئن معلوم ہوتے تھے۔ اس ضمن میں یہ سوال بھی اٹھا تھا کہ اسلام اور سوشلزم کے اصولوں میں بنیادی اختلاف ہے یا نہیں۔ میں نے اس رائے کا اظہار کیا کہ جہاں تک اصولوں کا تعلق ہے اسلام کا رجحان بھی سوشلزم کے مقاصد کے حصول کی طرف ہے۔ ایک تقریر پرنسپل (مسٹر اسکاٹ) کی دعوت پر اسلامیہ کالج پشاور میں بھی

کی۔ موضوع تھا "علم اور زندگی" (وہی اقبال سے اکتساب نور!) اور وہاں کے ٹریننگ اسکول کا معائنہ کیا اس کا پہلا معائنہ کا نوٹ ابا جی (خواجہ سجاد حسین صاحب) کا لکھا ہوا دیکھا۔ کئی نئے لوگوں سے ملاقات ہوئی جن میں ایک صاحب رائے بہادر دیوان اودھرائے وکیل قابلِ ذکر ہیں۔ عمر بھر وکالت کی، خوب روپیہ کمایا۔ ساتھ ہی قانون پر بہت سی کتابیں لکھیں اور اب روحانیت، تصوف اور یوگ کی طرف مائل ہیں اور اس کے متعلق بھی چند کتابیں لکھی ہیں۔ ہندوستان میں یہ بھی غنیمت ہے۔

کتابیں

DAYS OF OUR YEARS کے مصنف کی ایک نئی کتاب THAT DAY ALONE پڑھی۔ اتنی اچھی تو نہیں لیکن بعض حصّے بہت اچھے ہیں۔ اس میں جنگ سے قبل اور جنگ کے دوران کی یورپی ذہنیت اور مختلف رجعت پسند اور انصاف پسند تحریکوں کی بہت اچھی تفسیر کی گئی ہے ..... ایک پرانی کتاب یعنی ANDRE MAURIS کی ARIEL پڑھی جو شیلے کی زندگی کے متعلق ہے۔ معلوم نہیں واقعات اور سیرت نگاری میں مصنف نے کس درجہ واقفیت اور تحقیق سے کام لیا ہے لیکن اندازِ بیان بہت دل چسپ ہے اور اس کے ذریعہ مصنّف نے ان کرداروں کو اور ان کی زندگی کو دوبارہ جیتا جاگتا بنادیا ہے۔

ہندوستان میں تعلیم کی تنظیمِ نو

حکومتِ ہند کے مشیر تعلیمی جان سارجنٹ نے اپنی "بعد جنگ کی تعلیمی اسکیم" شائع کی ہے اور اس کا ایک ADVANCE نسخہ میرے پاس بھیجا ہے۔ اس میں اس نے وہ تجاویز پیش کی ہیں جن کے ذریعہ ہندوستان میں واقعتاً ایک مرتّب، مربوط اور مکمل قومی تعلیمی کا نظام قائم کیا جا سکتا ہے جو ابتدائی تعلیم سے لے کر یونی ورسٹی اور ٹکنیکل اسکولوں تک پر حاوی ہو۔ تجاویز بہت دور رس اور بحیثیت مجموعی معقول ہیں اور ظاہر ہے کہ ان کو عمل میں لانے کے لیے بے شمار مصارف کی ضرورت ہے۔ لیکن سارجنٹ کا کہنا یہ ہے کہ اگر ملک

تعلیم جیسے مرکزی اور اہم شعبے کے لیے مصارف اُٹھانے کے لیے تیار نہیں تو اس کا شمار مہذب ممالک میں نہیں ہو سکتا۔ اب دیکھنا ہے کہ اس تجویز کا (جو حکومت کے کسی افسر کی طرف سے پہلی دور بین اسکیم ہے) کیا حشر ہوتا ہے!

عبدالماجد کی کتاب محمد علی پڑھی۔ بہت دل چسپ اور اثر آفریں ہے۔ اگرچہ اس میں احساسِ تناسب کی کمی ہے۔ محمد علی کی سیرت کی عظمت اس کو پڑھ کر میری نظر میں بڑھ گئی ہے۔

چہل سال عمرِ عزیزت گزشت!

۱۹۴۳

۳ نومبر

کئی ہفتے زندگی کے اور گزر گئے۔ اس دوران میں ۱۴ اکتوبر بھی آکر چلی گئی۔ اس تاریخ کو میں نے اپنی عمر کے چالیس سال پورے کیے تھے۔ سوچتا ہوں کہ اس چالیس سال میں (جو عمر کا بیشتر حصہ ہے) اور جس کے بعد تھوڑے سے سال (غالباً) اور نوشتۂ تقدیر میں درج ہوں گے کیا کچھ کیا تو نامۂ اعمال بہت محدود اور مختصر نظر آتا ہے۔ چند عزیزوں کی دیکھ بھال، چند محتاجوں کی مدد، سماجی فرائض کی ادائیگی میں اور چند مضامین اور کتابیں، کچھ تقریریں، چند سال ٹریننگ کالج میں اساتذہ کی تعلیم اور چند سال سے ریاست کے محکمۂ تعلیم کی نظامت اور بس! کتنا کچھ کرنے کا امکان ہوسکتا تھا اور کے مقابلہ کتنا کم ہوسکا۔ یہ بات ہرگز کسی انصاف پسند اور خود دار انسان کے لیے کافی نہیں ہوسکتی کہ بعض دوسرے لوگوں نے اتنا بھی نہیں کیا ہوگا۔ ہر انسان کے لیے معیار اس کی ذات اور اس کے ۶۰۱م ہیں نہ کہ دوسروں کی پست ہمتی یا بے عملی۔ والدِ مرحوم کو چالیس سال سے کچھ ہی زیادہ کی زندگی نصیب ہوئی لیکن انھوں نے اس عرصے میں اپنی خدمات کے ذریعہ ایک خاصا دیرپا اثر قائم کرلیا تھا۔ زیادہ سے زیادہ میں اس بات سے کچھ تسکین حاصل کرسکتا ہوں کہ (غالباً ان کی اور دوسرے شریف بزرگوں کی صحبت اور تعلیم کے فیض سے) خواہ کام کی مقدار اور نوعیت معمولی ہو لیکن حتی الامکان اپنے اقدارِ حیات کو آلودہ نہیں ہونے دیا اور کسی قسم کی کامیابی یا ذاتی نفع کو حاصل کرنے کے لیے گھٹیا اور اوچھے ذرائع استعمال نہیں کیے بلکہ جہاں تک اپنی سمجھ میں آسکتا تھا حق اور انصاف کی خاطر باطل کے ساتھ سمجھوتا کرنے سے ہمیشہ انکار ہی کیا اور اپنے سے اونچے حکام اور افسروں سے اکثر مخالفت اور لڑائی مول لینی پڑی کیوں کہ وہ انصاف کے خلاف کارروائی کرنا چاہتے تھے اسی وجہ سے اکثر علی گڑھ میں ڈاکٹر ضیاء الدین سے اختلاف رہا اور ان کی پارٹی نے نقصان پہنچانے کی کوشش کی۔ اسی

سلسلہ میں کئی دفعہ ریاست میں بھی حکومت کے ساتھ سخت مقابلہ کرنا پڑا مثلاً اردو ہندی کے قضیہ میں۔ قابل اور مستحق ہندو اور مسلم افسروں کو جائز ترقی دلانے کے سلسلے میں، جب کہ حکومت کے مختلف دفاتر کی غلط پسند قوتیں اور اربابِ غلط کی سازشیں اس کے راستے میں حائل ہوتی تھیں۔ چناں چہ ابھی حال میں اس قسم کا ایک واقعہ پیش آیا جب میں چاہتا تھا کہ سابق انسپکٹر مدارسِ کشمیر مسٹر روپ چند مہدرتا کو (جو اس جگہ کے لیے نااہل تھے) کالج میں تبدیل کرکے ان کے بجائے ایک بہت زیادہ موزوں اور قابل افسر نند لال کترو کو ان کی جگہ مقرر کروں! معاملہ بالکل صاف اور مفادِ محکمہ کے عین موافق تھا لیکن چوں کہ اس میں بعض اربابِ غرض کی مفاد شکنی ہونے کا امکان تھا اور ضمناً یہ کہ اس سلسلے میں ایک مسلمان افسر کو ترقی ملتی تھی اس لیے انھوں نے اس کے خلاف سخت سازشیں کی اور درپردہ دفاتر میں اور پریس وغیرہ کے ذریعہ معاملات کو توڑ مروڑ کر پیش کیا اور انھیں اس بات میں اس حد تک کامیابی ہوئی کہ ایک تقریباً طے شدہ معاملہ کو پرائم منسٹر اور ہوم منسٹر کے ذریعہ بالکل اُلٹ پلٹ کر دیا۔ میں نے مجبور ہوکر ان دونوں سے ایک مفصل گفتگو کی، صورتِ حالات سمجھائی اور کہا کہ میں ہرگز ایسے حالات میں کام کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں جب کہ مجھے ایسے رفقائے کار نہ دیے جائیں جو اپنے فرائض کو کامیابی، دیانت داری اور قابلیت کے ساتھ انجام نہ دے سکیں۔ نہ میں اس بات کے لیے تیار ہوں کہ حکومت کے احکام سازشوں اور پبلک کے نام نہاد لیڈروں کی سازش کی بنا پر تبدیل ہوجائیں۔ خدا کا شکر ہے کہ بالآخر مجھے اس بات میں کامیابی ہوئی اگرچہ معاملہ کے ایک آدھ پہلو میں حکومت کے اعلیٰ ترین افسروں نے ایک حد تک جنبہ داری یا کمزوری دکھائی جس کا مجھے افسوس ہے۔

مُلاقاتیں

اس دوران میں سر بی۔ این۔ راؤ سے ملاقات ہوئی جو غالباً کشمیر کے وزیرِ اعظم ہونے والے ہیں اور آج کل مقامی حالات کا جائزہ لینے کی خاطر سری نگر میں ٹھیرے ہوتے ہیں۔ آدمی سنجیدہ، خاموش اور انصاف پسند معلوم ہوتے ہیں اور میرا خیال ہے کہ سازشوں

وغیرہ کی بیماری سے محفوظ ہیں۔ شاید ان کے آجانے سے کشمیر کے سیاسی حالات سُدھر جائیں۔ آج کل تو پارٹی بازی اور انفرادی سازشوں کا دور دورہ ہے اور مسلمانوں کو یہ شکایت ہے کہ انھیں ان کے جائز حقوق نہیں ملتے۔

سر شفاعت احمد خاں سے بھی ملاقات ہوئی جو آج کل افریقہ میں گورنمنٹ ہند کی طرف سے ایجنٹ جنرل کے عہدے پر مقرر ہیں۔ میں ان سے پہلے بھی ملا تھا اور اس وقت میرا خیال یہ تھا کہ وہ کسی قدر محدود اور تنگ نظر اور محض SELF SEEKING شخص ہیں لیکن اس دفعہ ان سے مل کر خوش گوار تعجب ہوا۔ ذہین اور باخبر ہیں اور ذہن مرتب ہے یہ باتیں شاید پہلے بھی ہوں گی لیکن اب زیادہ تجربہ حاصل کرنے اور دنیا دیکھنے کے بعد ان کے خیالات میں بھی کافی تبدیلی اور ترقی ہوئی ہے اور گو CAREERISM کا اثر اب تک غالب ہے لیکن اب وہ ہندوستان کی آزادی اور اس کے سیاسی اور سماجی مستقبل کے متعلق ترقی پسند ہو گئے ہیں۔ ان کا خیال یہ بھی ہے کہ ہندوستان کا، مسلمانوں کا اور دنیا کا مستقبل سوشلزم کے قبول کرنے کے ساتھ وابستہ ہے۔ اس کے سوا موجودہ حالات سے عہدہ برآ ہونے کا کوئی طریقہ نہیں۔ روس کی ترقی اور بالخصوص اس کی مشرقِ اسلامی جمہوریتوں کی تنظیمِ نو کے بہت معترف ہیں..... مجھے بعض اوقات تعجب ہوتا ہے اور میں سوچا کرتا ہوں کہ سوشلزم کا آئندہ کیا حشر ہوگا جب اس کی تائید ایسے ایسے خلافِ توقع حلقوں سے ہوتی ہے جیسے سر شفاعت، میاں شبّیر احمد، سر مہاراج سنگھ (ان کا حال کا ایک خطبہ) وغیرہ !!

جموّں میں گولی کا چلنا !

جموّں میں گزشتہ ماہ ایک نہایت افسوس ناک سانحہ پیش آیا۔ گرانی کی وجہ سے اور حکومت کی بے پرواہی سے خوراک کی قیمتوں میں ایک دم بہت اضافہ ہوگیا۔ لوگوں نے اس کے خلاف احتجاج کیا جس کو خوش اسلوبی کے ساتھ نبھایا نہیں جا سکا بلکہ ایک جلوس پر (غالباً بغیر کافی جواز کے) گولی چلادی گئی جس سے بارہ تیرہ آدمی مر گئے اور بہت سے زخمی ہوئے۔ اس واقعہ کی وجہ سے لوگوں میں، حکّام میں اور ہندوستان میں بھی کافی سنسنی

ہے...... مہاراجہ نے تحقیقات کے لیے ایک غیر جانب دار کمیشن مقرر کیا ہے جس میں دو باہر کے جج اور ایک ریاستِ عالیہ کے جج قاضی مسعود الحسن شامل ہیں۔ امید ہے کہ کمیٹی غیر جانب دارانہ تحقیق کر کے ذمہ دار لوگوں کے ساتھ مناسب سلوک اور آئندہ کے لیے روک تھام کی تدابیر پیش کرے گی۔

سفر اودے پور و رام پور اور قیامِ سری نگر

۱۹۴۴

یکم جنوری

میں اس وقت اودے پور جا رہا ہوں۔ وہاں ڈاکٹر سنہا نے (جو ریاست کے وزیرِ تعلیم اور ریونیو ہیں) ایک تعلیمی کیمپ کیا ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ تھوڑے سے تعلیمی کام کرنے والے چند روز کے لیے سر جوڑ کر بیٹھیں اور تعلیم کے متعلق تبادلۂ خیالات کریں۔ چوں کہ اس قسم کی چھوٹی سی کانفرنس میں مفید کام کا امکان "تماشا کانفرنسوں" کی نسبت زیادہ ہے اس لیے میں بھی شرکت کے لیے جا رہا ہوں۔ ذاکر صاحب کو بحث و مباحثہ کا آغاز کرنا ہے لیکن وہ نہیں آ سکے لہٰذا یہ ذمہ داری دفعتہً میرے سر پڑی ہے۔ خدا خیر کرے! پرسوں تک میں جے پور کی آل انڈیا تعلیمی کانفرنس میں شریک تھا جہاں سر مارس گوائر نے صدارت کی تھی اور خاص موضوع زیرِ بحث "تعلیم اور سماجِ نو" تھا جس میں مجھے سالہا سال سے بہت دل چسپی رہی ہے بلکہ اتفاقاً (یا غیر شعوری طور پر) گزشتہ چند سال میں جب کبھی مجھے تعلیم پر کچھ لکھنا پڑا ہے اس کا تعلق براہِ راست یا بالواسطہ اسی موضوع سے رہا ہے۔ SYMPOSIUM کی افتتاحی تقریر سر مرزا اسماعیل (دیوان جے پور) نے کی تھی اور بحث میں سارجنٹ، پرکاش نرائن سپرو، مسز شوا راؤ وغیرہ نے شرکت کی تھی۔ میں نے اپنی تقریر کے دوران میں اس بات پر زور دیا تھا کہ بغیر سماجی تنظیم اور ایک بہتر معاشرے کی ترتیب کے تعلیمی اصلاح کی کوشش ایک کھوکھلا سا کام ہے اور اس سماجی تنظیم کے لیے بعض حقائق کو (جو دورِ حاضرہ کی پیداوار ہیں) اور بعض آئیڈیل اور اصولوں کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔ مثلاً سائنس اور صنعت و حرفت کی ترقی اور وسائل آمد و رفت کی تیزی کا اثر۔ سائنس

اور SOCIAL VISION میں ہم آہنگی نہ ہونے کے نتائج۔ دنیا کا جغرافی اور صنعتی اعتبار سے ایک ہو جانا لیکن انسانی خیالات اور جذبات کا چھوٹے چھوٹے علاحدہ علاحدہ خانوں میں قید ہونا۔ جمہوریت کے اثرات اور اس کے تقائص وغیرہ۔ اسی طرح جہاں تک IDEALS کا تعلق ہے ہمیں ایک ایسے معاشرے کو پیدا کرنا ہے جس میں سماجی انصاف اور اقتصادی مساوات ہو اور سب لوگوں کو ترقی کے لیے یکساں مواقع نصیب ہوں۔ ہمیں افلاس کو دور کرنا ہے اور تہذیب کے ساتھ ساتھ بلکہ اس کی بنیاد کے طور پر مادی حالات کو عوام کے لیے بہتر بنانا ہے تعلیم کے ذریعہ نظر میں وسعت پیدا کرنی ہے۔ تہذیب کے مفہوم کو وسیع کر کے اس میں سائنس اور صنعت و حرفت کی قدروں کو شامل کرنا ہے طلبہ کو مرتب شدہ معلومات سکھانے اور بنے بنائے عقائد سکھانے کے بجائے ان میں قوتِ فکر کی تربیت پیدا کرنا ہے اور ان کو جمہوریت کا اہل بنانے کے لیے رواداری کی ذہنیت اور بین الاقوامی دنیا میں زندگی بسر کرنے کے لیے انسانیت دوستی کا میلان پیدا کرنا ہے ...... میں نے خاص کر کے اس بات پر زور دیا کہ EQUALITARIAM سوسائٹی تعلیم کا مطمحِ نظر ہونی چاہیے اور اس بارے میں بعض مقررین کے خیالات پر تھوڑا سا مخالفانہ تبصرہ بھی کیا جس میں لوگوں کو دلچسپی ہوئی۔

جے پور میں سر مرزا اسماعیل سے ملاقات ہوئی۔ وہ باوجود اپنی قابلیت اور غیر معمولی انتظامی شہرت کے ایک نہایت خلیق اور ملنسار آدمی ہیں اور خود کو اہمیت دینے کے لیے ایک "مصنوعی شان" کی فضا پیدا نہیں کرنا چاہتے۔ ان سے اُردو ہندی کے معاملے میں گفتگو ہوئی (اور جے پور کے ایک خاصے باحیثیت نمائندہ، مسلمان سے بھی) جس سے یہ اندازہ ہوا کہ انھوں نے اردو کی تعلیم کو مستحکم بنانے کے سلسلے میں بھی اقدامات کیے ہیں اور غالباً ہندی کے معاملے میں بھی مولوی عبدالحق وغیرہ نے صورتِ حالات کو ٹھیک طرح نہیں سمجھایا نہیں سمجھنا چاہا۔ جہاں تک ریاست کی ترقی کے وسائل کا تعلق ہے ان کی گفتگو سے اندازہ ہوتا ہے کہ معاملات ان کے ذہن میں بالکل صاف ہیں اور وہ حالات پر پورا قابو اور خود پر پورا بھروسہ رکھتے ہیں ...... وزیرِ مال اور تعلیم پنڈت امرناتھ اٹل سے بھی ملاقات ہوئی اور ان کے ساتھ کھانا بھی کھایا۔ خوش مزاق اور خوش اخلاق آدمی ہیں۔ کانفرنس حسبِ معمول رطب و یابس دونوں

قسم کی رہی۔ بعض تقریریں اچھی تھیں۔ اب اس کانفرنس میں کچھ انگریز تعلیمی کام کرنے والے بھی دل چسپی لینے لگے ہیں اور ان میں سے بعض خاصے باخبر اور ہمدرد ہیں ...... ابتدائی اور دیہاتی تعلیم کے سکشن کے لیے خطبۂ صدارت میں نے لکھا تھا اگرچہ میں بیمار ہونے کی وجہ سے خود وقت پر پہنچ کر اس کو نہیں پڑھ سکا۔

راستے میں ایک روز کے لیے اجمیر ٹھیرا تھا اور خان بہادر رضا حسین سے ملا تھا۔ ان سے ملنا ہمیشہ ذہنی مسرت کا باعث ہوتا ہے کیوں کہ باوجود عمر بھر مدرسی کرنے کے انھوں نے اپنے خیالات کی جدت اور نظر کی گہرائی کو قائم رکھا ہے اور اکثر معاملات میں ان کا نقطۂ نظر انفرادی ہوتا ہے دوسروں کی نقالی نہیں!

گزشتہ عرصے میں تعلیمی کتابوں کے علاوہ دو دل چسپ کتابیں پڑھیں۔ ایک CRIPPS کی سوانح عمری جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص واقعاً غیر معمولی قابلیت کا آدمی ہے اور اس میں بڑی اخلاقی جرأت اور عفتِ فکر ہے (پھر ہندوستان میں پہنچ کر اس کو کیا ہو گیا تھا؟) دوسری کتاب کا دل چسپ نام ہے PASSED TO YOU PLEASE اس میں انگریزی دفاتر اور سول سروس کے RED TAPE کا نہ صرف پُرلطف خاکہ اُڑایا گیا ہے بلکہ اس کی گہری نفسیاتی تشریح کی گئی ہے۔ گزشتہ چند سال میں دفتری RED TAPE سے جو واسطہ مجھے پڑا ہے اس کی وجہ سے یہ کتاب بہت مفید معلوم ہوئی۔

"اقبال کے تعلیمی فلسفہ" کا دوسرا ایڈیشن ختم ہو گیا ہے۔ پبلشر کا اصرار تھا کہ فوراً تیسرے ایڈیشن کے لیے کتاب پر "نظرِ ثانی" کر لی جائے۔ کسی مفصل ترمیم اور تبدیلی کا تو وقت نہ تھا لیکن میں نے اس دفعہ اس کے تمام نقل کردہ اشعار کا انگریزی میں ترجمہ کر دیا ہے۔ خدا مالک ہے کیوں کہ یہ کام بہت مشکل ہے اور مجھے اس بارے میں خود پر اعتبار نہیں۔

آج یکم جنوری ہے اور سالِ نو کے لیے پروگرام بنانے اور خود سے وعدے وعید کرنے کا دن ہے لیکن چلتی ریل کی یورش اور وقت کی تنگی میں کیا کہا جا سکتا ہے۔ البتہ اتنا ضرور چاہتا ہوں کہ جہاں تک عملی کام کا تعلق ہے اس سال میں مندرجہ ذیل کام کر ڈالوں۔

۱۔ محرم کی تقریروں کا ایک مجموعہ مرتّب کرنا۔

۲۔ تعلیم پر جو مضامین گزشتہ چند سال میں لکھے ہیں ان کو "تعلیم اور سماجِ نو" کے نام سے ترتیب اور تکمیل کرنا۔

۳۔ ایک پُرانا ترجمہ "بلجیم میں مدرسۂ جدید" پڑا ہوا ہے اس پر ایک نظر کی ضرورت ہے۔ اس کی تکمیل کر کے اس کو چھپوانا (ابھی چند روز ہوئے ACTIVITY SCHOOL کا ترجمہ "مدرسۂ عمل" کے نام سے چھپ گیا ہے۔ غلام حسین صاحب ایم۔ اے۔ نے کیا ہے)

۲۸ جنوری ۴۴ء

جموّں واپس آنے کے چند ہی روز بعد نواب صاحب رام پور کے اصرار پر ایک روز کے لیے رام پور جانا پڑا وہاں شیعہ کالج لکھنؤ کے بورڈ آف ٹرسٹیز کا جلسہ تھا جس کے صدر خود نواب صاحب ہیں۔ جلسے کا مقصد یہ تھا کہ مجلس امنا اور انتظامیہ کمیٹی میں کچھ باہمی جھگڑے پیدا ہو گئے ہیں ان کو دُور کر دیا جائے۔ ایک پارٹی راجہ صاحب محمود آباد کی تھی اور دوسری میں سیّد علی ظہیر (بیرسٹر) اور علماء کا گروہ شامل تھا۔ علماؔ کی کوشش یہ ہے کہ ان کی حیثیت بالکل آزاد اور جداگانہ ہو اور وہ کسی جمہوری ادارے میں دوسروں کی رائے اور مشورہ بلکہ تعاون تک کے پابند نہ ہوں۔ میں نے ابتدائی کمیٹی کے مباحثہ کے دوران میں کہا کہ یہ اصول سراسر غلط ہے۔ "علماؔ" اور "جہلا" کی یہ تقسیم میرے نزدیک تو امورِ دین تک میں جائز نہیں، کجا یہ کہ انتظامی امور میں جن کا تعلق عربی کالج (یا کسی کالج سے بھی) سے ہو علماؔ کو غیر علماؔ کے قرب سے محفوظ رکھا جائے ہم اسلام نے دین اور دنیا کی یہ تقسیم رکھی ہی نہیں اور در اصل علما بھی زندگی کی تگ و دو میں اپنا پورا اثر نہیں ڈال سکتے جب تک وہ جرأت کے ساتھ زندگی کے مشاغل میں حصّہ نہ لیں...... خیر یہ دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی کہ نواب صاحب نے کافی معقولیت اور رواداری کے ساتھ کمیٹی اور بورڈ کی صدارت کے فرائض انجام دیے اور پارٹیوں میں باہمی صلح و صفائی کرا دی۔ نواب صاحب کی یہ صلاحیت میرے خیال میں زیادہ حد تک ان کے چیف منسٹر (زیدی) کی تربیت اور ہدایت کا نتیجہ ہے۔ وہاں میں صرف ایک روز ٹھیرا۔ اس کے دوران میں نواب صاحب

کے ایما پر مولوی سید محمد صاحب وغیرہ سے "تفسیر اہلِ بیت" کی اسکیم کے متعلق گفتگو کی۔ اس اسکیم کے ابتدائی مشورہ کے لیے انھوں نے گزشتہ ماہ مجھے بلایا تھا لیکن میں پہنچ نہیں سکا تھا۔ گفتگو کے وقت میں نے اسی بات پر زور دیا کہ تفسیر کو محض فقہی اور منطقی بحثوں سے حتی الامکان بچانا چاہیئے اور اس کے ذریعہ یہ بتانا چاہیے کہ زندگی کے موجودہ مسائل اور تمدن کے اہم امور کے متعلق اسلام کی تعلیم کیا ہے اور بالخصوص معاشرت اور اقتصاد کے نزاعی مسئلوں میں اسلام کیا کہتا ہے۔ علاوہ اس کے یہ بھی ضروری ہے کہ لکھنے میں روئے خطاب زیادہ تر موجودہ تعلیم یافتہ گروہ کی طرف ہو جن کی دل چسپی تہذیب و تمدن میں ہے اور جن کو دین کی طرف مائل کرنے کا صحیح طریقہ بھی یہ ہے کہ ان کی دنیا کو درست کرنے کے وسائل اور طریقے انھیں بتائے جائیں اور دین و دنیا کے درمیان جو خلیج حائل ہو گئی ہے اس کو پاٹنے کی کوشش کریں۔ میں نے ان سے وعدہ کیا ہے کہ (دیگر ممبروں کی طرح) فہرست عنوانات کے سلسلے میں چند تجاویز لکھ کر بھیجوں گا۔

۱۱؍جون

آج پھر بہت عرصے بعد اس طرف توجہ کرنے کا موقع ملا ہے اور وہ بھی بستر پر لیٹے لیٹے کیوں کہ چند روز سے بخار کی شکایت رہی ہے ...... اس عرصے میں دل پر ایک سخت داغ اٹھانا پڑا لیکن امرِ الٰہی کے خلاف چارہ ہی کیا ہے؟ طاہرہ بتول ۱۱؍اپریل کو پیدا ہوئی اور ۲۵؍مئی کو دوبارہ خدا کے حضور میں پہنچ گئی۔ اس کا جو صدمہ سب کو ہے وہ ظاہر ہے لیکن عزیز کے لیے یہ آزمائش بہت کٹھن ہے۔ خدا انھیں صبر اور قوت دے!

گزشتہ مارچ کے آخر میں علاوہ اور جگہوں کے نواب صاحب رام پور کی طلبی پر ان سے ملنے گیا تھا۔ ان کا اصرار ہے کہ یہاں سے فارغ ہو کر بلکہ قبل از وقت فراغت حاصل کر کے ان کے ہاں بطور مشیرِ تعلیمی کے آجاؤں۔ اصرار بہت پرخلوص ہے اور عابد صاحب، ذاکر صاحب وغیرہ کا بھی مشورہ یہ ہے کہ میں اس پیش کش کو قبول کر لوں۔ یونی ورسٹی تو اب مزید رخصت دے گی نہیں۔ اس لیے اس تجویز کو منظور کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ یونی ورسٹی سے

علاحدگی اختیار کرلی جائے اور مستقل طور پر (کم از کم فی الحال) رام پور کی ملازمت اختیار کی جائے۔ (یہی نواب صاحب کی خواہش بھی ہے)۔ اس امر میں مجھے بڑی حد تک تامل ہوگا اور ہے کیوں کہ یہ یونی ورسٹی کے ساتھ اب تک ساری عمر کی ASSOCIATIONS قائم ہوگئی ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی اب یونی ورسٹی کا تصور ڈاکٹر ضیاءالدین صاحب کے تصور کے مرادف ہے اور یہ تصور کسی طرح ہم آہنگ نہیں۔ انھوں نے یونی ورسٹی پر اس طرح تسلط پیدا کرلیا ہے کہ وہاں بغیر ان کا آلہ کار بنے نہ عافیت کا امکان ہے، نہ اثر پیدا کرنے کا اور خالص علمی فضا میں کام کرنے کا تو کسی طرح بھی امکان نہیں۔ لہٰذا وہاں واپسی کا مطلب صرف ٹریننگ کالج میں پڑھاتا رہ جانا ہے (وہ ٹریننگ کالج جس کی خدا خدا کرکے کچھ شہرت قائم ہوئی تھی اور جو گزشتہ چھ سال میں پھر بے اثر اور بدنام ہوکر رہ گیا ہے) اور اس مختصر سے کام میں بھی ہر قسم کی مخالفتیں! علی گڑھ کی واپسی میں باوجود ان تمام حالات کے ایک کشش تھی اور وہ یہ ہے کہ وہاں جاکر باوجود ان مخالفتوں کے حالات کو درست کرنے کی کوشش کی جائے اور ایک ایسی جماعت بنائی جائے جو ذاتی اغراض کی کام برآری اور جھوٹے پروپیگنڈا کے بجائے یونی ورسٹی میں ایک صحیح اور آزاد علمی فضا قائم کرنے کی کوشش کرے۔ معلوم نہیں نارمل حالات میں بھی میں کہاں تک اس مشکل کام کو انجام دے سکتا لیکن اس وقت ایک مشکل یہ ہے کہ ارباب اقتدار نے علی گڑھ کی فضا کو سیاست کی دخل اندازی سے قصداً مکدر کر دیا ہے اور مسلم لیگ کے نام کو استعمال کرکے اور اس سے ناجائز فائدہ اٹھاکر اس میں ہر ایک ایسے شخص کے لیے کام کرنا مشکل کردیا ہے جو لیگ کی کاسہ برداری کا بلند آہنگی سے دعویٰ نہ کرے۔ اس طرح اسٹاف اور طلبہ دونوں میں آزادیٔ فکر و عمل کا گلا گھونٹنے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ کسی کو تنقید کا حوصلہ اور اس کی قابلیت ہی نہ ہو اور اگر کوئی ارباب اقتدار سے خلاف کرے تو اس کو مسلم لیگ، ملت اسلامیہ اور خود مذہب اسلام کی مخالفت قرار دے کر اس کی بیخ کنی کی جاسکے۔ ان حالات میں، فی الحال! اصلاح کی کوشش عبث معلوم ہوتی ہے۔ لیکن باوجود اس کے ؎

چھوڑوں گا میں نہ اس بت کافر کو پوجنا
چھوڑے نہ خلق گو مجھے کافر کہے بغیر

ممکن ہے بت خانے سے باہر رہ کر رفتہ رفتہ ایسے مواقع حاصل ہوں کہ بت خانے کی صفائی کی خدمت انجام دی جا سکے۔ اس لیے میں نے نواب صاحب سے تقریباً وعدہ کر لیا ہے کہ ان کی پیش کش منظور ہے۔

کشمیر چھوڑنے میں بھی ایک حد تک تامل اور افسوس ہوتا ہے۔ یہاں کام کرنے کا اچھا خاصا موقع ملا ہے اور ایک لحاظ سے بڑے پیمانے پر انتظامی کام کرنے کا موقع پہلی دفعہ ملا ہے۔ اس میں (باوجود احمقوں اور خود غرضوں اور دفتری مخالفتوں کے) خاصی کامیابی ہوئی ہے۔ بنیادی تعلیم کے تجربے کو چلایا ہے اور اس کا ایک حد تک ملک بھر میں اعتراف کیا گیا ہے۔ بہت سے لوگوں سے دوستی اور کام کی رفاقت قائم ہوگئی ہے۔ جو زندگی کی ایک عظیم دولت ہے۔ اس لیے یہ خیال کہ شاید کام کا یہ سلسلہ قائم نہ رہے اور ناواقفیت یا بے پروائی یا ناسمجھی کی مخالفت کی وجہ سے اس کو خراب کر دیا جائے یقیناً تکلیف دہ ہے مگر بہرحال اس کا فیصلہ میں نہیں کر سکتا، حکومتِ کشمیر ہی کر سکتی ہے اور اگر وہ اپنا بُرا بھلا نہیں پہچان سکتی تو میں کیا کر سکتا ہوں ..... میرا خیال یہ ہے کہ اس سال بعد جنگ کی تعلیمی تنظیم اور اس کے لیے ایک پروگرام کی تشکیل کے واسطے ایک کمیٹی مقرر کی جائے (جس میں بیرونی ماہرینِ تعلیم بھی ہوں اور مقامی لوگ بھی) جو آئندہ پندرہ بیس سال کے لیے ایک باقاعدہ اور مرتب تعلیمی پروگرام تیار کر دے تاکہ (اگر حکومت تعلیمی امور میں سنجیدگی کے ساتھ دل چسپی لے اور اس کے لیے روپیہ فراہم کرے) تو کام خوش اسلوبی اور تسلسل کے ساتھ چلتا رہے گا۔ میں نے تجویز حکومت میں بھیج دی ہے، دیکھیں کیا حشر ہوتا ہے؟

اس سال کے بجٹ میں دو نئی تجویزیں میں نے بمشکل تمام منظور کرائی ہیں جو میرے خیال میں ریاست کی تعلیمی تاریخ میں بہت مفید ثابت ہوں گی۔ ایک تو میرپور میں (جو ریاست کا ایک اہم علاقہ ہے) ایک انٹر میڈیٹ کالج قائم ہوگیا ہے اور دوسرے جموں میں (بھی سری نگر کی طرح) ایک استادوں کا ٹریننگ اسکول قائم ہوا ہے جس سے استادوں کی تربیت کا کام زیادہ سرعت کے ساتھ ہو سکے گا اور امید ہے کہ اسکولوں کی حالت جلد بہتر ہو سکے گی۔ اس میں بھی محکمہ فنانس وغیرہ کی طرف سے رکاوٹیں ڈالی گئیں لیکن بالآخر کامیابی ہوئی گو

اس کی خاطر ہز ہائی نس سے لنڈن تار دے کر خاص طور پر منظوری حاصل کرنی پڑی (ہز ہائی نس بحیثیت ممبر وار کیبنٹ انگلستان گئے ہیں اور سر فیروز خان نون کی معیت میں ہندوستان کی نمائندگی کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ اس ہفتے یہ خبر آئی ہے کہ کئی سال تک وعدہ کرنے کے بعد انگریزوں نے یورپ میں دوسرے جنگی محاذ کا آغاز کر دیا اور فرانس کے شمال مغرب (نارمنڈی) میں اپنی فوجیں آتار دی ہیں کیا یہ انجام کی ابتدا ہے؟ خدا کرے ایسا ہو!)

اس عرصے کی چند قابلِ ذکر کتابیں: VIRKI BAREM: MARION ALIVE ———

ANDRE MOAROIR : CALL NO MAN HAPPY جنگ کے زمانے میں جو ناول شائع ہو رہے ہیں، ان کا معیار نہایت ہی گھٹیا ہے لیکن یہ ناول ایک استثنا ہے۔ اس میں ایک باکمال عورت کے ذہنی ارتقا کی داستان ہے اور اس کا پس منظر تقریباً بیسویں صدی کی پوری یورپی تہذیب اور اس کا ارتقا موجودہ جنگ کے آغاز تک۔ زبان، کردار نگاری، فن کاری اور اقدار، سب کے اعتبار سے کتاب بہت اچھی ہے اور مصنف کی دوسری کتابوں کے مقابلے میں اس میں زیادہ پختگی اور گہرائی ہے۔

یہ مصنف کی خود نوشت سوانح عمری ہے اور خوب لکھی ہے اس کو پڑھ کر میری نظر میں اس کی وقعت بہت بڑھ گئی ہے۔ اس میں CHARM ہے، CHARITY ہے، انسانی اقدار اور انسانی سیرت کی اچھی سمجھ اور پرکھ ہے اور باوجود فرانس کی شکست اور یورپ پر ہٹلر گردی کے ان اصولوں کے ساتھ وفاداری ہے جو LIBERALISM اور HUMANTARIANISM کے ساتھ وابستہ ہیں اور جن کی حمایت فرانس کے بہترین فرزندوں نے ہمیشہ کی ہے۔ اس قسم کی کتابوں کو پڑھ کر از سرِ نو یہ عقیدہ تازہ ہوتا ہے کہ خیال اور ادب اور فنی تخلیق کی زندگی نہ صرف سیاسی ہلچل کی زندگی سے کم اہمیت نہیں رکھتی بلکہ اس میں زیادہ معنویت اور گہرائی ہے۔

اعمال نامہ (مصنفہ سر سید رضا علی) یہ بھی جیسا کہ نام سے ظاہر ہے خود نوشت سوانح عمری ہے اور بحیثیت مجموعی ایک قابلِ قدر تصنیف ہے کیوں کہ اس میں گزشتہ پچاس سال کی پوری سیاسی اور سماجی زندگی پر ایک سیر حاصل تبصرہ ہے۔ مصنف نے ایک "بھرپور" زندگی بسر کی ہے اور اس کا حال اچھے دل چسپ اور خوش آئند انداز میں لکھا ہے۔ میں نے ;

کتاب پر لاہور ریڈیو اسٹیشن سے گزشتہ اپریل میں تبصرہ بھی کیا تھا۔ اس کے ساتھ دوسری کتاب کنہیا لال کپور کی سنگ وخشت تھی جس میں ان کے مزاحیہ مضامین ہیں جن سے ان کے لطیف طنز اور مزاح کا پتہ چلتا ہے۔

اس سے پہلے لاہور ریڈیو اسٹیشن سے میں نے دو کتابوں پر تبصرہ کیا تھا۔ ایک عبدالماجد کی محمد علی جس کا ذکر کر چکا ہوں اور دوسری ذاکر صاحب کی تعلیمی خطبات۔ خطبات کی خوبی اور زبان اور خیالات کی ندرت کے لیے ذاکر صاحب کا نام کافی ضمانت ہے۔ ان کی طرح نہ کوئی دوسرا سوچتا ہے نہ لکھتا ہے!

۱۷ر اگست

ہم لوگ آج ہارون آئے ہوئے ہیں اور مرزا کمال الدین کے نہایت پر فضا مکان میں ٹھیرے ہوئے ہیں جو جھیل کے بالکل قریب واقع ہے۔ شام کو واپس چلے جائیں گے۔ گزشتہ دو ماہ میں بارہ مولا، ماگام، مٹن وغیرہ دورے کے لیے جانا ہوا۔ عزیز اور بچیاں بھی ساتھ تھیں۔ سرنگر سے باہر اس طرح چند روز گزارنا صحت کے لیے بھی اچھا ہے اور تفریح کا باعث بھی ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ کشمیر کے کئی سال کے قیام میں ہم لوگوں نے اس لحاظ سے کافی فائدہ نہیں اٹھایا اور سرکاری اور خانگی مجبوریوں کی وجہ سے زیادہ وقت سری نگر ہی میں گزرا۔

ان دوروں کے سلسلے میں میں نے بہت سے اسکول دیکھے، خصوصاً ابتدائی مدارس اور بعض اسکولوں کو دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ ان میں سے کئی ایسے اسکول ہیں جن میں صرف ایک یا دو استاد ہیں اور طلبہ کی تعداد ۵۰ سے لے کر ۱۰۰ تک ہے۔ لیکن چوں کہ استادوں نے جدید تعلیمی خیالات کو سمجھا ہے اور خود ان کی طبیعت میں معلمی کی اچھی صلاحیت ہے اس لیے انھوں نے (باوجود ہر قسم کی مشکلات کے) اچھا کام کر کے دکھایا ہے۔ بچوں میں ذہنی بیداری، شوق اور مستعدی پیدا ہوئی ہے۔ اعتمادِ نفس کا جذبہ پیدا ہو چلا ہے۔ اور وہ اسکول میں دل چسپی لینے لگے ہیں۔ اس کے علاوہ بعض جگہ گاؤں

اور اسکول کی زندگی میں ایک نیا رشتہ قائم ہوگیا ہے اور گاؤں والے اسکول کے کاموں میں ہر قسم کی امداد کرنے کے لیے تیار اور اس کے ترقی کے خواہاں ہیں۔ بہت سے گھٹیا یا معمولی اسکول دیکھنے کے بعد اس قسم کے اسکول دیکھ کر طبیعت کو بہت اطمینان ہوتا ہے۔ تعلیمی کام کرنے والوں کو اس بات کی توقع نہیں رکھنی چاہیے کہ ان کے مساعی کا نتیجہ جلد نکل سکے گا لیکن اگر کبھی کبھی نئے خیالات کا خمیر اسکولوں تک پہنچ کر کامیابی کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے تو اس سے حوصلہ افزائی ہو جاتی ہے۔ یوں کام کرنے کے لیے تو حضرت عیسیٰؑ کے دو قول بہت عمدہ رہنمائی کرتے ہیں۔ ایک تو یہ "پرندوں کے خوف سے بیج بکھیرنے میں کوتاہی نہ کرو" اور دوسرے "اپنی روٹی پانی پر پھینک دو، کبھی نہ کبھی تمہارے پاس واپس آجائے گی"!

ایک روز کا چھوٹا سا واقعہ مجھے یاد پڑتا ہے جس کا مجھ پر اس وقت گہرا اثر ہوا تھا۔ یہاں کے ایک بہت معزز عہدے دار کے ہاں ڈنر تھا جس میں چند منتخب لوگ مدعو تھے۔ یعنی علاوہ اس کے کہ اپنی پوزیشن کے اعتبار سے یہ معزز لوگ تھے سب کے سب اچھے تعلیم یافتہ تھے اور تربیت کے اعتبار سے بھی عام عہدہ داروں سے بہتر تھے کیوں کہ سب کا تعلق اچھے خاندانوں سے تھا۔ لہٰذا اس چھوٹے سے گروہ کو سوسائٹی کے "بہترین" طبقہ کا ایک اچھا CROSS SECTION سمجھنا چاہیے...... کھانے کے دوران میں گفتگو کا رخ کشمیر کی سیاست کی طرف مڑ گیا اور مجھے یہ معلوم کرکے بہت افسوس ناک تعجب ہوا کہ تقریباً سب لوگ کشمیر کے عوام کو ہر قسم کی آزادی کا نا اہل سمجھتے تھے' ان کے لیڈروں کو ناقابلِ اعتبار اور بددیانت خیال کرتے تھے (اس میں تو غالباً صداقت بھی ہے) اور ان میں دوئی کا وہ مہلک جذبہ جو عوام اور خواص میں صریح امتیاز کرتا ہے نہایت شدت کے ساتھ کارفرما تھا اور ستم یہ ہے کہ اس شان کے ساتھ یہ جذبہ موجود تھا کہ انھیں اس کی موجودگی کا کوئی شعوری احساس بھی نہ تھا! اس کے بعد اتفاقاً یہ ذکر چھڑا کہ حال ہی میں مہتروں نے ہڑتال کردی تھی کہ میونسپل کمیٹی ان کی تنخواہوں میں اضافہ کرے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ مطالبہ ناجائز یا باغیانہ تھا؟ یا اگر "پبلک لیڈروں" نے اس موقع سے فائدہ اُٹھاکر ان کی ترجمانی کی اور ان کی تائید کی تو یہ نامناسب تھا۔ لیکن ان بزرگانِ کرام کا یہ خیال تھا کہ ان غریب خاکروبوں

اور ان کے نمائندوں دونوں کو قانون کی زد میں لاکر خوب "ٹھوکنا" چاہیئے تھا اور جن لوگوں نے ان کے ساتھ سمجھوتا کرلیا۔ انھوں نے بڑی کمزوری کا اظہار کیا! اناللہ وانا الیہ راجعون ...... میں ان کے ساتھ کھانا کھا رہا تھا' ان سے بحث کر رہا تھا لیکن خیال یہ ہوتا تھا کہ گویا میں نہ اس جماعت کا جزو ہوں۔ نہ ان کے ساتھ کسی قسم کا اشتراک خیال وعمل ممکن ہے ...... اگر ہمارے بہترین تعلیم یافتہ لوگ بھی اب تک اس ذہنیت میں مبتلا ہیں تو اس قوم کا کیا مستقبل ہوگا۔ کیا سوائے تشدّد انقلاب کے اور کوئی صورت ممکن نہیں ہوگی؟

گزشتہ چند ہفتے میں دنیائے سیاست میں کئی اہم باتیں ہوئی ہیں لیکن چوں کہ یہ ایک ذاتی ڈائری ہے اس لیے میں اس میں بالالتزام سیاسی تاریخ کو داخل نہیں کرنا چاہتا۔ البتہ بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں جن کی خاص اہمیت ہے کیوں کہ ان سے ہوا کے رخ اور مستقبل کے رنگ کا کچھ پتہ چلتا ہے۔ یورپ میں جنگ نے صریحاً جرمنوں کے خلاف اور (بقول ترکی ریڈیو کے!) "متفقوں کے حق میں کروٹ لی ہے"۔ بلغاریا نے صلح کرلی ہے' روس جرمنی کی سرحد پر پہنچ چکا ہے اور پولینڈ کا خاتمہ ہوا چاہتا ہے' ترکی نے جرمنی سے سیاسی تعلقات قطع کرلیے ہیں۔ فرانس پر امریکن اور انگریزی فوجوں نے دوتین طرف سے چڑھائی شروع کردی ہے اور محبِّ وطن فرانسیسیوں نے پیرس پر قبضہ کرلیا ہے اور جرمنوں کو نکال دیا ہے۔ غرض بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جرمنوں پر عرصۂ حیات تنگ ہونے لگا ہے۔ لوگوں کا خیال ہے کہ شاید یورپ کی جنگ اس سال کے اندر اندر ختم ہوجائے (لیکن چین کے مصائب اور جاپان کی جنگ ابھی جاری رہے گی!) اس کے بعد کیا ہوگا؟ روس' انگلستان اور امریکہ میں جو اختلاف مقاصد واغراض سطح کے نیچے دبا ہوا ہے وہ روز بروز زیادہ دلیری کے ساتھ باہر جھانکنے لگا ہے۔ دیکھیے اس ناہموار اتحاد کا کیا انجام ہوتا ہے۔ ادھر ہندوستان میں گاندھی جی انگریزوں سے اور مسلم لیگ سے (یعنی جناح سے) سمجھوتا کرنے کی ٹکریں ہیں اور اپنی طرف سے اس کے لیے ہر کوشش کر رہے ہیں اور ان کی بعض باتیں ماننے کے لیے تیار ہیں مثلاً انھوں نے جناح کو لکھا ہے کہ راج گوپال چاری کے مجوزہ فارمولے کی بنیاد پر (جو پاکستان کے اصول کو تسلیم کرتا ہے) وہ ان کے ساتھ ملاقات کریں چناں چہ ابھی چند

روز میں جناح گفت و شنید کے لیے انھیں شرفِ باریابی بخشیں گے! شاید کچھ سمجھوتے کی صورت نکل آئے۔ گو میرا اندازہ یہ ہے کہ ایسا ہونا قرینِ قیاس نہیں۔ اُس طرف انگریزوں کی گزشتہ چند ماہ کی جیت نے حسبِ معمول ان کو اور سخت بنا دیا ہے (یہ سیاسی کم ظرفی کا ایک خاص ثبوت ہے) اور وائسرائے نے گاندھی کی ملاقات کی درخواست، ممبران کانگریس کمیٹی سے ملنے کی اجازت طلبی وغیرہ کو ردّ کر دیا ہے۔ انگریزوں کو یہ خواہش تو اب بھی بہ شدّت موجود ہے کہ وہ ہندوستان کو آزاد دیکھ کر اپنی آنکھیں ٹھنڈی کریں لیکن احتیاطاً وہ ایسے حالات پیدا نہیں ہونے دیں گے جن میں ان کی اس آرزو کی تکمیل کا امکان ہو!

میں نے پچھلے دنوں ایک مضمون "کشمیر میں بنیادی تعلیم" کے متعلق لکھا ہے جو نیشنل پریس سنڈیکیٹ کی طرف سے مختلف اخباروں میں چھپا ہے اور ایک مضمون "گاندھی جی اور بنیادی تعلیم" کے متعلق لکھا ہے جو ان کے آئندہ BIRTHDAY VOLUME میں چھپے گا۔ باقی اور کچھ لکھنے کا وقت کہاں سے لاؤں؟۔ دفتر میں قلم گھسنے سے مہلت نہیں ملتی!

ایک اچھی کتاب SO LITTLE TIME پڑھی ہے جو امریکہ کے ایک مصنف MARQRAAND کی لکھی ہوئی ہے جس میں اس نے گویا امریکہ کی موجودہ زندگی کے بہت سے موثر اور معنیٰ خیز SNAPSHOTS دکھائے ہیں۔ امریکی ناول عام طور پر اچھے نہیں ہوتے لیکن اس کتاب میں صحیح قدریں بھی پائی جاتی ہیں اور مصنف کا TECHNIQUE انفرادی اور کامیاب ہے۔ اس کا ہیرو ایک ادبی آدمی ہے جو خود ڈراما نویس تو نہیں لیکن دوسروں کے ڈراموں کو سینما کے لیے بہت قابلیت کے ساتھ EDIT کرتا ہے لیکن اس کی طبیعت اور خیالات اور لوگوں کی جانب اس کا ردِّ عمل اس قسم کا نہیں جیسا عام طور پر کامیاب امریکی لوگوں کا ہوتا ہے بلکہ اس میں انسانیت اور ہمدردی اور ایک قسم کا غیر معمولی عجز۔ بلکہ ہچکچاہٹ کی شان ہے جو اس کی شخصیت کو محبوب بنا دیتی ہے۔ چند اور کتابیں، کچھ یوں ہی سی!

۱- BORODIN : PEACE IN NOBODY'S TIME (ایک سیاسی FANTASIA ہے جس میں "عام لوگوں کی حکومت" کا ایک خاصا دل چسپ نقشہ کھینچا گیا ہے)

۲- FIELDEN: BEGGAR MY NEIGHBOUR (ریڈیوں کے پہلے چیف کی ایک چھوٹی سی

کتاب جس میں اس نے ہندوستان کے سیاسی مسائل پر بہت جرأت کے ساتھ اور بے لاگ انداز میں تنقید کی ہے۔ ایسے انگریز بھی کبھی کبھی نکل آتے ہیں)

۳- LESLIE CHARTERIS کی ایک ADVENTURE STORIES جن کا تعلق THE SAINT SERIES سے ہے۔"

۵/ستمبر

اس ہفتے کی چند کتابیں۔ HEMINGWAY: FOR WHOM THIS BELL TELLS

یہ اسپین کی سول جنگ کا ناول ہے جس میں مصنف نے نہایت جیتے جاگتے انداز میں اس زبردست جنگ کا نقشہ کھینچا ہے اور اشخاصِ ناول کی ایسی سیرت کشی کی ہے کہ وہ چلتے پھرتے، جیتے جاگتے، محبت اور نفرت کرتے، حبِّ وطن اور غداری کا کمال دکھاتے نظر آتے ہیں۔ اس کی عبارت میں ایک خاص انفرادیت ہے اور نفسی تجزیہ بہت کامیاب ہے خصوصاً ایک عورت PILLAR کا ایسا زبردست کیرکٹر دکھایا ہے کہ اسے ادب کے تصویر خانے میں ایک مستقل اضافہ سمجھنا چاہیے۔ گو اس کی ہمدردی تمام تر REPUBLICANS کی طرف ہے لیکن اس نے ان کی زیادتیاں اور خلافِ انسانیت حرکات بھی دکھائی ہیں ...... ادبی "ترقی پسندی" کے ساتھ عام طور پر جن چیزوں کا تصور ہندوستان میں وابستہ سمجھا جاتا ہے وہ سب بھی موجود ہیں لیکن ناول کی وسعت اور زور اور گہری انسانی ہمدردی اور عین پسندی میں (جو "جذباتی" نہیں بلکہ ٹھوس واقعیت کے رنگ میں رنگی ہوئی ہے) یہ سب چیزیں کھپ جاتی ہیں...... مصنف کا نقطۂ نظر JOHN DAME کے مندرجہ ذیل اقتباس سے واضح ہوتا ہے کہ جو کتاب کے سرِورق پر ہے اور جس سے کتاب کا نام لیا گیا ہے۔

NO MAN IS AN ISLAND, ENTIRE OF ITSELF;
EVERY MAN IS A PIECE OF THE CONTINENT,
A PART OF THE MAIN; IF A CLAD BE WASHED
AWAY BY THE SEA. EUROPE IS THE LESS AS
WELL AS IF A PROMONTORY WERE, AS WELL
AS IF A MAINOR OF THE FRIENDS OR OF

THINE OWN WERE; ANY MAN'S DEATH DIMINISHES ME BECAUSE I AM INVOLVED IN MANKIND; AND, THEREFORE, NEVER SEND TO KNOW FOR WHOM THE BELL TOLLS. IT TOLLS FOR THEM.

۱۶؍نومبر

چند قابلِ ذکر کتابیں۔

۱۔ (موجودہ مسائل پر ایک قابل ترقی پسندانہ تبصرہ) LASKI : FAITH REASON AND CIVILIZATION

۲۔ زمانۂ جنگ کے روس کا ایک زبردست ناول جس میں گوریلوں کی لڑائی اور جرمنی کے مظالم کا دل ہلا دینے والا حال ہے WASILEWSKA: RAINBOW

۳۔ اپٹن سنکلز کی نئی کتاب WIDE IS THE GATE ابھی تک میسر نہیں ہوئی لیکن OMNIBOOK میگزین میں اس کا خلاصہ پڑھا۔ یہ مجاہد نازی تحریک اور دوسرے مخالف انسانیت تحریکوں کے خلاف اپنے قلم کو تلوار کی طرح استعمال کرتا رہتا ہے۔ خلاصے میں اصل کتاب کا لطف تو کہاں ملتا لیکن قصہ معلوم ہوگیا۔ در اصل اس میں پچھلی تین کتابوں کا سلسلہ جاری ہے اور CONFLICT وہی ہے یعنی رجعت پسند ذہنیت کی جنگ اور مخالفت ان تحریکوں کے خلاف جن کی تائید میں خطرہ ہے لیکن جن کی کامیابی میں مستقبل کی امیدیں خوابیدہ ہیں۔

۴۔ " GANDHIJI " یہ وہ کتاب ہے جو حال ہی میں شائع ہوئی ہے اور گاندھی جی کی پچھترویں سال گرہ کے موقع پر انھیں پیش کی گئی ہے۔ بہت ہی اچھی چھپی ہے اور مواد کے اعتبار سے بھی قابلِ قدر ہے۔ اس میں باچھو کا اور میرا مضمون بھی شامل ہے۔ کتاب کو پڑھ کر گاندھی جی کی عظمت سے انکار کرنا ناممکن ہو جاتا ہے، خواہ لوگ بعض بعض باتوں میں ان سے کتنا ہی اختلاف نہ کریں۔

۵۔ TRIAL OF MUSSOLINI (جو صرف مسولینی کا نہیں بلکہ ان تمام انگریز سیاست دانوں

کا پردہ چاک کرتا ہے جنھوں نے برسوں اپنے ذاتی مفاد کی خاطر مسولینی کی حمایت کی!)

گزشتہ ماہ باپھو اور بجی ہمارے ہاں آئے ہوئے تھے۔ ان کی وجہ سے کافی دل چسپی رہی۔ باپھو نے اپنے فن میں کافی ترقی کی ہے اور اس کی تحریر میں زیادہ پختگی اور کہانیوں اور پلاٹ میں زیادہ جان پیدا ہوتی جاتی ہے۔ اپنے دورانِ قیام میں اس نے PEOPLES' THEATRE کی تحریک پر ایک تقریر کی اور اپنی ایک کہانی DEFEAT FOR DEATH سنائی جو بہت کامیاب تھی اور اس میں گاندھی جی کے برت، سٹالن گراڈ کے تحفظ اور ایک حبشی لڑکے کی داستانِ مصیبت کو ملا کر ایک کافی موثر کہانی تیار کی گئی تھی جس کا "مارل" یہ تھا کہ اگر عزم اور ارادہ کی پختگی موجود ہو تو موت بھی ہتھیار ڈال دیتی۔

۶- DOUGLES REED کی ایک کتاب جس میں ایک ڈراما کی شکل میں ہٹلر کے انجام کا حال بیان کیا گیا ہے۔ ڈراما دل چسپ ہے اور اس میں حالات کی پیش بینی تعجب خیز ہے۔ یہاں تک کہ اس (ناکام) کوشش کا ذکر موجود ہے جو چند ماہ ہوئے اسے مار ڈالنے کے لیے کی گئی تھی۔

اس دفعہ کشمیر میں میں نے دورے زیادہ کیے جس کی ایک وجہ یہ تھی کہ انسپکٹری کا چارج مختار صاحب کے پاس تھا اور انھوں نے اس چیز میں دل چسپی لی۔ ان دوروں کے ذریعہ باہر کے اسکولوں کے حالات کا بہتر اندازہ ہوا اور بعض جگہ یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی کہ باوجود سامان اور عمارت کی کمی اور استادوں کی مختلف مشکلات کے بہت اچھا کام ہو رہا ہے اور بعض استادوں نے محض اپنی دیانت داری اور فرض شناسی اور جو کچھ تھوڑی بہت ہدایت انھیں دی جا سکی ہے اس کی مدد سے بہت اچھا کام کر کے دکھایا ہے۔ میں نے ان استادوں کی قدر شناسی اور ہمت افزائی کرنے کے خیال سے گاؤں کے یہ چھوٹے چھوٹے اسکول پرائم منسٹر، سر مرزا اسماعیل اور مسٹر اور مسز شوار راؤ وغیرہ کو دکھائے اور سب ان سے خاصے متاثر ہوئے اور تعجب کرتے تھے کہ اس بے سروسامانی کی حالت میں بھی اتنا اچھا کام ممکن ہے۔

اس سلسلے میں ایک دورہ گریز کا کیا جو گلگت کے راستے میں ایک سرحدی علاقہ

ہے اور ۴۰ میل گھوڑے کا سفر کرنا پڑتا ہے۔ یہ ایک چھوٹی سی خوبصورت وادی ہے "چٹا پتھر" کی چوٹی سے گزر کر جو ۱۱ ہزار فٹ بلند ہے، اس وادی میں پہنچتے ہیں اور راستے میں بعض جگہ منظر بہت ہی نظر فریب ہے، خصوصاً گریز کے قریب پہنچ کر، پہاڑ، جنگل، دریا، سرسبز میدان جن میں خزاں کی آمد سے نئے نئے رنگ بھرے جا رہے تھے۔ بھوج پتر کے بالکل زرد درخت، جن کی چھال کا قدیم زمانہ سے کاغذ بنایا جاتا ہے ...... گریز چھوٹا سا ایک گاؤں ہے جس کی چند سو آبادی ہے اور لوگ بہت سیدھے سادھے، غریب اور شریف ہیں۔ ان کے لیے یہاں ایک بنیادی مدرسہ قائم کیا گیا ہے جس میں خاصا کام ہو رہا ہے۔ لیکن میری خواہش یہ ہے کہ ایسی جگہوں میں مدرسے مقامی سماج کا ایک جزو ہو جائیں جیسے کہ ان کی گرد کی دیواریں غائب ہو گئی ہیں اور وہ بچوں اور بالغوں کی روز مرّہ کی زندگی میں ضم ہو گئے ہیں اور تعلیم صرف کتابیں پڑھنے پڑھانے کا نام نہ ہو بلکہ بچے مقامی سماج کے مشاغل اور کاروبار میں اور ان کے دُکھ درد میں شریک ہو کر تربیت حاصل کریں۔ یہاں ابھی تک ایک حد تک وہ حالات موجود ہیں جو زیادہ ترقی یافتہ ملکوں اور ہندوستان کے صنعت و حرفت کے مرکزوں میں سو برس پہلے تھے۔ یعنی تعلیم اور زندگی کا براہِ راست رابطہ قائم کیا جا سکتا ہے۔ اس دورے میں باچھو بھی میرے ہم راہ تھا۔

ایک اور کتاب کا ذکر کرنا یاد نہیں رہا۔ اپٹن سنکلر کی پُرانی کتاب MAMMON ART جس میں دنیائے ادب کی تنقید ایک بہت دل چسپ اور اچھوتے انداز میں، شوخی اور ظرافت کے ساتھ کی گئی ہے۔ سنکلر کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ بیشتر ادیب اور اہلِ قلم اور فن کار بالواسطہ یا براہِ راست دولت کے غلام رہے ہیں اور سماجی امتیازات نے ان کے فن پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ یہ نقطۂ نظر بادی النظر میں بالکل یک طرفہ اور مبالغہ آمیز معلوم ہوتا ہے لیکن اگر کتاب کو غور اور غیر جانب داری سے پڑھا جائے تو اس نظریہ کا بڑی حد تک قائل ہونا پڑتا ہے۔ لیکن ابھی تک ہماری درس گاہوں میں ان خیالات کو جو انقلابی اور خلافِ تہذیب سمجھے جاتے ہیں بار حاصل نہیں ہوا۔ وہاں تو اُردو ادب ابھی تک پاسبانی ہی کی حیثیت میں ہے اور انگریزی ادب کے نقاد اور مفتہ محض سطحی اور مروّجہ تنقید پر بس کرتے ہیں۔

ہاں ایک چھوٹی سی جماعت ایسی بھی پیدا ہورہی ہے جو مثل ہر معاملے کے ادب کی تنقید بھی مارکس کے اصولوں پر کرتی ہے لیکن ان میں احساسِ تناسب اور رواداری کی کمی اور یک طرفگی کی زیادتی ہے۔ اس لیے وہ کافی اثر نہیں پیدا کر پاتے۔ اس سلسلہ میں ایک SYMPOSIUM بھی ہوا تھا "IS LITERATURE PROPAGANDA" جس میں میں نے صدارت کی تھی اور یہ رائے ظاہر کی تھی کہ ادب کا بیشتر حصّہ شعوری یا غیر شعوری طور پر پروپیگنڈا ہے لیکن جو پروپیگنڈا مروجہ اداروں، قدروں اور طریقۂ زندگی کے حق میں ہے اس کو لوگ ادب صحیح جانتے ہیں اور جو ادب نئی اور غیر مقبول قدروں اور اصولوں کی تبلیغ کرنا چاہتا ہے اس کو جانب دار اور PROPAGANDIST سمجھا جاتا ہے جس طرح ہم فضا کے بوجھ کے عادی ہوکر اس کو محسوس نہیں کرتے اس طرح ہمیں ان امور کا ذکر اور تبلیغ پروپیگنڈا نہیں معلوم ہوتی جن کے ہم عادی ہوچکے ہیں۔

سری نگر میں ایک روز ترقی پسند ادیبوں کا ایک جلسہ ہوا تھا جو خاصا اچھا تھا۔ اس سلسلے میں ستیارتھی (رونلد مصنّف" میں ہوں خانہ بدوش" سے ملاقات ہوئی جو ایک ہونہار اور انفرادی حیثیت رکھنے والے ادیب ہیں۔

دسمبر ۴۴ء چند کتابیں:- ۱۔ STEINBEEK (مصنّف GRAPES OF WRATH) کی کتاب IN DUBIOUS BATTLE جس میں امریکہ کے مزدوروں کی ہڑتال کا سچا اور جیتا جاگتا حال بیان کیا گیا ہے۔ اس مصنّف کے متعلق سنکلر نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ میرے بعد میری عبا اس کے شانوں پر ڈالی جائے گی۔

۲۔ سنکلر کی METROPOLIS جو ایک بہت پرانا ناول ہے جس میں بیسویں صدی کے آغاز میں نیویارک سوسائٹی کا حال بیان کیا گیا ہے اور "نو دولتوں" کی زندگی، عیش پسندی، بے مقصدی کام اور آئیڈیلز سے بیگانگی، غرض ان کے سماج کے تمام تاریک گوشوں کو بے نقاب کیا گیا ہے۔ اگر سنکلر کے علاوہ کوئی اور ان کی دولت اور ناکارگی کی ایسی داستانیں سناتا تو مجھے یقین نہ آتا۔ اس کتاب میں مصنّف کا آرٹ ابھی خام ہے لیکن سماجی ناانصافیوں کے خلاف جذبۂ جنگ ایسا ہی صاف اور صریح ہے جیسا آج کل۔

۳۔ INDIGO (CHRISTINE WESTON) ہندوستان کی زندگی کے متعلق ایک ناول ہے اور خاصا زوردار ہے اگرچہ اس میں ہندوستانی زندگی کا ایک محدود اور ذرا دور از کار شعبہ لیا گیا ہے یعنی نیل کا کام کرنے والے انگریزوں وغیرہ کی زندگی لیکن ہندوستانیوں کے ساتھ ہمدردی اور انصاف کا جذبہ بھی موجود ہے۔

۴- 999 AND ALL THAT انگلستان کے محکمۂ انفارمیشن کی ناکامی اور اس پر تنقید۔ لیکن کتاب مایوس کن ہے۔ 1066 AND ALL THAT کے مصنف سے اس سے بہتر چیز کی توقع ہو سکتی تھی۔

ایک کتاب حال ہی میں آئی ہے اقبال نامہ یعنی ان خطوں کا مجموعہ (حصّہ اوّل) جو اقبال نے لوگوں کو لکھے ہیں۔ مسلم یونی ورسٹی کے شیخ عطاء اللہ صاحب نے ان کو مرتب کیا ہے۔ میرے نام کے چند خط بھی اس میں شامل ہیں۔ ہر چیز جس سے اقبال کا تعلق ہو میرے لیے جاذبِ توجہ ہے اور اس مجموعے سے تو اقبال کی شخصیت پر روشنی پڑتی ہے اور ان کی انسانیت، شرافت، ہمدردی، استغنا، علم کی سچّی طلب اور اسلام کی گہری محبت کا پتہ چلتا ہے۔ دراصل بڑا آدمی وہ ہے جو روزمرہ کی زندگی میں بھی اس بلند سیرت کا اظہار کرے جو لوگ نمائش اور پلیٹ فارم کی تقریروں کے لیے محفوظ رکھتے ہیں۔

۱۵ر جنوری ۴۵ء سنکلر کی ایک کتاب COOP (A NOVEL OF LIVING TOGETHER) پڑھی جس میں امریکہ کے چند ان بے کار غریبوں کی زندگی کی داستان ہے جنھوں نے ۱۹۳۲ء وغیرہ کے DEPRESSION کے زمانے میں ایک COOPERATIVE جماعت قائم کر کے PRODUCTION اور BARTER کے اصول پر زندگی بسر کرنے کی کوشش کی تھی لیکن اس میں بھی مفادِ مخصوص کی مخالفت اور RED TAPE کی مشکلات کی وجہ سے کامیابی نہ ہو سکی۔ کس قدر صاف اور شریف تصورِ زندگی کا اس شخص کی کتابوں میں جھلکتا ہے۔ جو شخص اس قسم کی چیزوں کو پڑھے اور اس پر گہرا اثر نہ پڑے تو اس کی محرومی اور بدبختی ہے۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ اس قسم کا ناول سیاست اور اقتصادیات کی بہترین کتابوں اور کالجوں کی سالہا سال کی وقت گزاری سے بہتر تعلیم دیتا ہے۔ کتاب میں سے چند جملے درج کرتا ہوں:

"A COLLEGE OF RECIPROCAL ECONOMY". (P 321) FOR THE PEOPLE. WHEN ONE TAUGHT AN ORDINARY SCHOOL OR COLLEGE, ONE HAD PUPILS WHO CAME BECAUSE THEY WERE SENT AND WHOSE IDEA OF EDUCATION WAS A MANNER OF IMPROVING THEIR SOCIAL STATUS AND INCOME. THOSE WHO CAME FROM A GENUINE LOVE OF KNOWLEDGE WERE AS RARE AS WHITEBLACK BIRDS. BUT TO A WORKERS COLLEGE NOBODY CAME UNLESS HE OR SHE WANTED TO LEARN. WORKINGMEN CAME REVERENTLY, AS TO A SHRINE; THEY HAD LOOKED UPON KNOWLEDGE AS A PRIVILAGE OF THE WELL-TO-DO, SOMETHING TOWHICH THEIR CHILDREN MIGHT ATTAIN, BUT NEVER THEMSELVES. YOUNG PEOPLE WHO HAD GROWN DISCOURAGED, CONFRONTING A WORLD WITHOUT JOBS, TOOK NEW HOPE AT THE VISION OF A WAY TO MAKE ONES OWN JOB. ALL SORTS OF PEOPLE CAME, WITH ALL SORTS OF MOTIVES; CRANKS AND CRACKPOT AMONG THEM, BUT ALSO [illegible] POSSIBILITY OF GENIUS

قیامِ رام پور

۱۹۴۵

۱۷ فروری

آج زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ ۹ فروری کو میں نے جموں میں اپنے عہدہ کا چارج دے دیا اور کل شام یہاں پہنچا ہوں۔ خدا کرے یہ نیا باب جس کا آغاز ہو رہا ہے کامیابی اور نیک نامی کے ساتھ انجام کو پہنچے۔ مجھے اس جگہ کو قبول کرنے میں ابتدا میں کافی تامل تھا لیکن دوستوں کے مشورے اور غور کے بعد یہی طے کیا کہ یہاں کام کے حالات اچھے ہوں گے اس لیے اس کو آزما کر دیکھنا چاہیے۔

جموں سے روانگی سے پہلے ہلکا سا ٹائیفائڈ ہو گیا تھا جس میں عزیز نے تیمارداری اعلا جوہر دکھائے اور عابد صاحب دہلی سے پہنچے۔ مگر خیر یہ تو توقع ہی تھی۔ تعجب تو بات کا تھا کہ اہلِ جموں نے خواہ ان کا تعلق محکمۂ تعلیم سے تھا یا نہیں، اس عرصے میں ہمدردی، محبت اور خلوص کا ثبوت دیا اور محکمۂ تعلیم سے جس قدر عورتوں کا تعلق تھا وہ بھی اس ے میں عزیز کا ہاتھ بٹانے اور ہمدردی دکھانے میں بہت پیش پیش تھیں۔ ان کے لو

جب وہاں سے روانگی کا وقت آیا (بلکہ جب سے لوگوں کو اس بات کا علم ہوا کہ میں ریاست سے جارہا ہوں) تو عام طور پر سب لوگوں نے اس قدر خلوص سے (اور میری اپنی رائے ہے کہ غلو کے ساتھ!) قدر شناسی کی جس کی مجھے ہرگز توقع نہ تھی۔ عام طور پر اہلِ ریاست کے متعلق لوگوں کا خیال ہے کہ وہ "ناقدر" ہوتے ہیں اور خصوصاً بیرونِ ریاست کے لوگوں کے جانے کو نجات سمجھتے ہیں۔ لیکن میرا تجربہ اس سے بالکل مختلف رہا ہے۔ لوگوں نے جن میں ہندو، مسلم، سکھ، سبھی شریک تھے اس کام کو بہت کھلے دل سے سراہا جو گزشتہ سات سال میں محکمۂ تعلیم میں کیا گیا ہے اور میرے جانے پر میرے استحقاق سے زیادہ اظہارِ افسوس کیا اور بہت سے ایڈریس وغیرہ بھی دیے۔ مجھے اس بات کی خاص طور پر خوشی ہے کہ میں نے حکومتی نظم ونسق میں ایک تجربہ جو کیا تھا اور جس کو عام طور پر اصولِ حکومت کے خلاف سمجھا جاتا ہے اس میں مجھے کامیابی ہوئی۔ میں نے شروع سے اس بات کا التزام رکھا تھا کہ تمام اہل کاروں کے ساتھ انسانوں اور برابر کے شرکائے کار کا سا برتاؤ کیا جائے اور ان پر کسی قسم کا تحکّم اور بے جا رعب قائم نہ کیا جائے۔ مجھے نہ صرف اس صحیح اصول پر عمل کرنے سے کوئی افسوس یا انتظامی دقت پیدا نہیں ہوئی بلکہ جس بات کو مختلف ایڈریسوں اور تقریروں میں خاص طور پر پسند کیا گیا وہ یہی تھی .... واقعہ یہ ہے کہ اس عرصے میں مجھے چند بہت اچھے اور مخلص کام کرنے والے ملے اور انھیں کی وجہ سے اس قدر کامیابی بھی ہوئی۔ اس میں ملک فضل حق، غلام احمد مختار، نند لال کترو، پیرزادہ غلام رسول، شیخ عبدالعزیز، رگھوناتھ مٹو وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اس کامیابی میں ان کا اور ان جیسے دوسرے لوگوں کا جو حصّہ ہے اس کو میں نے ہر موقع پر بار بار اور وضاحت کے ساتھ بیان کیا اور ساتھ ہی حکومت کے اراکین، اخباروں کے نمائندوں اور پبلک لیڈروں پر زور ڈالا کہ وہ تعلیمی اصلاح اور اشاعت کے کام کو جاری رکھیں۔ حالات ایسے ہیں کہ اس کی زیادہ امید نہیں۔ پرائم منسٹر سر بی۔ این۔ راؤ بے حد نیک، شریف اور نیک نیت لیکن ذرا کم زور آدمی ہیں اور وزیر تعلیم ایک نیم تعلیم یافتہ شخص ہیں جن کو تعلیم کی مطلق سمجھ نہیں اور جو غالباً سیاسی جماعتوں کے اشارے یا دباؤ پر کام کریں گے۔ عام فضا سازش کی ہے جس کا میں نے مقابلہ بھی کیا اور بعض

اوقات اس کو بالکل نظرانداز کر کے بے ضرر بھی بنا دیا اس کی وجہ سے محکمے سے سازشں اور پارٹی بندی تقریباً ختم ہوگئی تھی۔ اگر اب دوبارہ ان چیزوں نے زور پکڑا تو تعلیم کا مستقبل مشکوک ہوجائے گا ...... حکومت نے ما بعد جنگ کی تعلیمی تنظیم کے لیے میری صدارت میں ایک کمیٹی مقرر کی تھی۔ اس کا کام میں نے مکمل کر دیا ہے۔ لیکن دیکھنا ہے کہ اس پر کہاں تک عمل ہو سکتا ہے ...... بہرحال میں اس بات سے خوش ہوں کہ بحیثیت مجموعی کشمیر کا قیام کام کے اعتبار سے کامیاب رہا اور لوگوں کو اس کا فیاضی کے ساتھ اعتراف بھی ہے ..... مخالفت میں ایک زبردست آواز (یا قلم) اُٹھائی گئی تھی یعنی ایک مسماۃ شانتا کماری کا اخبار بھارتی جو ہندی میں نکلتا ہے اور ہندی پرچارنی سبھا کے بعض غرض مند لوگ اس کو اپنا آلۂ کار بناتے ہوئے ہیں لیکن اس میں اندازِ مخالفت ایسا تھا کہ شاید ہی کوئی سمجھ دار اور معقول آدمی اس کو باور کرے یعنی میں کشمیر میں پاکستان قائم کرنے کی غرض سے آیا تھا اور میں نے اسکولوں کو تبلیغ کا مرکز بنا دیا ہے اور ہندی کے ساتھ اتیاچار کیا ہے وغیرہ ...... تعصب لوگوں کی عقل کو بالکل ہی اندھا کر دیتا ہے۔ جس شخص کو ہندو مسلم تعصب سے اس درجہ دوری ہے کہ اس کے بعض مسلم دوست اور مسلم حلقے اس بات سے ناراض ہیں اور اس پر کانگریسیت کا الزام لگاتے، اس پر اس نوعیت کا اعتراض کرنا قابلِ حیرت ہے!

یکم اکتوبر

آج کتنی مدت کے بعد اس کاپی کو اُٹھا کر دیکھنے کی نوبت آئی ہے۔ میں آج کل مری میں ہوں۔ نہ معلوم کیوں حکومت ہند نے مجھے اینگلو انڈین اور یورپین تعلیم کے کمیشن کا ممبر مقرر کیا ہے اور وہ کمیشن ہندوستان کے مختلف حصوں کا دورہ کر کے اور ان اسکولوں کو دیکھ کر ان کی اصلاح اور تنظیم کے بارے میں اپنی رپورٹ پیش کرے گا۔ میں نے اس رکنیت کو اس خیال سے قبول کیا ہے کہ شاید اس طرح اس جماعت کی تعلیم اور ہندوستان کی عام تعلیم میں کوئی معقول رابطہ قائم ہو سکے اور اس کی ذہنیت میں کوئی ایسا فرق پیدا

ہو کہ وہ آئندہ ہندوستان میں ہندوستانیوں کی طرح رہنا سیکھیں۔ اس سلسلے میں فی الحال لاہور، مری، مسوری وغیرہ کا دورہ کروں گا اور وسط نومبر کے بعد مدراس، پونا، بمبئی وغیرہ کا۔

گزشتہ ساڑھے سات ماہ رام پور میں گزرے ہیں۔ یہ زمانہ خاصا ذہنی کش مکش کا رہا ہے۔ خیال یہ تھا کہ رام پور میں کام کرنے کے حالات بہت سازگار ہوں گے اور ایک مختصر سے پیمانے پر سہی لیکن اوّل درجے کا تعلیمی کام ہو سکے گا۔ لیکن بدقسمتی سے جس زمانے میں میں آیا اس کے تھوڑے ہی عرصے کے بعد ریاست میں ایک نیم سیاسی، نیم مذہبی اور سراسر احمقانہ تحریک شروع ہوگئی جس کا مقصد ریاست کی حقیقی سیاسی اصلاح اور سیاسی حقوق طلبی نہیں (جو ایک بالکل جائز اور مناسب چیز ہے) بلکہ اس کا مقصد ریاست میں شیعوں کے (بالخصوص اس کے چیف منسٹر زیدی صاحب کے) خلاف پروپیگنڈا کرنا ہے۔ حق یہ ہے کہ رام پور آج کل جو کچھ ہے زیدی کا بنایا ہوا ہے اور اس بات کو تسلیم نہ کرنا انتہائی بے انصافی اور احسان ناشناسی ہے۔ لیکن تعصّب دل اور آنکھوں کو اندھا بنا دیتا ہے۔ اسی خلاف شیعہ محاذ کے سلسلے میں بعض لوگوں نے میری ذاتی مخالفت بھی کی اور گو اس میں کوئی خاص کامیابی نہیں ہوئی لیکن بہرحال تعلیم جیسے قوم ساز میں عام لوگوں اور ان کے لیڈروں کے اعتماد اور اشتراکِ عمل کی ضرورت ہے اور اگر یہ کھُلے دل کے ساتھ پیش نہ کیا جائے تو دل گرفتگی ہوتی ہے اور کام میں بھی مشکلات پیش آتی ہیں اس کے علاوہ ایک اور لطیفہ یہ ہے کہ ریاست میں جو انگریز افسر ہیں ان کے متعلق اندازہ یہ ہے کہ وہ دل میں میرے خلاف ہیں کیوں کہ انھیں یہ بتایا گیا ہے کہ یہ "قوم پرست" اور "غیر سرکاری" خیالات رکھتا ہے۔ یہ اتفاق مبارک ہو مومنوں کے لیے۔ کہ ہم زباں ہیں فقیہانِ شہر میرے خلاف! خدا کا شکر ہے کہ اس نے اتنی توفیق دی ہے کہ اپنے خیالات کو جرأت کے ساتھ ظاہر کرتا ہوں اور اربابِ باطل کی خوش نودی یا ناراضگی کا خیال نہیں کرتا۔ ولوکرہ الکافرون!

رام پور کے کام میں ایک اور مشکل یہ ہے کہ اس نیم سیاسی تحریک کی وجہ سے رام پوری اور غیر رام پوری کی مخالفت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ اس لیے باہر سے کوئی اچھا کام

کرنے والا آدمی لینا بھی محال ہوگیا ہے، جو لوگ موجود ہیں وہ زیادہ تر معمولی قابلیت اور جوش کے ہیں اور ان کے ذریعہ کسی بڑے اور اعلیٰ معیار کے کام کو پروان چڑھانا مشکل ہے۔ بہرحال اپنا کام کوشش کرنا ہے اور وہ میں برابر کر رہا ہوں۔ اب تک ایک خاصا اطمینان بخش کارنامہ یہ ہے کہ استادوں کی تنخواہوں اور گریڈوں میں تقریباً نیچے سے اُوپر تک ہر جگہ خاصا اضافہ کر دیا ہے اور استادوں کی عام معاشرتی حالت اور کارکردگی کو بہتر بنانے کی بہت تدبیریں کی گئی ہیں جن میں سے ایک تعلیمی دربار کا قیام ہے جو غالباً کسی ریاست کی تاریخ میں اپنی قسم کا پہلا واقعہ ہے۔ اس دربار میں تمام ریاست کے اساتذہ مدعو تھے اور وہیں نواب صاحب کے خاص مہمان تھے اور انھیں کی طرف سے ایڈریس اور نظمیں وغیرہ پڑھی گئیں جو میرے ایما پر پرائمری اسکول کے کم تنخواہ یاب مدرسین نے سب کی طرف سے پڑھیں تاکہ سماجی مساوات کا مظاہرہ ہو۔ تقریب خاصی کامیاب رہی۔

سفرِ انگلستان

۱۹۴۵

۲۳ اکتوبر

آج میں انگلستان جارہا ہوں۔ یہ جانا دفعتہً اور خلافِ توقع ہوا۔ ایک بین الاقوامی تعلیمی اور تمدنی کانفرنس لندن میں منعقد ہورہی ہے جس میں ہندوستان کی طرف سے ایک وفد شریک ہوگا۔ اس میں ہندوستانی ریاستوں کی طرف سے نیابت کے لیے مجھے منتخب کیا گیا ہے۔ باقی ممبران ذاکر صاحب، سارجنٹ، راج کماری امرت کور اور ڈاکٹر امرناتھ جھا ہیں۔ ہم لوگ ہوائی جہاز سے جارہے ہیں اور چوتھے روز لندن پہنچ جائیں گے۔ یہ ہے سائنس کا ایک ادنیٰ سا کارنامہ! اینگلو انڈین تعلیم کے کمیشن کا کام نامکمل چھوڑ کر جانا پڑا ہے لیکن یہ موقع اتنا اچھا ہے اور اس کی وجہ سے انگلستان کی عام تعلیمی اور سماجی حالت کو دیکھنے کا جو موقع ملے گا اس کو چھوڑنا اچھا معلوم نہیں ہوتا۔ دیکھنا ہے کہ گزشتہ بیس سال میں (میں ۲۵ء میں انگلستان سے تعلیم حاصل کرکے لوٹا تھا) وہاں کی زندگی میں کیا کیا تغیرات ہوئے ہیں۔ وہ لوگ کہاں پہنچے اور ہم کہاں ہیں اور ابھی جس آتشیں مرحلہ جنگ سے وہ گزرے ہیں اس نے ان کی زندگی پر کیا اثر ڈالا۔

تمہید: بیس سال کے بعد انگلستان کا سفر درپیش ہے۔ اس کی شانِ نزول یہ ہے کہ انگلستان میں ایک بین الاقوامی تعلیمی کانفرنس ہورہی ہے۔ جس کا مقصد یہ ہے کہ ایک مستقل تعلیمی اور تہذیبی ادارے کی تنظیم کی جائے جس کا کام یہ ہو کہ تمام قوموں میں باہمی رواداری اور میل جول پیدا کرنے کے طریقوں پر غور کرے اور ان کو عملی جامہ پہنانے کے لیے مناسب تدبیریں اختیار کرے۔ اس کانفرنس میں شریک ہونے کے لیے ہندوستان کی طرف سے ایک وفد جارہا ہے جس میں پانچ ممبر ہیں یعنی میرے علاوہ ڈاکٹر ذاکر حسین، راج کماری امرت کور، ڈاکٹر سارجنٹ

اور پروفیسر تھا۔

ان میں مجھ کو خاص طور پر ہندوستانی ریاستوں کی طرف سے نمائندہ منتخب کیا گیا ہے نواب صاحب بھوپال نے (جو والیانِ ریاست کے ایوان کے چانسلر ہیں) مجھے منتخب کیا ہے اور نواب صاحب رام پور نے جانے کی اجازت دی مجھے اس وفد میں شریک ہونے میں دل چسپی ایک تو اس وجہ سے ہے کہ بعد جنگ کا انگلستان اور اس کے تعلیمی حالات کو دیکھنے کا موقع ملے گا اور دوسرے یہ کہ تمام دنیا کے تعلیمی ماہرین سے ملنے اور ان کے ساتھ تبادلۂ خیال کرنے کا بہت اچھا موقع ہوگا۔ خدا کرے سفر کامیاب ہو۔

سفر کی پیشین گوئی!

میں بالعموم پیش گوئیوں اور ہاتھ دیکھنے وغیرہ پر ایمان نہیں رکھتا۔ لیکن اس سفر کے سلسلے میں ایک دل چسپ واقعہ یہ ہے کہ تقریباً تین ماہ ہوئے جب اس کا کوئی گمان بھی نہ تھا اس کی پیشین گوئی کی گئی تھی۔ اظہر کے ایک دوست جوزف ہیں جو دراصل برما کے پناہ گزیں ہیں اور عارضی طور پر انھیں کے دفتر میں اسسٹنٹ ڈائرکٹر لگے ہوئے ہیں۔ انھوں نے گزشتہ ستمبر میں میرا ہاتھ دیکھ کر کہا تھا کہ تین ماہ کے اندر اندر مجھے بڑی سفر کرنا اور انگلستان جانا ہوگا۔ عجیب بات ہے کہ یہ پیشین گوئی بالکل صحیح نکلی۔ اسی طرح کی ایک پیشین گوئی میرے کشمیر جانے کے متعلق میرے ایک اور دوست نے کی تھی۔ انھوں نے بھی ہاتھ دیکھ کر بتایا تھا۔ کیا PALMI STRY میں واقعاً کوئی صداقت ہے؟

سفر کا آغاز

اس وفد کی اطلاع مجھے دفعتاً جب میں ایک تعلیمی کمیشن کے ساتھ دورہ کر رہا تھا اور اس سے فارغ ہوکر دہلی اسٹیشن پر پہنچا ہی تھا کہ عابد صاحب نے اطلاع دی کہ مجھے انگلستان جانے کے لیے نامزد کیا گیا ہے اور ایک ہفتہ کے اندر اندر روانہ ہوجانا ضروری ہے (عابد صاحب کو ہمیشہ ان چیزوں کی دھن اور اس میں دل چسپی رہتی ہے اور انھیں پہلے ہی سے

یہ خیال تھا اور کوشش تھی کہ اس وفد کے ساتھ مجھے بھیجا جائے!) چناں چہ بہت جلدی میں انتظامات کیے گئے۔ اظہر کی مستعدی اور کارگزاری سے یہ انتظامات ہو سکے اور کپڑے وغیرہ بھی زیادہ تر اسی کی مہربانی سے ملے! ۔ عزیز شملے میں تھیں۔ ان کو بلایا۔ انھوں نے بہت ہمت اور ایثار سے کام لے کر بخوشی میرے جانے پر آمادگی ظاہر کی گو انھیں اور دوسرے عزیزوں کو خصوصاً باجی کو ہوائی جہاز کے سفر کی وجہ سے کافی پریشانی تھی۔ لیکن میں نے انھیں یقین دلایا کہ اس زمانے میں ہوائی جہاز کا سفر کسی طرح ریل یا بحری جہاز سے زیادہ خطرناک نہیں ہے۔ چناں چہ پاسپورٹ وغیرہ کی تکمیل کی گئی۔ عزیزوں سے ملاقات کی اور ۲۳ر کی صبح کو اوکھلے سے چار بجے اور پالم کے ہوائی اڈے سے ساڑھے چھ بجے روانگی ہوئی۔ عابد صاحب اظہر اور عزیز مجھے اور ذاکر صاحب کو روانہ کرنے اڈے پر آئے تھے۔

دہلی سے کراچی

دہلی سے کراچی کا سفر خاصا آرام سے کٹا اور کوئی غیر معمولی واقعہ پیش نہیں آیا۔ ہم یہ سفر ڈکوٹا قسم کے جہاز میں کر رہے ہیں جو فوجی نقل و حرکت کا جہاز ہے جس میں اٹھارہ بیس مسافر مع اپنے سامان کے آسکتے ہیں۔ آمنے سامنے دو لمبی لمبی سیٹ ہیں اور ایک سرے پر سامان رکھنے کے لیے جگہ خالی ہے۔ ایک چھوٹا سا پاخانہ بھی ہے جو مسافروں کے لیے ایک "نعمتِ غیر مترقبہ" ہے! جہاز میں بہت کم دھکے یا ہچکولے محسوس ہوتے ہیں۔ اس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ میں نے اسی میں بغیر کسی دقت کے خطوط لکھے جو کراچی سے بھیجے گئے۔ راستہ میں ہم لوگ ناشتہ کرنے کے لیے جودھ پور میں اترے تھے۔ اس کے بعد ایک بجے کے قریب کراچی پہنچ گئے پہلے AIR BOOKING CENTRE گئے۔ وہاں سے SEA PLANE کے ٹکٹ لیے سامان تُلوایا (جس کا کل وزن ہر مسافر کے لیے ۶۵ پونڈ یعنی ۳۲ سیر کے قریب مقرر ہے۔ اس سے زیادہ نہیں ہو سکتا) اور کارلٹن ہوٹل میں قیام کیا۔ یہ کوئی بہت آرام دہ ہوٹل نہیں ہے لیکن کمپنی اپنے مسافروں کو یہیں ٹھیراتی ہے۔ ۲۴ر کی صبح

کو چار بجے کے قریب ایروڈرم پہنچے جو سمندر کے کنارے واقع ہے کیوں کہ یہاں سے جو بحری ہوائی جہاز روانہ ہوتے ہیں وہ بجائے خشکی کے پانی پر سے اُٹھتے ہیں۔ یہ میرے لیے ایک نیا تجربہ تھا میں نے اس سے پہلے کوئی SEA PLANE نہیں دیکھا تھا۔ اس میں پانچ کمپارٹمنٹ ہیں جن میں سے تین میں مسافر ہیں اور دو میں سامان۔ ہر درجہ دیکھنے میں چھوٹے سائز کا ریلوے کمپارٹمنٹ معلوم ہوتا ہے..... بیٹھنے کے لیے آرام دہ سیٹ ہیں۔ پیچھے سر رکھنے کے لیے تکیہ لگا ہوا ہے۔ جن گدوں پر بیٹھتے ہیں وہ در اصل "لائف بیلٹ" ہیں جن کو خطرے کے وقت باندھ کر سمندر میں کود سکتے ہیں! صبح کا ناشتہ جہاز ہی میں دیا گیا اس کا طریقہ بہت مناسب اور دلچسپ ہے۔ یعنی ایک کاغذ کے بند ڈبے میں (جیسے FORCE وغیرہ کے ہوتے ہیں) باریک کاغذ میں لپی ہوئی مختلف چیزیں سلیقے سے رکھی ہوئی تھیں مثلاً مچھلی، پھل، سینڈوچ وغیرہ اور دوسری طرف ایک نقشہ سا بنا ہوا تھا جس پر خانوں میں مختلف چیزوں کے نام لکھے ہوئے تھے تاکہ اگر کوئی شخص کوئی چیز نہ کھانا چاہے تو اسے معلوم ہو جائے کہ کیا کیا چیزیں رکھی ہوئی ہیں۔ ایک چھوٹے سے لفافے میں نمک مرچ وغیرہ بھی رکھا ہوا تھا۔ اس قدر سلیقہ میں نے پہلے نہیں دیکھا تھا۔

کراچی سے قاہرہ

ہمارے ہم سفروں میں ایک افغانی ہیں جو حکومتِ افغانستان کے کوئی اعلیٰ افسر (غالباً سکریٹری محکمہ صنعت و کان کنی) ہیں۔ ان کا نام غلام محمد ہے۔ ایک شخص جو اسکاٹ لینڈ کے BAGPIPER رجمنٹ کا لباس پہنے ہوئے ہیں اور دیکھنے میں باجہ بجانے والا معلوم ہوتا ہے PENHOKE کالج کا پروفیسر DON ہے اور انگریزی پڑھاتا ہے! باقی زیادہ تر فوجی ہیں۔ ایک خاندان (جس میں میاں بیوی اور دو بچے ہیں) اور ہے۔ یہ لوگ کئی سال تک شانگھائی میں جاپانیوں کے قید خانے میں نظر بند رہے ہیں اور اب انھیں انگلستان جانے کے لیے ہوائی سفر کا مقدم حق ملا ہے۔ ان سے زیادہ حالات معلوم کرنے کا موقع نہیں ملا لیکن بچے جس آزادی اور بے باکی کے ساتھ گفتگو کرتے ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ خاندان کا

وقت بہت برا اور مطلق نہیں گزرا۔ (جب ہم لوگ قاہرہ پہنچے تو مجھے یہ معلوم کرکے بہت تعجب بھی ہوا اور خوشی بھی کہ بچوں کو بغیر کسی نوٹس اور بغیر کسی درخواست کے فوراً مقامی ریڈکراس کی انجمن میں لے جایا گیا اور وہاں ان کے لیے پورے کپڑے مع اورکوٹ اور جوتوں کے مہیا کیے گئے اور کھیلنے کے لیے گڑیاں اور کھلونے دیے گئے۔ یہ ہے ایک زندہ قوم اور کارکن جماعت کا احساس فرض شناسی!)۔

کراچی سے چل کر دوپہر کا کھانا کھانے کے لیے "بحرین" میں اُترے۔ وہاں صرف آدھے گھنٹے قیام کا خیال تھا لیکن انجن میں کچھ خرابی ہو جانے کی وجہ سے دن کے ایک بجے سے رات کے نو بجے تک وہیں رہنا پڑا۔ بحرین ایک چھوٹا سا قصبہ ہوگا لیکن جنگ کے زمانے میں بحری اور ہوائی اڈا بن جانے کی وجہ سے اس کی آبادی اور کاروبار میں بہت اضافہ ہوگیا ہے۔ یہاں موتی اور مونگے نکالے جاتے ہیں، پٹرول کا کارخانہ ہے اور یہ اندرون ملک کے لیے تجارت کا مرکز بھی ہے۔ ہم نے قصبے کو جاکر دیکھا۔ زیادہ تر عمارتیں کچی یا بانسوں کی بنی ہوئی ہیں بازار معمولی سا ہے۔ لوگ غریب ہیں لیکن بعض کاروباری حلقے اور ٹھیکہ دار وغیرہ ایسے ہیں جنھوں نے جنگ کے سلسلے میں بہت سا روپیہ کما لیا ہے (اور موٹریں خرید لی ہیں!)۔ عورتیں عام طور پر سیاہ برقع میں ملفوف ہوتی ہیں اور بالعموم چہرہ ڈھکے رکھتی ہیں۔ مرد اور عورتیں اکثر ننگے پاؤں پھرتے ہیں اور ان کے رنگ زیادہ تر سانولے یا سیاہ ہیں جس کی ایک وجہ حبشی خون کا اختلاط ہوگا۔ ان چند گھنٹوں میں علاوہ قصبے میں گھومنے کے ہم لوگ برٹش اوور سیز ایئر سروس (B.O.A.C.) کے ریسٹ ہاؤس میں ٹھیرے رہے جہاں چائے، کھانے وغیرہ کا انتظام سب کمپنی کی طرف سے تھا۔ جو کرایہ وہ وصول کرتے ہیں (ایک طرف کا کرایہ کراچی سے لندن تک تقریباً ۱۵۰ یا اس سے چند پونڈ زیادہ کرایہ ہے) اس میں راستے کا کھانا وغیرہ شامل ہوتا ہے۔

بحرین تک کے راستے میں ایک جگہ کچھ ایسی چٹانیں نظر پڑیں جو اپنی ساخت کے اعتبار سے بہت دلچسپ تھیں بلکہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جغرافیہ کا ایک کامیاب ماڈل بنا ہوا ہے۔ ان کے پتھروں کو غالباً پانی کے اثر نے (جس میں بارشیں اور سمندر دونوں کا پانی شامل

ہیں) عجیب طرح کاٹا ہے۔ کہیں ستون سے کھڑے ہوئے ہیں، کہیں دریا سے بن گئے ہیں۔ اس راستے میں پانی کے رنگ عجیب عجیب نظر پڑے جن کو دیکھ کر قدرت کی شان معلوم ہوتی ہے شلاً ہلکا سبز، گہرا سبز، لاجوردی، نیلا وغیرہ۔ بحرین میں ساحل کے قریب دو بالکل مختلف رنگ کا پانی ساتھ ساتھ بہتا ہوا نظر آتا ہے ایک بالکل سبز اور ایک گہرا نیلا۔ شاید اسی وجہ سے اس مقام کا نام "بحرین" ہو۔

مرج البحرین یلتقیان ۵ بینہما برزخ لا یبغیان ۵ فبای آلاء ربکما تکذبان ۵

قاہرہ

رات کو نو بجے کے قریب بحرین سے روانہ ہوکر صبح کے ساڑھے پانچ بجے قاہرہ پہنچے۔ لیکن مغرب کی طرف سفر کرنے کی وجہ سے اس وقت قاہرہ کا وقت ۳½ بجے کا تھا۔ کمپنی کی طرف سے ایک بہت عالی شان اور آرام دہ "ہاؤس بوٹ" کے کمروں میں ٹھیرایا گیا۔ یہ ہاؤس بوٹ جہاز کے اترنے کی جگہ سے بالکل ملی ہوئی ہے۔ کسٹم پوسٹ پر ہم لوگوں کے طبی سرٹیفکیٹ اور پاسپورٹ اور سامان دیکھے گئے لیکن خلافِ توقع مصر کے RED TAPE پسند حکام نے ہمیں ستایا نہیں۔ اس وقت تو جاکر سو رہے لیکن صبح کو روانہ ہونے سے پہلے کوئی گھنٹے بھر کے لیے قاہرہ کی سیر کو گئے جو وہاں سے سات آٹھ میل کے فاصلے پر ہے۔ اوّل تو رات کو سمندر پر اترنے سے پہلے ہوائی جہاز ہی میں قاہرہ کی میلوں پھیلی ہوئی روشنیوں کو دیکھ کر الف لیلہ کی یاد تازہ ہوگئی تھی اور پھر صبح کو قاہرہ کا کچھ حصہ دیکھ کر اس کی عظمت و شوکت اور عمارتوں کی خوبصورتی اور سڑکوں اور چوراہوں کی خوش سلیقگی دیکھ کر بہت اثر ہوا۔ اس جلدی اور روا روی میں شہر کا وہ حصہ جہاں غربا رہتے ہیں دیکھنے کا موقع نہیں ملا یقین ہے کہ وہ انسان کے انسان پر ظلم کا ایک معمولی نمونہ ہوگا لیکن جس حصّے کو دیکھا اس سے اندازہ ہوا کہ ہمارے بہترین شہروں کے مقابلے میں یہاں TOWN PLANNING زیادہ کامیابی کے ساتھ کیا گیا ہے۔ کلکتہ، بمبئی، دہلی، میں سے کوئی بھی قاہرہ کے اس حصّے کی برابری نہیں کرسکتے۔ بازاروں میں دوکانیں بہت عالی شان اور خوش سلیقگی

کے ساتھ آراستہ کی گئی ہیں۔ پھلوں اور پھولوں کی ایسی دوکانیں ہیں جیسے سرمایہ دار ملکوں میں بالعموم جواہرات کے لیے مخصوص ہوتی ہیں۔ کتابوں اور کھانے پینے کی دوکانوں یعنی کیفے وغیرہ کی کثرت ہے۔ اس حصّے میں یہ معلوم نہیں ہوتا کہ دنیا ایک خونیں غسل میں سے ہوکر گزری۔ ہر طرح کی چیزیں موجود ہیں، ان کو خریدنے والے موجود ہیں، اسٹاک اکسچینج کی عالی شان عمارت اس دولت کی آفرینش کی غمازی کرتی ہے۔ ہم نے دوتین جدید قسم کی مسجدیں بھی دیکھیں جن میں سے ایک حال ہی میں موجودہ حاکم شاہ فاروق نے بنائی ہے۔ یہ مسجدیں دیکھنے میں جدید قسم کے گھر معلوم ہوتی ہیں البتہ ان میں ایک بلند اور خوبصورت مینار ضرور ہوتا ہے۔ آج قاہرہ میں "محمل" کے جانے کا دن ہے جب شاہ مصر کی طرف سے روضۂ نبوی کے لیے قالین اور چادر وغیرہ بھیجی جاتی ہے۔ پہلے یہ شہر میں گشت کرائی جاتی ہیں اور پھر مکہ معظمہ روانہ ہو جاتی ہیں۔

قاہرہ میں چیزیں کافی گراں ہیں۔ میری گھڑی کا شیشہ کہیں گر گیا ہے۔ اس کو لگانے کے دوکاندار نے PIEVAS ۲۳ لیے جو تقریباً تین روپے کے برابر ہیں۔ کچھ پھل (انگور اور کھجوریں) بھی خریدے لیکن ان کے دام بہت زیادہ نہ تھے۔ قاہرہ کے تصویری کارڈ خرید کر انھیں باجی اور اپنی بچیوں کے پاس ہوائی ڈاک سے روانہ کیا......

قاہرہ سے لندن

قاہرہ سے اگلا قیام سسلی کی بندرگاہ آگسٹا پر ہوتا ہے۔ ہم قاہرہ سے دن کے بارہ بجے روانہ ہوئے اور شام کو سات بجے کے قریب آگسٹا کی بندرگاہ پر پہنچے۔ راستے میں حال کی جنگِ عظیم کے مشہور مقامات تبروک، مسرا مطروح اور العالمین کے اُوپر سے گزرے۔ اب تو یہ چٹیل میدان بلکہ ریگستان ہیں۔ صرف کہیں کہیں خیموں اور پڑاؤ کے نشانات وغیرہ ہیں لیکن دو سال پہلے یہاں قیامت کا نمونہ نظر آتا ہوگا اور انسان کے ہاتھوں انسان کی وہ درگت بنی ہوئی تھی کہ انسان ہونا باعثِ عار معلوم ہوتا۔ اور اب بھی حالت کہاں بہتر ہے۔ ابھی چند روز ہوئے اخباروں میں تھا کہ اس جاڑے کے موسم میں وسط

یورپ میں تیس لاکھ آدمیوں کا فاقے سے مرنا تقریباً ناگزیر ہے!)..... آگسٹا کو دیکھنے کا زیادہ موقع نہیں ملا لیکن اس کے بڑے بازار میں ہم لوگ گھومے اور لوگوں کو خاصا خوش باش اور بظاہر ملنسار پایا۔ یہ لوگ اپنی زندگی میں انگریزوں کی نسبت رسمیت کے بہت کم قائل ہیں۔ اس کا ایک معمولی سا اظہار اس بات سے ہوتا ہے کہ مکان اور دوکان میں کوئی حدِ فاصل نہیں ہوتی بلکہ دونوں گویا ایک ہی چیز ہیں۔ مثلاً حجام کی دوکان میں حجامت بھی ہو رہی ہے (میں نے حجامت کا کوئی ۱/= دیا تھا) اور اس کا سارا خاندان بھی وہیں ایک کونے میں بیٹھا ہوا باتیں کر رہا ہے۔ یا کچھ کھا رہا ہے۔ بچے کھیل رہے ہیں۔ اس کے دوست بات چیت کرنے کو آ بیٹھتے ہیں۔ مکان کا سامنے کا کمرہ دوکان کا کام دیتا ہے اور آس پاس کے کمرے رہنے کے کام آتے ہیں۔ آگسٹا میں انگریزوں کی ایک چھوٹی سی چھاؤنی ہے لیکن حکومت ان کی نہیں بلکہ غالباً مقامی اطالوی ہی ان کے زیرِ نگرانی حکومت کرتے ہیں۔ انگریز سپاہیوں کو سوائے بڑے بازار کے اور جگہ جانے کی اجازت نہیں۔ بازار میں چورا ہے پر ہم نے یہ بھی دیکھا کہ شام کو بہت سے لوگ بطور میلے کے جمع ہو جاتے ہیں۔ گھر کے اندر نہیں بیٹھتے۔ سڑکوں پر بچوں کی بہت کثرت تھی جو (اکثر ننگے پاؤں) وہاں کھیل رہے تھے اور دوکانوں میں مختلف قسم کی گڑیاں اور کھلونے بہت رکھے ہوئے تھے جس سے مجھے یہ اندازہ ہوا کہ شاید ان لوگوں کو بچوں کی اہمیت کا بہت احساس ہے۔ ممکن ہے یہ میڈم منسوری کا اثر ہو یا کھلونے بنانا اس مقام کی صنعت ہو۔

آگسٹا سے اگلے دن سویرے چار بجے کے قریب روانہ ہوئے اور فرانس کے اوپر سے پرواز کرتے اور اس کی محنت اور محبت سے بوئی ہوئی زمین اور (کم سے کم اوپر سے دیکھنے میں) خوش نما اور پُر امن قصبوں کو دیکھتے ہوئے مارسیلز کے قریب اریانا کی خوبصورت بندرگاہ میں اُترے۔ راستے میں کوہ اٹنا اور بعض دوسرے تاریخی مقامات بھی نظر پڑے۔ یہاں تک سفر بہت ہی آرام اور خیریت سے کٹا۔ کوئی جھٹکے یا ہچکولے محسوس نہیں ہوئے۔ سر میں گرانی تک نہیں ہوئی۔ لیکن اس کے بعد کے چار پانچ گھنٹے میں انگلستان تک پہنچتے وقت تمام آرام کی کسر نکل گئی۔ انگلستان اور فرانس پر ایک سخت ہوائی طوفان آیا ہوا تھا۔

بعض جگہ جھکڑ چالیس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چل رہا تھا۔ اخباروں سے معلوم ہوا کہ بحری جہاز اس کی وجہ سے اپنی جگہ سے چل نہ سکے تھے لیکن ہمارے جہاز نے (جو ایک بہت طاقت ور جہاز ہے) باوجود اس کے ہمت کی اور ہمیں (بجائے پول کی بندرگاہ کے جہاں ابتداءً پہنچنا تھا) کسی نہ کسی طرح ساؤتھیمپٹن کی بندرگاہ پر پہنچا دیا۔ لیکن راستے میں اس نے کافی ہچکولے دیے، کبھی اوپر چڑھتا تھا کبھی نیچے اترتا تھا کبھی دائیں بائیں ہلتا تھا اور معلوم ہوتا تھا جیسے طوفان کا مضبوط سینہ چیرتا چلا جاتا ہے۔ ہوا کی موجیں بھی بالکل اسی طرح ہوائی جہاز کو ہلاتی اور دھکے دیتی ہیں جیسے پانی کے تھپیڑے بحری جہاز کو۔ راستے میں کئی دفعہ متلی ہوئی۔ ذاکر صاحب تو اسے کسی طرح جھیل گئے لیکن میں ضبط نہ کرسکا۔ بہرحال اچھا ہوا کہ ہم لوگوں کو یہ تجربہ بھی ہوگیا ورنہ ہوائی سفر کی تصویر کا یہ رُخ بالکل ہی نظروں سے اوجھل ہوجاتا! غرض ہم لوگ کراچی سے ۲۴ر کی صبح کو روانہ ہوکر ۲۶ر کی شام کو تین بجے کے قریب انگلستان پہنچ گئے۔ یہ فاصلہ کل ۴۷۰۰ میل ہے اور اس میں ہمیں کل ۳۲ گھنٹے اصل پرواز میں صرف ہوئے (باقی وقت ٹھیرنے کا تھا) خدا کی قدرت اور انسان کی قدرت پر فتح کا اس سے بڑھ کر اور ثبوت کیا ہوسکتا ہے!

۳۱ر اکتوبر

آج انگلستان پہنچے مجھے چھٹا دن ہے۔ اس عرصے میں کافی چیزیں اور باتیں دیکھیں اور ان کی وجہ سے انگریزوں کی قوم اور ملک کے بارے میں کئی دل چسپ باتوں کا اندازہ ہوا۔ لندن پر ظاہری طور پر بم باری اور جنگ کے اثرات بہت زیادہ معلوم نہیں ہوتے لیکن بعض حصوں میں کافی عمارتیں گری ہیں۔ دیکھنے میں لوگ خوش، مستعد، اور خوش پوشاک معلوم ہوتے ہیں لیکن انھوں نے جنگ کے زمانے میں بڑی مصیبتیں جھیلی ہیں اور اب بھی خوراک پر راشن کی سخت پابندیاں ہیں (ہمیں کھانے کو بہت معمولی غذا ملتی اور شاید زیادہ کھانے والوں کا پیٹ بھی اس میں نہ بھرتا ہوگا) کپڑے آسانی سے اور جلدی نہیں دُھل سکتے، کپڑا، جوتا اور دیگر ضروریاتِ زندگی بغیر راشن ٹکٹ کے نہیں خرید سکتے، عام طور پر لوگوں کو مستقبل کی طرف سے فکر ہے، خصوصاً ان کو جو اب فوج سے علیحدہ کردیے

جاتیں گے۔ لیکن باوجود ان تمام باتوں کے یہ قوم جس کڑی آزمائش میں سے گزرتی ہے اس سے انھیں زیادہ مستعد اور کارگزار بنا دیا ہے اور میں نے تو عام طور پر لوگوں کا اخلاق اور میل جول بھی بہت بہتر پایا۔ ایک خاص بات اس جنگ کی وجہ سے یہ ہوئی ہے کہ عورتیں بہت زیادہ کام کرتی ہیں اور بڑی خوش مزاجی اور قابلیت کے ساتھ کرتی ہیں۔ اس کا اثر (جیساکہ مجھے محسوس ہوا) ان کی عام زندگی پر بہت اچھا پڑا ہے۔ اب یہ عورتیں جو مردوں کے دوش بدوش رہتی اور کام کرتی ہیں۔ بجائے عشوہ فروشی کے اپنے کام میں دل چسپی لیتی ہیں اور ان میں ایک نئی خود اعتمادی پیدا ہوگئی ہے۔ انگریز قومی سیرت کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ باوجود ان تمام تلخ تجربوں کے ان کے کام کا دھڑا بندھا ہوا ہے۔ ریلیں۔ بسیں موٹریں اسی باقاعدگی سے چلتی ہیں۔ کاروبار میں وہی باقاعدگی اور نظم ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ جماعتی کش مکش اور مخالفت (جو مزدوروں کی حکومت کی وجہ سے زیادہ واضح ہوگئی ہے) بڑھتی جاتی ہے۔ آج کل بندرگاہوں پر کام کرنے والے مزدوروں کی جو زبردست ہڑتال ہے وہ اسی کا ایک مظہر ہے۔

اب تک خاص خاص باتیں یہ ہوئی ہیں۔

۱۔ ایک ڈراما BETWEEN THE YEARS دیکھا جس کا پلاٹ یہ ہے کہ ایک شوہر جنگ کے بعد واپس آتا ہے اور اپنی بیوی کی زندگی اور مشاغل کو بالکل بدلا ہوا پاتا ہے۔ وہ بجائے محض چراغِ خانہ ہونے کے شمعِ انجمن اور ایک سیاسی کارکن بن گئی ہے اور اس کی وجہ سے کش مکش پیدا ہوئی ہے۔ اچھا خاصا ڈراما ہے۔

۲۔ سکریٹری آف سٹیٹ لارڈ پیتھک لارنس سے ملاقات کی۔ نیک نیت، ضعیف (عمر ۷۴ سال) اور (غالباً) غیر موثر آدمی ہیں۔ شرافت اور دل چسپی سے گفتگو کرتے رہے۔ ہندوستان کے تعلیمی مسائل کا حال پوچھتے رہے اور جب میں نے کہا کہ تعلیمی اسکیم کو چلانے کے لیے آپ کو حکومت ہند پر اپنا زور ڈالنا چاہئے تو فرمایا کہ بھئی بات یہ ہے کہ جوں جوں آدمی حکومت کے دھندے میں پھنستا ہے اسے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بہت کم کام کرسکتا ہے! (پھر کوئی اس میں پھنسے کیوں!)۔

ڈاکٹر حمید، ڈاکٹر سلیم الزماں، قیصر احمد صاحب (یہ بمبئی کے ایک کاروباری آدمی ہیں اور ابھی امریکہ ہو کر آئے ہیں) میاں افضل حسین (سابق V.C. پنجاب یونی ورسٹی) سے ملاقات ہوئی۔ آج کل ہندوستان کے وفدوں کا یہاں زور ہے۔

۴۔ مس اگا تھا ہیریسن (جو ایک نامور سماجی اور سیاسی کارکن ہیں، ہندوستان کے معاملات میں دل چسپی لیتی ہیں اور گاندھی جی کی سخت معتقد ہیں۔) اور کرشنا مینن (جو انڈیا لیگ لندن کے سکریٹری ہیں) ملنے آئے۔ یہ دونوں ذاکر صاحب سے ہندوستان کے متعلق پریس انٹرویو اور تقریر وغیرہ چاہتے ہیں۔

۵۔ انڈیا ہاؤس کے کارکنوں نے (جس میں سے بیشتر ضعیف العمر یا ناکارہ ہیں) ہمیں ایک ناموزوں سی جگہ ٹھیرایا تھا لیکن دو تین روز بعد ہمیں (یعنی مجھے اور ذاکر صاحب کو) فیلڈن نے (جو پہلے آل انڈیا ریڈیو کے کنٹرولر تھے) بہت اصرار سے اپنے مکان میں بلایا جو بہت آرام دہ ہے اور جس میں کتابوں، تصویروں وغیرہ کی وجہ سے ایک صحیح قسم کی ادبی اور آرٹسٹک فضا ہے 55 PARK LANE

۶۔ مس اگاتا ہیریسن اور لیڈی کریس کی مہربانی سے WORLD YOUTH CONFERENCE کے افتتاحی مشن میں شریک ہوئے جس میں چالیس سے زیادہ قومیں شریک ہوئی تھیں اور جو ایک خاصا اثر آفریں جلسہ تھا۔ ایک ایک ملک کا وفد آتا تھا اور اسے کامیاب الفاظ میں کانفرنس کی طرف سے استقبال کیا جاتا تھا۔ دو باتیں قابلِ ذکر تھیں۔ ایک تو یہ کہ سب سے زیادہ پُر جوش اور پُر تپاک استقبال روسی جمہوریتوں کے نوجوانوں کا کیا گیا اور دوسرے یہ کہ ہندوستان کا وفد دو جھنڈے لیے ہوئے تھا ایک ہندوستان کا اور ایک پاکستان کا! (کیا ایک غلام قوم کے لیے یہ بہتر نہ ہوتا کہ وہ ایک جھنڈا بھی نہ لاتے!) بعض ملکوں کے نمائندے اپنے اپنے قومی لباس میں آئے تھے جو بہت اچھا معلوم ہوتا تھا۔

۷۔ کتابوں کی بہت سی دوکانیں دیکھیں اور چند کتابیں خریدیں۔ یہاں بھی کتابوں کی کمی ہے لیکن وہ ہندوستان والی بات کہاں؟ "برباد شدہ" انگلستان تقریباً ہر مادّی لحاظ سے "آباد" ہندوستان سے بہتر ہے!

فیلاڈن کے مکان میں صبح کو ہم ناشتہ خود بناتے ہیں جو ایک دل چسپ شغل ہے (آج کل اس ملک میں نوکر ملنا خدا کے ملنے سے بھی زیادہ مشکل ہے) اور دن اور رات کا کھانا باہر ہوٹل وغیرہ میں کھاتے ہیں۔ بہت کم لوگ اپنے اپنے گھروں پر کھانا تیار کر پاتے ہیں۔ قیمتیں خاصی گراں ہیں لیکن ہندوستان کی طرح عام چیزوں کی قیمتیں تگنی اور چوگنی بلکہ دوگنی بھی نہیں ہوتیں لیکن بہت سی چیزیں مثلاً گھڑیاں، قلم وغیرہ ملتے نہیں۔ دوپہر کا کھانا ۳/= سے کم اور رات کا بالعموم ۵/= سے کم میں نہیں ملتا۔

۶/ نومبر

کانفرنس کا کام شروع ہوگیا ہے۔ پہلے تین روز مختلف ملکوں کے نمائندوں میں سے ایک ایک نے عام تقریریں کیں۔ ہندوستان کی طرف سے راج کماری امرت کور کو تقریر کرنے کے لیے تجویز کیا گیا تھا ان کی تقریر (جس کا مواد ذاکر صاحب، راج کماری اور میں نے تجویز کیا تھا) کافی پسند کی گئی اور چوں کہ دوسرے ملکوں کی طرف سے بہت کم عورتیں شریک ہوئی ہیں اس لیے ان کی نمائندگی سے لوگ کافی متاثر ہیں۔ ان عام تقریروں میں بین الاقوامی اشتراک کی ضرورت اور اس کی شرائط پر زور دیا گیا اور مختلف ممالک نے اپنی خاص خاص ضرورتوں اور تعلیمی اور تہذیبی مسائل کا ذکر کیا۔ ہندوستان کی طرف سے جو تقریر کی گئی اس میں اس بات پر خاص زور دیا گیا تھا کہ (باوجود موجودہ زمانے کے وقتی اختلافات کے) ہندوستان کی ذہنیت ہمیشہ بین الاقوامی رہی ہے۔ اس سلسلے میں ٹیگور، اقبال اور گاندھی کا حوالہ بھی دیا گیا جن میں سے کوئی بھی تنگ جغرافی اور نسلی حدود کا قائل نہیں۔ پہلے تین روز کے بعد کانفرنس پانچ کمیشنوں میں تقسیم ہوگئی ہے جن کے سپرد ان مختلف ابواب کی ترمیم اور نظر ثانی ہے جو برطانوی اور فرانسیسی وفود کی طرف سے مجوزہ کانسٹی ٹیوشن میں شامل ہیں۔ میرا انتخاب چوتھے کمیشن کے لیے ہوا ہے جس کا کام مجوزہ کانفرنس کے سکریٹریٹ اور مجلس عاملہ کے لیے قواعد اور قوانین بنانا ہے۔ میں نے اس میں اب تک دو تجویزیں منظور کرائی ہیں۔ ایک یہ کہ مجلس عاملہ

کے اراکین کا دوبارہ انتخاب (پہلی مدت ممبری ختم ہوجانے کے بعد) ممکن ہوگا۔ مجوزہ برطانوی مسودے میں دوبارہ انتخاب کی اجازت نہ تھی جس کی وجہ سے پالیسی کا تسلسل قائم نہیں رہ سکتا تھا۔ دوسرے یہ تجویز منظور ہوئی ہے کہ پہلے انتخاب کے بعد جب کل ممبروں میں سے ⅓ ہر سال علاحدہ ہوں تو وہ انتخاب کے ذریعہ نہ ہوں بلکہ قرعہ اندازی سے ہوں۔ اس کا فائدہ یہ ہے کہ مجلس عاملہ محض "بڑی قوموں" کے نمائندوں کا اجتماع نہ بن جائے گی بلکہ سب ممبروں کے حقوق برابر ہوں گے۔ (اس کانفرنس میں تو ایسی ہی اصطلاحی بحثیں ہیں!) اس عرصے میں بعض اور اہم لوگوں سے ملاقات ہوئی ہے جن میں قابلِ ذکر بریلز فورڈ (سوشلسٹ ممبر پارلیمنٹ) ڈرائی برگ (مصنف اور ایضاً M.P.)، نیوز پبلک (امریکہ کا سب سے اہم اخبار) کے اڈیٹر بروس بلیون، پروفیسر ہلی، لندن انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن کے سابق ڈائرکٹر پروفیسر کلارک شامل ہیں۔ ان کے علاوہ امریکہ، عراق، ایران، ترکی، چین، ناروے، ڈنمارک وغیرہ کے وفدوں کے اراکین سے بھی ملاقات ہوئی جن میں بعض نامور لوگ مثلاً چین کے DR. HU SHIH (فلسفی اور مصنف) اور امریکہ کے ARCHIBOLD LEASH (مصنف اور شاعر) شامل ہیں۔ اس عرصے میں حکومت برطانیہ اور وزیر تعلیم اور ڈومنین آفس کی طرف سے دعوتیں بھی ہوئیں۔ لیکن یہ سب قصہ تو ہوا ہی کرتا ہے۔ اصل بات جب ہے کہ یہ کانفرنس دراصل بین الاقوامی مفاہمت کے لیے کچھ کر کے دکھا سکے اور قومی منافرت اور شبہات میں کمی کر سکے!

سفرِ آسٹریلیا

۱۹۴۶

(بین الاقوامی تعلیمی کانفرنس میں ہندوستانی نمائندے کی حیثیت سے شرکت)

سفر آسٹریلیا۔

یاد داشتیں

روانگی دہلی

۱۶/ ستمبر ۸ بجے صبح۔

آمد کراچی

۱ بجے بعد دوپہر۔

روانگی کراچی

۱۶/ ستمبر ۱۱ بجے شب۔

آمد سنگاپور

۱۷/ ستمبر ۳ بجے بعد دوپہر۔

روانگی سنگاپور ۱۷ستمبر ۲½ بجے بعد دو پہر۔ آمد ڈارون ۱۸ستمبر ۴ بجے صبح (مقامی وقت)
" ڈارون ۱۸ستمبر ۶ بجے صبح۔ آمد سڈنی ۱۸ستمبر ۳ بجے تیسرے پہر۔

فاصلے :۔

کراچی تا سنگاپور	۲۹۶۴	میل
سنگاپور تا ڈارون	۲۰۸۶	"
ڈارون تا سڈنی	۱۹۶۸	"
کل فاصلہ کراچی تا سڈنی	۷۰۱۸	
رفتار	۲۲۵، ۲۰۰	میل فی گھنٹہ
بلندی	۱۱۰۰۰	فٹ تک

۱۷ستمبر ۴۶ء

مشاہداتِ سفر :۔

۱۔ سنگاپور بہت بڑا اور باقاعدہ طور پر بسایا ہوا شہر ہے۔ جہاز ہی میں سے دیکھا۔ سڑکیں اور مکانات وغیرہ سب نقشے کے مطابق بنے ہوئے ہیں۔ بڑی بڑی شاہ راہیں ایک دوسرے کو عموداً کاٹتی ہیں اور انھیں میں سے چھوٹی سڑکیں نکلتی ہیں، جو اکثر بالکل سیدھی جاتی ہیں۔ ہوائی اڈے پر جہازوں کی آمد و رفت کے لیے لوہے کی جالی دار چادریں بچھی ہوئی ہیں۔ آب و ہوا خاصی گرم ہے اور نباتات وہی جو منطقہ حارّہ میں ہوتی ہے یعنی درختوں کی بہتات اور شوخ رنگ پھول۔

۲۔ ڈارون شمالی آسٹریلیا کا دار الخلافہ ہے۔ یہ حصّہ زیادہ تر بنجر ہے اور دوسری ریاستوں کے مقابلے میں کم آباد اور پس ماندہ ہے جنگ میں اپنی پوزیشن کی وجہ سے اس کی اہمیت بڑھ گئی تھی۔ یہاں مکان نئی قسم کے دیکھے یعنی نیچے سمنٹ یا لکڑی کے ستون کھڑے کرتے

ہیں جو پندرہ بیس فٹ تک اُونچے ہوتے ہیں، اور اس پر مکان بناتے ہیں۔ بعض مکان جو زمین پر بنے ہیں، ان کے برآمدے میں نیچے کوئی دو دو فٹ کی لکڑی کی جالی لگی ہوتی ہے اور اس کے اُوپر جعفری کے پردے جن کو بند کیا جا سکتا ہے۔ غالباً آب و ہوا اور جانوروں کے خیال سے یہ انتظام کیا جاتا ہے۔ ضرورت ہو تو ان پردوں کو بند کر کے مکان کو (مع برآمدے کے) دم بخت کیا جا سکتا ہے۔

۳۔ میں جس جہاز پر سفر کر رہا ہوں اس کا نمبر 7Q70 ہے۔ اس میں چھ مسافروں کی گنجائش ہے اور سب کے واسطے رات کو سونے کا آرام ہے۔ تین برتھ نیچے ہیں اور تین اُوپر۔ انھیں کے بیچ میں ہتھے لگا کر دن کے وقت نو آدمی کے بیٹھنے کی جگہ بن سکتی ہے۔ سفر خاصا آرام دہ ہے لیکن ایک تو بند ہوا کی وجہ سے تکلیف ہوتی ہے اور ایک ٹمپریچر کے بدلتے رہنے کی وجہ سے۔ جب جہاز اُوپر چڑھتا ہے تو سردی ہو جاتی ہے۔ لہٰذا جہاز کو گرم کرنے کے لیے سوئچ لگا دیے ہیں، جب جہاز زیادہ گرم ہونے لگتا ہے تو اس کو بند کر دیتے ہیں۔ پھر تھوڑی دیر میں ٹھنڈ معلوم ہونے لگتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ شاید یہ انتظام کی یا مشین کی خرابی ہے۔ ورنہ اس کا بندوبست ہو سکتا ہے کہ ایسا نہ ہو۔

۴۔ سنگاپور سے عزیز اور ذاکر صاحب کو خط لکھے جن پر ۳/= کے ٹکٹ لگانے پڑے۔

۱۸ ستمبر

۵۔ صبح کے چار بجے ڈارون پہنچے جو شمال مغربی ساحل پر ایک بندرگاہ ہے۔ یہ صوبہ آسٹریلیا کا سب سے پس ماندہ صوبہ ہے، نہ اس میں بڑے بڑے شہر ہیں، نہ پُر فضا مقام۔ ڈارون کی ایک خصوصیت یہ دیکھی کہ یہاں مکان آٹھ دس فٹ اُونچے سمنٹ کے ستونوں پر بناتے ہیں۔ اس طرح غالباً مکان جانوروں وغیرہ سے محفوظ رہتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ نمی کے نہ پہنچنے اور نیچے سے ہوا گزرتے رہنے کی وجہ سے صحت کے لحاظ سے اچھا ہے۔ بعض مکان زمین پر بھی بنے ہیں لیکن ان کے برآمدوں میں چاروں طرف لکڑی کی جعفریاں سی لگی ہوئی ہیں جن کو حسبِ ضرورت بالکل بند کر کے مکان کو ایک محفوظ قلعہ

بنایا جا سکتا ہے!

۶۔ سیکڑوں میل بنجر علاقہ طے کرنے کے بعد، تیسرے پہر کو سڈنی پہنچا۔ ایروڈرم ہی پر تین چار پریس کے نمائندوں نے گھیر لیا ہے اور ہندوستان اور تعلیم وغیرہ کے متعلق سوال پوچھتے رہے۔ اسی اثنا میں ٹیلی فون آیا کہ ہوائی جہاز کے شہری دفتر پر N.E.F. کی طرف سے لوگ میرے منتظر ہیں۔ چنانچہ ایک خاتون (ڈاکٹر FINK) اور دو اور ممبر ملے۔ چند گھنٹے ڈاکٹر اور مسز فنک کے ساتھ گزارے، ایک ریڈیو کی تقریر ریکارڈ کرائی، کچھ لوگوں کے ساتھ چائے پی اور رات کی گاڑی سے ملبورن روانہ ہوگیا۔ مجھے یہاں پہنچ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اہلِ آسٹریلیا انگریزوں سے زیادہ خلیق اور ملنسار ہیں اور ان میں (کم از کم ظاہری طور پر) رنگ کا تعصب کم ہے۔ یا ممکن ہے میں ایسے ہی لوگوں سے مل رہا ہوں۔ آپس میں بھی خاصا میل جول ہے۔ چناں چہ ریل کے اجنبی ہم سفر بغیر تعارف کے ایک دوسرے سے بات چیت شروع کر دیتے ہیں (جو انگلستان میں ایک غیر معمولی بات ہے!) بلکہ چائے پینے اور کھانا کھانے تک پر دعوت دیدیتے ہیں! سڈنی بہت بڑا اور خاصا اچھا شہر ہے (آبادی ۱۳ لاکھ ہے)۔

۱۹ستمبر

ملبورن دن کے ۱۲ بجے پہنچا۔ وہاں پروفیسر جانسن کے یہاں ٹھیرا جو یونی ورسٹی میں فزکس کے پروفیسر ہیں اور QUEEN'S کالج کے ماسٹر ہیں۔ ان کی بیوی اور دو لڑکیاں (ایک کا نام مارینی ہے اور دوسری کا ؟) جو اس سال انٹرنس کا امتحان دیں گی بہت تپاک اور خلوص سے ملیں۔ رات کو کھانے کے بعد (مجھے اس بات پر خاصا تعجب ہے) ان لڑکیوں نے ہندوستان کے متعلق بے شمار سوال کیے جن میں سے اکثر کافی دل چسپی اور ذہانت کا ثبوت دیتے تھے مثلاً مذہب، فلسفہ، یوگا، سیاست وغیرہ کے متعلق۔ گاندھی اور جواہرلال کے اقتصادی خیالات میں کیوں فرق ہے؟ ایک دستکاری کیوں چاہتا ہے، دوسرا بڑے پیمانہ پر صنعت وحرفت کیوں؟۔ اگر نئی نسل کو اس طرح دوسرے ملکوں میں صحیح قسم کی دل چسپی پیدا ہوجائے تو دنیا کی نامبارک گتھی سلجھنے کا

امکان نکل آتے! رات کو پروفیسر جانسن نے ڈائننگ ہال میں کھانا کھلایا اور وہاں کھانے کے بعد ایک مختصر سی تقریر بھی کرنی پڑی۔

۲۰ ستمبر

ہوبارٹ (تسمانیہ) صبح کو ۷ بجے ہوائی جہاز سے روانہ ہوکر ½۹ بجے تسمانیہ کے خوبصورت اور پُرفضا جزیرے اور اس کے دل کش صدر مقام ہوبارٹ پہنچا۔ تسمانیہ آسٹریلیا کا سب سے زیادہ خوبصورت اور معتدل (بلکہ سرد) حصّہ ہے۔ یہ ملبورن سے جو جنوبی بندرگاہ پر پانچ سو میل کے فاصلے پر واقع ہے اور گہرے نیلے سمندر کے بیچ میں ایک انگوٹھی کے خوبصورت نگینہ کی طرح جڑا ہوا ہے۔ اس کو دیکھ کر کشمیر کی یاد تازہ ہوتی ہے۔ وہی پہاڑ، وہی سبزہ، وہی خوبصورت گھاٹیاں اور برف سے ڈھکی ہوئی پہاڑیاں۔ لیکن اس میں ایک بات زائد ہے اور ایک مختلف۔ زائد تو یہ کہ اس کی بندرگاہ بالکل قدرتی اور خوبصورت ہے اور جا بجا فراخ آبنائیں شہر کے اندر آگئی ہیں جس کی وجہ سے بڑے بڑے جہاز شہر کے وسط تک پہنچ سکتے ہیں۔ لیکن باوجود بندرگاہ ہونے کے یہ شہر (سری نگر کے برخلاف) بہت صاف ستھرا ہے۔ پکّی، سمنٹ کی وسیع سڑکیں، خوبصورت مکان جن کی دیواریں وغیرہ لکڑی کی ہیں جن پر خوش سلیقہ رنگ کرکے بہت خوش نما بنا دیا گیا ہے، ہر مکان (یا بیشتر مکانوں) کے ساتھ چھوٹے چھوٹے خوبصورت باغیچے جس میں سیب، ناشپاتی اور دوسرے پھول دار درختوں کے شگوفوں کی وجہ سے بہت رونقِ عیش رنگ کا سامان نظر آتا ہے۔ ہوبارٹ اور تسمانیہ کا پیمانہ چھوٹا ہے لیکن انسان اور فطرت نے مل کر اس کو در اصل ایک قابلِ رشک مقام بنا دیا ہے۔ اگرچہ ہمارے قیام کے دوران میں بہت بارش ہوتی رہی اور سردی توقع سے زیادہ تھی۔ (ایک روز برف بھی پڑا) لیکن میں نے تو اس جگہ کو بہت پسند کیا۔ ایک روز ہمارے میزبان مجھے ایک قریب کے پہاڑ کی چوٹی پر لے گئے جہاں (کوئی چار ہزار فٹ کی بلندی پر!) ایسا سفید، شفاف اور خوبصورت برف تھا جس کی مثال میں نے بمشکل دیکھی ہے۔ ایک روز کوئی بیس پچیس میل

دیہاتی علاقے میں گئے اور اس کو بھی بہت پُر فضا اور سرسبز پایا۔

ہوبارٹ میں ۲۴ر تک قیام رہا۔ اس دوران میں اندازہ ہوا کہ ان لوگوں نے باوجود ایک مختصر جماعت ہونے کے تمدنی اور ذہنی زندگی کی طرف کافی توجہ کی ہے۔ مثلاً تسمانیہ کی اپنی یونی ورسٹی ہے، عجائب خانہ ہے۔ پبلک لائبریری ہے۔ بچوں کی لائبریری ہے (جس پر دو ہزار پونڈ سالانہ خرچ ہوتے ہیں!)۔ ایک علاحدہ سکشن ہے جہاں سے تمام جزیرے کے اسکولوں کو پڑھنے کے لیے کتابیں بھیجی جاتی ہیں یعنی گشتی کتب خانوں کا طریقہ رائج ہے۔ کانفرنس میں کافی تعداد میں لوگ شریک ہوئے اور اس کی کارروائی میں خاصی دلچسپی لی۔ لکچروں کے بعد اکثر سوالات اور بحث و مباحثہ کی نوبت بھی آئی۔ میں نے ایک تقریر EDUCATION FOR PEACE کے عنوان سے کی، ایک اقبال کے فلسفۂ تعلیم کے متعلق اور ایک UNESCO کے اغراض و مقاصد اور اس کی کامیابی کی شرائط کے متعلق۔ تقریریں معلوم ہوتا ہے سب پسند کی گئیں لیکن (خلافِ توقع، کیوں کہ مضمون بالکل اجنبی تھا) اقبال کی تعلیم کے بارے میں لوگوں نے بہت دل چسپی کا اظہار کیا حالاں کہ مضمون خاصا ٹھوس تھا۔ یہاں میرے میزبان مسٹر اور مسز بیکر ہیں جو نہایت خلیق اور متواضع اور شریف لوگ ہیں اور انھوں نے مجھے بالکل عزیزوں کی طرح رکھا۔ ان کے ایک چھوٹی بچی الزبتھ اور تین لڑکے، اینڈر، جم اور ڈیوڈ ہیں جو فرصت کے وقت مسلسل ہندوستان کے متعلق سوال پوچھتے رہتے تھے!

کانفرنس میں تقریریں کرنے کے علاوہ ریڈیو پر ایک تقریر ہندوستان کے متعلق آسٹریلیا کے بچوں کے نام نشر کی جس میں انھیں بتایا کہ گو ہندوستان کے بچوں کی زندگی ان سے بہت مختلف ہے اور وہ زیادہ سختی کی زندگی بسر کرتے ہیں لیکن دونوں میں انسانیت مشترک ہے جو تمام اختلافات پر بھاری ہے۔

اڈیلیڈ کا قیام

اڈیلیڈ میں ۲۵ر سے ۳۰ر اکتوبر تک قیام رہا اور یہ وقت بہت مصروفیت کا گزرا۔

اڈیلیڈ ہوبارٹ سے بڑا شہر ہے آبادی تین لاکھ کے قریب ہے اور اس کو ایک باقاعدہ نقشے کے مطابق بسایا گیا ہے جس میں علاوہ سیدھی لمبی اور صاف سڑکوں کے اور خوش نما مکانات کے ایک خوبی یہ ہے کہ شہر کے گرد بہت وسیع پارک اور باغات بنائے گئے ہیں جن میں مکانات نہیں بنائے جا سکتے اور اس کی وجہ سے آب و ہوا اور شہر کی خوش نمائی میں فرق نہیں آسکتا۔ شہر کا ایک ذرا قدیم حصّہ چاروں طرف باغات سے گھرا ہوا ہے۔ اس کے باہر شمالی اڈیلیڈ کے نام سے ایک اور حصّہ بسایا گیا ہے (جس میں میرا قیام تھا) لیکن یہ حصّہ بھی اسی طرح باغات سے گھیرا ہوا ہے۔ شہر کے بہت قریب چاروں طرف پہاڑیاں ہیں جن پر لوگوں کے خوبصورت مکان بنے ہوئے ہیں۔

میرا قیام اڈیلیڈ کے لوٹ پادری مسٹر روبن کے مکان پر تھا۔ ان کی بیوی اور دو بچیوں نے (جن میں سے ایک "نٹالی" ذکیہ کے برابر اور دوسری "میری" اس سے چھوٹی ہے) بہت خاطر اور تواضع کی اور ہوبارٹ کے میزبانوں کی طرح ایسا ہی سلوک کیا جیسا اپنے عزیزوں سے کرتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ دل کے اچھے آدمی جہاں مل جائیں خواہ وہ کسی قوم یا ملک یا رنگ یا مذہب کے ہوں ان کے ساتھ نباہنا بلکہ ان کو پسند کرنا بہت آسان ہوتا ہے۔ اڈیلیڈ پہنچ کر یہ اندازہ بھی ہوا کہ اس ملک کے لوگ سبھی جگہ بہت بااخلاق اور ملنسار ہیں اور اس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ اتنے عرصے میں مجھے غیر ملکی ہونے کا احساس نہیں ہوا۔ برخلاف انگریزوں کے ان میں رسمیت اور سوشل میل جول میں تکلف بہت کم ہے۔ مثلاً مجھے اس قسم کا تجربہ پہلے کبھی نہیں ہوا کہ بازار میں چلا جارہا ہوں اور مرد اور عورتیں (جن سے متعلق واقفیت نہیں!) راستے میں روک کر کہیں کہ تم نے کل جو تقریر کی تھی اس کا ہم پر بہت گہرا اثر ہوا اور ہم نے آج تک اس قسم کی باتیں مطلق نہیں سنی تھیں۔ ان کی رائے اور تعریف کے صحیح یا غلط ہونے سے تعلق نہیں۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ لوگ اس طرح بے تکلفی سے مل کر بات چیت کرنے کو عیب نہیں سمجھتے جس طرح انگریز سمجھتے ہیں! یوں بھی جس گرم جوشی سے ان لوگوں نے دعوتیں دیں، ہندوستان اور وہاں کے مسائل کے متعلق باتیں پوچھیں اس کا مجھ پر کافی اثر ہوا۔

شاید ہی کسی نے یہ کہا ہو (بلکہ غالباً کسی نے نہیں کہا) کہ ہندوستان کو آزادی نہ ملنی چاہیے۔ ممکن ہے مجھ سے اس قسم کے خیال کا اظہار نامناسب سمجھتے ہوں یا میں زیادہ تر مقابلتاً روشن خیال لوگوں سے ملا ہوں لیکن بہرحال میرا تجربہ یہی ہے۔

کانفرنس میں اور دوسرے جلسوں وغیرہ میں کئی تقریریں کرنی پڑیں۔ کانفرنس کے موضوع "ہندوستان میں تعلیم" "یونسکو کانفرنس" اور مذہبی تعلیم بالخصوص اسلام کے نقطۂ نظر سے تھے۔ ان میں سے آخری موضوع پر ایک تقریر میں نے اور ایک تقریر مسٹر S.H. WOOD نے (جو برطانیہ کی وزارتِ تعلیم کے نمائندے اور ایک نہایت ہی خوبیوں کے انسان ہیں) کی۔ نہ معلوم کیوں اس تقریر کا بہت چرچا ہوا۔ اخباروں میں ذکر آیا، گورنر نے اپنے آخری ایڈریس میں اس کا ذکر کیا اور ذاتی طور پر سیکڑوں مردوں اور عورتوں نے مختلف موقع پر اس بات کا اظہار کیا کہ وہ اس تقریر سے بہت متاثر ہوئے ہیں۔ موضوع کو پیش کرنے میں میری کوشش یہ تھی کہ مذہبی تعلیم اور اس کی ضرورت کے عالم گیر پہلو کو پیش کیا جائے اور اس کو دورِ حاضر کے حالات اور تقاضوں کے ساتھ متعلق کیا جائے۔ شاید یہی چیز پسند آئی ہو۔ "ہندوستانی تعلیم" کا میں نے ٹھیک نقشہ پیش کر دیا جو کافی تاریک تھا اور جس کی ذمہ داری (میں نے انھیں بتایا) پہلے حکومت پر اور اس کے بعد کم تر حد تک لوگوں پر عائد ہوتی ہے۔ لوگوں کا عام طور پر خیال یہ تھا کہ کانفرنس کی سب سے کامیاب تقریریں WOOD کی اور میری تھیں (لیکن انگریزی زبان کے اعتبار سے مجھے ترجیح دیتے تھے جو ایک مہمل سی بات ہے!) زبان کے متعلق بعض لوگوں نے جب اظہارِ رائے کیا تو میں نے کہا کہ بات یہ ہے کہ تمہاری تو یہ زبان ہے۔ تم اس کے ساتھ جیسا چاہتے ہو سلوک کرتے ہو لیکن میرے لیے یہ ایک غیر زبان ہے۔ اس لیے میں اس کے ساتھ ادب اور احتیاط کا برتاؤ کرتا ہوں!

اڈیلیڈ میں بعض قابلِ ذکر لوگوں سے ملاقات ہوئی جن میں سے ایک سر ولیم مچل ہیں جو آسٹریلیا کے ایک نامور اہلِ علم اور فلسفی ہیں اور ۸۰ برس کی عمر ہے۔ دماغ اور حواس اور ذہنی جودت بالکل سلامت ہے اڈیلیڈ یونی ورسٹی کے چانسلر ہیں۔ میں نے UNITED NATION ایسوسی ایشن کے ایک اعزازی لنچ میں تقریر کی تھی جس کا موضوع تھا آج کل کی دنیا میں تعلیم

کے ذریعہ کس حد تک تغیّر اور تبدّل ہو سکتا ہے۔ انھوں نے اس تقریر میں صدارت کی اور اس کے بعد تقریر سے (خواہ مخواہ، کیوں کہ تقریر میں کوئی خاص بات نہ تھی) اس قدر متاثر ہوئے کہ بہت مبالغہ کے ساتھ اس کی تعریف کی اور کہا کہ اس سے سری نواس شاستری کی یاد تازہ ہوتی ہے اور اس کے بعد میری ایک اور تقریر میں رات کے وقت جان بر کھیل کر شریک ہوئے (یہ مذہبی تعلیم کے بارے میں تقریر تھی) اور مجھ سے بعد میں معذرت کی کہ پہلے میں نے تمھیں ایک نوجوان طالبِ علم سمجھا تھا!۔ میں نے جواب میں کہا کہ طالبِ علم ہونا تو بہر حال میرے لیے فخر ہے۔ اور ان کے مقابلے میں "نوجوان" کہلانے پر بھی کوئی خاص، اعتراض نہیں! اس کے بعد انھوں نے دعوت دی کہ جن شرائط پر چا ہو ایک سال کے لیے یہاں رہ جاؤ اور استادوں اور عوام کی تعلیم کے لیے تقریریں کیا کرو! میں نے با دب اس "اعزاز" سے معافی چاہی!

ایک اور قابلِ ذکر شخص یونی ورسٹی کے سیاسیات اور تاریخ کے پروفیسر مسٹر V.G PORTUS ہیں۔ خاصے معمر آدمی ہیں۔ بجلی کے تار کی طرح زندہ ہیں۔ اپنی بات بے دھڑک کہتے ہیں۔ خیالات خاصے ریڈیکل ہیں۔ قومی تاریخ کے بجائے بین الاقوامی تاریخ پڑھانے پر مصر ہیں۔ مجھ سے بہت محبت اور تپاک سے ملے اور اپنی ایک دو کتابیں بھی "تحفتاً" دیں۔ باوجود عام لوگوں کے مختلف خیال ہونے کے، ان کے شاگرد، ساتھی اور عام لوگ ان سے کافی محبت کرتے ہیں۔ .U.N ایسوسی ایشن (مذکورہ بالا) کے صدر ہیں اور ریڈیو کے تعلیمی پروگرام میں کافی دل چسپی لیتے ہیں۔ ہندوستان سے کافی واقف ہیں۔ ایک روز کہنے لگے کہ پنڈت جواہر لال نہرو کو محض اس ایک وجہ سے جنّت میں بڑی بلند جگہ ملنی چاہیے کہ انھوں نے اٹلی پہنچ کر مسولینی کی دعوت کو رد کر دیا اور اس سے نہیں ملے!

کانفرنس کے حلقوں میں اس کے سکریٹری R.J. BEAT اور صدر .A.G میکڈانلڈ قابلِ ذکر ہیں۔ دونوں مستعد اور گرم جوش کارکن ہیں اور اس کانفرنس کے انعقاد میں انھوں نے بہت کام کیا۔

ریڈیو پر دو تقریریں کرنی پڑیں۔ ایک میں اس تقریر کا خلاصہ جو .U.N ایسوسی ایشن

کے جلسے میں کی تھی، نشر کیا اور دوسری کے لیے جس کا موضوع تھا THE WORLD WE MEAN TO ANOTHER آسٹریلیا کے صدر مقام سڈنی سے دعوت آئی تھی کہ میں آسٹریلیا کے ریڈیو کے لیے اعزازی مہمان GUEST OF HONOUR کی حیثیت سے تقریر کروں تقریر اڈیلیڈ میں ریکارڈ کی گئی تھی اور کل (یعنی ۱۶ر اکتوبر) کو نشر ہو گی۔ میں خود تو نہ سن سکوں گا کیوں کہ کل شام سے آسٹریلیا کے ایک بہت لمبے سفر میں مشغول ہوں جو پورٹ آگسٹا سے شروع ہو کر پرتھ پر ختم ہو گا اور ہم لوگ ۱۴ر کی شام کو چلے ۱۷ر کی صبح کو پہنچیں گے۔ یہ ملک بھی ہندوستان کی طرح بہت لمبے فاصلے کا ملک ہے اریڈیو کی تقریروں کے سلسلے میں وہاں کی نگراں تقریر مس ای۔ ایم۔ ڈو سے ملاقات ہوئی جو ایک دل چسپ اور باخبر اور مہذب عورت ہے اور اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ آسٹریلیا سے باہر جینوا وغیرہ میں لیگ آف نیشنز کے دفتر میں کام کر چکی ہے۔

اڈیلیڈ سے تین مقرر یعنی ڈاکٹر برو اور ڈاکٹر آدم اور میں ایک روز کے لیے ایک مقام گئے جس کا نام WHYALLA ہے۔ یہ قصبہ پانچ سال پہلے ایک گاؤں تھا جس کی آبادی پانچ سو کے قریب تھی۔ اب یہ ایک بارونق قصبہ ہے جس کی آبادی نو ہزار ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس کے قریب لوہے کی بہت اچھی کان دریافت ہوئی ہے اور اس زمانے میں آبادی صنعت و حرفت کے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ قابلِ تعریف بات یہ ہے کہ اس قصبے میں (جہاں ظاہر ہے کاروباری ذہنیت کا زور ہے) کتب خانہ ہے، ایک علمی انسٹی ٹیوٹ ہے، دو پرائمری اسکول ہیں اور ایک بہت اچھا ٹکنیکل ہائی اسکول ہے جو انگلستان کے عمدہ اسکولوں کے ساتھ ٹکر کھاتا ہے اس میں دو سو کے قریب لڑکے اور لڑکیاں پڑھتی ہیں اور شام کے وقت ۵۰۰ کے قریب بالغ اور کارخانے کے APPRENTICES صنعتی تعلیم کے لیے ہفتہ میں ایک یا دو بار آتے ہیں۔ اس کی عمارت اور سامان پر تقریباً ۶۰۰۰۰ صرف ہوئے ہیں۔ جو ہمارے ہاں کسی بڑے کالج کی قسمت میں بھی نہیں ہوتے! سامان بہت جدید ہے مثلاً ہیڈ ماسٹر کے دفتر میں ایک مائکروفون ہے اور ہر کلاس روم میں لاؤڈ اسپیکر لگے ہیں جن کے ذریعہ ہیڈ ماسٹر یا کوئی ممبر اسٹاف براہِ راست تمام طلبہ سے گفتگو کر سکتا ہے، امتحان کے پرچے (جیساکہ جنرل نالج کے سلسلے میں ہوتا ہے) لکھائے جا سکتے ہیں اور طلبہ اسکول ریڈیو کا یہ پروگرام

نشر کر سکتے ہیں۔ یہاں بجلی ہے، آرام دہ ہوٹل ہیں اور پانی نہیں ہے لیکن اسے ۳۰۰ میل کے فاصلے سے بہت بڑے بڑے نلوں کے ذریعہ لایا گیا ہے اور ایسا انتظام کیا گیا ہے کہ لوگ نہ صرف FLUSH سے فائدہ اُٹھا سکتے ہیں بلکہ باغبانی تک ہو سکتی ہے۔ ایک DAIRY ہے جو بہت جدید اور سائنٹفک اصولوں پر چلائی جاتی ہے میں نے اس قدر اچھی دوسری کوئی DAIRY نہیں دیکھی۔ جس احتیاط کے ساتھ گایوں کی نگہداشت کی جاتی ہے ہمارے ہاں رؤسا کے بچوں کی نہیں ہوتی! اور لوگوں کی صحت کی خاطر دودھ لاگت سے کم نرخ پر فروخت ہوتا ہے۔

WHYALLA میں شام کو جلسہ ہوا جس میں خاصی تعداد تھی، حسبِ معمول مردوں سے زیادہ عورتیں! اس میں تین تقریریں ہوئیں ایک انگلستان کے ڈاکٹر ADAM کی، جو یونہی سی تھی۔ بھلا ان گاؤں والوں کو انگلستان کے جدید تعلیمی ایکٹ کی تفصیل سے کیا دلچسپی؟ ایک ڈاکٹر بروکی جو ہماری پارٹی کی سب سے زیادہ پُرمذاق ممبر ہیں اور انگلستان میں GIRLS CLUBS اور MIXED CLUBS کی منتظم ہیں اور اس سلسلے میں انھوں نے بہت اچھا کام کیا ہے (یہ قانون کی L.L.D اور طبی ڈاکٹر بھی ہیں!) جس میں انھوں نے انگلستان میں اس تحریک کا حال بتایا اور کہا کہ نوجوانوں کے لیے اس قسم کے کاموں کی تنظیم ایسی کرنی چاہیے کہ ان کے موجودہ مذاق اور دلچسپی سے شروع کر کے انھیں اس مقام کی طرف لے جایا جائے جہاں وہ فطرتاً جانا چاہتے ہیں۔ YOU CANNOT TAKE A PERSON FROM WHERE HE DOES NOT WANT TO GO. میری تقریر کا موضوع ہندوستان کی تعلیم تھا اور میں نے اس کو بحیثیت ایک WORLD PROBLEM کے پیش کیا جس کی وجہ سے غالباً لوگوں نے دلچسپی لی۔

WHYALLA سے پرتھ۔ ریل میں ۱۴ سو میل سے زیادہ کا سفر ہے اور ایک سست رفتار ریل "نلا بور" کے لق و دق صحرا میں سے گزرتی ہوئی مغربی آسٹریلیا کے صدر مقام پرتھ جاتی ہے۔ ہم لوگ ریل میں کوئی ۴۶ گھنٹے رہے اور اگر سب ڈیلیگیٹ ساتھ نہ ہوتے تو سفر خاصا تکلیف دہ تھا۔ کیوں کہ راستے میں مشکل سے دو تین قصبے پڑتے ہیں۔ ان کے علاوہ تمام علاقہ بنجر ہے جس میں آبادی نہیں ہے۔ اہلِ آسٹریلیا تو اس میں رہ نہیں سکتے اور باہر

والوں کو آنے نہیں دیتے (یعنی ان کی WHITE AUSTRALIA) لیکن ریل آرام دہ ہیں۔ ہم لوگ فرسٹ کلاس SLEEPERS یعنی سونے کی گاڑی میں سفر کر رہے ہیں۔ اس میں ہر درجہ میں اُوپر نیچے دو سیٹ ہوتی ہیں جن میں دن اور رات کو دو ہی آدمی رہتے ہیں۔ کپڑوں وغیرہ کے لیے وارڈ روب، منھ ہاتھ دھونے کا سامان، پڑھنے کا لمپ سب چیزیں کمپارٹمنٹ میں موجود ہیں۔ ریستوران کار ساتھ ہے اور ہر ڈبّے کے ساتھ ایک نشست کا کمرہ ہے جس میں کرسیاں، صوفے، پیانو اور لکھنے کی میز سبھی کچھ موجود ہے! راستے میں ہم لوگ تین گھنٹے کے لیے ایک مقام پر ٹھیرے جس کا نام "کل گورلی" ہے۔ یہاں سونے کی کانیں ہیں جس کی وجہ سے یہ ایک خاصا بارونق قصبہ بن گیا ہے۔ آبادی تو تیس ہزار کے قریب ہوگی لیکن ہر طرح کا آرام کا سامان، اشیائے ضروری کی دوکانیں (یہاں تک کہ موٹر کاریں اور ریڈیو وغیرہ تک بکثرت) موجود ہیں۔ اسکول، نہانے کا بہت خوبصورت حوض اور ایک SCHOOL OF MINING جس میں ۶۰۰ سے زیادہ طلبہ پڑھتے ہیں! شہر کا ایک حصّہ اچھا خوش نما ہے لیکن جس حصّے میں سونے کی کانیں ہیں وہ حسبِ معمول بے قاعدہ اور UNATTRACTIVE ہے۔ جس نے کسی زمین پر قبضہ کر لیا وہاں سونا نکالنے کا ایک کارخانہ قائم کر دیا جس میں خوش نمائی اور مزدوروں کے آرام وغیرہ کا خیال نہیں رکھا گیا۔ ٹاؤن ہال کے سامنے ایک چھوٹے سے، مضحک نما انسان کا بت ہے جس کے ہاتھ میں ایک اسٹک ہے۔ اس کا نام بھولتا ہوں۔ یہ وہ شخص ہے جس نے گزشتہ صدی میں یہاں پہنچ کر سب سے پہلے سونے کا ڈلا پایا تھا! خدا ہی جانتا ہے کہ ایسے آدمیوں کا شمار انسانوں کے محسنوں میں کرنا جائز ہے یا نہیں! سونا ہو یا کوئلہ لوہا ہو یا پٹرول جہاں کہیں اس قسم کی قدرتی دولت دستیاب ہو جاتی ہے لوگوں کی زندگی کا دھارا پلٹ جاتا ہے اور اکثر انجام بُرا ہوتا ہے یا بین الاقوامی پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں جو اور بدتر ہے (ایران، فلسطین وغیرہ)

پرتھ میں میرا قیام صرف تین روز رہا کیوں کہ میں ۱۰ر کی صبح کو واپس روانہ ہونا چاہتا تھا یہاں بھی کانفرنس خاصی کامیاب رہی۔ چوں کہ میرا قیام مختصر تھا اور کانفرنس والوں کا اصرار تھا کہ میں حتی الامکان تین ہی دن میں اپنے پانچ دن کے لکچروں کا پروگرام مکمل کر لوں (بہت

سمجھایا کہ حاضرین پر رحم کرو لیکن وہ نہ مانے!) اس لیے خاصی مصروفیت رہی۔ ایک لکچر اسلامی تعلیم پر، ایک تہذیب کے مستقبل پر، ایک UNESCO پر اور ایک نصاب تعلیم اور بین الاقوامی مفاہمت پر دیا۔ لکچر ضرورت سے زیادہ پسند کیے گئے اور موضوع اور زبان دونوں کا خاصا نوٹس لیا گیا۔ مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ ان لکچروں اور ذاتی تقریروں کی بدولت لوگوں کو اقبال سے آگاہی اور دل چسپی پیدا ہوگئی اور ان کے دل میں ایک حد تک ہندوستان کی قدر اور وقار بڑھ گیا۔ یونی ورسٹی کے اسٹاف نے بھی ایک روز گفتگو کے لیے بلایا تھا۔ خاصا دل چسپ مکالمہ رہا۔ مجھے یونی ورسٹی کے تمام لوگوں میں پروفیسر CURRIE سب سے زیادہ پسند آئے جو پہلے زولوجی کے پروفیسر تھے اور اب وائس چانسلر ہیں۔ نہایت معقول، شریف اور فرض شناس آدمی ہیں۔ مجھ سے بہت تپاک اور خلوص سے ملے اور اپنے خاندان کے ساتھ کھانے پر بلایا۔ ہندوستان کے متعلق ان کے خیالات بہت ہمدردانہ اور انصاف پسند ہیں۔ اور تعلیم سے بھی اچھی واقفیت رکھتے ہیں۔ جب سے .V.C ہوئے ہیں تعلیم پر کتابیں پڑھتے رہتے ہیں۔ ان لوگوں کی شرافت اور مہمان نوازی کا اندازہ اس ذرا سے واقعہ سے ہوسکتا ہے کہ میں نے ان کی بیوی سے کہا کہ میں نے اپنی بیوی کے لیے ایک چمڑے کا بیگ خریدا ہے اور کسی ایسی چیز کی تلاش ہے جس میں اس کو رکھ کر لے جاؤں، ورنہ راستے میں خراب ہو جائے گا۔ دونوں نے فوراً سب کام کو چھوڑا، اپنے مکان سے چار میل کے فاصلے پر ایک دوکان میں لے گئے جہاں سے ایک کینوس کا بیگ خرید سکا......

روانگی سے پہلی شب کو وفد کے باقی تمام ممبروں نے مجھے رات کو دس بجے SUPPER پر مدعو کیا اور خاصے افسوس اور خلوص کے ساتھ رخصت کیا۔ ایک صاحب نے تقریر کے دوران میں یہ بھی کہا کہ عجیب بات یہ ہے کہ اس وفد میں بیشتر ممبر انگریزی بولنے والے ہیں لیکن شاید سب سے بہتر انگریزی دو غیر انگریز بولتے ہیں۔ ان میں سے نمبر ۱ ہندوستانی ہے اور دوسرا ہالینڈ کا باشندہ! وفد کے ممبروں میں سے مجھے سب سے زیادہ مندرجہ ذیل لوگ پسند آئے :-

۱۔ S.H. WOOD جو انگلستان کی وزارتِ تعلیم کے ممبر ہیں اور ۱۹۳۶ء میں نیو ایجوکیشن فیلو

شپ کے وفد کے ساتھ ہندوستان بھی آئے تھے۔ شریف، مذہبی، مخلص آدمی ہیں۔ تقریر مختصر کرتے ہیں لیکن بات پتے کی کہتے ہیں اور دل نشین انداز میں سمجھاتے ہیں۔ مثلاً ایک تقریر میں انھوں نے ایک تعلیم یافتہ شخص کے لیے تین معیار یا شرطیں لازم قرار دی تھیں۔ بات نئی نہیں لیکن اندازِ بیان خوب ہے۔

تلاشِ حق

1. CAN YOU ENTERTAIN A NEW IDEA OR DO YOU RUNAWAY FROM IT ?
2. CAN YOU ENTERTAIN THE OTHER FELLOW IN YOUR HEART?
   (PURSUIT OF GOODNESS)
3. CAN YOU ENTERTAIN YOURSELF? i.e. CREATIVE, SPIRITUAL CAPACITY
   (PURSUIT OF BEAUTY)

۲۔ KEES BOEKE ہالینڈ کے رہنے والے ہیں۔ بین الاقوامی تعلیمی حلقوں میں خاصے مقبول ہیں۔ انھوں نے ایک CHILDRENS' INTERNATIONAL COMMUNITY کے نام سے ایک درسگاہ کھولی ہے جس میں جدید تعلیمی اصولوں اور طریقوں بالخصوص آزادی اور بین الاقوامی مفاہمت پر زور دیا جاتا ہے۔ نہایت مخلص آدمی ہیں اور اپنے عقائد کی وجہ سے کافی مصیبتیں جھیل چکے ہیں۔ پہلی جنگِ عظیم کے موقع پر اپنی امن پسندی (PACIFISM) کی وجہ سے جیل میں رہے پولیس نے بعد میں بھی بہت ستایا۔ اور یہ دیکھنے کے لیے کہ یہ کہاں تک NON-VIOLENT بنیں گے ان کے مکان پر کئی بدمعاشوں کو مسلط کر دیا کہ جاکر قبضہ کر لو۔ یہ مکان چھوڑ کر چلے آئے، جنگل میں ایک جھونپڑی تھی اس میں مع اپنے بیوی بچوں کے رہنے لگے اور پھر کبھی اس مکان کو واپس نہیں گئے! انھوں نے انگلستان کی ایک بہت دولت مند عورت سے جو CADBURY (چوکلیٹ کے مشہور بنانے والے) خاندان سے ہے شادی کی۔ لیکن شادی کے کچھ ہی عرصے بعد طے کیا کہ بغیر کمائی دولت سے فائدہ اُٹھانا ناجائز ہے۔ لہٰذا میاں بیوی دونوں نے اپنا حصّہ واپس کر دیا۔

۳۔ ڈاکٹر MACALLISTER BREW جن کا ذکر پہلے کر چکا ہوں۔ غالباً اپنے شوہر کے انتقال کی وجہ سے ان پر ایک جذباتی المیہ طاری ہے۔ لیکن ظاہری گفتگو اور تقریر میں بہت ذہانت اور ظرافت کا ثبوت دیتی ہیں اور تقریر میں ہنسی ہنسی میں گہری باتیں کہہ جاتی ہیں۔

۴۔ پروفیسر BRANELD امریکہ کی مینسوٹا یونی ورسٹی میں فلسفۂ تعلیم کے پروفیسر ہیں۔ جوان آدمی ہیں اچھی خاصی تقریر کرتے ہیں۔ ملنے جلنے میں بہت اچھے ہیں کام میں دل چسپی رکھتے ہیں۔

باقی لوگ بھی اپنے اپنے طرز میں اچھے خاصے ہیں لیکن تقریر وغیرہ میں کوئی خاص بات اور جاذبیت نہیں۔ ایک خاتون فرانس کی مس سشیتوں تھیں جن سے تقریر تو بن نہیں آئی لیکن معلوم ہوا کہ انھوں نے جرمنوں کے قبضۂ فرانس کے دوران میں "زیر زمین" تحریک میں بڑا حصّہ لیا تھا جس کے صلے میں ابھی چند روز ہوتے (کانفرنس کے دوران میں) اطلاع ملی کہ ان کو LEGION OF HONOUR ملا ہے جو فرانس کا سب سے بڑا اعزاز ہے۔ یہ ایک اسکول کی ہیڈ مسٹریس ہیں۔ آج اتنے روز انتظار کے بعد عزیز کا پہلا خط ملا ہے (۲۶ اکتوبر) جو ۱۸ کا لکھا ہوا ہے۔ اس کے بعد کوئی اتا پتا نہیں، معلوم نہیں اتنی دیر کیوں ہوتی ہے۔ میں ہندوستان دس یا بارہ خط لکھ چکا ہوں۔ دل پریشان ہے......

آسٹریلیا اور کانفرنس کے متعلق چند باتیں:۔

۱۔ کانفرنس خاصی کامیاب رہی۔ یعنی ہر جگہ لوگوں نے ضرورت سے زیادہ دل چسپی لی اور کافی تعداد میں لکچروں وغیرہ میں شریک ہوئے۔ بین الاقوامی مفاہمت جو کانفرنس کا خاص موضوع تھا مختلف پہلوؤں سے زیر بحث رہا اور خیال یہ ہے کہ غالباً ان لوگوں کو جو فاصلے کی وجہ سے دنیا سے الگ تھلگ ہیں مختلف ملکوں کے نمائندوں سے اس بحث پر خیالات کو سُن کر یہ احساس ضرور ہوا کہ دنیا کی نوعیت اور نقشہ بدل گیا ہے اور جب تک (بقول میرے) ہم دنیا کے تمام لوگوں اور قوموں سے بلا لحاظ نسل و رنگ و مذہب (جو اسلام کا اصل اصول ہے!) وہی سلوک نہ کریں جو شریف ہم سایے ایک دوسرے کے ساتھ کرتے ہیں یعنی ان کے دُکھ درد میں شریک ہوں، ان کی مدد کے لیے تیار رہیں، ان کی مصیبت کو اپنی مصیبت سمجھیں اور اس کو نگاہِ تخیّل کی مدد سے اسی وضاحت کے ساتھ دیکھ سکیں جس طرح چشم دید واقعات، اس وقت تک دنیا کے مسائل حل نہیں ہو سکتے۔ امن کا قیام دنیا کی سب سے شدید ضرورت ہے لیکن بغیر معاشرتی انصاف کے امن کا قائم ہونا بالکل ناممکن ہے۔

۲۔ اس ضمن میں کہیں کہیں گفتگو اور تقریر کے دوران میں آسٹریلیا کی "سفید پالیسی" کا

ذکر بھی آیا جس کا اصول یہ ہے کہ نہ خود کھائے نہ دوسروں کو کھانے دے۔ گو ابھی تک حکومت اور اکثریت کا یہی اصولِ سیاست ہے لیکن یہ خوشی کی بات ہے کہ کہیں کہیں ایسے حلقے بھی ہیں جو اس کو ناپسند کرتے ہیں اور اس کی مخالفت کرتے ہیں۔ یہ معاشرتی ناانصافی کی ایک مثال ہے۔ دوسری مثال وہ سلوک ہے جو آسٹریلیا کے قدیم باشندوں کے ساتھ کیا جاتا ہے جس کی وجہ سے وہ انسانی حیثیت سے گری ہوئی زندگی بسر کرتے ہیں اور ان کی تعداد گھٹ کر ساٹھ ہزار پر آگئی ہے! ایک زمانہ تھا جب یہ بے درد لوگ جنگلوں میں ان کا شکار کرنے اس طرح جاتے تھے جس طرح جانوروں کا شکار کیا جاتا ہے۔ اب وہ صورتِ حال تو نہیں رہی لیکن ابھی تک مشترک انسانیت کا احساس مفقود ہے۔ انھیں ایک گھٹیا نوع سمجھا جاتا ہے، جن میں سے جو لوگ سفید باشندوں کی بستیوں کے قریب آگئے ہیں ان کی تو حالت بہت ہی خراب ہے۔ وہ محض بھیک پر گزارہ کرتے ہیں اور اسٹیشنوں پر جب ریل گزرتی ہے (یہ چیز میں نے مغربی آسٹریلیا کے صحرائی علاقے میں دیکھی) تو وہاں آکر کھڑے ہو جاتے ہیں (مرد، عورتیں، بچے) اور مسافر انھیں کھانے کی چیزیں دیتے ہیں، ان کے فوٹو لیتے ہیں۔ بدسلوکی نہیں، بے اعتنائی ہے یا وہ دل چسپی جو کسی عجیب قدرتی منظر یا ABNORMALITY کو دیکھ کر ہو سکتی ہے۔ بعض لوگوں مثلاً پادری CHARLES DUGWIL نے اس کے خلاف سخت احتجاج کیا ہے اور رسالے اور کتابیں لکھی ہیں۔ ایک عورت جو خود آسٹریلین ہے پچاس سال سے ان کی اپنی بستیوں میں (جو شہروں اور قصبوں سے سیکڑوں میل دور ہیں) رہتی ہے اور ان کی خدا واسطے خدمت کرتی ہے۔ بعض مشن بھی اس کام کو کرتے ہیں لیکن ان کے مقصد میں مذہبی پرچار بھی شامل ہے۔ بہرحال آسٹریلیا کی جمہوریت پر یہ ایک بدنما داغ ہے۔ میں نے اس کا ذکر اپنی آخری ریڈیو تقریر GOODBYE AUSTRALIA میں بھی کیا تھا۔ سنا ہے کہ یہ قدیم باشندے جب اپنی مخصوص بستیوں میں رہتے ہیں تو ان کی زندگی میں زیادہ معقولیت اور ایک قسم کی فطری شرافت پائی جاتی ہے۔

۳۔ میرے نقطۂ نظر سے کانفرنس کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ لوگوں میں اقبال سے دل چسپی پیدا ہوئی اور اسلام کی طرف سے غالباً ان کے خیالات بہتر ہو گئے۔ مجھ سے بہت سے لوگوں نے

یہ کہا کہ ہمیں اسلام کے بارے میں ایسا تصور نہیں ہو سکتا تھا۔ میں نے انھیں بتایا کہ جو تصور میں نے پیش کیا ہے وہ اسلام کا بہترین تصور ہے۔ جیسا قرآن میں پایا جاتا ہے اور جیسا اس زمانے میں بالخصوص اقبال نے پیش کیا ہے۔ برخلاف اس کے بعض تنگ خیال لوگوں کے ذہن میں "مذہب ملآ و نباتات و جمادات" کا تصور بھی ہے اور بیشتر لوگوں کا عمل ان کے آئیڈیل کی بلندی کو نہیں پہنچا۔ لیکن یہ بات تمام مذاہب پر صادق آتی ہے۔ موجودہ زمانے میں اسلام کی اہمیت یہ ہے کہ اس نے زندگی کی ان قدروں پر زور دیا ہے (مثلاً شخصیت کا احترام، نسل و رنگ و قومیت کے تعصب کا تدارک، بین الاقوامی ذہنیت کی تربیت، مذہبی رواداری وغیرہ) جو اس دور میں انسانیت کے نجات کے لیے لازم ہیں۔

۴۔ ہندوستان کے بارے میں لوگوں نے کافی دل چسپی کا اظہار کیا اور جواہر لال، گاندھی اور جناح کے متعلق بہت سوالات پوچھے۔ میں نے ہندوستان کے متعلق کوئی علیحدہ تقریر نہیں کی لیکن اس کا ذکر مختلف موقعوں پر گفتگو یا تقریر میں آتا رہا۔ بالخصوص اسی تقریر پر جو میں نے "ہندوستان کی تعلیم" پر کی تھی۔ اچھوتوں کا موضوع اکثر اُٹھایا جاتا میں نے انھیں اصلی صورتِ حال بتادی اور یہ کہا کہ ہم نے ان کے ساتھ نہایت شرمناک سلوک کیا ہے لیکن اب اس کی اصلاح کی کوشش کر رہے ہیں۔ پھر بھی شاید یہ سلوک اس سے بہتر ہے جو امریکن حبشیوں کے ساتھ اور تم اپنے قدیم باشندوں کے ساتھ کرتے ہو!

۵۔ اہلِ آسٹریلیا کا یہ کارنامہ قابلِ داد ہے کہ انھوں نے صرف ۱۵۰ سال کے اندر اس برّاعظم میں جو بالکل بنجر تھا (سوائے ساحلی علاقوں کے) جس میں کوئی قدیم روایات نہ تھیں (سوائے ابتدائی باشندوں کے جو بربریت کی منزل سے نہ نکلے تھے) ایک جدید مغربی تمدن کی بنیادیں قائم کرلی ہیں۔ بڑے بڑے خوبصورت شہر بنائے ہیں۔ کارخانے جاری کیے ہیں۔ زراعت اور اُون کی صنعت کو ترقی دی ہے۔ تعلیم کا نظام قائم کیا ہے (چودہ یا پندرہ سال تک تعلیم مفت، عام اور لازمی ہے) لوگ خاصے خوش حال ہیں (جس کی ایک وجہ سترلاکھ آبادی اور ہندوستان سے زیادہ وسیع علاقہ ہے، گو اس کے بیشتر حصے صحرائی اور جنگلی ہیں جن کو ابھی تک قابلِ رہائش نہیں بنایا گیا) حکومت مزدور پارٹی کی ہے جو اب سوشل

سردیس وسیع پیمانے پر قائم کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ لوگ خاصے ملنسار ہیں۔ دولت اور افلاس کا تقابل امریکہ اور انگلستان سے کم ہے۔

۶۔ ایک چیز جس نے مجھے بہت متاثر کیا ایک نیا تجربہ "FLYING DOCTOR" SERVICE کا ہے جس کے ذریعہ ان دور دراز علاقوں میں فوری طبی امداد پہنچائی جاتی ہے جو بہت غیر آباد ہیں اور جہاں نہ جلدی سے پہنچنا ممکن ہے، نہ آسانی سے ان علاقوں میں جگہ جگہ PEDALLING RADIO STATION بنا دیے گئے ہیں جن کے ذریعہ مرکزی مقامات پر ڈاکٹر کو اطلاع پہنچ جاتی ہے اور وہ فوراً ہوائی جہاز میں بیٹھ کر وہاں پہنچ جاتا ہے۔ یا تو وہیں علاج کرتا ہے یا اندیشہ ناک CASES کو ساتھ مرکز پر لے آتا ہے۔ ایک دفعہ ایک پوسٹ ماسٹر نے (اس سروس کے شروع ہونے سے پہلے) ایک آدمی کا معدے کا فوری آپریشن ایک چھری کے ذریعہ کیا (مریض کو شراب کے ذریعہ بے ہوش کیا گیا تھا) اس طرح کہ ریڈیو پر ایک ڈاکٹر کوئی سو میل سے ہدایات دیتا جاتا تھا! اس ریڈیو اسٹیشن کے ذریعہ لوگ آپس میں بات چیت بھی کرتے جاتے ہیں

سڈنی:۔ میں ۱۰ اکتوبر کو رات کے ایک بجے ہوائی جہاز میں سڈنی پہنچ گیا۔ پرتھ سے سڈنی کا فاصلہ غالباً ۱۸۰۰ میل ہے۔ اگر ریل سے آتا تو کم سے کم چار روز لگ جاتے۔ جہاز سڈنی سے ۱۲ کو چلتا ہے۔ اس لیے ۱۱ کو وہاں قیام کیا۔ ڈاکٹر اور مسز فنک نے میزبانی کے فرائض انجام دیے۔ اس قیام کے دوران میں علی گڑھ کے پرانے پروفیسر اور دوست مسٹر FIREBRACE سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے کسی اخبار میں میری تصویر دیکھی تھی چناں چہ فوراً خط لکھا کہ ہم سب سے مل کر جانا۔ چناں چہ ان کے ہاں کھانا کھایا۔ ان کی بیوی سے ملاقات ہوئی جو عزیز کو بہت یاد کرتی تھیں انھوں نے ان کو اس روز دیکھا تھا جب وہ رخصت ہو کر ہمارے ہاں آئی تھیں، لیکن اب تک اچھی طرح یاد تھا۔ ان کی تین لڑکیوں میں سے دو سے ملاقات ہوئی جو علی گڑھ میں تین اور پانچ سال کی تھیں اور اب (سولہ سال کے بعد) خوب جوان ہو گئی ہیں۔ سب لوگ بہت تپاک سے ملے اور علی گڑھ کے دوستوں کو پوچھتے رہے۔ فائر بریس اب خود UNIVERSITIES COMMISSION میں ملازم ہیں۔ کئی سال پادری رہے ہیں بہت سنجیدہ اور مخلص

آدمی ہیں اور فطرت میں مذہبیت بھی ہے۔ اپنے خاندان کی ایک تصویر ہم لوگوں کے لیے اور اپنی کئی تصویریں علی گڑھ کے دوستوں کے لیے دیں۔

DR. EVATT سے جو آسٹریلیا کے وزیرِ خارجہ ہیں اور بین الاقوامی شہرت رکھتے ہیں ملاقات ہوئی۔ پنڈت جواہرلال نے ان کے نام تعارفی خط دیا تھا جو میں نے ان کے پاس بھیج دیا تھا۔ انھوں نے ٹامس کک کے ہاں پیغام کہلا بھیجا کہ میں سڈنی پہنچوں تو ان سے مل لوں۔ ان سے خاصی دل چسپ گفتگو رہی جس میں انھوں نے ہندوستان میں بہت دل چسپی لی اور پنڈت جواہرلال کے ساتھ بہت عقیدت کا اظہار کیا۔ اور کہا کہ میری طرف سے تین باتیں ان سے ضرور کہہ دینا۔ ایک تو یہ کہ میں بہت خواہش مند ہوں کہ ہندوستان اور آسٹریلیا کے باہمی تعلقات مضبوط ہوں اور اس مقصد کے لیے نہ صرف تجارت بلکہ اہلِ علم اور طلبہ کی آمد و رفت اور دونوں میں کرکٹ کے میچ زیادہ سے زیادہ رائج ہوں۔ دوسرے یہ کہ انھیں نہ صرف ہندوستان کی سیاسی آزادی سے بلکہ انڈونیشیا کی آزادی سے بھی گہری دل چسپی ہے اور وہ اپنی ذاتی حیثیت سے جو کچھ ہو سکتا ہے اس مقصد کے لیے کرتے رہے ہیں اگرچہ حکومت برطانیہ اس دخل در معقولات کو پسند نہیں کرتی! ان کا عقیدہ یہ ہے کہ آسٹریلیا کا مستقبل انگلستان اور امریکہ سے زیادہ ہندوستان، ملایا، انڈونیشیا، چین کے ساتھ وابستہ ہے۔ اس لیے وہ چاہتے ہیں کہ ان تعلقات کو مستحکم کریں اور اسی وجہ سے انھوں نے ایک بڑی حد تک آسٹریلیا کی خارجی پالیسی کو برطانیہ کی خارجی پالیسی کے دامن سے آزاد کر لیا ہے اور ان کا خیال یہ ہے کہ مملکت برطانیہ میں شریک رہ کر بھی اس قسم کی آزادی حاصل ہو سکتی ہے اور ان کی آرزو ہے کہ ہندوستان کا رشتہ آزادی حاصل کر لینے کے بعد بھی مملکتِ برطانیہ سے نہ ٹوٹے خواہ وہ سو فی صدی کے بجائے پانچ فی صدی رہ جائے۔ انھوں نے یہ بھی درخواست کی کہ میں اس خیال کو جواہرلال تک پہنچا دوں۔ میں نے کہا کہ پل کے نیچے سے اس قدر پانی بہ گیا ہے کہ اب مجھے یہ امکان معلوم نہیں ہوتا کہ ہندوستان کسی شکل میں بھی مملکتِ برطانیہ کا شریک رہنا گوارا کرے۔ شاید بیس سال بلکہ دس سال پہلے تک بھی اس کا امکان تھا لیکن اب مجھے یہ قرینِ قیاس معلوم نہیں ہوتا —— ایوٹ دوہرے جسم کے مستعد آدمی ہیں۔ کمرے میں ایک بڑا سا دنیا کا نقشہ لٹکا ہوا تھا۔ بار بار باتیں کرتے ہوئے

اُٹھ کر دیوار کے پاس جاکر نقشے کے ذریعے اپنی دلیل کی تائید کرتے تھے۔ یہ پہلے بیرسٹر تھے اور بہت ممتاز بیرسٹر تھے۔ پھر جج ہوگئے اور اس کے بعد چند سال ہوئے ایک دم سیاست کے خارزار میں کود پڑے۔ مزدور پارٹی سے تعلق ہے اور دوسری پارٹیاں ان پر کافی اعتراض کرتی ہیں۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو کہ زور دار آدمی ہیں۔ جواہرلال سے انگلستان میں کرپس کے ہاں ملاقات ہوئی تھی جب کہ لاسکی بھی وہاں تھے اور اس زمانے میں ہندوستان کی آزادی اور دستور کے متعلق غیر رسمی بحث و مباحثہ ہوا کرتا تھا۔ کہتے تھے کہ نہ صرف ہندوستان کی طرف سے جو نمائندے بین الاقوامی کانفرنسوں میں شریک ہوتے ہیں (مثلاً مدالیار جن کی قابلیت کے معترف لیکن آزادی رائے میں مشکوک تھے) ان پر بلکہ انگریزی نمائندوں پر بھی اعتبار نہیں کیا جاسکتا کہ جب کوئی واقعاً سخن گسترانہ بات آپڑے گی جس سے بڑی طاقتوں کی قوت اور اختیار کو محدود کرنا مقصود ہو تو یہ لوگ ساتھ دیں گے۔ لیکن انھیں یہ امید ہے کہ کانگریس کی حکومت جن نمائندوں کو بھیجے گی وہ زیادہ آزادی کے ساتھ کام کریں گے۔ اس بات کا میں نے انھیں یقین دلایا کہ بین الاقوامی معاملات میں ہم لوگ ہمیشہ آزادی اور مساوات کا ساتھ دیں گے اور اس وقت سے دے رہے ہیں جب حکومتِ برطانیہ ہٹلر کی رضا جوئی کو اپنا کمالِ سیاست سمجھتی تھی۔ انھوں نے اپنی تازہ کتاب AUSTRALIA IN WORLD AFFAIRS کی دو جلدیں (ایک جواہرلال کے لیے اور ایک مجھے) دیں۔ میں نے ان کے بارے میں یہ تنقید سنی ہے کہ گو یہ ظاہر میں تمام بڑی طاقتوں کے خلاف چھوٹی طاقتوں کی ترجمانی کر رہے ہیں لیکن در اصل در پردہ یہ مخالفت روس کی مخالفت ہوتی ہے۔ لیکن میں خود صورتِ حال سے اتنا واقف نہیں کہ اس کی تصدیق یا تکذیب کرسکوں۔

پرتھ سے روانگی کے وقت آسٹریلیا کے ہائی کمشنر کا تار ملا کہ حکومتِ ہند ہمیں UNESCO بھیجنا چاہتی ہے۔ قبولیت سے مطلع کرو۔ اس کے بعد سڈنی میں ان کی طرف سے ٹریڈ کمشنر ملنے آئے۔ میں نے کہا کہ میں کل روانہ ہو رہا ہوں۔ دہلی پہنچ کر بات کروں گا۔ میں نے اس بارے میں تار کے ذریعے کوئی جواب نہیں دیا۔ عزیز سے گفتگو کرنے کے بعد جواب دوں گا۔

ابھی (۱۳/اکتوبر شام کے ساڑھے چھ بجے) جہاز ہندوستان کے ساحل پر سے گزرا ہے

(اس کے شمال میں) اور عزیز اور بچیوں اور سب اعزّہ کی یاد بہت شدّت سے محسوس ہو رہی ہے۔ خدا جلد کل شام کا وقت دکھائے!

۱۴/اکتوبر

آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا! بہت تدبیروں سے ایسا پروگرام بنایا تھا کہ توقع سے بھی ایک روز پہلے پہنچ جاؤں اور اب تک تقریباً ۱۸ ہزار میل کے اس سفر میں منٹوں کی دیر بھی نہیں ہوئی تھی لیکن اپنے اس کارگزار ملک میں پہنچ کر پہلے تجربے ہی نے دانت کھٹے کر دیے۔ اوّل تو ایروڈروم پر بدنظمی۔ کسی بات کی اطلاع نہیں۔ دوسری جگہوں پر ہمیشہ لاؤڈ اسپیکر لگا رہتا ہے جس کے ذریعے مسافروں کو ضروری اطلاعات برابر دی جاتی ہیں۔ یہاں کسی کو کچھ خبر نہیں! دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ دہلی سے آنے والا جہاز (جس میں واپس جانا ہوتا ہے) دیر سے آئے گا کیوں کہ اس میں کچھ خرابی ہے اور وہ جودھ پور میں رکا ہوا ہے۔ اور ممکن ہے آئے ممکن ہے بالکل نہ آئے۔ لیکن اگر آیا تو اس کے آدھ گھنٹے کے اندر اندر روانہ ہو جائیں گے۔ جہاز خدا خدا کر کے ۵ بجے آیا۔ جانے کے لیے تیار ہوئے، مژدہ سنایا گیا کہ پٹرول بھر لیا گیا ہے، سامان بار کیا جا رہا ہے۔ بہت دیر انتظار کے بعد پتہ چلا کہ نہیں کچھ خرابی ہے۔ آج نہیں جا سکتا! ہم لوگوں کو ایروڈروم کے اُوپر کے کمروں میں ٹھیرایا گیا (یہ بھی غنیمت تھا ورنہ ممکن ہے پھر شہر بھیج دیتے کہ ایک رات کے =/۱۸ خرچ کرو!) رات کو اطلاع ملی کہ صبح کے ٹھیک پانچ بجے روانگی ہوگی تاکہ دس سے پہلے دہلی پہنچ جائیں اور سب کو ½۴ بجے جگا دیا جائے گا۔ شوقِ سفر میں ۴ بجے ہی اُٹھا، منہ ہاتھ دھویا، سامان باندھا، تیار ہوا، ساڑھے چار بجے کا انتظار تھا کہ ملازم نے آ کر کہا کہ رات بھر انجن میں کام ہوا ہے لیکن ابھی تک کام مکمل نہیں۔ اس لیے دیر میں روانگی ہوگی۔ چناں چہ پھر جوں کا توں لیٹ رہا۔ سات بجے پھر اُٹھ کر کپڑے پہننے کی نیت کر رہا تھا کہ ایک افسرِ ہوائی جہاز تشریف لائے کہ جہاز تیار ہے۔ جلدی چلیے۔ بھاگ دوڑ کر کے منہ دھویا بیگ بند کیا، قلی سامان نیچے لے جا چکا تھا کہ وہ صاحب پھر نمودار ہوئے اور کہا کہ جہاز کا کپتان کہتا ہے کہ مجھے ابھی تک انجن پر پورا اعتماد نہیں۔ اس لیے میں اس میں مسافروں کو لے

جانے کی ذمہ داری نہیں لے سکتا۔ جو جہاز آج دہلی سے آئے گا اس میں جانا ہوگا۔ چناں چہ راوی فرصت ہی فرصت لکھتا ہے اور کوفت ہی کوفت دیتا ہے اور ان دونوں کو بہلانے کے لیے اس تفصیل کے ساتھ یہ داستانِ حسرت لکھ رہا ہوں تاکہ وقت کٹے اور اس بات کا احساس (مجھے تو دا) ہو کہ ابھی تک ہمارے ملک کے نظم میں کس قدر چولیں ڈھیلی ہیں۔ کسی دوسرے متمدّن ملک میں ضرور ایک اور جہاز کا انتظام کرکے ہمیں پہنچا دیا گیا ہوتا۔

۱۳ر نومبر

آج ایک سال سے زیادہ عرصے کے بعد اس ڈائری کو ہاتھ میں لیا ہے۔ کام کو باقاعدگی اور استقلال سے نہ کرنا بہت بُری عادت ہے۔ لیکن اس عرصے میں اتنا ضرور ہوا کہ ایک دوسری کاپی میں آسٹریلیا اور انگلستان کے سفر کا حال مختصر طور پر لکھ سکا۔ آسٹریلیا میں ایک بین الاقوامی تعلیمی کانفرنس تھی جس میں دس قوموں کے نمائندے شریک ہوئے تھے۔ اور ہندوستان کی طرف سے مجھے دعوت دی گئی تھی۔ میں ستمبر کی ۱۶ر کو روانہ ہوا تھا اور اکتوبر کی ۱۲ر کو کراچی واپس پہنچ گیا اور اس عرصے میں تین مختلف "ریاستوں" میں کانفرنسوں میں شامل ہوا۔ بیس ہزار میل کا سفر طے کیا۔ بہت سے لوگوں سے ملاقات کی اور مختلف انجمنوں وغیرہ میں بہت سی تقریریں کیں! یہ ہے آج کل کے تیز رفتار ہوائی جہازوں کا اعجاز! لیکن بعض دفعہ میرے دل میں یہ خیال آتا ہے کہ یہ فاصلہ کی تسخیر اور وقت کی کفایت تسلیم لیکن اس فرصت کا لوگ کیا بناتے ہیں جو اس ذریعہ سے حاصل ہوتی ہے۔ فرصت کا احساس تو بہرحال آج کل کے زمانے میں گزشتہ زمانوں سے بہت کم ہے۔ اور پھر یہ خیال بھی ہوتا ہے جس کو تفصیل سے لکھوں تو کئی صفحے درکار ہیں لیکن اقبال کے شعر میں مضمون کو یوں ادا کیا گیا ہے ؎

عجب ایں نیست کہ اعجاز مسیحا داری　　عجب ایں است کہ بیمار تو بیمار تر است!

بہرحال یہ عجب حسنِ اتفاق ہے کہ یا تو گزشتہ بیس سال میں بیرونِ ہند کا صرف ایک سفر (ایران اور عراق والا) پیش آیا تھا یا جنگ کے بعد دفعتاً تین سفر پیش آ گئے۔ گزشتہ سال UNESCO

کانفرنس میں شریک ہوئے لندن گیا۔ اس سال ستمبر میں آسٹریلیا اور اب ایک ماہ کے بعد پیرس جا رہا ہوں تاکہ UNESCO کی پہلی باضابطہ کانفرنس میں شریک ہوسکوں۔ میرے علاوہ باقی ڈیلیگیٹ سر رادھا کرشنن (لیڈر)، سارجنٹ، راج کماری امرت کور اور ڈاکٹر بھابا ہیں (جو ایک مشہور سائنس داں اور رائل سوسائٹی کے فیلو ہیں)۔ جو اسٹاف ساتھ بھیجا جا رہا ہے اس میں آغا اشرف (المعروف بہ آداب عرض!) بھی شامل ہیں۔ افسوس ہے کہ ذاکر صاحب اس وفد میں شامل نہ ہو سکے کیوں کہ انھیں اس زمانے میں جامعہ کے جشنِ جو.بلی کا انتظام کرنا ہے جو ۱۵، نومبر سے ۱۸، نومبر تک ہو رہا ہے۔ ان کی ذات ایک ایسی انجمن ہے کہ اس کی بدولت گزشتہ سال کا سفر لندن سوار سا ہو گیا تھا۔ اس سال وہ بات کہاں نصیب ہوگی۔ خیر خدا کرے جامعہ کی یہ پچیس سالہ جو.بلی اس معنی میں بھی کامیاب ہو کہ ناواقف لوگوں کو اس کام کی اہمیت اور اس ایثار کی عظمت کا اندازہ ہو جو ذاکر صاحب اور ان کے ساتھی ایک قدر ناشناس قوم اور نامساعد زمانے میں انجام دیتے رہے ہیں۔ جو.بلی کا پروگرام بہت دل چسپ، مفید اور خوش مذاقی کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے اور میری محرومی ہے کہ میں اس میں شریک نہ ہوسکوں گا۔

سفرِ فرانس

۱۹۴۶

اس وقت ولایت کا جو سفر در پیش ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ پیرس میں UNESCO کا پہلا اجلاس ہو رہا ہے۔ گزشتہ سال تو اس جماعت کا دستور مرتب کیا گیا تھا لیکن اب اس کا مستقبل کا پروگرام طے ہوگا اور اصلی کام کا آغاز کیا جائے گا۔ ابھی تک معلوم ہوا ہے کہ اس کے سامنے بہت سی تجاویز آئی ہیں جن میں رطب و یابس ہر قسم کی ہیں اور ان کو سکریٹریٹ نے غور کرنے کے بعد کاٹ چھانٹ کر مرتب کیا ہے۔ ہم لوگوں کو جو دنیا کی مختلف قوموں کی طرف سے نمائندے بن کر شریک ہو رہے ہیں ان کے متعلق غور کرنا ہے اور یہ طے کرنا ہے کہ ملکوں میں علمی اور تعلیمی رابطہ بڑھانے اور تعلیم کے ذریعہ بین الاقوامی مفاہمت پیدا کرنے کے لیے کیا ذریعے اختیار کیے جا سکتے ہیں۔ (لیکن گزشتہ چند ماہ سے ملک میں جو شرمناک حالت برپا ہے اور ہندو مسلم تعلقات نے درندگی کی سی نوعیت اختیار کر لی ہے اس کا خیال کر کے "از خجالت آب می گردد وجود!" ہم لوگ کس منہ سے دوسری قوموں کے

لوگوں کے سامنے امن اور آشتی اور محبت کا پیغام پیش کریں گے جب ہمارے ہاں ہزاروں لاکھوں آدمیوں کی انسانیت دیکھتے دیکھتے خاک میں مل گئی ہے اور اندر سے وحشی درندے بلکہ ان سے بھی بدتر جانور نکل آئے ہیں. جو قدریں اور خیالات ہم لوگ تعلیم کے ذریعے پھیلانا چاہتے ہیں وہ اہلِ سیاست کی حماقت اور پاجی پن ذرا سی دیر میں برباد کر دیتا ہے اور برسوں بلکہ نسلوں کی محبت اور محنت تباہ ہو جاتی ہے!)

میں ۱۲؍نومبر کو دن کے ڈیڑھ بجے دہلی سے روانہ ہوا۔ عزیز، سیّدہ، باجی، اظہر، محبوب وغیرہ مجھے چھوڑنے ہوائی جہاز کے اڈے پر آئے تھے۔ روانگی خاصی پریشانی کی حالت میں ہوئی کیوں کہ عزیز کی طبیعت اچھی نہیں ہے اور ان کے لیے میرا اس قدر جلد آسٹریلیا سے آتے ہی جانا، بہت شاق تھا اور خود مجھ پر بھی یہ خیال بھاری ہے کہ میں پھر کئی ہفتے تک سب عزیزوں سے علاحدہ ہوں گا. ادھر ملک کی فرقہ وارانہ کشیدگی نے ایسی صورت اختیار کرلی ہے کہ اطمینانِ قلب مفقود ہے۔ لیکن عزیز نے جرأت کرکے جانے دیا اور میں اس وجہ سے راضی ہو گیا کہ بعض اعتبار سے یہ موقع اہم ہے اور یہ کانفرنس گزشتہ سال سے زیادہ ضروری ہے اس لیے خدا پر بھروسا کرکے روانہ ہو رہا ہوں. خدا ہی سب لوگوں سے ہنسی خوشی ملائے!۔

دہلی سے کراچی تک کا سفر محض تین گھنٹے کا ہے! چناں چہ ہم لوگ ساڑھے چار بجے پہنچ گئے اور پیلس ہوٹل میں ٹھیرے۔ کراچی میں راج کماری کے ایک عقیدت مند سیٹھ رام موتی رام ہیں جو کاروباری آدمی ہیں اور بہت دولت مند ہیں۔ انھوں نے بڑی مہربانی کرکے ہم سب کو (بعد مغرب کی تاریکی میں!) کراچی کی سیر کرائی اور رات کو بہت سے آدمیوں کے ساتھ وہاں کے سب سے بڑے کلب میں ڈنر دیا. گزشتہ سال بھی انھوں نے اسی طرح مہمان نوازی کی تھی۔ آدمی اچھے ہیں اور اپنی دولت، اپنی موٹروں، اپنے مکانوں وغیرہ کا ذکر اس قدر سادگی اور بے ساختگی کے ساتھ کرتے ہیں کہ دل چسپ ہوتا ہے لیکن ان کا NAIVETE ناگوار نہیں ہوتا! آج صبح ۷ بجے ہم لوگ کراچی سے روانہ ہو گئے۔ پہلا قیام دن کے ایک بجے کے قریب بصرہ میں ہوگا۔

بصرہ میں ڈیڑھ گھنٹے قیام رہا۔ یہاں کی ایروڈروم کی عمارتیں خصوصاً ہوٹل خاصا شاندار اور آرام دہ ہے۔ ہمارا راستہ یہاں پہنچنے سے پہلے بلوچستان کے جنوبی علاقے کے اُوپر سے گزرا ہے اور اس کے بعد اس وقت (ہندوستانی وقت ۴ بجے، مقامی وقت ۲ ½ بجے تیسرے پہر) ہم بحیرۂ مردار کے اُوپر سے (یروشلم کے جنوب میں) گزر رہے ہیں۔ یہ بیشتر علاقہ یا تو صحرا نما ہے یا (زیادہ تر) سخت پتھریلا اور چٹانوں کا بنا ہوا ہے۔ ہزاروں میل تک چٹانیں چلی گئی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے دیوزادوں نے اپنے ہیبت ناک اوزاروں سے تراش کر ان کے چہرے پر شکنیں ڈال دی ہیں۔ لیکن یہ دراصل پانی جیسی رقیق اور نرم چیز کا صدیوں کا کارنامہ ہے۔ کہیں سمندر کے پانی نے، کہیں بارش کے پانی نے ان چٹانوں کو ایک خاص انفرادیت بخشی ہے جس کی وجہ سے ان کو دیکھ کر کسی نامور اور باکمال مصوّر کی تصویر کا خیال آتا ہے جس نے بہت محبت اور محنت کے ساتھ ایک بوڑھے آدمی کے چہرے کا نشیب و فراز دکھایا ہو..... ایک اور نہایت اثر آفریں منظر جو میں نے دیکھا وہ ہوائی جہاز کی آٹھ نو ہزار فٹ کی بلندی سے بادلوں کا نظارہ تھا۔ اس سے پہلے میں نے ایسے بادل تو اکثر دیکھے ہیں جن کو دیکھ کر دھنکی ہوئی روئی کے بڑے بڑے گالوں کا خیال آتا ہے۔ لیکن آج سفید بادلوں کے گھنے دل کے میلوں تک زمین کو بالکل ڈھانکے ہوئے تھے اور سورج کی روشنی نے جو ان پر جہاز کی پشت کی طرف سے پڑ رہی تھی ان میں شفاف چاندی کی سی چمک پیدا کر دی تھی۔ اگر اس منظر کے لیے کوئی مثال دی جاسکتی ہے تو وہ یہ ہوگی کہ گویا کسی بہت اُونچے پہاڑ کی دور دور تک پھیلی ہوئی چوٹیاں برف کے عظیم الشان تودوں سے ڈھکی ہوئی ہیں، تھوڑا تھوڑا برف نہیں جس پر آسانی سے چل پھر سکتے ہیں جیسا ہمیں گلمرگ سے اُوپر کھلن مرگ پر ملتا تھا بلکہ خود برف کے تودوں کی پہاڑیاں سی بنی ہوئی جن کو دیکھ کر بادلوں کی اصلی ساخت کا اندازہ ہوتا ہے، یا یہ بھی نظر کا فریب ہے!

میں راستے میں ایک کتاب پڑھ رہا ہوں جس کا نام ہے BELLED AND ITS SERVICE ایک عورت ROSAMOND LEHMA.. کی لکھی ہوئی ہے۔ اس قدر مبصرانہ نفسیاتی مطالعہ ہے، بالخصوص عورتوں کی فطرت کا (بلکہ ایک خاص اور غیر معمولی انفرادیت رکھنے والی عورت کی

فطرت کا) کہ میں نے کم کتابیں اس کی ٹکر کی پڑھی ہیں۔ اور بر خلاف بیشتر انگریز مصنفین کے اس عورت کو زبان اور اس کی لطافتوں اور الفاظ کے SENEMONS حسن سے عشق ہے اور نہایت اثر آفریں اور انفرادی امتیاز رکھنے والی زبان استعمال کرتی ہے۔ بصرے سے میں نے ایک کتاب DEMOCRACY ON THE ROAD خریدی ہے جس میں امریکہ کی مشہور T.V.A. پروجکٹ کا بیان ہے جس نے وہاں کے ایک مقابلتہً پس ماندہ علاقے میں ایک انقلابِ عظیم پیدا کر دیا ہے۔ مجھے اس مضمون سے اس لیے دل چسپی ہے کہ ہندوستان کو بھی اپنی صنعتی اور سوشل ترقی کے لیے اس قسم کے منصوبے چلانے ہوں گے۔ (بلکہ خود اس نے بھی اس چیز کا ذکر کیا ہے)۔

قاہرہ۔ شام کے چار بجے سے رات کے دو بجے تک۔ قاہرہ حسبِ معمول عالی شان، خوبصورت، لہو ولعب میں مگن اور بے روح شہر ہے۔ ہمیں جس ہوٹل میں ٹھیرایا گیا تھا یعنی SHEPPRED' S وہ یہاں کا سب سے زیادہ فیشن ایبل اور پُرتکلف ہوٹل ہے اور عمارت اور کھانا دونوں در اصل بہت اچھے ہیں۔ بس وہی بات ہے کہ سارے مصر کی دولت سمٹ کر قاہرہ میں آگئی ہے جس پر وہاں کا تمام متموّل طبقہ عیش کرتا ہے۔ موٹریں، پُر رونق بازار، سودے سے بھری ہوئی دوکانیں جس میں ہر چیز کی قیمت نامناسب ہے، رات کے دو بجے تک چہل پہل اور رنگ وامش۔ بقول شخصے، جس کو کسی اُردو شاعر (سودا؟) نے بھی باندھا ہے، ایک لُٹی ہوئی بستی پر ایک چراغ روشن ہے ؎

روشن ہے اس طرح دلِ سوزاں میں داغ ایک   اُجڑے نگر میں جیسے جلے ہے چراغ ایک!

یہ سماجی ظلم اور نامعقولیت کی ایک خراب لیکن عام مثال ہے۔ ہندوستانی ریاستوں میں مثلاً یہ چیز اکثر پائی جاتی ہے۔

۱۴؍ نومبر

صبح کے پونے سات (مقامی ۴½ بجے) ٹیونس کے ساحل کے اُوپر سے گزر رہے ہیں اور صبح کے سورج کی پہلی جھلکیاں مشرق میں سُرخ رنگ کی ہلکی ہلکی دھاریوں کا کھیل بنا رہی ہے۔

اب دیکھتے دیکھتے اس نے بادلوں اور پہاڑیوں اور سمندر کے نیلے پانی کو اندھیرے کی گود سے نکال کر ایک تصویر بنا دیا ہے۔ ہمارا قیام ابھی ذرا سی دیر کے بعد ایک گھنٹے کے لیے مقام CASTEL BENITS میں ہوگا جو بظاہر بدبخت مسولینی کے نام پر بسایا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ یہ طرابلس سے شاید ۱۵ یا ۲۰ میل دُور ہے۔

شام کے تین بجے لندن کے ہوائی اڈے پر پہنچے لیکن بادل اور کہر اس قدر زیادہ تھی کہ جہاز وہاں نہ اُتر سکا اور اسے جنوبی انگلستان میں پورن متھ جانا پڑا! وہاں چند گھنٹے انتظار کر کے ہم لوگ شام کو ریل سے روانہ ہوئے اور رات کو نو بجے کے بعد لندن پہنچے اور گروونر ہاؤس میں (جو گزشتہ سال کی قیام گاہ، یعنی فیلڈن والے مکان کے قریب ہے) مقیم ہوئے۔

لندن میں چار روز قیام کرنا پڑا۔ تین دن بہرحال ٹھیرنا تھا، چوتھے دن فرانس کے سفارت خانے کی مہربانی جہاں ہمارا پاسپورٹ VISA لینے کے لیے بھیجا گیا تھا اور ان کارگزاروں نے اسے گم کر دیا۔ خود جاکر تلاش میں مدد دی تو ملا! لیکن اس سے یہ فائدہ ہوا کہ میں (اور اشرف) بجائے بحری جہاز سے فرانس جانے کے ہوائی جہاز میں آئے اور ۱۸ر کو پیرس پہنچ گئے۔

لندن میں مندرجہ ذیل قابلِ ذکر لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ مسٹر وُڈ (محکمۂ تعلیم) مسٹر بیری (چیف کالج لاہور) اور "فنشر" اور "انون" کے اشاعت خانے کے مالک سر اسٹینلے انون جو اقبال پر ایک کتاب انگریزی میں شائع کرنا چاہتے ہیں اور مجھ سے اس کے لکھنے کی فرمائش کرتے ہیں۔

قیامِ پیرس

پیرس میں ہم لوگوں کا قیام PLACE D' STOIBY کے قریب ایک بہت اچھے ہوٹل میں ہے جو رائل مونسو ہوٹل کہلاتا ہے اور AVENUE HOCHE میں واقع ہے۔ میں نے پیرس کو اس سے قبل ۱۹۲۵ء میں دیکھا تھا۔ لیکن اس دفعہ جو اس کو دیکھنے کا موقع ملا تو اس کی خوبصورتی، کشادگی اور توازن و تناسب کو دیکھ کر دل بہت متاثر ہوا۔ لندن ایک بحرِ زخار کی مانند ہے

جس کو دیکھ کر دل پر ایک بوجھ سا ہوتا ہے، گویا یہ دل و دماغ کو کچل کر رکھ دے گا۔ برخلاف اس کے پیرس میں فرصت اور فراخی اور دل کشی کا سامان ہے۔ فراخ سڑکیں، خوبصورت عمارتیں اور مجسمے، قدم قدم پر تاریخی ناموں کی وابستگی گویا چاروں طرف یورپ کی تاریخ کا مرقع کھلا ہوا ہے، باغات، روشنی، پُر رونق بازار۔ پیرس کا مسکراتا ہوا بیرونی چہرہ دیکھ کر یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ یہ ابھی دو سال پہلے موت اور زندگی کی کش مکش بلکہ موت سے بدتر زندگی کے بھنور میں گرفتار تھا۔ اندر سے اس کا جو حال ہے (اور ظاہر ہے کہ چیزوں کی گرانی اور کمیابی کی وجہ سے غریبوں پر عرصۂ حیات تنگ ہے) لیکن باہر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اب بھی یہاں ہر قسم کی فراغت اور آسائش کا سامان موجود ہے۔ مجھے خاص طور پر اس کی آرٹ گیلریاں، (جو نہ صرف خوبصورت اور قدیم تاریخی تصویروں اور مجسّموں کا گھر ہیں بلکہ خود بھی خوبصورتی کا نمونہ ہیں) اس کے وسیع AVENUES اور تاریخی MONUMENTS خاص طور پر پسند آئے۔ لوگوں کی بات چیت اور میل جول میں اخلاق اور تکلّف اور شائستگی کی ایک خاص ادا ہے اور زبان میں شیرینی۔ نوکر، نوکرانی، لفٹ چلانے والا لڑکا بے ضرورت شکریہ ادا کرنے کے لیے بھی MERCI MAU-SIEUR اس طرح سے کہے گا گویا دراصل اس پر کوئی احسانِ عظیم کیا گیا ہے جس کا وہ دل سے احساس رکھتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ چیز ایک طرح کا تکیۂ کلام ہی ہے لیکن اس کی وجہ سے زندگی کے پُرزے زیادہ سہولت اور نرمی کے ساتھ چلتے ہیں۔

کانفرنس ۱۹ ار سے شروع ہوئی اور اہلِ فرانس نے اس کا انتظام بہت شان اور اہتمام سے کیا ہے۔ علاوہ کانفرنس کے روزانہ پروگرام کے، جو صبح کو شام اور کبھی شام کو رات کر دیتا ہے دعوتوں کی بھرمار ہے۔ وزیرِ اعظم سے لے کر یونسکو اسٹاف کے ممبران تک مختلف دعوتوں پارٹیوں وغیرہ پر بلاتے رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک نمائش جدید آرٹ کی، ایک سائنس کی، ایک تعلیمی کتابوں اور سامان کی مسلسل ہو رہی ہے۔ تعلیمی اور سائنٹفک فلم روز دکھائے جاتے ہیں (گو میں بہت کم جا سکا ہوں) حکومتِ فرانس کی طرف سے کئی OPERA اور BALLET اور موسیقی کے پروگرام۔ یہاں کے بہترین تھیٹروں میں خاص طور پر نمائندگانِ عالم کو دکھائے گئے ہیں۔ ان میں ہندوستانی موسیقی کے ریکارڈ اور DOCUMENTARY فلم بھی

شامل ہیں اور ہندوستانی آرٹ بھی نمائش کا ایک حصّہ ہے۔ غرض فرانس والوں نے CULTURAL FESTIVAL نام سے تہذیب کے مختلف ادبی اور جمالی اور علمی عناصر کا ایک طوفان رنگ و بو مہیّا کردیا ہے جو اس قسم کی کانفرنس کے لیے ایک بہت موزوں پس منظر مہیّا کرتا ہے۔ کانفرنس کے پہلے اجلاس میں بھی ہر تقریر کے بعد ایک نہایت بلند معیار کا پروگرام کلاسیکل موسیقی کا ہوتا تھا! مجھے خیال آتا ہے کہ جب ہندوستان اس کانفرنس کو وہاں دعوت دے گا تو ہم ممبران کانفرنس کے لیے کیا سامان تفریح اور نمائشِ تہذیب کا انتظام کر سکیں گے! اس میں شک نہیں کہ باوجود اپنی سیاسی اور اخلاقی کمزوری کے اہلِ فرانس اب بھی یورپی تہذیب کے معاملے میں پیش پیش ہیں اور نفاست اور خوش مذاقی میں سب سے آگے ہیں۔ (لیکن سیاست کی حالت خراب ہے۔ پارٹیاں بہت ہیں۔ اتفاق ندارد ہے۔ مستقل حکومت نہیں بنتی۔ آج کل بھی روز صدرِ جمہوریہ کے انتخاب کے جلسے ہوتے ہیں اور ہر نام مسترد ہوجاتا ہے اور پھر جرمنوں کے قبضے کے زمانے میں APPEARERS نے کیا کچھ نہیں کیا' لیکن اس کی داستان تو UPTON SINCLAIR ہے۔

۱۲ / دسمبر

پیرس کی کانفرنس بخیر و خوبی ختم ہوگئی اور مصروفیت اس قدر رہی کہ روزانہ اس ڈائری میں کچھ نہ لکھ سکا۔ اب مختصر طور پر بعض تاثرات اور یادداشتیں لکھتا ہوں۔ کانفرنس میں ہندوستانی نمائندوں کا کام خلافِ توقع بہت سراہا گیا۔ اس کی خاص وجہ یہی تھی کہ ان کی غرض کسی قوم سے وابستہ نہ تھی، نہ اپنے ذاتی مفاد کی خاطر جدو جہد کرنی تھی۔ اس لیے انھیں جو کچھ کہنا تھا وہ انھوں نے برملا کہا اور جرأت کے ساتھ کہا جس کی وجہ سے لوگوں نے عزت کی (گو کمیٹی وغیرہ کے کام میں اہلِ امریکہ نے اکثر ہندوستانیوں کے بجائے چینی ممبران کو لینے کی تجویز پیش کی کیوں کہ چینی بالعموم انھیں کی دُھن پر راگ الاپتے ہیں!)

کانفرنس کی پہلی باضابطہ تقریر جس میں سکریٹری کی رپورٹ پر تبصرہ کیا گیا تھا ہمارے وفد کے لیڈر رادھاکرشنن نے کی اور نہایت جرأت کے ساتھ روحانی اقدار کی حمایت کی

اور امریکہ اور روس کو عقل سکھانے کی کوشش کی! کانفرنس کی آخری تقریر یں نے کی جس میں اس کام پر تبصرہ کرنے اور فرانس کا شکریہ ادا کرنے کے علاوہ اس بات پر زور دیا کہ ہمیں سیاست کی قدیم روایت یعنی ہر بات میں COMPROMISE کی عادت کو چھوڑ کر صحیح اور سچی بات کہنی چاہیے اور ذاتی مفاد کی خاطر دوہری جنگ کرنے کی عادت کو ترک کرنا چاہیے۔ اس کے علاوہ اس دوران میں مندرجہ ذیل کام کیا:-

۱۔ کانفرنس کے پہلے عام اجلاس میں ان اصولوں کی توضیح جن پر UNESCO کو کام کرنا چاہیے۔ خوشی کی بات ہے کہ ختم کانفرنس تک وہ اصول عام طور پر مسلمہ قرار پائے۔ ان میں سے ایک یہ تھا کہ اس جماعت کو تمام تجاویز پر اس نقطۂ نظر سے غور کرنا چاہیے کہ آیا وہ امن کے ذہنیت کے قائم کرنے میں مفید ہیں یا نہیں۔ دوسرا اصول یہ تھا کہ وہ تمام تجاویز جو کلچرل اعتبار سے پس ماندہ جماعتوں کو اُبھاریں اور دنیا میں تہذیبی مساوات قائم کریں دوسری تجاویز پر مقدم سمجھنا چاہیے۔

۲۔ تعلیمی کمیشن میں تجاویز کی ترتیب اور تنقید۔ اس بارے میں عام طور پر خیالات کی خاص قدر کی گئی۔ بعض لوگوں نے استحقاق سے بہت زیادہ ان کو پسند کیا۔

۳۔ MASS MEDIA کمیشن میں (جہاں پریس، ریڈیو فلم وغیرہ زیرِ بحث تھے) ان اسباب کی تشریح اور اس صورتِ حال کی تنقید جس کی وجہ سے ان کا معیار اس درجہ گرا ہوا ہے اس ضمن میں امریکی فلموں اور عام طور پر مغربی آلات نشر و اشاعت پر سخت گیری کے ساتھ نکتہ چینی (جس کو امریکہ والوں نے بہت زیادہ پسند کیا!!) اور اس خیال کی توضیح کی جب تک سرمایہ داری کا چنگل ان پر حاوی ہے اصلاح کی صورت پیدا نہیں ہو سکتی۔ اس مسئلے کو اور کسی نے نہیں اُٹھایا تھا۔

۴۔ معاشرتی علوم کے کمیشن میں نسلی اختلاف کے مسئلے سے بحث جس کی وجہ سے قوموں کے تعلقات میں خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔

۵۔ اقبال پر ایک تقریر (لسانیات مشرق کے ادارۂ عالیہ میں) جس کا ترجمہ ساتھ ساتھ فرانسیسی زبان میں کیا گیا۔ (لیکن اشعار مجھ سے اُردو اور فارسی ہی میں پڑھوائے گئے!)۔ اس پر

پروفیسر "مسی نوں" نے (جو بہت بڑے مستشرق ہیں اور اقبال سے مل چکے ہیں) صدارت کی تھی۔ اقبال میں بہت دل چسپی کا اظہار کیا گیا اور اس کے بعض اردو اور فارسی کے اشعار مجھ سے فرانسیسی ریڈیو کے لیے ریکارڈ کرائے گئے۔

۶- فرانس کے ریڈیو اسٹیشن پر ایک الوداعی تقریر (بہ زبان فرانسیسی) کنیڈا، ہندوستان اور B.B.C. کے لیے کانفرنس کے متعلق تقریریں نشر کیں۔

B.B.C. کے ہندوستانی پروگرام کے لیے اقبال کے متعلق دو تقریریں جن میں سے ایک کا عنوان ہے " اقبال حبِ وطن" اور دوسری کا " اقبال کی کہانی اقبال کی زبانی"۔

۷- یونسکو سکریٹریٹ کے ساتھ FUNDAMENTAL EDUCATION کے مسئلے پر تبادلۂ خیال اور اس کے متعلق تجاویز کی ترتیب۔

فرانس کا قیام بہت مصروف لیکن خوش گوار رہا۔ اس دوران میں چند آرٹ گیلریاں دیکھیں جو واقعاً بہت قابلِ قدر ہیں مثلاً LOMERE ورسیلز کی گیلری، ساں جرماں کا قدیم چیزوں کا عجائب خانہ جس میں وقت گزارنا بجائے خود ایک تعلیم ہے۔ ایک دو اسکول دیکھے جن کا کوئی خاص اثر نہیں پڑا۔ بہت سے لوگوں سے ملاقات ہوئی لیکن زیادہ تر بھاگ دوڑ اور رواروی کی ملاقات۔ ان کانفرنسوں میں بے ضابطہ میل جول کے لیے موقعے زیادہ ملنے چاہئیں۔ کانفرنس میں دو موقعوں پر خاصی سخن گسترانہ بات آپڑی تھی۔ ایک تو ڈائرکٹر جنرل کے انتخاب میں جہاں برطانیہ والے جولین ہکسلے کا تقرر چاہتے تھے (اور ہماری رائے میں بھی وہی سب سے زیادہ موزوں شخص ہیں) اور اہلِ امریکہ جنرل ہڈل کا اور چوں کہ وہ تمام بین الاقوامی جماعتوں کے خرچ کا سب سے زیادہ حصہ (تقریباً نصف) ادا کرتے ہیں لہٰذا انھیں اصرار یہ تھا کہ ہماری بات چلنی چاہیے۔ ایک موقع پر تو یہ اندیشہ تھا کہ شاید وہ کانفرنس کو چھوڑ نہ دیں۔ لیکن بالآخر دو ہفتے کی جدوجہد کے بعد معاملہ طے ہو گیا اور بجائے ۶ سال کے HUXLEY نے صرف دو سال کے لیے عہدہ قبول کیا۔ دوسری کش مکش بجٹ کے معاملے میں ہوئی جس میں برطانیہ والے اضافہ اور امریکہ والے کمی چاہتے تھے۔ اس میں بالآخر امریکہ کو کامیابی حاصل ہوئی۔ لیکن باندازِ شریفانہ کافی نوک جھونک رہی! میں نے آخری تقریر

میں ان پسِ پردہ کارروائیوں کی طرف ذرا لطیف انداز میں اشارہ کیا تھا جس سے لوگ خاصے محظوظ ہوئے کیوں کہ محسوس سب کرتے تھے لیکن اس پر تنقید کی ہمّت نہ کرتے تھے اور مجھے کون سا اہلِ امریکہ یا اہلِ برطانیہ سے کوئی خطاب یا عہدہ حاصل کرنا ہے!

ہندوستانی وفد میں ایک دل چسپ سوال یہ پیدا ہوا کہ آیا ان دعوتوں میں جو وفد کی طرف سے دی جائیں شراب ہو یا نہ ہو۔ راج کماری امرت کور اور میں نے مخالفت کی، ساجت اور ڈاکٹر بھابا تائید میں تھے۔ سر رادھاکرشنن نے ہمارا ساتھ دیا اور یہی طے ہوگیا لیکن بھابا نے (جو پارسی ہیں اور ذرا احساسِ کمتری کا شکار ہیں) اس فیصلے کے خلاف بہت احتجاج کیا اور کہا اس کی وجہ سے ہندوستان کی سبکی ہوگی وغیرہ۔ لیکن میں نے اس کے جواب میں یہ حرکت کی (راج کماری کے ساتھ مل کر) کہ تمام مہمانوں سے الگ الگ صورتِ حال اور اختلافِ خیال کا ذکر کرکے ان سے پوچھا کہ آیا ان کو شراب نہ ملنے کی وجہ سے کھانا ناپسند ہوا اور تقاضہ کیا کہ وہ صداقت کے ساتھ جواب دیں، مصلحت اور اخلاق کو بھول جائیں۔ ہر شخص نے کہا کہ تم نے جو کچھ کیا وہ ٹھیک کیا اور ہم خود اس بات سے خوش ہیں کہ کبھی کبھی سادگی کے ساتھ یعنی بغیر شراب کے کھانا کھانے کا موقع ملے! معلوم نہیں بعض لوگ اپنی تہذیب کو حقیر سمجھ کر خود اپنے نفس کو کیوں ذلیل کرتے ہیں۔

فرانس کے متعلق چند (سطحی) تاثرات

۱۔ اہلِ فرانس بہت خوش مزاج، خوش مذاق (دکانوں کی آراستگی ہی ملاحظہ ہو) اور مہذّب لوگ ہیں لیکن ان میں انگریزوں کی سی سیرت کی پختگی اور سیاسی تدبّر اور تنظیم نہیں۔ بہت سی پارٹیاں ہیں جن میں باوجود جزوی اختلاف کے بھی اتفاق یا اشتراکِ عمل نہیں ہو پاتا۔ اس لیے کوئی دیرپا حکومت نہیں قائم ہو سکتی۔

۲۔ جنگ کے بعد سے قیمتیں بہت بڑھ گئی ہیں۔ بڑے بڑے ہوٹلوں میں -/F550 یعنی کوئی -/۱۵ روپے سے کم میں ایک وقت کا کھانا نہیں ملتا (اگرچہ یونسکو کے ریسٹوراں میں معمولی کھانا -/F150 کا مل جاتا تھا اور بعض شہر کے ریسٹوراں وغیرہ میں کوئی -/F200 میں

وہ چیزیں مل جاتی ہیں) دوسری تمام قیمتیں بھی بہت زیادہ ہیں۔ ایک £ کے ۸۰۰ فرانک بنک کی شرح پر ملتے ہیں لیکن کالی منڈی میں پاؤنڈ کے ایک ہزار فرانک تک (سنا ہے) مل جاتے ہیں!

۳. فرانسیسی صنعت میں ایجاد اور تکلف کا مادّہ بہت ہے۔ ہوائی جہازوں سے لے کر معمولی روزمرّہ کی چیزیں اہتمام اور خوش مذاقی سے تیار کی جاتی ہیں۔ ان کے بنک نوٹ تک خوبصورت ہیں۔

۴. قوم جذباتی ہے اور جذبات کا کھلم کھلا اظہار کرتی ہے، برخلاف انگریزوں کے جو بہت ضبط کے پابند ہیں۔

۵. نسلی تعصب کم ہے۔ اکثر فرانسیسی عورتیں اور حبشی مردوں کی شادیاں ہو جاتی ہیں اور اسے بُرا نہیں سمجھا جاتا۔

لندن ۱۱ر کو واپس ہوا۔ ۱۲ر کو کیمبرج جاکر وہاں سے چند میل کے فاصلے پر ایک PEOPLES COLLEGE ہے (ایک گاؤں میں جس کا نام ہے "بوٹی شیم") اسے دیکھا۔ یہ ان کالجوں میں سے ہے جو ہنڈری مدرّس نے کیمبرج کے گرد و نواح میں قائم کیے ہیں اور جن میں سے سب سے مشہور غالباً "امپنگ ٹن" کا کالج ہے جس کا حال جوڈ نے اپنی کتاب ABOUT EDUCATION میں لکھا ہے۔ کالج کا مقصد یہ ہے کہ گاؤں کے لوگوں کے لیے مزید تعلیم اور تہذیبی مشاغل کے لیے سہولتیں بہم پہنچائی جائیں ان کے واسطے مختلف قسم کے کورس اور صنعتیں سکھانے کا انتظام ہو اور کالج گرد و نواح کی تہذیبی زندگی کا مرکز بن جائے۔ یعنی وہ کام جو میں رام پور کے عوام کے لیے کالج کے ذریعہ کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن بغیر اسلحہ جنگ کے لڑنا پڑتا ہے۔ ان وسائل کے مقابلے میں جو ان کالجوں کے پاس ہیں ہمارے پاس کچھ بھی نہیں! اس کالج کی ایک بہت عمدہ اور خوش سلیقہ عمارت ہے، سامان اور آلاتِ تعلیم ہیں۔ کتب خانہ ہے۔ صنعت و حرفت سکھانے کے کمرے ہیں۔ ایک بڑا ہال ہے جس میں موسیقی، ڈراما اور عام جلسے ہو سکتے ہیں۔ یہ کالج اردگرد کے پانچ سات گاؤں کے لیے مرکز کا کام دیتا ہے لیکن اسی پر اکتفا نہیں کرتا کہ لوگ اس کے جلسوں اور کورسوں میں شریک ہوں بلکہ خود اپنے پروگرام

فرداً فرداً ہر گاؤں میں پہنچاتا ہے۔ انگلستان کے نئے تعلیمی ایکٹ میں عوام کے کالج کی جو تجویز منظور ہوئی ہے وہ غالباً انھیں درسگاہوں کی مرہونِ منت ہے۔

لندن میں ۱۲/اور ۱۳/ کو نہایت سخت FOG تھی۔ اس قسم کی جسے کہا جاتا ہے کہ چاقو سے کاٹ سکتے ہیں! ریلیں، موٹریں آمدورفت کے دوسرے وسائل، ہوائی جہاز وغیرہ سب ایک حد تک معطل ہوگئے۔ مجھے ۱۴/ کو روانہ ہونا تھا۔ جہاز لندن سے نہ چل سکا پھر ہمیں بورن متھ لے گئے۔ وہاں بھی وہی حالت تھی۔ ۲۴ گھنٹے وہاں رہنا پڑا۔ ۱۴/ کو روانہ ہو سکے جس کی وجہ سے خاص کوفت ہوئی۔ لیکن ناچاری کا کیا علاج ؟ ایک شخص نے اخبار میں لکھا ہے کہ اگر سائنس داں ایٹم بم پر اپنی تمام قوت صرف کرنے کے بجائے اس کا عشرِ عشیر بھی FOG کو دور کرنے میں صرف کریں تو لوگوں کی زندگی پر کیسا خوش گوار اثر ہو۔

میرے لندن کے سہ روزہ قیام کے دوران میں جناح صاحب اور لیاقت علی خان وہاں تھے۔ جواہرلال واپس جا چکے تھے۔ اس عرصے میں پارلیمنٹ میں ہندوستان پر بحث بھی ہوئی جس میں ایک معنی خیزبات یہ تھی کہ مسٹر چرچل اور ان کی پارٹی کو ہندوستان کی تمام "پس ماندہ اقوام"، بالخصوص مسلمانوں اور ہریجنوں سے انتہائی محبت اور ہمدردی اظہار کا موقع ملا! اس التفاتِ فراواں کا کچھ سبب ان کے اس جملے سے معلوم ہوا کہ حکومتِ برطانیہ کو چاہیے کہ جو لوگ مملکتِ برطانیہ سے الگ ہونا چاہتے ہیں انھیں اس کا موقع ملنا چاہیے۔ معلوم ہوتا ہے چرچل کو یہ امید ہے کہ اگر پاکستان بن گیا تو وہ مملکتِ برطانیہ کا جزو بن کر رہے گا۔ جناح صاحب نے لندن میں ایک تقریر کی تھی جس میں پاکستان کا مطالبہ حسبِ معمول پیش کرنے کے بعد کہا کہ انگریز ذرا ذرا خوابِ گراں سے بیدار ہوکر اب ہندوستان کی اصلی حالت سمجھنے لگے ہیں۔

۱۷/ دسمبر

اس وقت دن کے ساڑھے دس بجے ہیں اور میں دہلی اور کراچی کے درمیان ہوائی جہاز میں ہوں۔ امید ہے کہ ۱۲ بجے کے قریب ہمارا جہاز دہلی پہنچ جائے گا خدا کرے سب عزیزوں کو بخیریت پاؤں۔ جامعہ کی جوبلی کا حال معلوم کرکے بہت خوشی ہوئی۔ وہاں جاکر

ذاکر صاحب وغیرہ کو مبارک باد دینی ہے۔

لندن سے واپسی کا راستہ : بورن متھ۔ مالٹا۔ قاہرہ۔ بصرہ۔ کراچی سنکلر کی نئی کتاب A WORLD TO WIN ختم کی! بالکل اپنے زمانے کے بارے میں اس قدر کامیابی کے ساتھ ایک "تاریخی ناول" لکھنا، اور اس قدر خوبی سے لکھنا بڑا کمال ہے!

قیامِ رام پور

۱۹۴۷

جنوری مجھے آخر دسمبر میں تعلیم بالغان کی کانفرنس کی صدارت کرنے کے لیے تری وندرم جانا تھا لیکن بعض مجبوریوں کی وجہ سے نہیں جا سکا۔ البتہ خطبۂ صدارت بھیج دیا تھا جو وہاں پڑھا گیا۔ اس میں تعلیم بالغان کے بعض خاص مسائل سے، خصوصاً اس کے وسیع تر تخیل سے بحث کی تھی اور ضمناً اس باہمی منافرت اور دشمنی کا ذکر کیا تھا جس کی وجہ سے ہندوستان میں نہ صرف زندگی بلکہ تہذیب اور اخلاق خطرے میں پڑ گئے ہیں اور اس کو تعلیم بالغان کا ایک جزو لازم قرار دیا تھا۔ لیکن کہیں ٹھیک بات کہنے سے تقدیریں پلٹتی ہیں؟

دہلی میں مارچ میں ایک ایشیائی اقوام کی کانفرنس ہو رہی ہے جس کی تنظیمی کمیٹی میں مجھے بھی رکھا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ تعلیم اور تہذیب کے تمام مسائل پر ایک میمورنڈم تیار کروں جو بحث و مباحثہ کی بنیاد بن سکے۔ کام بہت بڑا ہے اور وقت کم۔ بہرحال کوشش کر رہا ہوں کہ کچھ ہو جائے۔

کسی اخبار میں حال ہی میں یہ چھپ گیا ہے کہ مجھے صوبۂ سرحد میں بطور ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم بلوایا جا رہا ہے حقیقت صرف اتنی ہے کہ وہ چاہتے ہیں اور کچھ عرصے سے بہت اصرار کر رہے ہیں۔ اس کی وجہ سے بہت سے دوستوں کے خط آرہے ہیں اور جواب طلب خطوط میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ میں جواب میں امریکہ کے مشہور مصنف مارک ٹوین کی طرح یہی کہہ سکتا ہوں کہ جیسا اس نے اپنی موت کی خبر چھپ جانے پر کہا تھا کہ یہ ذرا مبالغہ آمیز ہے!

رام پور میں آج کل بجٹ سازی کا موسم ہے لیکن اس وجہ سے بہت کوفت ہے کہ ریاست کے پاس روپے کی کمی ہے اور تعلیم کے لیے ہر طرف روپیہ درکار ہے۔ یہاں نہ معقول عمارتیں،

نہ اچھی تنخواہ پانے والے اُستاد نہ کارکن اور کاروان دفتر اور بعض مقامی مجبوریوں کی وجہ سے کام کی چکی سست چلتی ہے. جس شخص کو اپنی عمر کی مدت کے متعلق کوئی خوش فہمی نہ ہو اور کام کرنے کی دُھن ہو اس کے لیے یہ دقتیں بہت روح فرسا ہیں!

فروری تا مارچ تا جون

اس عرصے میں ایشیائی قوموں کی کانفرنس دہلی میں ہوئی جس میں بطور ایک نمائندے کے میں بھی شریک ہوا. کانفرنس بہت پُر رونق اور کامیاب رہی اور سوائے جاپان اور ایک دو اور قوموں کے (جو کسی دقت کی وجہ سے نمائندے نہ بھیج سکیں) ایشیا کے تمام ملک شریک ہوئے اور اس میل جول کی بدولت ایک نیا ایشیائی اتحاد اور شعور کا جذبہ مستحکم ہوا. مسلمان نمائندوں کی تعداد بہت کافی تھی جن میں سے کئی روسی رپبلکوں کے نمائندے تھے. البتہ لیگ نے حسبِ معمول کانفرنس کو یہ کہہ کر بائیکاٹ کیا تھا کہ یہ محض کانگریس کا پروپگنڈا کرنے کا ذریعہ ہے. لیکن میرا خیال ہے کہ ان کا یہ اندیشہ غلط ہے. خود لیگ کو بار بار شرکت کی دعوت دی گئی تھی...... کانفرنس مختلف سکشنوں میں تقسیم تھی جس میں سے ایک سکشن (تعلیم، کلچرل اور سائنس) کی رپورٹ میں نے مرتّب کر کے پیش کی تھی......

اس عرصے میں رام پور کے کام کی مشکلات اور "محدودیت" بہت بڑھ گئی ہے اور وہاں دل لگاکر کام کرنا مشکل ہوگیا ہے. ساتھ ہی سرحد، آسام، سی. پی وغیرہ کی ڈائرکٹری پر بلایا گیا لیکن بوجوہ نہیں جا سکا. مرکز میں بحیثیت جوائنٹ سکریٹری محکمۂ تعلیم بلانے کی تجویز مولانا ابوالکلام آزاد کی تھی اور معاملہ تقریباً طے ہوگیا تھا لیکن کچھ تو دفتری ریشہ دوانیوں کی وجہ سے دیر ہوئی اور کچھ اس عرصے میں یہ سوال پیدا ہوگیا کہ آیا مرکز میں محکمۂ تعلیم رہے گا یا نہیں یا کیبنٹ مشن کی تجویز کی رو سے مرکز میں صرف تین محکمے رہیں گے اور باقی سب ختم کر دیے جائیں گے. اس وجہ سے وہ تجویز بن کر بگڑ گئی. (اس بدخطی کی وجہ یہ ہے کہ چلتی ریل میں یہ ڈائری لکھنے کی سعی لاحاصل کر رہا ہوں) اب بالآخر یہ طے پایا کہ میں حکومتِ بمبئی کے مشیرِ تعلیمات کی حیثیت سے کام کروں گا. گو رام پور کے قیام کے دوران

میں مجھے کام کی طرف سے اطمینانِ خاطر نصیب نہیں ہوا لیکن اس عرصے میں جو چند مفید کام کر سکا ان میں سے ایک تو استادوں کی تنخواہ کا اضافہ ہے جو رام پور کی مالی حالت کو دیکھتے ہوئے غنیمت ہے یعنی ابتدائی مدرسوں کے استادوں کی ابتدائی تنخواہ -/۱۱ اور -/۱۳ ماہوار سے بڑھ کر -/۴۰ ہوگئی C.T.'S کو ۴۰۰ کے بجائے -/۷۰ اور بی۔ ٹی کو -/۸۵ کے بجائے -/۱۱۰ سے -/۲۰۰ تک تنخواہ منظور ہوگئی۔ اس کے علاوہ استادوں کی سوشل حیثیت بڑھانے میں خاصی کامیابی ہوئی (جس کا بہت پرخلوص اعتراف انھوں نے اپنے الوداعی ایڈریس میں کیا) ایک ماڈل اسکول، ایک عوام کا کالج، استادوں اور بچوں کے مرکزی کتاب خانے، رسالہ تعلیم جدید کا اجرا اس زمانے کی خاص چیزیں ہیں جو خاصی کامیابی کے ساتھ چل رہی ہیں۔ (اگر میرے بعد بھی چلتی رہیں) میری توقع کے خلاف روانگی کے وقت محکمۂ تعلیم کے لوگوں نے اور عام پبلک اور حکومت نے کام کو کافی سراہا اور مجھے اپنے معیار کے مطابق تو کامیابی نہیں ہوئی لیکن ان کے نزدیک خاصی کامیابی ہوئی۔ اس کی شاید یہی وجہ ہو کہ میں نے تمام استادوں سے انسانوں کا سا سلوک اور مساوات کا برتاؤ رکھا اور جب ایک دفعہ دوسرے سول ملازمین کے ساتھ تنخواہوں کے معاملے میں استادوں کی ایسوسی ایشن نے ہڑتال کا ارادہ کیا تو (برخلاف دوسرے محکموں کے صدروں کے) میں نے بجائے تحریک کے لیڈروں کو دبانے اور ڈرانے کے ان کو بلاکر چاء پلائی اور ان کے ساتھ سکونِ خاطر کے ساتھ تمام معاملات میں گفتگو کی چنانچہ وہ مطمئن ہوگئے اور ہڑتال نہیں ہوئی۔ اسی طرح جب روانگی سے پہلے میں نے اپنے تمام کلرکوں اور چپراسیوں کو چاء کی دعوت دی (جو ایک معمولی بات تھی اور مجھے اس سے پہلے کرنی چاہیے تھی اور سب کو کرنی چاہیے) تو اسے رام پور کی تاریخ کا ایک انقلابی واقعہ سمجھا گیا!

یہ زمانہ ہندوستان کی تاریخ کا بہت اہم زمانہ رہا ہے۔ اس عرصہ میں لارڈ ویول وائسرائے کی حیثیت سے ناکام ہوکر واپس گئے اور ان کے بجائے ماؤنٹ بیٹن وائسرائے ہوکر آئے۔ حکومتِ برطانیہ نے اعلان کیا کہ وہ ۱۵/جون ۴۸ ۱۹ء سے پہلے ہندوستان کو آزادی دے کر چلی جائے گی اور تفویضِ اختیارات کا کام فوراً سپرد کر دیا جائے گا۔ لیکن اس امر پر کوئی اتفاق رائے ہندوؤں اور مسلمانوں میں نہیں ہو سکا کہ اختیارات کس کو سونپا جائے! بالآخر

لیڈروں سے مفصل مشورہ کرنے کے بعد یہ طے پایا کہ ہندوستان کو دو حصّوں میں بانٹ دیا جائے اور جناح صاحب کی پاکستان کی اسکیم اس ترمیم کے بعد منظور ہوگئی کہ اس میں سے پنجاب اور بنگال کے وہ علاقے جس میں ہندوؤں کی اکثریت ہے خارج کر دیے جائیں۔ چناں چہ آج کل اسی "تقسیم جائداد" کی تفصیلات طے ہو رہی ہیں۔ ہندو بہت خفا اور بدظن ہیں اور ان میں مخالفت اور تعصب کے جذبات بڑھ رہے ہیں۔ مسلمان خوش ہیں لیکن ساتھ ہی یہ اندیشہ ہے کہ نہ معلوم ان کے اقلیتوں کے ساتھ ہندوؤں کے صوبوں میں کیا سلوک ہو۔ حالات کو دیکھتے ہوئے مجھے یہ اندیشہ ہے کہ کم سے کم فی الحال یہ سلوک اچھا نہ ہوگا اور مسلمانوں کو اس فیصلے کی وجہ سے فائدے کی نسبت نقصان زیادہ ہوگا۔ یہ چیز بعض لوگوں کو مدت سے نظر آرہی تھی لیکن ان کو غدار یا ہندو دوست کہہ کر چپ کرادیا گیا اور اب یہ فیصلہ ہوگیا ہے جس کی رو سے ہندوستان کے مسلمان پاکستان کے ہندوؤں سے کہیں زیادہ کمزور اور بے بس ہوں گے لیکن بہرحال جو بستر تیار کرے گا اسی میں اسے سونا پڑے گا! اب ضرورت اس بات کی ہے کہ معاملات کی سمجھ رکھنے والے لوگ ہندوستان کے مسلمانوں کی سیاست کو ایک نئے رُخ پر ڈالیں اور بجائے ان کی ایک کمزور اقلیت بنانے کے ان کو دوسری جماعتوں کے ترقی پسند حلقوں سے ملا کر سیاسی کام کریں۔

قیامِ بمبئی

۱۹۴۷

۱۳ جون

میں نے اس عرصے میں دو اُردو کی کتابیں ترتیب دی ہیں " آندھی میں چراغ" جس میں ادبی، قومی، ذاتی اور اقبالی مضامین کا مجموعہ ہے اور " استادوں سے خطاب" جس میں تعلیمی مضامین ہیں۔ انگریزی میں بھی دو کتابیں تقریباً مرتب ہوچکی ہیں لیکن ابھی آخری شکل میں نہیں آئیں۔ ایک میں آسٹریلیا کے لکچروں کا مجموعہ ہے اور دوسری میں ان تعلیمی مضامین کا جن کا تعلق زیادہ تر تعلیم اور سماج کے باہمی تعلق سے ہے۔

آج زندگی کا ایک اور باب شروع ہوتا ہے۔ میں کل بمبئی پہنچا اور آج اپنے نئے عہدہ کا چارج لینے پونا جارہا ہوں جہاں مجھے حکومت بمبئی کا مشیر تعلیمات مقرر کیا گیا ہے۔ دیکھنا

ہے کہ اس کام میں توفیقِ الٰہی سے کیا کامیابی حاصل ہوتی ہے۔ یہ ماحول ایک حد تک نیا ہے اور کام کی نوعیت بھی مختلف ہے لیکن بہرحال رام پور کی طرح ایک CUL DE SAC نہیں ہے اور کام میں وسعت اور فراخی ہوگی۔ شاید بحیثیت مجموعی یہ بھی اچھا ہی ہے کہ میرا کام براہِ راست محکمۂ تعلیم کا تفصیلی انتظام نہیں ہوگا جس کے لیے وہاں ایک عہدہ .D.P.I کا موجود ہے بلکہ تعلیمی اسکیمیں بنانا اور تعلیم کی اصلاح اور اشاعت کی تجویزیں تیار کرنا ہوگا۔ اس طرح سوچنے، غور کرنے کا بہتر موقع ملے گا اور غیر ضروری "دستخط بازی" میں وقت صرف نہ ہوگا!۔

جولائی کے شروع میں مجھے ایک ہفتہ کے لیے شملہ جانا پڑا جہاں بنیادی تعلیم اور یونسکو کمیشن کے سلسلے میں دو کمیٹیاں تھیں۔ ممبروں میں ذاکر صاحب بھی تھے اور ہم دونوں مولانا کے ہاں ٹھیرے تھے۔ ان کے ساتھ ہفتے بھر کا یہ قیام ایک نعمت تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کے ہندوؤں اور مسلمانوں میں (شاید دو تین آدمیوں کے سوا) کوئی ان کی ٹکر کو نہیں پہنچتا۔ ان میں علاوہ اور خوبیوں کے معلّم کی تمام صفات ہیں اور عام معلّموں کی تنگی اور خشکی سے وہ بہت دُور اور بلند ہیں۔ مثلاً ان کے ساتھ ایک نوکر تھا۔ اس سے حساب لیتے تھے تو اسی انداز اور نیت سے کہ اس کو ٹھیک ٹھیک حساب رکھنا آجائے۔ اس کو سمجھاتے تھے کہ کسی نئی جگہ جاؤ تو اس کا مطالعہ کرو، وہاں کی تصویریں جمع کرو، کوئی خاص چیز (مقامی صنعت کی) خرید سکتے ہو تو خریدو۔ ان کی صحبت ایک چشمۂ فیض ہے جس سے ہر کوئی مستفید ہوتا ہے۔ کمیٹیوں میں کچھ زیادہ کام نہیں ہوا۔ یہ کمیٹی کا دستور بھی اچھا چلا ہے۔ چند لوگ بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں، کچھ ضروری، کچھ بے کار کہتے ہیں اور اس کے بعد دفتر ایک رپورٹ تیار کر دیتا ہے جس کو شائع کرنے کے بعد داخل دفتر کر دیا جاتا ہے اور کام کچھ بھی نہیں بنتا! دراصل لاکھ کلیم سر بجیب، ایک کلیم سربکف!۔

پونا میں ایک روز مولوی سر رفیع الدین سے ملاقات ہوئی۔ اب تو بہت بوڑھے ہوگئے ہیں لیکن ایک عرصہ تک حکومت اور سیاست میں کافی دخیل رہے ہیں۔ ابّا میاں کے ہم عصر ہیں مسلمانوں کی سیاست کے پُرانے قصّے بہت دل چسپ انداز میں سناتے رہے ابّا میاں کی

تقریر اور قابلیت کی بہت تعریف کرتے تھے۔ ضمناً یہ قصہ سنایا کہ ۱۹۰۶ء میں جب لارڈ کرزن کے پاس مسلمانوں کی طرف سے وفد گیا تھا تاکہ جداگانہ انتخاب کا مطالبہ کرے تو اس کی سرکردگی آغا خاں کو مجبوراً آخری وقت میں سپرد کی گئی تھی اور اس مطالبہ کے تعین میں نہ ان کا کوئی ہاتھ تھا، نہ انگریزوں کا بلکہ وہ مسلمانوں کا ایک از خود کا مطالبہ تھا۔ میں نے اس بارے میں اس سے مختلف روایت بھی کئی جگہ پڑھی اور سنی ہے لیکن وہ بہت وثوق سے اور ذاتی تجربے کی بنا پر بیان کرتے تھے کہ ایسا ہی ہے۔ اس قسم کی رائے محمد اکرام صاحب کی ہے جو موجِ کوثر، شبلی نامہ وغیرہ کے مصنف اور پونا میں رجسٹرار کوآپریٹو سوسائٹیز ہیں۔ ذہین آدمی ہیں اور ادبی مطالعہ بہت اچھا ہے۔ شبلی نامہ میں انھوں نے (غالباً خلوصِ نیت لیکن غیر شعوری تعصب کی بنا پر) شبلی کو DEBUNK کیا ہے اور لیٹن سٹریچی اور بعض جدید مغربی سوانح نگاروں کے انداز میں ان کی تحلیلِ نفسی کی کوشش کی ہے۔ ان کا نظریہ یہ ہے کہ شبلی دراصل آرٹسٹ تھے۔ مولانا خوامخواہ بن بیٹھے تھے اور ان کے آرٹسٹ مزاج اور (دعائے تقدس اور مولویت میں ہمیشہ جنگ رہی!) وہ سرسید کے بہت قائل ہیں۔ مولانا طفیل احمد، سلیمان ندوی، شبلی اور دوسرے "قوم پرست" مسلمانوں کے خلاف ہیں۔ پاکستان میں مسلمانوں کی نجات اور سرسید کی پالیسی میں پاکستان کی ابتدا بتاتے ہیں...... ان سے اور عابد صاحب سے خوب خوب بحثیں رہیں۔ ان کا خیال یہ بھی ہے کہ پاکستان میں بہت بڑی تعداد ایسے نوجوانوں اور سرکاری حکام کی ہے جو اقبال کے فکر اور شاعری سے بہت متاثر ہوئے ہیں اور وہ پاکستان میں بڑے خلوص اور جوش سے تعبیرِ ملت اور اقبال کے خواب کو عملی جامہ پہنانے کا کام کریں گے۔ خدا کرے ایسا ہو مگر مجھے تو بہت شبہ ہے!

۲۰/اگست

بمبئی پہنچے ہوئے اب تقریباً تین ماہ ہو چکے ہیں۔ اس عرصے میں ہندوستان میں بڑی بڑی تبدیلیاں ہو گئیں۔ ۱۵/اگست سے ہندوستان آزاد ہو گیا ہے اور اب اسے ایک DOMINION کا پورا مرتبہ حاصل ہے۔ یہ وہ آزادی تو نہیں جس کے لیے ہندوستان نے جدوجہد کی تھی لیکن

اس کی طرف ایک بہت بڑا قدم ضرور ہے۔ انگریزوں نے آخری وقت میں اپنے تدبر اورمعاملہ فہمی کا ثبوت دے کر گزشتہ سو برس کی زیادتیوں کی (گویا) تلافی کردی اور آج عام طور پر ان کی طرف سے جس قدر اچھے تاثرات ہیں ہندوستان میں پہلے نہیں ہوئے تھے۔ اس وجہ سے یہ بھی امکان ہے کہ فی الحال ہندوستان اور پاکستان دونوں مملکتِ برطانیہ میں شامل رہیں جو برطانوی سیاست کی ایک بڑی جیت ہوگی۔ لیکن اس کی ایک اور جیت اور ہندوستانیوں کی ایک بہت بڑی ہار یہ بھی ہے کہ نہ صرف ہندوستان تقسیم ہوگیا بلکہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات آج کل اس قدر خراب ہیں جس قدر کبھی پہلے نہیں ہوئے تھے اور ملک بھر میں قتل اور خون کا بازار گرم ہے جس کی وجہ سے شرم کی بدولت سر اٹھانے اور آنکھ ملانے کا یارا نہیں! خصوصاً مشرقی اور مغربی پنجاب میں اس قدر کشیدگی ہے اور ہندو اور مسلمان اس قدر بے دردی اور حیوانی جذبات کے ساتھ ایک دوسرے کو تباہ کر رہے ہیں کہ ملک میں سول جنگ کی کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔ میں نے ۱۵/اگست کو بمبئی کرانیکل کے خاص آزادی نمبر کے لیے ایک مضمون میں لکھا تھا کہ جب تک ہم اپنے میں وہ صفات پیدا نہیں کریں جو آزادی کو نباہنے اور قائم رکھنے کے لیے ضروری ہیں اس وقت تک اس آزادی کا کوئی خاص فائدہ نہیں ہوسکتا۔ بات بدیہی سی ہے لیکن روز بروز اس کی واقعیت کا احساس اور گہرا ہوتا جاتا ہے۔ لوگوں میں آزادی کے مل جانے کی وجہ سے جوش اور خوشی بہت ہے (اس کا ثبوت اس زبردست اور شاندار مظاہرے سے ملتا ہے جو ۱۵/ سے ۱۷/ تک بمبئی میں ہوا اور جس کی رو میں کم سے کم اس وقت ہندو مسلم نفرت اور تعصب بھی ایک دفعہ کو بالکل ختم ہوگیا) لیکن اس سے بھی زیادہ نفسی گتھیاں اور مادی مشکلات ہیں جن کی وجہ سے لوگ بہت پریشان ہیں اور جن کو دُور کرنا تعلیم اور سیاست کا مشترکہ کام ہے۔ بنگال میں مہاتما گاندھی نے سہروردی کے ساتھ مل کر ہندو مسلم مفاہمت کے سلسلے میں ایک معجزہ سا کر دکھایا ہے۔ وہ جاکر ایک مسلمان کے گھر میں ایک ایسے محلے میں ٹھیرے ہیں جہاں سخت بلوہ ہوا تھا اور بہت کشیدگی تھی لیکن ان کی ذاتی کوشش اور اثر سے وہاں کی فضا دفعتاً اس قدر بدل گئی ہے کہ یقین نہ ہوسکتا تھا۔

واقعہ یہ ہے کہ آج کل ہندوستان میں انصاف اور معقولیت کا راستہ دکھانے کی توقع صرف دو شخصوں سے ہوسکتی ہے ایک مہاتما گاندھی اور دوسرے جواہرلال نہرو۔ یہ سچی بات کہنے سے چوکتے نہیں اور عام تعصب سے بلند ہیں۔ مولانا آزاد بھی اس سلسلے میں بہت بڑا کام کر سکتے تھے لیکن تقسیمِ ہندوستان کی وجہ سے مسلمانوں کی پوزیشن میں جو کمزوری پیدا ہوئی ہے اس کا اثر لازمی طور پر ان کی پوزیشن پر بھی پڑتا ہے۔ کم سے کم میرا یہ خیال ہے اور اس وجہ سے کانگریس کی پالیسی پر وہ اس طرح اثر نہیں ڈال سکتے جس طرح اب سے پہلے کر سکتے تھے۔ اور یہ ایک بڑا سیاسی اور تمدنی سانحہ ہے۔

رام پور میں گزشتہ ماہ ایک قیامت گزر گئی۔ ریاست کے ہندوستان میں شامل ہونے کی وجہ سے لوگوں نے احتجاج اور شورش کی اور عاقبت ناشناس خودغرضوں نے اس سے فائدہ اٹھاکر نہ صرف سخت بد امنی کی فضا پیدا کر دی بلکہ فرقہ وارانہ تعصب سے کام لے کر رام پور کے شیعوں کے بہت سے مکان جلا دیے گئے بعض سرکاری عمارتیں جلا دیں اور زیدی صاحب کے خلاف بہت کچھ زہر اگلا۔ صورتِ حال اس قدر خراب ہوئی کہ ریاست کو باہر سے (یعنی حکومت ہند سے) فوج کی امداد لینی پڑی۔ تب جاکر وہاں کچھ امن وامان قائم ہوا۔ اس مظاہرے کی وجہ سے ایک طرف تو مسلمانوں کی پوزیشن ریاست میں زیادہ خراب ہوگئی اور دوسری طرف اس بات کا افسوس ہے کہ زیدی صاحب کی پندرہ سالہ خدمات کا وہاں کے "نکتہ نواز" لوگوں نے یہ بدلہ دیا۔ جب کسی قوم میں سے انصاف کی روح جاتی رہے اور وہ حق و باطل میں اور سود و زیاں میں تمیز نہ کریں یعنی ان کا احساسِ قدر بگڑ جائے تو اس کے سنبھلنے کی کیا صورت ہوسکتی ہے ؟ !

اس عرصے میں نئے کام کی تنظیم کی کوشش کر رہا ہوں۔ اس میں قباحت ایک یہ ہے کہ EDUCATION و PLANNING میں ایک قسم کی خلیج حائل ہے یعنی تجویزیں مرتب کرنا، ان کی تنقید وغیرہ میرے سپرد ہے لیکن ان کو عملی جامہ پہنانے کا کام D.P.I. کا ہے۔ اس کی وجہ سے میرا کام مقابلتہً آسان ہے اور اس کا بار بہت زیادہ نہیں لیکن آسانی کون بے وقوف چاہتا ہے! مجھے تو وہ شکل پسند ہے جس کو حل کرنے کے لیے پوری قوت صرف کرنے کی ضرورت ہو۔ لیکن امید

ہے کہ بعض جدید تجاویز جو میں نے مرتب کی ہیں ان کی منظوری کے بعد کام میں اضافہ ہوگا۔

۲۱ر اگست

آج بمبئی جاکر صابرہ کو جہاز میں سوار کرایا۔ اسے تعلیم کے فن کا مطالعہ کرنے کے لیے حکومت ہند سے وظیفہ ملا ہے اور وہ امریکہ جارہی ہے۔ باجی نے بہت ہمت کی کہ اس کو جانے کی اجازت دے دی۔ اس کے جانے کا رنج سب کو ہے لیکن اس بات کی خوشی رنج سے زیادہ ہونی چاہیے کہ خدا نے اس کو ایسی قابلیت دی کہ محض اپنے بھروسے پر، بغیر کسی سفارش یا اثر کے اس کو وظیفہ مل گیا اور اس کی طبیعت میں اتنی سلامت روی اور صلاحیت ہے کہ اُسے تنہا اس دور دراز کے سفر پر بھیجا جاسکتا ہے۔ خدا اسے بخیریت واپس لائے۔ اس کی ذات سے بہت توقعات ہیں۔

صابرہ ۲۱ر کو بمبئی سے انگلستان روانہ ہوگئی اور وہاں سے امریکہ جائے گی۔ باجی نے بہت بہت ہمت کی کہ جانے دیا۔ اس کو بہت شاندار طریقے سے "وداع" کیا گیا۔ باجی، بچیاں، ہم سب لوگ پونا سے، باچھو، مجی وغیرہ سب اسے چھوڑنے گئے تھے۔ مجھے اس کی سلامتیِ طبع اور سمجھ داری سے امید ہے کہ وہ وہاں سے کامیاب اور تعلیم سے پوری طرح مستفید ہوکر واپس آئے گی۔ انشاء اللہ۔

میں نے گزشتہ چند ہفتوں میں اپنی تقریروں اور مضامین کا ایک انگریزی مجموعہ EDUCATION FOR INTERNATIONAL UNDERSTANDING کے نام سے مرتب کیا ہے جس میں میری آسٹریلیا کی تقریریں اور براڈ کاسٹ اور پیرس کانفرنس کی چند تقریریں شامل ہیں جن کا مرکزی موضوع یہ ہے۔ وہ مسودہ باچھو کو سپرد کرکے آیا ہوں تاکہ وہ اس کی طباعت کا انتظام کرے۔

آج میں کسی کام سے سکریٹریٹ گیا تو معلوم ہوا کہ حکومتِ ہند سے حکومتِ بمبئی کو تار اور ٹیلی فون آیا ہے کہ چین کی بنیادی تعلیمی کانفرنس REGIONAL STUDY CONFERENCE ON FUNDAMENTAL EDUCATION کے لیے مجھے نمائندہ منتخب کیا گیا ہے اور مجھے ۲۵ تک دہلی

پہنچ جانا چاہیے۔ لیجیے پھر ایک غیر ملکی سفر درپیش ہے۔ عزیز نے حسبِ معمول ہمت سے کام لے کر مجھے جانے کی اجازت دیدی ہے گو میں خود مذبذب ہوں کہ وہ اکیلی بہت گھبرائیں گی۔ لیکن ان کو بیک وقت ایمان روکتا ہے اور کفر کھینچتا ہے اور بالآخر وہ کفر کے ہاتھوں مجبور ہو کر (یعنی میری بھلائی کے خیال سے!) جانے دیتی ہیں! چناں چہ بہت جلدی اور رواروی میں انتظام کر کے روانہ ہونا ہے۔

سفرِ چین

۱۹۴۷

۲۴ اگست

آج رات کو اظہر کے ساتھ پونا سے بمبئی جاؤں گا اور کل صبح کو ہوائی جہاز سے دہلی۔

دہلی پہنچ کر معلوم ہوا کہ ابھی بدقسمتی سے تین دن ٹھیرنا پڑے گا۔ جہاز کی روانگی میں تاخیر ہے۔ چناں چہ ۲۸ تک ٹھیرنا ہوا۔ اس عرصے میں مولانا، پنڈت جواہرلال، ذاکر صاحب، گوپالاسوامی وغیرہ سے ملاقات ہوئی۔ سب سے زیادہ "سنسنی خیز" خبر یہ معلوم ہوئی کہ جالندھر کے اسٹیشن پر ذاکر صاحب تقریباً شہید ہو گئے تھے (بعض ہندو اور سکھ غنڈوں کے ہاتھوں جو ہر مسلمان کو تیغ کے گھاٹ یا بندوق کی گولی کے پار اُتارنا اپنا فرض سمجھتے ہیں) لیکن پھر ایک سکھ کپتان نے اپنی جان پر کھیل کر ان کی جان بچائی۔ ملّتِ اسلامی اور ملکِ ہند کی عزیز ترین ہستی (اور بعض لحاظ سے افضل التفضیل کا یہ صیغہ استعمال کرنا بالکل جائز ہے) اگر اس طرح ہاتھ سے جاتی رہتی تو کیا نتیجہ ہوتا! تصور سے دل کانپتا ہے۔ ملک کی حالت کا صحیح اندازہ کسی واقعہ سے اتنا نہیں ہوا جتنا اس واقعہ سے جس کے ساتھ دل کا قریبی تعلق ہے۔ اگر یہی صورتِ حال رہی تو زندگی بے کار ہے۔ دہلی میں بھی اس عرصے میں عام خبر تھی کہ مغربی پنجاب سے جو پناہ گزیں آئے ہیں اور جنھوں نے واقعاً بڑی مصیبتیں اُٹھائی ہیں وہ ٹھیک اور غلط اور مبالغہ آمیز بیانات سنا سنا کر لوگوں کے جذبات کو بھڑکاتے ہیں اور اس کی وجہ سے پھر ہندو مسلمانوں میں کشیدگی بڑھ رہی ہے اور نہ معلوم کب بارود میں چنگاری جا پڑے (یہی حال مغربی پنجاب

کا ہے جہاں مشرقی پنجاب کے پناہ گزیں جارہے ہیں) گوپالا سوامی کی گفتگو سے معلوم ہوا کہ جواہرلال کی ان کے دل میں بڑی قدر اور عزت ہے اور چوں کہ وہ ایک مردم شناس آدمی ہیں اس لیے ان کی اس تائیدی رائے کو سُن کر مجھے خوشی ہوئی۔

۲۸؍اگست تا ۲؍ستمبر

کلکتہ ۲۸؍کو ہوائی جہاز سے پہنچا۔ معلوم ہوا کہ حکومتِ ہند نے اپنی قابلیت سے ہوائی جہاز کے انتظامات اتنی دیر میں شروع کیے کہ ۲؍سے پہلے جگہ نہیں مل سکتی! B.O.A.C کے جہاز میں جو ۳۰؍کو جارہا ہے مطلق جگہ نہیں ہے۔ C.N.A.C. یعنی چینی کمپنی کے جہاز میں جانا ہوگا۔ وہ بھی اچھا بڑا جہاز ہے جس میں چار انجن ہیں یعنی SKY MASTER چناں چہ اس میں سیٹیں بک کرلی ہیں اور ۲؍کی صبح تک کلکتہ میں تضیع اوقات کرنی ہوگی میرے ساتھ دوسرے ڈیلیگیٹ ڈاکٹر جھا ہیں جو C.P. میں ڈائرکٹر ہیں اور ایک قابل، شریف اور نیک آدمی ہیں۔ ہم دونوں گرینڈ ہوٹل میں جاکر ٹھیرے۔

گاندھی جی آج کل یہاں ہیں۔ ان سے جاکر ملاقات کی۔ بہت تپاک سے ملے۔ دیر تک باتیں کرتے رہے (لیکن دانتوں کے نہ ہونے کی وجہ سے ان کی بات اب پوری طرح سمجھ میں نہیں آتی!) ہم نے کانفرنس کے لیے پیغام مانگا۔ کہا کہ بس تم نے تو میری باتیں تعلیم کے متعلق سنی ہیں انھیں سے پیغام نکال لینا۔ (چناں چہ ایسا ہی کیا!) پنجاب کی حالت سے بہت پریشان اور افسردہ اور بنگال کی حالت سے کافی مطمئن تھے۔ کہتے تھے کہ "بھول جانا" فطرت کا ایک بہت بیش قیمت عطیہ ہے۔ ضرورت ہے کہ ماضی کی باتیں ہندو اور مسلمان دونوں بھول جائیں۔ گاندھی جی نے کلکتہ میں اپنی تقریر میں مندرجہ ذیل الفاظ استعمال کیے! حیثیت، تونگر، گنجائش، نتیجہ، غلطی، حق، محبت، برداشت، حکومت، سلطنت، زمانہ، تنگ، سوال، کوشش، حاکم، مخمل، ریشم، ثواب، انتظام، آزادی، انسان، آرام، غسل، طاقت، مجمع، دشمن، موقع، بدمعاش، شیطان، مذہب، جاہل، کافر، اثر، بے وقوف۔ کلکتہ میں انھوں نے واقعاً ایک معجزہ کر دکھایا ہے۔ ایک مسلمان کے گھر میں رہتے ہیں۔ سب سے ملتے ہیں۔ ان کی وجہ سے کلکتہ میں بڑا امن

اطمینان ہے ورنہ یہاں بھی پنجاب کی سی حالت ہوتی۔ لوگوں نے گاندھی جی پر وقتاً فوقتاً بڑے اعتراض کیے ہیں لیکن بات یہ ہے کہ وہ بہت بڑے آدمی ہیں اور آج بھی اگر کوئی آدمی حق بات ڈنکے کی چوٹ کہہ رہا ہے (خواہ ہندو اس سے ناراض ہوں یا مسلمان) تو وہ گاندھی جی ہیں۔ ان سے ہر قسم کے لوگ ملنے آتے ہیں۔ چناں چہ ہم سے ایک روز پہلے چرچل کے صاحبزادے رین ڈولف بڑی دیر تک رات کے وقت باتیں کرتے رہے۔ پوچھتے تھے کہ ہندوستان برٹش مملکت میں شامل رہے گا یا نہیں۔ گاندھی جی نے کہا میں کیا جانوں!

۱۳ کی شام کو کلکتہ کے بہت سے مسلمان تاجروں نے مل کر گاندھی جی کے اعزاز میں ایک بڑی پارٹی دی (ہمارے ہوٹل ہی میں) جہاں کئی سو ہندو مسلمان، سکھ جمع ہوئے۔ تقریریں نظمیں، رقص اور ورزش کے نمونے دکھائے گئے۔ گاندھی جی کو ایک تھیلی مسلمانوں نے پیش کی تاکہ اس کی رقم سے وہ مندروں کی مرمت کرائیں۔ اس موقع پر سہروردی بھی (جو آج کل گاندھی جی کی پرچھائیں بنے ہوئے ہیں) موجود تھے۔ انھوں نے تین تقریریں (اُردو، انگریزی، بنگالی میں) کیں اور ایک گاندھی جی نے جس میں انھوں نے ایک کروڑ کی اپیل کی اور کہا کہ تاجر یہ رقم جمع کریں (زیادہ تر ہندو تاجر) تاکہ اس سے جو لوگ مصیبت زدہ اور بے گھر ہو گئے ہیں ان کی مدد کی جائے۔ میں نے خاص طور پر یہ غور کیا کہ وہ بالکل سیدھی اور صاف (اگرچہ ذرا اُکھڑی اُکھڑی) اُردو ہی بولتے ہیں اور اس کو ہندوستانی کہتے ہیں اور برخلاف ہندو لیڈروں کی عام روش کے بہت سے فارسی اور عربی کے لفظ بے تکان استعمال کرتے ہیں۔ میں نے ان میں سے بعض الفاظ کو ساتھ ساتھ لکھ لیا تھا۔ وہ اس سے سابق کے صفحے پر سب سے نیچے لکھے ہوئے ہیں۔ جو لوگ اُردو یا ہندوستانی میں سے اسی قسم کے لفظ نکالنا چاہتے ہیں انھیں گاندھی جی کے اس طریقے سے سبق لینا چاہیے۔

یکم کو بنگال کے گورنر راجا گوپالا چاری سے ملاقات کی۔ قابل اور ذہین آدمی ہیں گو اب ذرا عمر کا اثر معلوم ہونے لگا ہے...... آج یہ معلوم کرکے بہت افسوس اور پریشانی ہوئی کہ گزشتہ شب کو بعض ہندوؤں نے گاندھی جی کے مکان پر حملہ کیا اور اس کو بہت نقصان پہنچایا۔ ان کا گناہ یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کا اعتماد اور ان کی دوستی حاصل کرنا کیوں چاہتے ہیں اور سہروردی کے

ساتھ مل کر کیوں کام کر رہے ہیں! ان عاقبت ناشناسوں کو یہ اندازہ نہیں کہ وہ اسی طرح ہندوؤں، مسلمانوں اور سارے ہندوستان والوں کی خدمت کر سکتے ہیں ورنہ آج کل جو حالات ملک میں ہیں اگر وہ یوں ہی رہے تو ملک جنون کی منزل سے ہو کر تباہی کی منزل سے جا لگے گا. بلکہ میرا خیال تو یہ ہے کہ اگر گاندھی جی اب سے پہلے یہ پالیسی اختیار کرتے اور اپنی تمام تر کوشش اس امر پر صرف کرتے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں مفاہمت ہو جائے تو شاید موجودہ صورت پیدا ہی نہ ہوتی ...... لیکن ایسا نہ کرنے یا کر سکنے کی بہت سی وجہیں تھیں اور ایک طرح سے اس تعصب اور جنون کے دور میں اس کارِ خیر پر اپنی جان کی بازی لگانا زیادہ تعریف کا اور دل گردے کا اور زیادہ (تر) آفریں کام ہے ...... جن کمینے لوگوں نے یہ حرکت کی گو وہ کلکتہ کی جدید تحریکِ مصالحت کے خلاف تھے اور بدامنی میں اپنی عافیت اور مالی اور سیاسی فائدہ سمجھتے تھے. چناں چہ ان کا مطلب حاصل ہو گیا اور معلوم ہوا ہے کہ آج کلکتہ میں جا بجا جھگڑے بھی ہوئے اور عام کش مکش اور پریشانی کی فضا پیدا ہو گئی ہے. یعنی ذرا سی دیر میں ان لوگوں نے گاندھی جی کا بنا بنایا کام (بظاہر) بگاڑ کر رکھ دیا ہے.

۲؍ ستمبر کلکتہ سے روانگی

ہم لوگ آج صبح سویرے کلکتہ سے ایک SKY MASTER میں روانہ ہوئے. جہاز $4\frac{1}{2}$ بجے صبح کے روانہ ہوا (ہوٹل سے $2\frac{1}{2}$ بجے چلنا پڑا!) دس بجے کے قریب کن سنگ پہنچے جو ایک پُر فضا پہاڑی مقام ہے، کوئی ۵ یا ۶ ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے. یہاں ایک گھنٹے کے قریب ٹھیرے. ایک چھوٹے سے کمرے میں (جو چنداں صاف نہ تھا) دوپہر کا کھانا کھایا جس کی زیادہ تعریف نہیں کی جا سکتی اور وہاں سے ہانگ کانگ کے لیے روانہ ہوئے. ہمارے ساتھ ایک ہندوستانی پارسی خاندان، ایک بمبئی کے تاجر، چند یوروپین اور چند چینی ہیں. پارسی (پاردے) شنگھائی میں تجارت کرتے ہیں اور اچھے آدمی معلوم ہوتے ہیں. لیکن اس قدر کم وقت میں اپنے ہم سفروں سے زیادہ مراسم قائم کرنے کا موقع نہیں ہوتا. جہاز میں دو AIR HOSTESSES ہیں لیکن ان میں وہ مستعدی اور کارکردگی معلوم نہیں ہوتی جو انگریز یا ٹاٹا کمپنی کی

ہندوستانی HOSTESSES میں ہوتی ہے۔

شام کے ۵ بجے کے قریب ہم ہانگ کانگ کے اُوپر پہنچے لیکن نیچے نہیں اُتر سکے کیوں کہ موسم خراب تھا چناں چہ جہاز کینٹن (CANTON) جاکر اُترا۔ ہانگ کانگ میں ایک خاص بات یہ دیکھی کہ وہاں زمین سے بہت زیادہ ہر طرف پانی ہی پانی ہے۔ دریا، نہریں، جھیلیں، تالاب۔ معلوم ہوتا ہے کہ وینس کا شہر ہے۔ لیکن اس کو نیچے سے نہیں دیکھ سکے۔ ۶ بجے کے بعد کینٹن پہنچے جہاں ایک نہایت خراب سے ہوٹل میں (جو ہوائی جہاز کے اڈے ہی پر بنا ہوا ہے دو پیالیاں چائے کی پیں جن کی قیمت ۸ ہزار ڈالر (یعنی ایک روپیہ کے قریب!) دینی پڑی چین میں آج کل اس قدر INFLATION ہے کہ چینی ڈالر کی قیمت بالکل ختم ہوگئی ہے ہزار ڈالر سے کم کے تو نوٹ بھی نظر نہیں پڑتے اور ہر شخص جس کے پاس سو روپے بھی ہوں چینی ڈالروں کے اعتبار سے لکھ پتی ہے! شانگھائی میں ایک وقت کا کھانا ۲۴/= روپے! صرف قیام کے ۲۵/= روزانہ!! ابھی تک چینیوں کی کارگردگی کا جو اندازہ ہوا وہ اچھا نہیں ہے۔ نظم و انتظام کی کمی ہے۔ RED TAPE بہت معلوم ہوتا ہے۔ ہم سے کلکتہ سے لے کر مینن گنگ تک شاید چار دفعہ کسٹم کے فارم بھروائے گئے اور ہر جہاز اُترنے والے مقام پر سامان دیکھا گیا جس میں وقت بھی ہوئی اور وقت بھی ضائع ہوا! CANTON میں ہم خلافِ توقع پہنچے تھے اور اس لیے اندیشہ یہ تھا کہ صبح تک وہاں رہنا ہوگا وہاں سے (اگلے روز دوبارہ ہانگ کانگ کے مسافروں کو اُتارنا ہوگا اور پھر شانگھائی جاکر تیسرے روز مینن گنگ پہنچیں گے۔ ان تبدیلیوں کی وجہ سے کوفت تھی کیوں کہ ہانگ کانگ میں برٹش کونسل اور مینن گنگ میں اپنے ہندوستانی سفیر مینن کو اپنے ترمیم شدہ پروگرام کا تار دے چکے تھے۔ لیکن خوش قسمتی سے بدنظمی کام آئی اور ہمیں ایک ہی گھنٹہ کے اندر اندر ایک جہاز میں جو بیٹویا سے آیا تھا شنگھائی روانہ کردیا گیا جہاں ہم رات کے ۱۲ بجے پہنچے۔ ایک بلکہ ڈیڑھ بجے ہوٹل کیفے میں پہنچے۔ صبح کے ۵ بجے تک وہاں سوئے جاگے اور ساڑھے سات بجے روانہ ہوکر ۹ بجے مینن گنگ پہنچ گئے یعنی ایک صبح کلکتہ میں تھے اور دوسری صبح مینن گنگ میں۔ لطف یہ کہ (جیسا بعد میں معلوم ہوا) چینی سفیر جو ہم سے چار دن پہلے روانہ ہوئے ایک دن بعد پہنچے کیوں کہ انھیں ہانگ کانگ وغیرہ

میں رہنا پڑا۔ موسم کی خرابی کی وجہ سے وہ نہیں چل سکے!!

۳ر ستمبر

ہم لوگ اس وقت پہنچے جب کانفرنس کا پہلا رسمی اجلاس شروع ہو چکا تھا اور جب تک ہم مقامِ اجلاس (اکیڈمی شینکا) پہنچ سکے جلسہ برخواست ہو رہا تھا۔ جاتے ہی ہندوستانی سفیر مسٹر مینن سے ملاقات ہوئی اور یونسکو کے نمائندے ڈاکٹر لورائس سے۔ انھوں نے بتایا کہ مجھے کانفرنس کا نائب صدر منتخب کیا جائے گا اور مجھ سے درخواست کی کہ میں چین کے نائب وزیرِ تعلیم (ڈاکٹر ہان لی دو) کا نام صدارت کے لیے پیش کروں۔ چناں چہ شام کے اجلاس سے کارروائی شروع ہو گئی۔ اس میں مجھے علاوہ نائب صدر کے ڈرافٹنگ کمیٹی کا صدر بھی چُنا گیا۔ کانفرنس میں دس مختلف ملکوں اور علاقوں کے نمائندے شریک ہوئے ہیں۔ چوں کہ ہم لوگ دو روز دیر سے پہنچے ہیں اس لیے ازراہِ اخلاق کانفرنس دو روز کے لیے ملتوی ہو گئی تھی اور بجائے یکم کے آج شروع ہوئی ہے۔

ہم لوگوں کو مسٹر مینن اور مسز مینن نے اپنے یہاں ٹھیرالیا ہے۔ یانگ سی ہوٹل جہاں ہمارے قیام کا انتظام تھا بہت دور ہے اور زیادہ اچھی جگہ نہیں ہے عابد صاحب نے مینن صاحب کے نام خط دیا تھا۔ لیکن یہ لوگ بہرحال بہت شریف اور متواضع معلوم ہوتے ہیں۔

۴ر ستمبر تا ۱۲ر ستمبر

کانفرنس کے یہ دس روز بہت مصروفیت اور ہماہمی میں گزرے اس عرصے میں علاوہ کانفرنس کا کام انجام دینے کے (جس میں ہندوستانی وفد کے کام کا ضرورت سے زیادہ اعتراف کیا گیا اور اسے اہمیت دی گئی، حالاں کہ ان کانفرنسوں میں تقریریں کرنے اور بعض دفعہ رپورٹیں لکھنے کے سوا ہوتا ہی کیا ہے!) بہت سے لوگوں سے ملنے کا موقع ملا۔ بہت سی دعوتیں کھانی پڑیں اور تقریریں کرنی ہوئیں ان میں قابلِ ذکر مارشل اور میڈم چانگ کائی شیک، وزیرِ تعلیم، نائب وزیرِ تعلیم، میر آف مینن گنگ، صدر مرکزی کلچرل ایسوسی ایشن، پرائم منسٹر، صدر EXAM- YUAN

امریکن سفیر، مصری سفیر کی ملاقاتیں اور دعوتیں تھیں۔ ان میں سے بعض لوگ ایسے ہیں جن کا مختصر سا ذکر اور ذاتی تاثرات لکھنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

میڈم چانگ کائی شیک۔ اصطلاحِ عام میں بہت CHARMING خاتون ہیں۔ خاصی باخبر اور ذہین معلوم ہوتی ہیں۔ اپنے ممدوح پنڈت جواہرلال کا حال پوچھتی رہیں۔ ہاتھ میں کسی ہندوستانی دوست کا دیا ہوا تحفہ (یعنی سونے کی چوڑیاں!) پہنے تھیں جن کی طرف خاص طور پر توجہ دلائی! جنرلسمو چانگ دیکھنے میں بہت سادہ اور شریف آدمی معلوم ہوتے ہیں لیکن چوں کہ وہ انگریزی نہیں جانتے اس لیے ان سے بات چیت نہیں ہوئی۔ جب میں میڈم سے باتیں کر رہا تھا تو اخبار والوں نے تصویر لی تھی جو بعد میں اخبار میں شائع ہوئی۔

وزیرِ تعلیم (چوچیا ہوا) اور پرائم منسٹر CHANG CHEU دونوں صورت سے نیک اور شریف معلوم ہوتے ہیں۔ آہستہ آہستہ باتیں کرتے ہیں اور میل جول میں اچھے ہیں وزیرِ تعلیم زیادہ باخبر تو معلوم نہیں ہوتے لیکن خلیق آدمی ہیں اور اپنے کام سے دل چسپی رکھتے ہیں وزیرِ دفاع ...... ایک مسلمان ہیں جو بہت ہوشیار، مضبوط ارادے کے اور باخبر آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ سنا ہے کہ چانگ کائی شیک اگر کسی سے خائف ہیں تو ان سے، کیوں کہ صاف بات کہنے اور صاف مخالفت کرنے سے نہیں چوکتے! چین کے بہترین ماہرِ جنگ ہیں۔

نائب وزیرِ تعلیم ڈاکٹر ہان لوئی دو ایشائی کانفرنس میں آئے تھے۔ وہ کانفرنس کے صدر تھے۔ بہت خاموش، شریف اور بے ضرر آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ اپنے مکان پر ہماری دعوت کی تھی (یہاں وزرا کو علاوہ مکان، موٹر، سرکاری تقریبوں کا خرچ ملنے کے صرف ۱۰۰/= ماہوار کے بقدر تنخواہ ملتی ہے۔ لیکن وہ رہتے ہیں کافی شان کے ساتھ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یا تو وہ زیادہ تر دولت مند لوگ ہیں یا دستِ غیب سے آمدنی ہوتی ہے!)

ڈاکٹر گائی اکیڈمی سینکا کے صدر اور بہت مشہور چینی عالم اور بدھ مذہب کے ماہر ہیں ہندوستان اور ہندوستانی تہذیب کے دوست ہیں۔

ریل کی بدخطی

امریکن سفیر (ڈاکٹر L. STUART) ۷۵ سالہ مشنری ہیں، چین سے خوب واقف ہیں، عمر بھر تعلیمی کام کیا ہے۔ اب حسنِ اتفاق سے سفیر ہیں۔ عالم میں جو شانِ انکسار ہونی چاہیے ان میں پائی جاتی ہے۔ سرسری ملاقات ہو سکی لیکن مجھ پر بہت اچھا اثر پڑا۔

پروفیسر TSUNG KAI CHENG نیشنل چکیانگ یونی ورسٹی ہانگ چاؤ میں تعلیم کے پروفیسر ہیں نہایت شریف، با اخلاق، منکسر مزاج اور معمر آدمی ہیں۔ امریکہ میں ڈیوئی وغیرہ سے تعلیم پائی ہے شاعر اور ادیب بھی ہیں۔ ایک خاص معذرتی لہجہ میں باتیں کرتے ہیں۔ نہ صرف ہانگ چاؤ کے دن بھر کے قیام میں میرے ساتھ رہے بلکہ خریداری کرائی اور چین اور ہانگ چاؤ کی تاریخ اور تہذیب کے متعلق بہت سی دل چسپ باتیں سنائیں۔ ان کے شاگرد چین کے تعلیمی حلقوں میں جا بجا پھیلے ہوئے ہیں RUS CHUIDAM YUI TANG شانگھائی کے تعلیم بالغان کے تجربی مرکز کی ڈائرکٹر ہیں اور ایک ان تھک، مخلص کارکن ہیں جو بالکل "مذہبی جنون" کے ساتھ کام کرتی ہیں اور نہ خود پر رحم کھاتی ہیں نہ اپنے ساتھیوں پر! ان کا اسکول صبح سے لے کر رات کے نو بجے تک مسلسل بچوں، نوجوانوں، جوانوں، بوڑھوں، عورتوں مردوں کی تعلیم کا کام چار SHIFTS میں کرتا ہے اور ہر وقت اس میں رونق اور تعلیمی ہنگامہ رہتا ہے۔ انھوں نے سارے "میونسپل ضلع" مرکز قائم کرنے اور ان کی دیکھ بھال کا کام بھی اپنے ذمے لیا ہے۔

ہندوستانی سفیر مسٹر K.P.S. MENON غیر معمولی خوبیوں کے اور دل چسپ آدمی ثابت ہوئے۔ ان کی بیوی (جو غالباً سر سنکرن آتر کی بیٹی ہیں) بھی اتنی ہی خلیق، مہمان نواز اور ذہنی حیثیت سے خاصی بیدار ہیں۔ مینن صاحب نے اپنی شرافت اور خلوص اور قابلیت کی وجہ سے چین میں بہت اچھا اثر پیدا کیا ہے اور میں نے ہر کسی سے ان کی تعریف سنی۔ ذاتی تجربے نے ثابت کیا کہ وہ ہر طرح سے اس تعریف کے اہل ہیں۔

کانفرنس کا سب سے بڑا مقصد میرے خیال میں بنیادی تعلیم کے تصور کو چین میں مقبول بنانا تھا اور اس میں خاصی کامیابی ہوئی۔ بہت سے لوگوں نے، بلکہ تمام تعلیمی حلقوں نے، اس

اصطلاح کو ضرور اپنا لیا ہے بلکہ آج کل چین میں ہر قسم کا تعلیمی کام بنیادی تعلیم ہے! کانفرنس نے اپنا کام تین کمیٹیوں میں تقسیم کیا تھا۔ ایک طریقۂ تعلیم کے متعلق، ایک تعلیم کے CONTENTS, MATERIALS کے متعلق اور تیسری عام پالیسی، مالیات اور نظم ونسق کے متعلق۔ میں نے پہلی دونوں کمیٹیوں میں کام کیا لیکن مجھے یہ محسوس نہیں ہوا کہ ان میں کوئی زیادہ گہرا اور علمی لحاظ سے وقیع کام ہو سکا۔ بعض ممبر تو ایسے تھے جن کی حیثیت تعلیمی ماہرین کی نہ تھی مثلاً سیام کی طرف سے وہاں کے سفیر تھے۔ ملایا کی طرف سے ایک ڈاکٹر تھے۔ جن کا نام اونگ ہے (ذہین اور باخبر آدمی ہیں) دوسرے کانفرنس کا ایجنڈا وغیرہ پہلے سے ممبروں کو معلوم نہ تھا اس لیے وہ تیاری کر کے نہیں آ سکے تھے۔ بہرحال اتنا ضرور ہوا کہ ہر کمیٹی میں بعض اہم تعلیمی اصولوں پر کافی زور دیا گیا۔ بدیہی باتوں کو بیان کرنا بھی اپنی جگہ پر اچھی چیز ہے کیوں کہ وہ بھی بعض لوگوں کو معلوم نہیں ہوتیں اور بیشتر ان پر عمل نہیں کرتے۔ رپورٹ کا مرکزی حصہ جس میں مختلف ملکوں کی تعلیمی رپورٹوں اور مباحثوں میں سے اہم اور عام دلچسپی کے POINTS شامل کیے گئے تھے، میں نے لکھا اس کانفرنس کے عام اندازِ خیال کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ ہم لوگوں کو اپنے ہاں کی تعلیمی رپورٹ لکھنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ اس لیے میں نے زبانی ایک تقریر میں عام حالات پر تبصرہ کر دیا تھا اور ڈاکٹر جھا نے بعد میں ایک تحریری رپورٹ دفتر میں دے دی تھی تاکہ کانفرنس کی رپورٹ میں شامل کر لی جائے۔

مینن گنگ میں کئی مدرسوں اور تعلیمی مرکزوں کو دیکھنے کا موقع ملا۔ ان میں سے ایک بہت دل چسپ مرکز WOMEN'S ADVISORY COMMITTEE کا تجربی تعلیمی مرکز ہے جہاں عورتوں کو مختلف قسم کی دستکاریاں سکھائی جاتی ہیں ہر قسم کے کام کا بہت اچھا تصویری ریکارڈ موجود ہے۔ بچوں اور عورتوں کو جو مدرسوں میں نہیں پڑھ سکتیں پڑھایا جاتا ہے۔ UNRA کی مدد سے کئی ایک ہزار بچوں اور عورتوں کو روزمرہ دودھ دیا جاتا ہے۔ اور یہ سارا کام بہت خوش مزاجی کے ساتھ عورتیں کرتی ہیں جو اسے کم و بیش اعزازی طور پر کر رہی ہیں۔ ان کے مرکز گاؤں میں بھی ہیں جہاں ان کی ٹریننگ پائی ہوئی نرسیں اور سوشل کام کرنے والیاں جا کر کام کرتی ہیں۔ ایک PRODUCTION DEPARTMENT بھی ہے جہاں بہت سی دستکاری کی چیزیں ملتی ہیں۔ یہ انجمن

میڈم چانگ کائی شیک کی قائم کردہ ہے اور چین کی NEW LIFE MOVEMENT کا جزو ہے یہ ایک اسپتال ہے اور ایک مشورتی مرکز ہے جہاں عورتیں اپنی صحت اور دوسری مشکلات اور مسائل کے متعلق آکر مشورہ کرسکتی ہیں۔

۷/ تاریخ کو ہم جمہوریہ چین کے FATHER ڈاکٹر سن یات سین کے مقبرے پر پھول چڑھانے کے لیے گئے۔ وہاں اس رسم کو بحیثیت نائب صدر کے مجھے ادا کرنا پڑا۔ میں نے قبر کے سامنے بہت بڑا ہار (جو ایک فریم پر چڑھا ہوا تھا) رکھنے کے بعد بطور تعظیم کے سر جھکایا۔ اگلے دن چین کے اخباروں میں چھپ گیا کہ ہندوستان کے نمائندے نے MADE A VERY GRACEFUL, RESPECTFUL BOS WHICH WAS MUCH APPRECIATED ۔

۹/ کو ہم نے ایک مخصوص چینی تماشا PUPPET SHOW دیکھا جو ہمارے ہاں کے کٹ پتلی کے ناچ کی طرح ہوتا ہے لیکن اس سے زیادہ اہتمام اور تکلف سے کیا جاتا ہے۔ ایک وقت میں تین چار "کیرکٹر" اسٹیج پر آتے ہیں اور ان کے جسم کے مختلف حصوں میں باریک تار بندھے ہوتے ہیں جن کو اُوپر سے کھینچا جاتا ہے اور اس کی وجہ سے وہ مختلف حرکات کرتے ہیں۔ مجھے کھیل تو زیادہ پسند نہیں آیا کیوں کہ ایک تو زبان بالکل سمجھ میں نہیں آئی، دوسرے کچھ دیر کے بعد حرکات بالکل MONOTONOUS ہوجاتی ہیں۔ البتہ STAGE EFFECTS بہت اچھے تھے اور چینیوں میں جو آرٹ کا احساس اور صلاحیت ہے اس کو ظاہر کرتے تھے۔ موسیقی میں انھوں نے تقریباً تمام تر مغربی اسٹائل اختیار کرلیا ہے۔ اس قسم کے دو SHOW اور ہمارے لیے رکھے گئے تھے۔ ایک میں سرحدی قبائل کا ناچ تھا اور دوسرے میں SNOW WHITE کا آپرا جو اسکول کے بچوں نے کیا تھا میں ان دونوں میں نہیں جاسکا لیکن سنا دونوں بہت اچھے تھے۔

۸/ کو امریکن سفارت خانے کے مسٹر MEBLY نے مجھے اور چند ڈیلیگیٹوں کو بلایا تھا۔ امریکہ والے اپنے سفارت خانے میں ایک PUBLIC RELATIONS کا افسر اور ایک CULTURAL ATTACHE ضرور رکھتے ہیں اور اس کا کام ہی یہ ہے کہ وہ باہر سے آنے والے اور بااثر مقامی لوگوں سے راہ و رسم پیدا کرے تاکہ امریکہ کا رسوخ بڑھایا جاسکے۔ ایک روز امریکہ کے سفیر ڈاکٹر سٹوارٹ سے ان کے ایٹ ہوم میں ملاقات ہوئی۔ یہ دراصل مشنری ہیں اور

چالیس سال سے زیادہ چین میں رہے ہیں ایک کالج کے (جو بعد میں یونی ورسٹی ہوگیا) پروفیسر تھے۔ مجھے بہت پسند آئے۔ اصل کلچر اور انسانیت ان میں پائی جاتی ہے اور ایک قسم کا انکسار جو بہت اچھے آدمیوں ہی میں ہو سکتا ہے۔ ستر برس سے زیادہ عمر ہے اور لوگ کہتے ہیں کہ جیسی اچھی طرح یہ چین کو جانتے ہیں کوئی اور نہیں جانتا۔

۸/کو ایک خاص جلسے میں مجوزہ PILOT PROJECT پر بحث ہوئی جس کا مقصد یہ ہے کہ دنیا کے مختلف حصّوں میں بعض علاقے چھانٹ لیے جائیں وہاں بنیادی تعلیم کا ایک نمونے کا تجربہ کیا جائے جس میں صرف لکھنا پڑھنا ہی نہیں بلکہ پورا سماجی اور کلچرل RECONSTRUCTION شامل ہو۔ اس کے لیے ایک علاقہ چین میں رکھا جائے گا اور ایک دریائے ایمیزن (امریکہ) کی وادی میں اور مختلف طبعی اور سماجی حالات میں کام کرنے سے جو نتائج حاصل ہوں گے ان سے حسبِ ضرورت دوسری جگہ فائدہ اٹھایا جا سکے گا۔

۱۱/کو مجھے ینن کنگ کے زیرِ اہتمام اس کے POLITICAL SCIENCE انسٹی ٹیوٹ میں (جس کی اپنی حیثیت ایک یونی ورسٹی ہے اور جہاں سول سروس میں شامل ہونے والے ملازمین ایک عرصے تک علمی اور عملی ٹریننگ حاصل کرتے ہیں) تقریر کرنے کے لیے مدعو کیا گیا تھا۔ میں نے اس موضوع پر تقریر کی کہ ہماری دنیا کن اثرات اور قوتوں کے ماتحت تیزی کے ساتھ تبدیل ہو رہی ہے اور آئندہ ہوگی اور اس نئی صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کے لیے ہمیں بحیثیت معلمین اور طلبہ اور شہریوں کے کیا کرنا چاہیے۔ تقریر خاصی دل چسپی سے سنی گئی اور غالباً وہاں کافی لوگ انگریزی جانتے ہیں۔ کیوں کہ چینی میں ترجمہ ضروری نہیں سمجھا گیا۔

ایک روز ہم نے سنٹرل ینن کنگ یونی ورسٹی کا تجربی اسکول جاکر دیکھا جہاں اچھا کام ہو رہا ہے خصوصاً زبان کی تعلیم کے مشکل مسئلے پر۔ چینی زبان کے سیکھنے میں خاصی مشکلات ہیں۔ اس میں روزمرّہ کی بول چال کے لیے اور معمولی نوشت و خواند کے لیے چار ہزار CHARACTERS سیکھنے کی ضرورت ہے جن کی مدد سے دوسرے لفظ بھی بنائے جا سکتے ہیں (کل تعداد غالباً چالیس پچاس ہزار الفاظ کی ہے) پوری خواندگی حاصل کرنے کے لیے چھ سال درکار ہیں۔ اسکول میں ۹ سو سے زائد طلبہ پڑھتے ہیں اور ۶ جماعتیں ہیں۔ پہلی عمارت جنگ میں تباہ ہوگئی تھی۔ اب نئی

بنائی گئی ہے۔ اس تجربی اسکول میں پہلی اور دوسری جماعت میں بولنے اور پڑھنے پر زور دیا جاتا ہے۔ تیسری اور چوتھی میں انسان کی چار بنیادی ضرورتوں یعنی خوراک، لباس، مکان اور وسائل آمدورفت پر اور پانچویں چھٹی میں سائنس پر۔

خاص خاص موقعوں پر خاص پروجکٹ کی تیاری کی جاتی ہے۔ چناں چہ آج کل بچے ایشیا کے جنوب مشرقی ملکوں کا مطالعہ کر رہے تھے اور ایک ایک جماعت نے ایک ایک ملک پسند کیا تھا چناں چہ ہمیں پانچویں جماعت نے (جس نے ہندوستان کا خاص مطالعہ کیا تھا) مدعو کیا۔ بچوں نے خیر مقدم کی تقریریں کیں۔ ہم نے مختصر سا جواب دیا۔ پھر انھوں نے سوال پوچھے اور ایک خط ہندوستان کے بچوں کے نام دیا۔ بعض اور اسکولوں کے بچوں نے بھی اس قسم کے خط دیے ہیں اور ان سب میں خاص طور سے (غالباً استادوں کے ایما پر) دنیا میں امن قائم کرنے پر زور دیا ہے۔

آج معلوم ہوا کہ ۱۴/ کے جہاز میں جگہ نہیں مل سکتی جس کا مطلب یہ ہے کہ ۲۱/ تک یہاں رہنا پڑے گا۔ اس خبر سے بہت افسوس ہے کیوں کہ گھر جانے کو دل بے تاب ہے خصوصاً جب سے دہلی کے فساد کی خبریں آرہی ہیں اس وقت سے کسی کام میں دل نہیں لگتا۔ ایک ایک لمحہ پہاڑ معلوم ہوتا ہے۔ حکومتِ چین نے ممبرانِ وفد کی سیاحت کے لیے ایک ہفتے یا دس روز کا پروگرام بنایا تھا۔ میں نے ۱۴/ کو جانے کے خیال سے اس میں شریک ہونے سے انکار کر دیا تھا لیکن اب معلوم ہوتا ہے مجبوراً جانا ہوگا۔ دہلی تار دیا ہے لیکن ابھی تک کوئی جواب نہیں آیا۔ نہ معلوم ڈاک وغیرہ کا انتظام کیسا ہے؟ خدا خیریت رکھے!

قیامِ شانگھائی

۱۵/ اور ۱۶/ کو ہم لوگ شانگھائی میں رہے جو چین کا سب سے بڑا شہر ہے، آبادی چالیس لاکھ سے اُوپر ہے اور دوسرے بین الاقوامی شہروں کی طرح (مثلاً کلکتہ، قاہرہ، لندن، نیو یارک) اس میں بھی وہ چیزیں پائی جاتی ہیں جو ایسے شہروں کی خصوصیت ہیں، بہت امارت، اور بہت افلاس، شور وغل، شہری احساس اور یک جہتی کی کمی۔ لیکن یہاں بھی دوسری جگہوں

کی طرح گزشتہ دو سال میں ان لوگوں نے بہت اچھا تعلیمی کام کیا ہے اس سے پہلے تو یہ شہر بھی جاپانیوں کے قبضے میں تھا۔ ہم نے بہت سے اسکول اور دوسری تعلیمی درسگاہیں دیکھیں (قیام یہاں کے سب سے بڑے ہوٹل PARK HOTEL میں ہے اور شہر کی میونسپلٹی کی طرف سے ہر وفد کے پاس ایک موٹر کار ہے لیکن سارا وقت اتنی مصروفیت میں گزرتا ہے کہ سیر کرنے کا موقع نہیں ملتا)۔ مجھے یہاں کے تعلیمی کام میں بعض چیزوں نے خاص طور پر متاثر کیا ہے :۔

۱۔ ایک چینی خاتون مسز TANG ہیں جنھوں نے عوام کی تعلیم میں ایک مشنری کی طرح ان تھک اور مخلصانہ کام کیا ہے۔ یہ ایک MUNICIPAL EXPERIMENTAL SCHOOL FOR MASS EDUCATION کی پرنسپل ہیں۔ کانفرنس میں بھی ہمارے ساتھ تھیں۔ ان کی تعلیم گاہ میں چار SHIFTS میں روزانہ کام ہوتا ہے۔ ایک بچوں کا باقاعدہ اسکول ہے جس میں نئے تعلیمی طریقے رائج ہیں اور صنعت اور دستکاری کا اچھا کام ہے۔ شام کو ایک بڑی جماعت ان طلبہ کی آتی ہے جو سارے وقت اسکول میں نہیں پڑھ سکتے۔ اس کے بعد عورتوں اور نوجوان لڑکیوں کے لیے تعلیم کا انتظام ہے جو خواندگی کے علاوہ اور مفید چیزیں بھی سیکھتی ہیں، بچوں کے کھیل کا انتظام ہے، رات کو بالغوں کی جماعتیں ہوتی ہیں جن کو فلم وغیرہ کے ذریعہ بھی تعلیم دی جاتی ہے۔ کل تین ہزار کے قریب طلبہ تعلیم پاتے ہیں! استاد صبح سے رات تک کام کرتے ہیں اور اس کے لیے کوئی خاص معاوضہ انھیں نہیں ملتا اور نہ وہ طلب کرتے ہیں! بالغ اس قدر دلچسپی لیتے ہیں کہ ان سب کو بٹھایا بھی نہیں جاسکتا۔ انھوں نے خود ہی رات رات بھر کام کر کے ایک نئی عمارت کھڑی کردی ہے۔ اس کے علاوہ شانگھائی کے اس خاص ضلع کے لیے انھوں نے ایک مکمل سروے تیار کیا ہے اور ان کی کوشش سے دوسرے اسکولوں اور کارخانوں میں عوام کی تعلیم کا کام جاری کیا ہے۔ مبارک ہیں وہ لوگ جو اس جوش اور اس انداز سے کام کرتے ہیں!

۲۔ ایک میونسپل نارمل اسکول خواتین کا ماڈل پرائمری اسکول (جس کے پرنسپل خندہ جبیں MR. CHEN ہیں) جہاں جدید اصولوں پر بہت اچھا کام ہو رہا ہے۔

ان کو اپنے کام میں بہت ذوق اور دلچسپی ہے انھوں نے اپنے اسکول میں ایک CONCERT

کا انتظام کیا تھا جس میں مختلف اسکولوں نے حصّہ لیا تھا اور بچوں نے اتنا دل کش اور متنوع پروگرام مرتب کیا تھا جس کی تعریف کرنا مشکل ہے۔ اس میں کنڈر گارٹن جماعت کے چار پانچ سالہ بچوں کا آرکسٹرا تک شامل تھا اور سب بچے بہت خود اعتمادی اور فطری احساسِ حسن کے ساتھ کام کرتے تھے۔ پرنسپل چن نے ایک رسالہ LIVING EDUCATION اور اپنی سوانح عمری بھی لکھی ہے۔

۳۔ ایک رات کو چین کے مشہور ماہرِ تعلیم پروفیسر TSAO کے قائم کردہ اسکول کے طلبہ اور طالبات نے ایک خاص پروگرام پیش کیا جس کے DANCES اور موسیقی وغیرہ میں چین کی زندگی کی نہایت جیتی جاگتی تصویریں نظر آتی تھیں خصوصاً "نوجوانوں کی روح" "چینیوں کی قوم زندہ باد" کے عنوان سے جو ناچ تھے ان سے زیادہ اثر آفریں میں نے کوئی چیز نہیں دیکھی۔ ان میں واقعیت کے ساتھ ساتھ آرٹ کا اس درجہ خیال رکھا گیا تھا کہ بیک وقت دماغ اور نظر کو تفریح ہوتی تھی۔ اس میں ایک ناچ "بھک منگوں" کے عنوان سے بھی تھا جس میں شانگھائی کے فقیروں کی حالت دکھائی گئی تھی۔ اس قدر کامیابی کے ساتھ ان کی دن بھر زندگی کو ایک ماں اور دو بچوں کے ناچ کی صورت میں پیش کیا گیا تھا کہ ہال میں بالکل سناٹا تھا، لوگوں کے سانس لیتے بن نہ پڑتی تھی۔

۴۔ تصویروں کی ایک نمائش دیکھی جس میں گزشتہ سو برس کے مصوّروں کا کام تھا۔ اچھی چیزیں تھیں لیکن بہت اعلیٰ قسم کی تصویریں کم تھیں۔ شانگھائی کے ایک مشہور ناشر نے ایک تعلیمی نمائش کی تھی جس میں گزشتہ پچاس سال کی تعلیمی تصانیف اور سائنس کے سامان اور تعلیمی فلموں وغیرہ کا مظاہرہ تھا۔ کافی وسیع نمائش تھی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ خاصا کام ہو رہا ہے لیکن بچّوں کی کتابوں میں کوئی خاص قابلِ ذکر بات معلوم نہیں ہوئی۔

۵۔ ایک اسکول میں بچوں کے کام کی نمائش اور خاص طور پر وہ آلات دیکھے جو زبان کی تعلیم میں استعمال ہوتے ہیں۔ ان کے ہاں خوش خطی اور ہلکی قسم کی دستکاریوں کا کام اچھے معیار کا ہے اور چینی زبان کی تعلیم کے لیے جو آلات بنائے گئے ہیں ان میں بہت INGENIOUS

ہیں اور اس سلسلے میں فلموں اور دوسرے سائنس کے آلات سے بہت کام لیا گیا ہے۔ ہمیں بھی اس طرف توجہ کرنی چاہیے۔

یہاں علاوہ تعلیمی انجمنوں اور میونسپلٹی کے (جو بہت با اثر اور دولت مند ہے) شانگھائی کے بعد میرا اور میڈم وو نے (جو بہت تعلیم یافتہ اور CHARMING خاتون ہیں) اپنے مکان پر ڈنر دیا۔ ان کا مکان اور باغ دونوں بہت خوبصورت ہیں اور بیوی میں سوشل GRACES ہیں اور میاں سیاسی معاملات میں کمال رکھتے ہیں ایک زمانے میں وزیر خارجہ رہ چکے ہیں لیکن دوسرے چینیوں کی طرح روس کے خلاف ہیں کہتے ہیں روس ضرور جنگ کرے گا خواہ دوسرے لوگ کچھ ہی کریں۔ روس کے خلاف ہر جگہ جذبہ بڑھتا جاتا ہے (اس پر یاد آیا کہ آج کل امریکہ کی ایک کمیٹی ہولی وڈ کے مشہور ترین اداکاروں کے خلاف امریکن حرکات کی پڑتال کر رہی ہے۔ الزام یہ ہے کہ انھیں روس کے ساتھ ہمدردی ہے!)

۱۷ ستمبر

آج کا دن ہم لوگوں نے چین کے ایک بہت خوش منظر شہر ہانگ سو چاؤ میں بسر کیا جس کے متعلق مارکو پولو نے لکھا تھا کہ اگر دنیا میں کہیں بہشت ہے تو وہ ہانگ سو چاؤ میں ہے اور خود چین میں ایک مثل یہ ہے کہ "اوپر HEAVEN ہے اور نیچے ہانگ سو چاؤ! یہ شہر ایک نہایت خوبصورت جھیل کے کنارے پر آباد ہے جس کے چاروں طرف سبز پوش پہاڑیاں ہیں اور شانگھائی کے شور و غل کے بعد اس کا امن اور سکون بہت اچھا معلوم ہوتا ہے۔ اس کو دیکھ کر کشمیر اور جینوا اور آسٹریلیا کے شہر پرتھ کی یاد کچھ تازہ ہو جاتی ہے۔ یہاں دو یونی ورسٹیاں ہیں ایک قومی اور ایک عیسائیوں کی، بہت سے مندر ہیں جن میں سے سب سے مشہور جنرل YUFEY (شوفے!) کے نام معنون ہے جس نے عرصہ ہوا کسی چینی شہنشاہ کے ظلم کے خلاف احتجاج کیا تھا اور اس کی پاداش میں اسے مارا گیا تھا۔ داخل ہوتے وقت ایک طرف ان دو حاکموں کے مجسمے بھی بنے ہوتے ہیں جنھوں نے اس کو سزا دی تھی تاکہ لوگ جنرل کی ہمت کے ساتھ ساتھ ان کی "غداری" کو یاد رکھیں اور ان پر لعنت بھیجتے رہیں! یہ

جنرل شاعر بھی تھا اور یہ شہر قدیم زمانے سے اب تک شاعری، ادب اور کلچر کا مرکز رہا ہے۔ اس کی خاص صنعت ریشم، پنکھے، چھتریاں ہیں جن میں چینی صناعوں کی صنعت کاری کا کمال دکھائی دیتا ہے۔ پتھر کے کھلونے اور مجسّمے بھی بہت خوبصورت بناتے ہیں۔

یہاں ہم نے ایک گاؤں کا پرائمری اسکول، ایک تعلیم بالغان کا مرکز، ایک شہر کا پرائمری اسکول، ایک نارمل اسکول اور اس کا ملحقہ اسکول، ایک کتب خانہ اور ایک تصویروں کی نمائش دیکھی! (دن بھر کے لیے کس قدر تھکا دینے والا کام ہے!) یہاں بہت سے پرائمری اسکولوں کی عمارتیں توقع سے بہتر ہیں (میرا مطلب ہے چین میں) گاؤں کی خاصی فراخ اور اچھی عمارت کو دیکھ کر میں نے پوچھا کہ یہ اسکول ہی کے لیے بنائی گئی تھی یا پہلے کسی اور کام آتی تھی۔ معلوم ہوا (بعض دوسری عمارتوں کی طرح) کہ پہلے یہ ایک مندر تھا۔ اب بدھا کے مجسّموں کو اُوپر کی منزل میں بند کر دیا گیا ہے اور تمام عمارت اسکول کے استعمال میں ہے۔ اس کے ساتھ ایک بڑا سا احاطہ تھا جو چار دیواری سے گھرا ہوا تھا۔ اس میں بچے باغبانی کر رہے تھے اور بانس کے درخت کاٹ رہے تھے تاکہ ان سے ایک شیڈ تیار کریں۔ مجھے ان کو اس طرح مصروف دیکھ کر بہت خوشی ہوئی کیوں کہ چین میں اس قسم کا محنت مزدوروں کا کام اسکولوں میں زیادہ دیکھنے میں نہیں آیا۔

رات کو جب ہم پہنچے تو شہر کے MAYOR وغیرہ کی طرف سے استقبالی ڈنر دیا گیا جس میں (حسب معمول) تقریریں بھی ہوئیں۔ میئر نے بتایا کہ یہ شہر ۸ سال تک جاپانیوں کے زیرِ تصرّف رہا اب صرف دو سال سے یہاں دوبارہ تعلیم کا باقاعدہ نظم قائم کیا گیا ہے۔ جاپانیوں نے زیادہ عمارتیں وغیرہ تو تباہ نہیں کیں لیکن تمام سامان، کتابیں، فرنیچر وغیرہ تباہ کر دی تھیں۔ لیکن اندازہ ہوا کہ دو سال کی قلیل مدّت میں ان لوگوں نے تعمیرِ نو کا کام خوب کیا ہے۔ میں نے جوابی تقریر میں چین کی تعلیمی جد و جہد اور بچوں کو ایک بہتر تعلیمی فضا اور ماحول میں تربیت دینے کی تعریف کی، ٹیگور کا مشہور قول انھیں سنایا کہ ہر بچہ جو پیدا ہوتا ہے یہ پیغام لاتا ہے کہ خدا انسانوں کی طرف سے مایوس نہیں ہوا" اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ آپ لوگوں کو ان بچوں کے لیے ایک بہتر دنیا اور بہتر سماج بھی بنانا ہوگا کیوں کہ اس تعلیم کے بعد یہ بچے اس کا مطالبہ کریں گے جس کی طرف

بے اعتنائی کرنا انصاف کے خلاف اور خطرے سے خالی نہ ہوگا۔ اگلے روز گورنر صوبہ نے، جو سابق امیرالبحر اور وزیر زراعت رہ چکے ہیں، اپنی تقریر میں بتایا کہ ان کے سامنے پانچ سالہ تعلیمی پروگرام ہے جس میں چالیس لاکھ لوگوں کو خواندہ بنائیں گے اور سب بچوں کو اسکول میں داخل کریں گے۔ بہت باخبر اور دانش مند معلوم ہوتے ہیں گو ان کی صورت سے اور فوجی زندگی بسر کرنے کی وجہ سے ان سے یہ توقع نہ تھی کہ تعلیم اور دنیا کی سیاست سے وہ ایسی اچھی طرح واقف ہوں گے ...... یہاں کے لوگوں میں مجھے سب سے زیادہ ایک نہایت مخلص اور معمر اور انسان صفت پروفیسر CHENG پسند آئے جو مقامی یونی ورسٹی میں تعلیم کے شعبہ کے صدر ہیں۔ امریکہ میں تعلیم پائی ہے اور مقامی تاریخ اور کلچر سے غیر معمولی واقفیت ہے اور مجھ سے بہت ہی تپاک اور محبت سے پیش آئے یہاں تک کہ دو کانوں میں لے جاکر خریداری بھی کرائی۔ سچی انسانیت کا اندازہ چند گھنٹے میں بھی ہو سکتا ہے۔

۱۸ ستمبر

میں اس وقت پے پنگ جا رہا ہوں اور ہوائی جہاز میں ہوں۔ دل بہت اداس ہے اور بے اختیار رونے کو جی چاہتا ہے! ہندوستان سے کوئی خط خیریت کا نہیں آیا۔ اظہر کو دہلی تار دیا تھا اس کا جواب بھی نہیں ملا۔ آج کے اخبار سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہاں قتل اور خوں ریزی کا سلسلہ جاری ہے اور ملک کی ایسی حالت ہے کہ کسی کی جان تک محفوظ نہیں۔ ہندوستان میں جو باہمی مخالفت اور نفرت کی فضا پیدا ہوئی اس میں ابتدا میں بدقسمتی سے لیگ کے پروپگنڈے کو زیادہ دخل تھا۔ اس کی وجہ سے جذبات میں برہمی پیدا ہوتی گئی۔ اس کے بعد تقسیم ہند ہوگئی اور کرانے والوں نے یہ نہ سوچا کہ اس کے اثرات کیا کچھ ہو سکتے ہیں۔ اب پاکستان سے زیادہ ہندوستان میں شورش اور بہیمانہ حرکات کا سلسلہ جاری ہے اور جہاں تک میں اندازہ کر سکتا ہوں مسلمانوں کے اوپر ہندوؤں اور سکھوں نے انتقاماً یا کسی خاص سازش کے ماتحت بے انتہا مظالم کیے ہیں۔ لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ کون زیادہ قابلِ الزام ہے؟ جب کبھی انسان انسان کے خلاف ظلم کا ہاتھ اُٹھاتا ہے جب کبھی انصاف اور شرافت اور

ہمدردی کے سوتے خشک ہو جاتے ہیں (اور جہاں کہیں خشک ہوتے ہیں) اپنا سر ندامت اور رنج کے ساتھ جھک جاتا ہے۔ جس ملک کے مستقبل کے لیے کیا کیا امیدیں باندھیں اور کیا کیا خواب دیکھے تھے وہاں خانہ جنگی کی یہ کیفیت ہے کہ امید کے تار ایک ایک کر کے ٹوٹتے جاتے ہیں۔ غضب خدا کہ لاکھوں ہندو اور مسلمان ملک کے ایک حصّے سے دوسرے حصّے میں پناہ گزینوں کی طرح جا رہے ہیں۔ کیوں کہ ایک دوسرے پر سے اعتبار اُٹھ گیا ہے اور راستے میں ان مصیبت زدوں پر حملہ کر کے "بہادری" کا ثبوت دیا جاتا ہے۔ ادھر سیاسی لیڈر (شاید دو تین کو چھوڑ کر) ملک کی تقسیم کے بعد ایک دوسرے پر ذمّہ داری اور الزام کی تقسیم میں لگے ہیں۔ ظفر اللہ خاں نے کہا کہ ہمیں اس معاملے کو U.N. میں پیش کرنا ہوگا (تاکہ اس صداقت کا مکمل ثبوت مل جائے کہ ہم میں انسانوں کی طرح زندگی بسر کرنے کی صلاحیت نہیں!) اصفہانی نے امریکہ میں کہا کہ یہ زیادہ تر قصور سکھوں کا ہے اور ان کی ابتدا کرنے کی وجہ سے بیس لاکھ کے قریب آدمی ہندوستان میں مارے جا چکے ہیں اور قصور تمام تر ہندوستان کی حکومت کا ہے (کبھی قصور ایک پارٹی کا بھی ہوتا ہے؟) ادھر گاندھی جی نے آج راشٹر سیوک سنگھ کو تنبیہ کرنے کے بعد کہا ہے کہ اگر پاکستان کی حکومت نے اپنی پالیسی نہ بدلی تو ہندوستان اور پاکستان میں باضابطہ جنگ کا اندیشہ ہے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ کیا ان لڑنے اور لڑانے والوں کو یہ معلوم نہیں کہ ؎

ہر کہ خنجر بہر غیر اللہ کشید　　　　تیر اُو در سینۂ آور رسید!

گاندھی جی ضرور اس بات کو بار بار کہہ رہے ہیں۔ لیکن آج کل اس کا بھی اثر نہیں ہوتا۔

پے پنگ!

ہم لوگ دن کے ایک بجے کوئی چار گھنٹے کی اُڑان کے بعد پے پنگ پہنچے پہلے اس شہر کا نام پیکنگ تھا (جس کا مطلب ہے شمالی دارالسلطنت، جس طرح نین کنگ کا مطلب ہے جنوبی دارالسلطنت) لیکن جب دارالسلطنت جاپانی حملے کی وجہ سے تبدیل ہو گیا تو اس کا موجودہ نام قرار پایا جس کا مطلب ہے "شمالی امن"۔ واقعہ یہ ہے کہ اس شہر میں ایک عجیب امن اور خواب اور تاریخ اور تہذیب کی فضا رچی ہوئی ہے۔ شانگھائی کے بعد تو یہ ایک

ہی دوسری دنیا ہے۔ آبادی بہت ہے۔ ۱۶ لاکھ کے قریب لیکن دو تین منزل سے اُونچی عمارتیں نہیں۔ جدید تہذیب کا اثر جو شانگھائی میں اوچھے پن کے ساتھ نظر آتا ہے یہاں بہت کم ہے۔ شہر کے گرد، دوسرے شہروں کی طرح ایک چار دیواری ہے۔ اس میں داخل ہونے کے بعد جا بجا خوبصورت اور عظیم الشان دروازے بنے ہوئے ہیں جن پر خوب رنگ آمیزی کی ہوئی ہے سُرخ سبز اور نیلے رنگ کی ٹائل چھتوں اور دیواروں میں لگی ہوئی ہیں اور چھتیں چین کی مخصوص انداز میں اس شکل کی ◡ ہیں کہیں ایک اور کہیں دو یا تین (ایک کے اُوپر ایک) بعض جگہ سب سے اُوپر خوبصورت گول چھتری سی بناتے ہیں۔ پوری عمارت کا اثر بہت اچھا پڑتا ہے ...... شہر کے وسط میں چار دیواری سے گھرا ہوا ایک اور خوابوں کا شہر ہے جس کو FORBIDDEN CITY کہتے ہیں جس میں صدیوں تک چین کے شہنشاہ رہے اور کسی عام آدمی کو اس میں داخلے کی اجازت نہ تھی۔ اس میں سرخی مائل زرد رنگ کی چھت کے بڑے بڑے محل اور مندر اور بہت صنعت کاری کے ساتھ بنائے ہوئے باغ ہیں جن کی وسعت اور عظمت اور بلندی اور اندر کی نفاست اور رنگ آمیزی حیرت میں ڈالتی ہے لیکن ان میں وہ تعمیر کا حسن اور نزاکت نہیں جو مغلوں کی عمارت میں پائی جاتی ہے۔

ہم نے اس "شہر ممنوع" کے تیس محلوں میں سے ایک محل WINTER PALACE کو بہت سرسری طریقہ پر دیکھا۔ کئی دربار ہال ہیں (سب کی کرسی اور چھتیں بلند، ان میں پرانے زمانے کا فرنیچر رکھا ہوا جو اس وقت سے بہت مختلف لیکن خوبصورت ہے اور بیچ میں ایک پلیٹ، فارم جس پر شہنشاہ کے بیٹھنے کی کرسی رکھی ہوئی ہے) باغ کے اندر رہنے کے الگ الگ مکان ہیں جن کو اب زیادہ تر پبلک عجائب خانوں میں بدل دیا گیا ہے جہاں مختلف خاندانوں (TENG , TSUNG , CHING اور آخری خاندان MING) کے وقت کے لباس، برتن (جو بہت اعلا صنعت کاری کا نمونہ ہیں) زیورات وغیرہ رکھے ہیں۔ خدا کی شان ہے کہ جہاں پہلے عوام کے تخیل کے علاوہ ان کا کوئی گزر نہ تھا اب وہ تمام محل ان کے لیے کھلے ہیں اور ان کے رہنے والے ناپید ہیں۔ چین میں ۱۹۱۱ء کے انقلاب کے بعد شہنشاہی ختم ہوئی اور جمہوریت قائم ہوئی اور شروع ہی سے ارادہ تھا کہ ان محلوں کو عوام کے لیے کھول دیا جائے لیکن قدیم

روایات کا اثر اس قدر گہرا ہوتا ہے کہ ۱۹۲۵ء میں جاکر ایسا ہو سکا! بعض اور چیزیں جو ایک روز کے قیام میں دیکھ سکا یہ ہیں!

DRUM TOWER ایک بہت اُونچی عمارت ہے جس کے ساتھ مارکو پولو کا نام وابستہ ہے وہ ایک زمانے میں پیکن آکر یہاں ٹھیرا تھا۔ سب سے اوپر کی منزل میں ایک بہت بڑا ڈھول رکھا ہے (جو ایک طرف سے پھٹا ہوا ہے!) جس کو خطرے یا کسی اور اہم ضرورت کے وقت بجایا جاتا تھا۔ (اس کے مقابلے میں ایک BELL TOWER ہے جس میں ایک بہت بڑا گھنٹہ اسی مقصد کے لیے ہے) نیچے کی کئی منزلوں میں ایک عجائب خانہ ہے جس میں مختلف قسم کی صنعتوں اور تاریخی چیزوں کی نمائش ہے جو تعلیم بالغان کے سلسلے میں استعمال کی جاتی ہیں۔ اس سے چین والوں کی نظر میں تعلیم کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

ایک بہت دل چسپ عمارت کنفیوشس کا مندر ہے، بہت بلند چھت پر LEAGUER کا سرخ اور سبز اور نیلا بہت خوبصورت کام ہے (اس قسم کا دیواروں پر بھی ہے) اور سُرخ رنگ کے گول ستون ہیں۔ عمارت کیا ہے ایک بڑا سا باعظمت اور خاموش ہال ہے جس میں کوئی بُت وغیرہ نہیں (جیسے بدھ مندروں میں عام ہیں) نہ کوئی پروہت ہیں۔ بیچ میں ایک پلیٹ فارم ہے جس پر شہنشاہ کے بیٹھنے کی کرسی ہے۔ وہ یہاں آکر اپنے وزرا کو لکچر دیتے تھے اور تمام سول سروس کے امیدواروں کا آخری امتحان خود لیتے تھے! (ان میں سے اکثر خود اچھے ادیب اور عالم ہوتے تھے) مندر کے باہر سائبانوں کے نیچے پتھر کی بہت سی لاٹیں ہیں۔ جن پر ان تمام امیدواروں کے نام (کئی صدیوں کے!) کندہ ہیں۔ جو امتحان میں پاس ہوتے تھے۔ بعض لاٹوں پر مشہور چینی تصانیف CLASSICS کندہ ہیں۔ یہ گویا ایک قسم کی انمٹ لائبریری ہے جو آسانی سے تباہ نہیں ہوسکتی۔ مندر سے باہر بھی جا بجا نقشین پتھروں کی لاٹیں بنی ہوئی ہیں جن پر کنفیوشس کے ارشادات لکھے ہیں۔

شہر کے میر کی طرف سے ہم لوگوں کی پارٹی PEI-HEI پارک میں ہوئی تھی جو ایک بلند پہاڑی پر واقع ہے۔ وہاں سے "شہرممنوع" اور جھیل کا بہت دل کش نظارہ دکھائی دیتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس پہاڑی پر "کبلا خاں" کا مکان تھا (یہاں ہر چیز مارکو پولو ہے یا کبلا خاں!)

اگلے روز (۱۹؍ کو) ہمیں روانہ ہونا تھا۔ اس لیے صبح کو بہت جلدی میں علاوہ "سرما محل" کے صرف TEMPLE OF HEAVEN دیکھ پائے جہاں شہنشاہ سالِ نو کے پہلے دن صبح کی پو پھٹنے سے پہلے آکر کوئی مذہبی رسم (شاید بدھ کا بت ایک عمارت سے دوسری عمارت میں منتقل کرنے کی رسم) ادا کرتے تھے۔ یہ مندر بھی دوسرے مندروں کی طرح فراخ، بلند اور پُرعظمت ہے اور نیلی خوبصورت کھپریلوں کی چھت اور اندر اور باہر کی میناکاری دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

یہاں کے قیام میں چین کے مشہور عالم ڈاکٹر HU SHICH سے ملاقات ہوئی جو پے پنگ یونی ورسٹی کے چانسلر ہیں۔ ان سے اس اسکیم کے متعلق گفتگو ہوئی جو انھوں نے چینی یونی ورسٹیوں کی مزید ترقی اور استحکام کے لیے بنائی گئی ہے تاکہ چینی طلبہ کو ہر ذرا سی چیز کے لیے باہر کی یونی ورسٹیوں میں نہ جانا پڑے بلکہ اعلا تعلیم زیادہ تر اپنے ہی ملک میں ہو۔ صرف خاص خاص مضامین مثلاً غیر زبانوں کی تکمیل کے لیے باہر جائیں۔ ہمیں ہندوستان میں بھی اس مسئلے پر بحث کرکے اس کا مناسب انتظام کرنا ضروری ہے۔ پے پن میں ہمارا قیام گرینڈ ہوٹل میں ہوا جو وہاں کا بہت اچھا ہوٹل سمجھا جاتا ہے لیکن شانگھائی کے ہوٹلوں کے مقابلے میں بہت پُرانے فیشن کا ہے۔

پے پن کے ایک اخبار میں دیکھا کہ ۱۸؍ کو وہاں ایک چھوٹا سا بلوہ ہوگیا۔ وہاں کے کسی اخبار نے شانگھائی کے اخبار سے نقل کرکے کوئی خبر چھاپی تھی جس پر مسلمانوں کو اعتراض تھا کہ وہ اسلام کی توہین اور اس کی غلط تعبیر کرتی ہے۔ انھوں نے اخبار کو نوٹس دیا کہ معذرت کرے اور معافی مانگے اور جب اس میں تاخیر یا انکار ہوا تو انھوں نے اس کا تمام پریس وغیرہ جاکر توڑ پھوڑ ڈالا مجھے یہ اندازہ نہ تھا کہ چین کے مسلمانوں میں کوئی خاص جوش یا احساس مذہبی معاملات میں ہے۔ واقعہ کی تفصیلات معلوم نہ ہوسکیں۔

۲۰؍ ستمبر

آج کا دن شانگھائی میں گزرا۔ میں نے یہاں سے کوئی بارہ پندرہ میل باہر ایک دیہات کا ہائی اسکول (جسے یہاں مڈل اسکول کہتے ہیں) دیکھا جس کا نام ہے CHENGARE PROVINCIAL MIDDLE SCHOOL بہت بڑا اسکول ہے سوا سو کے قریب طلبا مڈل سیکشن میں اور چھ سو

پرائمری میں ہیں۔ عمارتیں ہمارے یہاں کے اچھے کالجوں کی ٹکر کی ہیں ان میں سے تین جاپانیوں کے حملے کے زمانے میں تباہ ہوگئی تھیں لہٰذا بہت سے طلبا کو (سب کے سب کی رہائش بورڈنگ ہاؤس میں ہے) ان DORMITORIES میں رکھا جاتا ہے جو جاپانیوں نے CONCENTRATION CAMP کے طور پر بنائی تھیں۔ ہر ایک میں ساٹھ کے قریب طلبا آتے ہیں۔ لوہے کے پلنگ، ایک رنگ کے پلنگ پوش، چھت میں لگی ہوئی مچھردانیاں جو دن میں اوپر کھینچ کر ایک چھتری سی بن جاتی ہیں اور بکس ٹرنک بستر کے نیچے کھانے کے کمروں میں آٹھ بچے ایک میز پر کھاتے ہیں۔

سرپوش سے ڈھکی ہوئی چار پلیٹیں کھانوں کی میز پر رکھی ہوتی ہیں۔ ہر بچہ الماری میں سے اپنا پیالہ، چمچہ اور چاپ اسٹک اٹھا کر لاتا ہے اور کھانے کے بعد انھیں دھو کر رکھ دیتا ہے۔ کھانا ختم ہونے کے بعد سرپوش ڈوریوں کے ذریعہ کھنچ کر چھت پر پہنچ جاتے ہیں!

اس مدرسے میں جو COMPREHENSIVE TYPE کا ہے (جسے انگلستان میں MULTI-LATERAL کہتے ہیں) تین شعبے ہیں، سائنس (جو سب سے زیادہ مقبول ہے) تجارت اور انجینیرنگ۔ چھ سال کا کورس ہے تین سال جونیر کے جو مشترک ہیں اور آخری تین سال جن میں طلبا ایک خاص شعبے کو پسند کرتے ہیں۔ تیسرے سال میں بچوں کو ان کی صلاحیت معلوم کرنے کے لیے EXPLANATORY کورس دیے جاتے ہیں اور استاد والدین اور بعض دفعہ بیرونی ماہرین مل کر طلبا کو VOCATIONAL GUIDANCE دیتے ہیں۔ تاکہ وہ مناسب کورس کا انتخاب کرسکیں۔ ضرورت ہو تو کورس کو ۱۱ گریڈ کے بعد بدلا بھی جاسکتا ہے۔ اسکول میں ۳۳ سیکشن اور ۸۰ نمبران سٹاف ہیں۔ جن کے رہنے کا انتظام اسکول کے CAMPUS پر ہی ہے بچوں سے صرف کھانے کا خرچ لیا جاتا ہے۔ عملی کام کے لیے بہت اچھی WORKSHOP ہیں۔ جہاں میں نے طلبا کو مستعدی سے کام کرتے دیکھا۔ اسپتال کا انتظام بھی ہے۔

ابتدائی مدرسے میں بھی بچوں کی رہائش کا انتظام ہے۔ ہر عمارت میں ایک طرف کلاس روم اور برآمدے کے دوسری طرف رہنے کے کمرے (وہی لمبی لمبی DORMITORIES) میرا اس اسکول میں آنا صرف گزشتہ شام کو ہی طے ہوا تھا۔ لیکن ان لوگوں کا STAGE MANAGING اچھا معلوم ہوتا ہے کیوں کہ صبح کو ہم پہنچے تو کئی جماعتوں میں ہندوستان پر سبق دیے جارہے ہیں۔

ایک میں گاندھی جی کے متعلق۔ (جن کا ذکر معلوم ہوا، چین کی تمام کورس کی کتابوں میں ہے)۔ ایک میں ترکِ موالات کی تحریک کے بارے میں اور ایک میں ہندوستان کی پیدا وار ہے ادا خلے کے ہال میں بورڈ پر ہندوستان اور چین کا نقشہ لگا ہوا تھا اور اس میں جنرل چانگ کائی شیک اور گاندھی جی کی (جوانی کی) تصویر ا

۱۲ر ستمبر

آج چین سے واپس جا رہا ہوں اور ہندوستان کا خیال کر کے دل اُداس اور اُچاٹ ہے۔ ہوائی جہاز کے اڈے پر مجھے ہندوستانی قونصل مقیم شانگھائی کیپٹن R.D. SATHE نے پہنچایا۔ جو ایک نوجوان اور خاصے سمجھدار اور مستعد افسر ہیں۔ کل انھوں نے کھانے پر بلایا تھا اور وہاں منجملہ اور لوگوں کے ڈاکٹر لوکا ناتھن (U.N. کے اقتصادی افسر) اور ایک پارسی مسٹر ڈوڈا سے ملاقات ہوئی جو پچاس سال سے چین میں ہیں اور خاصے دل چسپ اور باتونی آدمی ہیں انھوں نے چینیوں کے متعلق بہت سی باتیں بتائیں۔ لیکن بحیثیت مجموعی ان کے معترف ہیں۔

شانگھائی سے پے پنگ کا واپسی کا کرایہ تقریباً ۸۰۰/- روپیہ ہیں اور شانگھائی سے کلکتہ تک کا کرایہ ۱٫۸۰۰٬۰۰۰/- ڈالر (چینی) ہے! جس کے کوئی ۲۵۰/- روپے ہوتے ہیں۔

ہانگ کانگ

۱۲ر کو شانگھائی سے چل کر ہانگ کانگ میں ٹھیرا۔ جہاز والوں کی نالائقی کی وجہ سے کسی ہوٹل میں جگہ نہ ملی اس لیے بہت تلاش کے بعد مجھے اور نیپال کے دو نمائندوں N.A. DIKSHIT کو ایک چھوٹے سے کمرے میں جگہ ملی جو Y.M.C.A کی عمارت میں تھا۔ ورنہ رات بیٹھے بیٹھے گزارنی پڑتی۔ ہم KOWLOON کے جزیرے میں ٹھیرے تھے اور سامنے دوسرے ساحل پر ہانگ کانگ کا شہر تھا ایک پہاڑی پر بسا ہوا۔ رات کو اس کی خوبصورت روشنیاں اس طرف سے ایسی معلوم ہوتی تھیں جیسے ایک خوبصورت کنگن میں رنگ برنگ کے جواہرات جڑے ہوں۔ شہر دیکھنے

کو دل نہیں چاہا۔ وقت جوں کا توں گزار دیا۔

چین کے متعلق بعض اہم اور سرسری تاثرات اور تجربات

تین ہفتے کے سرسری قیام میں چین جیسے عظیم الشان اور وسیع مُلک کے متعلق رائے دینا (خصوصاً جب زبان سے ناواقفیت ہو اور صرف ایک ہی طبقے کے لوگوں سے ملنے کا موقع ملا ہو) بہت مشکل ہے۔ اس کے لیے ایک عمر بھر کا مطالعہ درکار ہے۔ اس لیے محض چند مشاہدات پر اکتفا کرتا ہوں۔

۱۔ چین کے لوگ بہت چُست ہیں اور ان میں زندہ رہنے کی غیر معمولی صلاحیت ہے مصیبت اور پریشانی سے پریشان نہیں ہوتے خوش باش رہنے کے قائل ہیں۔ جنگ کی آگ سے گزرے اور خانہ جنگی جاری ہے لیکن ہر طرف چہل پہل رونق نظر آتی ہے دوکانیں اس قدر دیسی اور بدیسی مال سے بھری ہوئی ہیں کہ آنکھیں حیران رہ جاتی ہیں اور دماغ پوچھتا ہے چین کا متوقعہ اور اخباری ECONOMIC COLAPSE کہاں ہے! لوگ ہندوستان کی نسبت بہتر لباس پہنتے ہیں! غالباً بہتر خوراک کھاتے ہیں اور (بظاہر) مستقبل کے تصوّر کا بوجھ ان کے دل و دماغ کو زیادہ نہیں دباتا عورتیں ہندوستان کی نسبت زیادہ آزاد ہیں اور ہر قسم کا کام کرتی ہیں۔ شہروں میں لباس مغربی ہے اور گاؤں وغیرہ میں ملا جُلا۔ ڈالر کی قیمت ندارد ہے۔ ہر چیز گراں ہے لیکن لوگ خوب چیزیں خریدتے نظر آتے ہیں۔ بازاروں کی رونق مندی نہیں پڑی۔

۲۔ چین میں بچے بے تحاشا پیدا ہوتے چلے جاتے ہیں! ہر جگہ ان کی ریل پیل ہے۔ ریلوں میں، ہوائی جہاز میں سڑکوں پر ہر عورت کے ساتھ دو تین بچے، اسکولوں میں بچے عام طور پر خوش، مستعد اور تندرست اور خوش پوشاک نظر پڑے۔ ممکن ہے ہم نے صرف نمائشی اسکول دیکھے ہوں۔ لیکن بہرحال عام طور پر ان کی ظاہری، جسمانی اور تعلیمی حالت اچھی ہے انھوں نے جو کھیل ڈرامے، موسیقی وغیرہ کے مظاہرے دکھائے ان سے ان کی تخلیقی صلاحیتوں کا اندازہ ہوتا ہے اگر بچوں کی تعلیم ان معیاروں اور اصولوں پر ہو تی رہی جو اچھے اسکولوں میں پائے جاتے ہیں تو چین کا مستقبل اچھا ہے۔

۳۔ چین میں تعلیم کی بہت قدر ہے۔ مدرسوں میں اور تعلیمِ بالغان کے مرکزوں میں تعداد اس قدر ہے کہ ان کے لیے گنجائش نہیں نکلتی۔ حاضری کا مسئلہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ پڑھنے والے جوق درجوق آتے ہیں (کم سے کم مجھے یہی اندازہ ہوا) جنگ کے زمانے میں تعلیم کو بہت نقصان پہنچا لیکن ان بے ڈھب لوگوں نے دو سال میں بہت کچھ کمی پوری کرلی ہے۔ اس کا ایک سبب یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہاں تعلیمی DECENTRALIZATION ہے۔ ہر ضلع کا کمشنر تعلیمی اور مقامی حکام وہاں کے تعلیمی مسائل میں واقعاً دل چسپی لیتے ہیں اور کام کو بڑھانے کی فکر میں لگے ہوئے ہیں۔ تعلیمِ بالغان (جس کا مناسب نام یہاں SOCIAL EDUCATION ہے) کا دیہاتی اور سماجی تعمیر سے قریبی تعلق ہے اور اس کے سلسلے میں بہت سا مفید تجربی کام کیا گیا ہے روشی، سوچاؤ، شانگھائی وغیرہ میں ہم نے بہت عمدہ اور ACTIVE مرکز اور استادوں کے ٹریننگ سنٹر دیکھے جن میں (امریکن تعلیمی روایات کے زیرِ اثر) خوب کام ہو رہا ہے۔ اور خاص طور پر زبان کی تعلیم اور عام طور پر FILMS وغیرہ کے موثر استعمال کے بارے میں تجربے کیے جا رہے ہیں۔ طریقۂ تعلیم کے بارے میں خاصی آزادی ہے کسی بندھے ٹکے طریقہ کی پابندی پر زور نہیں دیا جاتا۔

۴۔ اکثر جگہ ہم نے دیکھا کہ تعلیم گاہوں کی عمارتوں کا معیار ہندوستان سے کہیں بہتر اور دراصل بہت اچھا ہے مثلاً شانگھائی میں بعض پرائمری اسکول اور تعلیمِ بالغان کے مرکز ہمارے اچھے کالجوں کی ٹکر کے ہیں سوچاؤ کا ٹریننگ کالج ایک باغ میں واقع ہے۔ جو چین کے مشہور ترین باغات میں سے ہے (اور جہاں جنگ کے زمانے میں جاپانیوں نے اپنی کٹھ پتلی حکومت کا ہیڈکوارٹر رکھا تھا)۔ بعض جگہ مندروں کی وسیع عمارتیں اسکولوں کو دے دی گئی ہیں یہ ایسی صورت میں ہو سکتا ہے جب لوگوں اور حکومت کو تعلیم کی اہمیت کا صحیح احساس ہو۔

۵۔ لوگ بہت خلیق اور مہمان نواز ہیں۔ کوئی جلسہ یا معائنہ یا تقریب بغیر چائے پلائے، فوٹو لیے، دو تین مرتبہ کاغذوں پر نام لکھائے شروع نہیں ہو سکتا انھوں نے کام کو ضیافت وغیرہ کے ساتھ ملا کر ایک خاص خوش گوار چیز بنا دیا ہے (گو میرا تو معدہ چین کے کھانے نے خراب کر دیا!) تقریریں کرنے اور کرانے کا بہت شوق ہے۔ مجھے چھوٹی بڑی درجنوں تقریریں کرنی

پڑیں۔ جب تک یہ نہ ہو وہ سمجھتے ہیں میزبانی کا صلہ نہیں ملا! (ساتھ ہی بعض لوگ کہتے ہیں کہ اگر چینی کسی سے واقف نہ ہوں تو بہت بدسلوکی بھی کرتے ہیں!) ہر مدرسے میں جہاں ہم جاتے تھے کئی کئی فوٹوگرافر تصویریں لیتے رہتے تھے (ان کے یہاں اس سامان کی بھی کوئی کمی نہیں) کاشتکاری بڑی محنت سے کرتے ہیں۔ تمام قابلِ کاشت علاقہ ایک نہایت مرتب نقشہ معلوم ہوتا ہے۔ بعض حصوں میں آبادی اس قدر گنجان ہے کہ ایک ایک میل میں کئی کئی گاؤں ہیں اور ہوائی جہاز سے میلوں تک میدان گاؤں سے بالکل بھرے ہوئے ہیں۔ جہاں ہری بھری کھیتیاں اہلِ چین کی محنت اور سلیقہ کی خبر دیتے ہیں۔ لیکن ابھی تک کاشت کا طریقہ پُرانا ہے۔ جدید آلات کا استعمال بہت کم ہے سنا ہے کہ گاؤں پہلے بہت جگہ SELF SUFFICIENT تھے۔ اب نہیں رہے البتہ اب بھی گاؤں والوں کو کھانے کو مل جاتا ہے۔ اور اگر کوئی شخص شہر میں تجارت کرتے کرتے ناکام ہو جاتا ہے تو وہ گاؤں جاکر اپنے بھائیوں کے ساتھ رہ سکتا ہے۔ اور کھا سکتا ہے۔

۶۔ چین والوں کی انگلیوں میں صنعت اور حسن کاری کا مادّہ ہے۔ ان کا ریشم، لاکھ کا کام، پنکھے اور چھتریاں، خوبصورت کھلونے، مکانوں کی آرائش اور تعمیر غرض بہت سی چیزوں سے ان کی خوش مذاقی اور کمال ظاہر ہوتا ہے۔ (گو کھانا بدتمیزی سے کھاتے ہیں!)۔ ان کی تحریر بجائے خود نقاشی ہے اور مکانوں اور دوکانوں کے نام (جن پر ایک قسم کا سنہری روغن ہوتا ہے اور NEON LIGHTS میں لکھے ہوئے۔ بورڈ اور اشتہار دن اور رات میں اس قدر خوبصورت معلوم ہوتے ہیں کہ سارے کا سارا بازار سج جاتا ہے اور کسی دوسری آرائش کی ضرورت ہی نہیں رہتی!

۷۔ چینی لوگوں میں SAVING THE FACE کا بڑا زور ہے۔ کوئی بات ایسی نہ ہو جس سے بظاہر کسی چینی کی سبکی یا ہتک ہوتی ہو! اس کو کوئی اصلی نقصان یا خرابی یا اپنی ذاتی بُرائی اس قدر نہیں کھلتی جس قدر دوسرے آدمیوں کے سامنے کسی طرح کی سبکی کا ہونا۔ یعنی ان کے نزدیک (ایک معنی میں) بدنام ہونا بد ہونے سے بدرجہا بدتر ہے۔ لہٰذا بدیسی لوگوں کو کوئی ایسی بات نہ کرنی چاہیے جس سے ان کا FACE جاتا رہے!

۸۔ دفتروں وغیرہ میں EFFICIENCY اچھی نہیں ہے ہر بات کو O.K. کہہ دیتے ہیں لیکن اکثر وہ نہیں ہو پاتی! پابندی وقت کا احساس نہیں ہے۔ اجتماعی ذمہ داری اور شہری فرائض کا احساس بھی کم ہے۔ در اصل (بقول ایک چینی پروفیسر کے) ان کی سیرت میں ایک بنیادی عنصر ANARCHISM (مزاج) کا ہے جس کی اجتماعیت COLLECTIVISM سے کش مکش رہتی ہے۔ اور شاید ابھی تک مزاجیت ہی غالب ہے۔ اسی وجہ سے عام طور پر پبلک لائف میں دیانت کی کمی ہے۔ اور چین کی ایک بڑی مشکل یہ ہے کہ اس کے بیشتر افسر (خصوصاً نیچے کے طبقے کے) بد دیانت سمجھے جاتے ہیں۔ حکومت اس کے خلاف کارروائی کرنا چاہتی۔ لیکن کامیاب نہیں ہوتی۔ ملک میں "کالی منڈی" نہایت آزادی کے ساتھ اپنا کام کرتی ہے۔ کوئی کچھ نہیں کر سکتا!۔

۹۔ حکومت زیادہ تر سرمایہ دار، فوجی اور امرا کے طبقے کے ہاتھ میں ہے۔ کمیونسٹ سے جنگ، اس کی وجہ سے روس سے بدگمانی اور خوف، امریکہ کی پشت پناہی اور تقلید کی وجہ سے سیاست میں ترقی پسندی نہیں ہے۔ ابھی تک الیکشن کا رواج نہیں۔ نیا دستور بن گیا ہے لیکن اس پر عمل نہیں ہوتا۔ میونسپلٹی تک میں انتخاب رائج نہیں ہوا۔ چین کی تاریخ میں پہلا میونسپل انتخاب آج شروع ہو رہا ہے!..... یونی ورسٹیوں وغیرہ میں ایک حد تک موجودہ سیاسی SET UP کے خلاف ردّ عمل ہے اور وہاں کسی قدر RADICALISM پایا جاتا ہے لیکن بظاہر عام لوگوں کو نہ سیاست سے زیادہ گہری دل چسپی ہے نہ مذہب سے۔ (مندروں وغیرہ میں عبادت کے بجائے زیادہ تر لوگ سیر کرنے جاتے ہیں۔ اہلِ علم کا طبقہ خود کو بیشتر AGNOSTICS میں شمار کرتا ہے)۔ دونوں کے متعلق لوگ گفتگو کرنے سے پرہیز کرتے ہیں (برخلاف ہندوستان کے جہاں انھیں دو چیزوں میں لوگوں کو دل چسپی ہے، یہی گفتگو اور توجہ کا موضوع ہیں اور انھیں کی غلط وابستگی نے ملک کا آج یہ حال کر دیا ہے!)۔

۱۰۔ EATING THE RICH (امیروں کو کھانا) بھی کبھی آپ نے سُنا ہے؟ یہاں کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ غریب اور فقیر لوگ بھوک سے تنگ آ کر ہوٹلوں، ریسٹورانٹ اور امیروں کے مکانوں میں گھس جاتے ہیں۔ اور جو کچھ مل جاتا ہے سب کھا لیتے ہیں۔ پولیس وغیرہ روک تھام

کی کوشش کرتی ہے (ذرا نیم دلی کے ساتھ!) لیکن زیادہ کامیابی نہیں ہوتی ..... فقیر ہیں لیکن شاید ہندوستان کی نسبت کم ہیں۔ ان کے لیے ابھی تک کوئی باقاعدہ منظم تدبیر نہیں مرتب کی گئی ہے۔

۱۱۔ چینی اخبار تو میں پڑھ نہیں سکتا۔ لیکن یہاں کے انگریزی اخباروں میں امریکن نامہ نگاروں کی بدولت اور (غالباً انگریزوں کی بھی) ہندوستان کے خلاف کافی شدید پروپگنڈا ہے اور وہاں کے فسادوں کا حال (جن کی وحشیانہ شدّت سے کون انکار کر سکتا ہے؟) بہت تفصیل اور مبالغہ کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔ مثلاً یہ کہ پنجاب میں اس قدر آدمی مارے گئے کہ گزشتہ جنگِ عظیم میں بھی اتنے نہ مارے گئے تھے۔ کلکتہ کی گلیاں خون سے رنگین ہیں (یہ ۳؍ کے اخبار میں تھا اور ہم ۲؍ کو کلکتہ میں تھے!) ان بیانوں کو دیکھ کر میں نے اور جہانے (مینن صاحب کے مشورے سے) اخباروں کو ایک بیان دیا تھا اور اس میں بتایا تھا کہ فساد کی تہہ میں اکثر ANTI SOCIAL عناصر کا ہاتھ بھی ہوتا ہے اور ان کا واقع ہونا مسلم اور افسوسناک ہے۔ لیکن ان پر بغلیں بجانا اور حکومت کی کوششوں کو نظرانداز کر کے محض قتل و غارت کے قصّے بیان کرنا خلافِ انصاف ہے۔ اس وقت تو میں نے یہ بھی لکھا تھا کہ کلکتہ اور پنجاب کے متعلق بہت مبالغہ کیا جا رہا ہے لیکن اس میں (بعد کی خبروں سے اندازہ ہوا) میری خوش فہمی کو بھی دخل تھا کیوں کہ کلکتہ کے فساد تو دب گئے لیکن پنجاب میں جو ہوا اس کے خیال سے دل کانپتا ہے ......

۲۲؍ستمبر تا اکتوبر

ہندوستان خیریت سے پہنچا۔ لیکن یہاں آکر پتہ چلا کہ اس عرصے میں ملک پر کیا قیامت گزر گئی ہے۔ دہلی کے فساد کا جو حال وہاں اخباروں میں پڑھا تھا اس کی مبالغہ آفرینی بھی حقیقت کے مقابلے میں ہلکی ثابت ہوئی۔ یوں تو پنجاب میں جو کچھ ہوا اس کی وجہ سے ہندوستان کی عزّت خاک میں مل چکی ہے۔ لیکن دہلی کے خونی واقعات نے رہی سہی تہذیب اور تمدن اور اس کے دعووں کا خاتمہ کر دیا۔ حکومتِ ہند کے صدر مقام پر، حکام کی موجودگی

میں، پولیس اور فوج کی آنکھوں کے سامنے اس قدر بلوہ اور خوں ریزی اور مسلمانوں کا خون ہوا، ہندو بھی بہت سے مارے گئے لیکن اس معاملے میں زیادتی ان کی طرف سے تھی. کیوں کہ ان کی تعداد کہیں زیادہ تھی اور راشٹریہ سیوک سنگھ (سیوا کے خوبصورت لفظ کو شرمندہ اور ذلیل کرنے والے!) وغیرہ نے باقاعدہ اس "جہاد" کی تیاری کی تھی۔ سوائے جواہرلال کے، جنھوں نے اس موقع پر ایسی جرأت اور فراخ دلی اور انسانیت سے کام لیا کہ ان کا ذہنی اور اخلاقی نقش اور زیادہ گہرا ہو گیا ہے، حکومت کے باقی بااثر لوگوں میں سے کسی نے وہ سب نہیں کیا جو کرنا چاہیے تھا. پولیس اور فوج فسادیوں کے ساتھ مل گئی اور تین دن تک غدر کی سی کیفیت رہی. نہ جان کی قیمت تھی نہ مال کی. ہزاروں آدمی مارے گئے. دہلی کے تقریباً تمام مسلمان لال قلعہ اور ہمایوں کے مقبرے میں جاکر پناہ گزیں ہوئے اور وہاں دو لاکھ کے قریب آدمی ہفتوں رہے اور اس کے بعد ان میں سے بیشتر کو پاکستان جانا پڑا۔ جامعہ پر بھی کافی تشویش کا وقت آیا تھا لیکن ذاکر صاحب کی نیکی اور خلوص اور جواہرلال اور مولانا وغیرہ کی کوشش اور فوجی امداد سے جامعہ نگر تو محفوظ رہا۔ البتہ قرول باغ کے تمام ادارے مع تعلیمِ بالغان کے مرکز، کتب خانہ اور پبلشنگ ہاؤس کے جنون کی نذر ہو گئے. مکتبہ کی تباہی کی وجہ سے مصداق، عابد صاحب، ذاکر صاحب، بھابی قدسیہ کی کتابوں کا بھی کافی نقصان ہوا. اور اس علمی اور ادبی نقصان کا تو کیا ذکر ہے جو اس ۲۵ سالہ خدمت کے تباہ ہو جانے سے ہوا. (ضمناً یہ کہ میرا "آندھی میں چراغ" کا مسودہ اور اس کی کاپیاں بھی نذرِ آتش ہو گئیں!) ذاتی نقصانوں میں اظہر اور قیصر کے مکانوں کا لٹنا، ساجدہ اور اس کی بہنوں کے تمام سامان کی بربادی بھی شامل ہیں۔ اظہر اور ان بچیوں کی جان ان کے پڑوسیوں (ایک ہندو اور ایک سکھ) کی شرافت اور انسانیت کی وجہ سے بچی. اس کے بعد کئی دن تک یہ سب لوگ مولانا ابوالکلام آزاد کے ہاں "مہاجرین" کی حیثیت سے رہے. اور انھوں نے اپنے نقصان اور عام پریشانی کا مقابلہ بہت بہادری اور خندہ پیشانی کے ساتھ کیا جس کے اظہر اور ہم سب معترف ہیں. امید ہوتی ہے کہ اس ابتلائے عظیم کا اثر ان سب کی طبیعت اور شرافتِ نفس پر اچھا پڑے گا. اس کے بعد اظہر

ہوٹل میں آ گئے اور بچوں کو زیدی صاحب اور بہت سے لوگوں کے ساتھ ایک سپیشل ٹرین میں رام پور لے گئے۔ میں شروع اکتوبر میں دہلی گیا تھا تاکہ پانی پت کے پریشان کن حالات کے متعلق مہاتما جی، پنڈت نہرو اور دوسرے اراکین حکومت سے گفتگو کریں۔ ان دونوں سے اور مولانا سے مفصل گفتگو ہوئی۔ انھوں نے کافی ہمدردی کا اظہار کیا۔ میرا کہنا یہ تھا کہ اتفاق سے اب تک پانی پت میں ہندو مسلم جھگڑا نہیں ہوا۔ اور ان کے باہمی تعلقات اچھے ہیں۔ لیکن باہر کے شنار تھیوں (خصوصاً سکھوں) کے آجانے کی وجہ سے وہاں بھی صورتِ حال تشویش ناک ہوتی جاتی ہے اور مقامی حکام کی بدسلوکی کی وجہ سے انھیں بھی پاکستان جانے پر مجبور کیا جا رہا ہے۔ اس طرح جبراً لوگوں کو ملک بدر کرنا بہت بُری بات ہے اور حکومتِ ہند کو چاہیے کہ وہ ہر ممکن کوشش کر کے اس قسم کی جو چند POCKETS OF GOOD WILL رہ گئی ہیں۔ ان کو قائم رکھیں۔ جواہرلال اور گاندھی جی دونوں نے اس اصول سے اتفاق کیا۔ لیکن جواہرلال نے کہا کہ حکومت اس قسم کا فیصلہ کر سکتی ہے جس پر اس کو عمل کرانے کی صلاحیت ہو اور ان کے بیان سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ فوج اور پولیس اور مقامی حکام اور حکومت کی جو ذہنی اور اخلاقی حالت ہے اس میں حکومت کیسے مسلمانوں کو ہر جگہ اطمینان دلا سکتی ہے کہ ان کی جان مال کی ضرور حفاظت کر سکے گی۔ جواہرلال کی دیانت داری اور خلوص اور انسانیت کی تعریف کرنا مشکل ہے۔ لیکن مجھے اندازہ نہیں کہ حکومت کے اراکین کس حد تک اس وسیع القلب اور وسیع النظر پالیسی میں ان کا ساتھ دیں گے۔ بہرحال یہ یقین ہے کہ حکومت میں دو پارٹیاں ہیں اور ملک کے مستقبل اور اس کی تہذیب اور اخلاق کا انحصار اس امر پر ہے کہ ان میں سے کون سی پارٹی ملک میں غالب رہتی ہے۔ مسلمانوں کی عافیت اس میں ہے کہ اس پارٹی کا ساتھ دیں جو جواہرلال کی قیادت میں ملک کی تشکیل کرنا چاہتی ہے۔ اور اگر پاکستان کے اربابِ حل و عقد میں عقل ہو تو وہ ایسی پالیسی اختیار کریں کہ اس کی بدولت ایسی پارٹی کے ہاتھ مضبوط ہوں۔ لیکن ان کے جو سیاسی لیڈر اور مقرر ہیں وہ برابر ایسے بیان دے رہے ہیں اور اس قسم کی حرکتیں کر رہے ہیں جن کی وجہ سے ہندوستان کی متعصب اور مسلم دشمن، مسلم آزاد پارٹی کے ہاتھ مضبوط ہوتے ہیں

اور بیک وقت جواہرلال کی اور ہندوستان کے مسلمانوں کی پوزیشن خراب ہوتی ہے۔ سچ ہے جب کسی قوم کے بُرے دن آتے ہیں تو پہلے اس کی مت ماری جاتی ہے......

ذاکر صاحب اور جامعہ والوں نے، خصوصاً ان کے سکاؤٹس نے اس زمانے میں جس خلوص اور قابلیت کے ساتھ پناہ گزینوں کے کیمپ میں جاکر کام کیا ہے۔ اس سے ذرا امید کے چراغ میں تیل پڑتا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ ایسے لوگ اس وقت بھی موجود ہیں۔

ذاکر صاحب سے یہ بھی معلوم ہوا کہ قرول باغ میں جامعہ کے شاید ۵۵ سکاؤٹس میں سے چالیس سے زیادہ کام آئے۔ لیکن انھوں نے اس قیامت کے ہنگامے میں اس قدر خدمت کی کہ ذاکر صاحب کو رنج سے زیادہ فخر ہے (اور بقول ان کے) جو چند سکاؤٹ باقی بچے ہیں وہ اس قدر پختہ ہو گئے ہیں کہ "ایک EMPIRE قائم کر سکتے ہیں" ہندوؤں میں بھی بعض ایسے لوگ ہیں جنھوں نے اپنا توازن ذہن و اخلاق قائم رکھا ہے۔ مثلاً رگھونندن صرن، ان سے مفصل گفتگو ہوئی اور اندازہ ہوا کہ دہلی میں جو کچھ ہوا اس کا لوگوں کو پہلے سے اندازہ اور علم تھا اور خود انھوں نے سردار پٹیل وغیرہ سے ان تمام تیاریوں کا حال بیان کیا تھا جو دہلی میں راشٹر سیوک سنگھ وغیرہ کے زیر اہتمام مسلمانوں کو ختم کرنے کے لیے کی جارہی تھیں۔ لیکن انھوں نے اس تمام WARNING پر کان نہیں دھرا اور کہا کہ دہلی میں کچھ نہیں ہو سکتا اور جب یہ تمام قتلِ عام ہو چکا تو اس کے بعد بھی مقامی حکام اور پولیس کے خلاف کوئی ACTION نہیں لیا! ان کے بیان کی تصدیق ان انکشافات سے بھی ہوتی ہے۔ جو کمیونسٹ اخبار PEOPLE AGE گزشتہ چند ہفتوں میں چھپتے رہے ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون!

میں نے ابھی چند روز ہوئے احمد آباد میں جاکر ہیڈ ماسٹران ہائی اسکول کی کانفرنس میں شرکت کی تھی اور وہاں ان کی درخواست پر تعلیم کے مستقبل پر ایک تقریر بھی کی تھی۔ کانفرنس میں کوئی دو سو کے قریب کارکن شریک ہوئے تھے۔ اور بحث و مباحثہ اچھا خاصا تھا۔ اس موقع سے فائدہ اُٹھاکر میں نے احمد آباد کے ٹریننگ کالج (اُردو، مرہٹی، مردانہ و زنانہ) دیکھے۔ کام اچھا ہے لیکن مری نگر اور جموں کے کالجوں کے ساتھ لگاؤ نہیں کھاتا۔

منحوس شام

۱۹۴۸

۳۰ جنوری

آج شام ۵ بجے جب گاندھی جی اپنی پرارتھنا سبھا میں جا رہے تھے تو ان کو ایک شخص نے پستول چلا کر ہلاک کر دیا۔ اور اس طرح ہندوستان اور ایشیا بلکہ دنیا کی امیدکا یہ چراغ ہمیشہ کے لیے گُل ہو گیا۔ اور اس کا قصور کیا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ ہندو، مسلم، سکھ سب آپس میں محبت اور اتفاق سے رہیں۔ مسلمانوں کے ساتھ ظلم اور ناانصافی نہ کی جائے ہندوستان اور پاکستان دونوں میں حال کے واقعات اور حادثات کی وجہ سے جو زہر بھر گیا ہے اس کو دُور کیا جائے، اور وہ اس بات کو کہتا تھا یہ اچھی طرح جان بوجھ کر کہ اس کے بے شمار ہم وطنوں کو یہ سچی باتیں کڑوی لگتی ہیں۔ ہندوستان کو آزادی کے ساحل پر لگانے کے بعد جب ان کو یہ اندازہ ہوا یہ آزادی کا نہیں بلکہ بربریت اور حیوانیت کا ساحل بنا جاتا ہے اور انسانیت اور شرافت کا خاتمہ ہوا جاتا ہے تو انھوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کی سیاسی آزادی کو نہیں بلکہ روح کی دولت اوز ایمان کی روشنی اور ضمیر کی آواز کو بچانے کے لیے اپنی جان کی بازی لگا دی۔

تقریروں اور تحریروں سے، دو مرتبہ روزہ رکھ کر اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر دھمکیوں کے خطوں اور قتل کی دھمکیوں کو نظر انداز کرکے، ابھی چند روز پہلے ایک بم کے حادثے سے جان بر ہونے کے بعد، اس بلند اور شریف اور بے نفس اور پاک باطن انسان نے آج شام ایک ہندو کے ہاتھ شہادت پائی اور آخری وقت بھی دم نکلتے نکلتے ہاتھ باندھ کر مجمع کو (اور شاید اپنے قاتل کو) محبت اور درگزر کا سلام کیا اور حضرت عیسیٰ اور امام حسین کی یاد تازہ کردی! ہندوستان نے مہاتما بُدھ کے بعد اس قسم کا انسان پیدا نہیں کیا تھا کیے تباہ ہوجائے گا وہ ملک جو ایسے سپوت پیدا کرسکتا ہے؟ لیکن اسی وقت تو دنیا اندھیر معلوم ہوتی ہے اور خاص طور پر ہندوستان کے مسلمانوں کا سہارا ٹوٹ گیا۔ جو ان کی خاطر اپنے ہم مذہبوں کے سامنے سینہ سپر تھا اور اسلام اور ہندو مت دونوں کی بہترین تعلیم کا مظہر تھا......

۳۱ جنوری

آج کا تمام دن ریڈیو پر گاندھی جی کی ارتھی کے جلوس کا حال سُننے اور اس دل توڑ دینے والے حادثے پر آنسو بہانے اور آنسو پینے میں گزرا۔ اس واقعہ کا جو اثر ہندوستان، پاکستان، برطانیہ U.N.O. اور دنیا کے تمام ملکوں میں ہوا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دنیا کے تمام دل رکھنے والے لوگوں کے دلوں پر گاندھی جی کا کس قدر زبردست قبضہ تھا۔ اور گو مدتوں دانش مندوں اور سیاست دانوں نے ان کی انوکھی سیاست کا مذاق اُڑایا، دنیا داروں نے ان کی مذہبیت اور دین داری پر آوازیں کسیں اور ان کو ایک بیتے ہوئے زمانے کی بے محل یادگار سمجھا، مسلمانوں نے ان کی نیک نیتی پر شبہ کیا، انگریزوں نے مدتوں انھیں سب سے بڑا دشمن سمجھا۔ سکھوں، ہندوؤں نے ان کے آخری جہاد کی وجہ سے، جو انسانیت کی بہترین قدروں کے لیے جہاد تھا، ان کی مخالفت کی اور ان کو اپنے راستے کا کانٹا خیال کیا۔ لیکن ان کے خلوص، ان کی جرأت، ان کی اتھاہ محبت، ان کی بے نظیر بے نفسی اور ہاں، ان کی سیاسی سوجھ بوجھ اور رائے عامہ اور عوام کی ذہنیت کو سمجھ سکنے کی صلاحیت نے ایک ایک کرکے ان مخالفوں کی ناسمجھی اور تعصب کو اپنی محبت کے جادو سے فتح کرلیا۔

اور اپنے آخری ایثار کے کارنامے سے لوگوں کے دلوں میں ایسا انقلاب پیدا کر دیا (کم سے کم اس وقت یہی اندازہ ہوتا ہے جو سیاست دانوں کی برسوں کی کوشش سے بھی نہ ہو سکتا تھا۔

؎ چڑھتی ہے جب عشق کی سان پہ تیغِ خودی ایک سپاہی کی ضرب کرتی ہے کارِ سپاہ

جب کافر تلوار پر بھروسہ کرتا ہے تو مومن بغیر تیغ کے لڑتا ہے، سر نہیں کاٹتا، دلوں کو تسخیر کر لیتا ہے۔ اس مومن نے، اس مرد درویش نے مسلمانوں کی حفاظت اور عزت کی خاطر اپنی جان دے کر پاکستان میں قلبِ ماہیت کر دی۔ لاہور کے ریڈیو اسٹیشن پر کل اور آج سوائے گاندھی جی کے ذکر کے اور کچھ نہ تھا۔ اور اس خلوص، عقیدت، محبت کے ساتھ ان کا ذکر تھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ کم سے کم آج ہندوستان اور پاکستان کی تقسیم ختم ہو گئی ہے اور اس بے تاج کے بادشاہ کی دونوں ملکوں پر بادشاہت ہے! دہلی کا ریڈیو اسٹیشن بھی اس قسم کا پروگرام نہیں پیش کر سکا۔ شاید کر ہی نہیں سکتا۔ اگر یہ بیسویں صدی کا معجزہ نہیں تو کیا ہے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ یہ قربانی ان دونوں بدبخت ملکوں کی تاریخ میں ایک نئے باب کا آغاز کرے؟ کون کہہ سکتا ہے! لیکن اس کے لیے جو کچھ ایک انسان کر سکتا ہے وہ سب گاندھی جی نے کر دکھایا۔ "گاندھی جی کی جے" آج دنیا میں پکاری جا رہی ہے۔ کیا وہ ان کی ذاتی فتح ہی رہے گی یا سارے ملک کے لیے نیکی کی فتح ثابت ہو گی بدی اور تاریکی کی قوتوں پر؟

سفرِ یورپ

۱۹۴۹

۷ اکتوبر یورپ کا ایک اور سفر درپیش ہے۔ اور اس مرتبہ عزیز اور اظہر بھی ساتھ ہیں۔ اس کی شانِ نزول یہ ہے کہ مجھے یونسکو کی طرف سے بلاوا آیا ہے کہ تعلیمِ بالغان اور تعلیمِ بنیادی کی ایک مشورتی کمیٹی میں شریک ہوں جو پیرس میں ۱۶ اکتوبر سے ۲۱ اکتوبر تک ہوگی غالباً اس دعوت کی ایک وجہ یہ ہوگی کہ کچھ عرصہ ہوا یونسکو کے ایک ہندوستانی عہدے دار ڈاکٹر ادی سیٹیا ہندوستان آئے تھے اور ملک میں مختلف جگہ گھومے تھے انھیں بمبئی کے تعلیمِ بالغان وغیرہ کے کام نے کافی متاثر کیا تھا..... خیال ہوا کہ اس سفر میں گو مختصر ہے، عزیز کو بھی ساتھ لے چلیں۔ شاید ان کی صحت وغیرہ پر اچھا اثر پڑے۔ اظہر کی تو پُرانی آرزو تھی کہ ہندوستان سے باہر سیر کو نکلیں انھیں بھی "ٹھیلنے کا بہانہ" مل گیا اور اس طرح ایک "خاندانی پارٹی" بن گئی۔ پروگرام بہت مختصر ہے۔ دو تین روز لندن، ۶،۵ دن جنیوا، ۶،۵ دن پیرس۔ جلد واپس آنا ہے کیونکہ ۲۶ اکتوبر سے مہابلیشور میں ایک کلچرل اتحاد کی کانفرنس ہے جس کی انتظامی کمیٹی کا صدر میں ہوں۔

ہوائی اڈے پر بہت سے لوگ رخصت کرنے آئے، اپنے سب عزیز، محسن، گوپال، ڈاکٹر مقصود، دھیر و بھائی (اندھیری پبلک اسکول کے پرنسپل)۔ پروفیسر پٹور دھن وغیرہ۔ وہاں ایک کوفت یہ ہوئی کہ ہمیں بہت پہلے پاسپورٹ وغیرہ کے معائنے کے بعد ایک الگ حصے میں "محصور" کر دیا اور بچیاں وغیرہ دوسری جگہ انتظار کرتی رہیں۔ اس لیے چلتے وقت ان سے ملاقات بھی نہ ہو سکی۔ بس دُور سے خدا حافظ کر سکے۔ پنڈت جواہر لال نہرو اس جہاز میں ہمارے ہم سفر ہیں۔ رات کا کھانا انھوں نے ہمارے ساتھ ہی کھایا۔

کچھ کھوئے کھوئے سے معلوم ہوتے ہیں۔ انھوں نے ایک مقالہ دکھایا جو کسی امریکی طالبِ علم نے یونی ورسٹی میں ماسٹر آف تھیالوجی کی ڈگری کے لیے پیش کیا ہے اور جس کا موضوع ہے "پنڈت جواہر لال کا فلسفۂ حیات" (وہ خود اس مضمون کے انتخاب سے بہت محظوظ تھے ("بھلا یہ بھی کوئی مضمون ہے!")) راستے میں جہاز بھرے نہیں ٹھیرا۔ وہاں کا موسم کچھ اچھا نہ تھا۔ سیدھے قاہرہ آئے۔ جہاں ہوائی اڈے پر ساڑھے تین گھنٹے قیام کرنا پڑا۔ فیضی صاحب ان کی بیوی ان کے اوّل سکریٹری عابد حسن سفرانی، (جو ہادی حسن صاحب کے بھائی ہیں) اور بعض دوسرے لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ مسز ہیتی سنگھ بھی قاہرہ سے ہمارے جہاز میں سوار ہوئیں۔ وہ امریکہ لکچروں کا سلسلہ دینے کے لیے جارہی ہیں۔ سارا بھائی (احمد آباد) مع بیوی کے ہمارے ہم سفر ہیں قاہرہ میں بہت سے پریس کے نمائندے پنڈت جی سے ملے اس وقت انھوں نے ہندوستان کی خارجی پالیسی کشمیر، پاکستان، ایٹم بم وغیرہ کے متعلق ایک اچھا لیکن قدرے INTROSPECTIVE بیان دیا جس میں انھوں نے اعتدال اور انصاف کے ساتھ اپنا نقطۂ نظر بیان کیا اور پاکستان کی پالیسی کی تنقید کرتے وقت بھی احتیاط کو ملحوظ رکھا۔ ان کی گفتگو اور تقریر سے ہمیشہ یہ اثر ہوتا ہے کہ وہ طبعاً بہت ہی دیانت دار آدمی ہیں۔ ایک دل چسپ لطیفہ یہ پیش آیا کہ ہوائی اڈے پر بہت سی مصری پولیس اور فوج مسلح موجود تھی۔ یہ انتظام پنڈت جی کے اعزاز میں کیا گیا تھا۔ ایک امریکن ہم سفر جو غالباً مشرقی ملکوں کے متعلق بہت مبالغہ آمیز بیان پڑھتے ہوں گے۔ سمجھے کہ غالباً کوئی گڑبڑ ہونے والی ہے۔ یا کسی کو KIDNAP کیا جائے گا۔ اس لیے ذرا پریشان تھے۔ اظہر نے انھیں یہ کہہ کر اطمینان دلایا کہ یہ انتظام حکومت کی طرف سے ہندوستان کے وزیرِ اعظم کے اعزاز میں کیا گیا ہے۔

مانٹ بلانک اور لوتستاں کے خوبصورت علاقے کے اوپر سے اُڑتے ہوئے جنیوا کے اڈے پر۔ دن کے ساڑھے دس بجے (یعنی ہندوستان کے چار بجے) پہنچے وہاں کے خوش مذاق ریسٹوراں میں اچھا کھانا کھانے کو ملا۔ لیکن اس کے بعد کہیں ہوائی اڈے کے احاطے میں بھی پھرنے کی آزادی نہ تھی۔ بلکہ سب کو ایک ہی جگہ محصور رکھا گیا۔ اس وقت ½۱۱ بجے یہاں سے روانہ ہو رہے ہیں۔ عزیز اور اظہر دونوں سرزمینِ یورپ پر قدم

رکھ کر خوش ہیں۔

قیامِ لندن ۸ر اکتوبر تا ۱۱ر اکتوبر

لندن میں دو روز قیام رہا۔ ہفتہ اور اتوار کی وجہ سے زیادہ سیر نہیں کر سکے۔ لندن کا ہائڈپارک جو گویا ایک انسٹی ٹیوشن ہے اتوار کی صبح میں دیکھا اور اسی روز میڈم شاڈ کی وہ مشہور و معروف نمائش دیکھی جس میں اس کے بنائے ہوئے موم کے ہزاروں بُت ہیں۔ جن کے ذریعہ دیکھنے والوں کو تاریخ کے کردار تقریباً جیتے جاگتے نظر آجاتے ہیں۔ انگلستان کی تاریخ تو مکمل ایک مرئی شکل میں موجود ہے اور دوسرے ملکوں کے مشاہیر بھی کم کم ہیں۔ گاندھی جی اور جواہر لال کے مجسمے بھی ہیں۔ لیکن اچھے نہیں لیکن خود انگریز مشاہیر وغیرہ کے بُت ایسے ہیں کہ اکثر لوگوں کو اصل کا دھوکا ہوجاتا ہے۔ ایک "بچوں کا کونہ" ہے۔ جس میں کہانیوں کے مشہور کردار مثلاً CINANLLE, JACK, ALICE IN WONDERLAND وغیرہ کو دکھایا ہے۔ ایک CHAMBER OF HORRORS ہے جس میں مشہور مجرموں کے مجسمے اور بعض کی باقیات بھی موجود ہیں۔ ہٹلر کا مجسمہ جو پہلے عام مجسموں کے ساتھ تھا اب اس کمرے میں ہے!

قیامِ لندن کے دوران میں کرشنامینن، سندرم، ڈاکٹر مہتا (سفیر ہالینڈ) اور مس اگیتھا ہیریسن سے ملاقات ہوئی۔ مؤخر الذکر نے ہم تینوں کو اپنے ہاں چائے پر بُلایا۔ اپنے گھر اور اس کے پاس ایک پُرانی وضع کے خوبصورت باغ کی سیر کرائی۔ ان کے ہاں گھر میں صرف چار کمرے ہیں۔ دو بہنیں ساتھ رہتی ہیں۔ مکان صاف ستھرا ہے۔ سارا کام خود کرتی ہیں ہفتے میں ایک دفعہ ایک عورت آکر فرش وغیرہ دھوتی ہے۔ اس کے علاوہ کھانا پکانا، صفائی، خرید و فروخت سب دونوں بہنیں کرتی ہیں۔ بلکہ اگیتھا تو زیادہ تر سیاسی کام کرتی ہے۔ دوسری بہن بہت کفایت کے ساتھ گھر سنبھالتی ہیں (اور ہمارے ہاں کس قدر نوکروں کی گڑبڑ اور کام کی خرابی ہوتی ہے!)

رات کو ایک سینما دیکھا۔ جس میں کوئی کہانی نہ تھی۔ لیکن خبریں، کارٹون، عام معلومات وغیرہ تھیں جو دل چسپ اور سبق آموز طریقے پر پیش کی گئی تھیں۔ ایسے سینما دن کے $2\frac{1}{2}$ بجے

سے رات کو دس یا گیارہ بجے تک ہوتے رہتے ہیں۔ جس کا جب دل چاہے آجائے اور پروگرام ختم ہونے تک (یا اس کے بعد بھی) بیٹھا رہے۔

وزارتِ تعلیم حکومتِ ہند سے وابستگی

۱۹۵۰

دسمبر ڈائری کے لکھنے میں بھی اور کسی طرح باقاعدگی اور تسلسل نہیں ہو پاتا۔ تاہم کبھی کبھار ہی سہی، کچھ نہ کر لینا، کچھ نہ کرنے سے بہتر ہے! لہٰذا زندگی کا ایک نیا باب شروع ہونے کی تقریب میں ایک مرتبہ پھر اس کی تجدید کرتا ہوں۔

بمبئی کا قیام ختم ہوگیا اور ختم ہونے سے پہلے کئی مہینے تک بیماری کے اس چکر میں سے گزرنا پڑا۔ جس میں ابتدائی زمانہ میں موت اور حیات کی کش مکش سی رہی۔ اور جس نے ایک طرح سے باقی تمام عمر کے لیے بھی (جتنی کچھ بھی باقی ہے) کارکردگی کی صلاحیت کو مستقل طور پر مجروح اور لنگ کر دیا۔ جب دل ہی ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دے تو اعتماد کے ساتھ کام کرنا کیسے ممکن ہو سکتا ہے؟ بہرحال

میں سادہ دل آزردگی یار سے خوش ہوں!

آخر نومبر سے آخر دسمبر تک مصداق اور عابد صاحب کے ساتھ جامعہ میں قیام رہا اور انھوں نے (جیسا کہ توقع تھی) اس قدر محبت اور توجہ سے رکھا کہ اس کا میرے دل پر گہرا نقش ہے۔ مصداق کی نئی کتاب "یادگارِ حالی" کو دیکھنے کی مسرت حاصل ہوئی۔

۹ دسمبر آج وزارتِ تعلیمات میں اپنے عہدے (جوائنٹ ایجوکیشنل ایڈوائزر) کا چارج لیا۔ کام کی تقسیم کے بارے میں ابتدائی گفتگو ہوئی اور مولانا، ڈاکٹر تارا چند، اشفاق اور ہمایوں کبیر سے ملاقات کی۔

۱۱ر دسمبر

ہندی میں جو سائنس کی اصطلاحیں بنانے کے لیے جو کمیٹی بنائی گئی ہے اس میں شریک ہوا۔ ممبروں نے اس خیال سے اتفاق کیا کہ بحیثیت مجموعی یہ مناسب ہے کہ انٹرنیشنل اصطلاحوں کو قبول کرلیا جائے۔

سنٹرل بیورو آف ایجوکیشن کا شعبہ میرے سپرد کرنے کی تجویز ہے۔ اس لیے آج اس کے افسران سے تبادلۂ خیال کیا اور اس بارے میں اپنی بعض تجویزوں اور مشوروں پر ان سے گفتگو کی۔ انھیں اس بات کا افسوس تھا کہ اب تک وزارت نے اس شعبے کی طرف کافی توجہ نہیں کی اور یہ امید ہے کہ اب ایسا ہوگا۔

۱۳ دسمبر

آج مولانا کے ہاں لنچ تھا۔ جس میں وزیرِاعظم، راجہ جی، آئینگر، مرزا اسماعیل اور بعض دوسرے وزرأ وغیرہ مدعو تھے۔ ۱۲ر کو پنڈت جی کے ہاں کھانے کی دعوت تھی جس میں علاوہ اور لوگوں کے مشہور برطانوی سائنس داں پروفیسر بلیکٹ سے ملاقات ہوئی جو اٹومک سائنس کے بہت بڑے ماہر ہیں اور اٹومک انرجی کمیشن کے کام کے بارے میں مشورہ دینے آئے ہوتے ہیں۔

۱۴ر دسمبر

آج ڈاکٹر رادھا کرشنن سے ملاقات ہوئی جو موسکو سے آئے ہوتے ہیں اور روس کے بارے میں دل چسپ گفتگو رہی۔

۱۵ر دسمبر

کام کی تقسیم میں مجھے تمام عام تعلیمی مسائل کا شعبہ (جس میں ابتدائی، ثانوی، بنیادی اور سوشل تعلیم، ذریعہ تعلیم، سنٹرل ایڈوائزری بورڈ وغیرہ شامل ہیں) بیورو اور یونسکو کے کام کا ایک

حصّہ ملا ہے۔ مجھے یہ تقسیم اس وجہ سے منظور ہے کہ مقابلتہً اس میں معمولی کم اور تخلیقی کام کا امکان زیادہ ہے۔

۱۶ر دسمبر

آج تعلیمی بیورو کے مختلف شعبوں کا معائنہ کیا اور اس کے طریقۂ کار کے بارے میں استفادہ کیا۔ بعض شعبے جو باقی رہ گئے تھے وہ ۱۸ر کو دیکھے۔

۲۰ر دسمبر

آج پارلیمنٹ کی تعلیمی کمیٹی کا جلسہ تھا جس میں ممبران نے بہت آسانی سے وزارت تعلیم کی تجویزوں پر صاد کر دیا۔ اس کے صدر خود مولانا ہیں۔ ممبران میں سے جو لوگ شریک ہوئے تھے ان میں اہل الرّائے بہت کم تھے۔ ذاکر صاحب بھی اس کے ممبر ہیں لیکن وہ موجود نہ تھے۔

۲۶ر دسمبر

دہلی میں ایک PILOT LITERACY PROJECT قائم کرنے کی تجویز ہے۔ اس کے لیے پہلے چھ مہینوں کے لیے یونسکو کی طرف سے ایک ڈائرکٹر آتے ہیں۔ جن کا نام ہے فرینک سڈنی۔ انھوں نے ایک عرصے تک لائبریریاں قائم کرنے کا کام انگلستان میں، خصوصاً مزدوروں وغیرہ کے لیے کیا ہے۔ ان سے اس کتب خانے کے خاص مقاصد کے بارے میں تبادلۂ خیال کیا اور اس بات پر زور دیا کہ اس میں ہر چیز اس طرح کرنی چاہیے جو دوسرے کتب خانوں کے لیے نمونے اور INSPIRATION کا کام دے۔

۲۷ر دسمبر

آج ڈاکٹر مرفی سے ملاقات ہوئی۔ جو یونسکو کی طرف سے ہندوستان میں TENSIONS پروجیکٹ کو چلا رہے ہیں۔ جس کا مقصد ہے ان اسباب کا مطالعہ اور تفتیش جو ملک میں مختلف

جماعتوں اور فرقوں کے باہمی تعلقات کو ناگوار بناتے ہیں اور ساتھ ہی ایسی تجویزوں پر غور کرنا جو اس کشیدگی کو دور کرنے میں مدد دے سکیں۔ اس اسکیم میں ان مسئلوں پر نفسیاتی اور عمرانی دونوں نقطۂ نظر سے غور کرنا شامل ہے۔ اس مقصد کے لیے ملک میں آٹھ دس "پارٹیاں" (یعنی پروفیسروں وغیرہ کے گروپ) کام کر رہی ہیں۔

آج ہی ایک اور "یونسکو منصوبہ" میرے سامنے آیا جو خاصا دل چسپ ہے یعنی مشرق اور مغرب کے چند منتخب مفکّرین اور فلسفیوں کی ایک کمیٹی کا اجلاس۔ جو ایک گروپ کے طور پر اس مسئلے کے بارے میں تبادلۂ خیال اور غور فکر کرے کہ مشرق اور مغرب میں انسان اور اس کی زندگی کا کیا تصوّر ہے۔ اور اس کی تعلیم اور تہذیب کے لیے کیا ذرائع اختیار کیے جاتے ہیں۔ THE CONCEPT OF MAN AND HIS EDUCATION IN THE WEST AND EAST

تجویز یہ ہے کہ کوئی آٹھ دس چوٹی کے مفکّرین اس بحث میں حصّہ لیں اور یہ آئندہ سال دسمبر میں منعقد ہو۔ اس ضمن میں ایک فرانسیسی مفکّر اور فلسفی PROFESSOR LACOMBE یونسکو کی طرف سے ابتدائی انتظامات طے کرنے آئے ہوئے ہیں۔ میں نے ان سے گفتگو کی اور اس کے بعد انھیں مولانا سے ملایا۔ مولانا نے انھیں یہ مشورہ دیا کہ اس کمیٹی کو اس بات پر بھی غور کرنا چاہیے کہ فلسفے کو جغرافی حدبندیوں سے آزاد کرکے ایک عالم گیر فلسفے کی بنیاد ڈالنے کے لیے کیا تدبیریں اختیار کرنی چاہئیں۔ میں نے اس گفتگو میں ترجمان کا کام کیا!

۳۱، دسمبر

آج عابد صاحب، مصداق، عزیز اور میں مولانا کے ہاں مدعو تھے۔ وہاں مسز آصف علی سے بھی عرصے کے بعد ملاقات ہوئی۔ وہ کچھ عرصہ ہوا روس (ازبکستان وغیرہ) گئی تھیں۔ وہاں کے حالات سناتی رہیں اور مشاہدہ اور IDEALOGY کی بنا پر وہ ان کی بہت تعریف کرتی تھیں۔ اور ان کا بیان ہے کہ نہ صرف روس کے زمانۂ جدید میں انھوں نے بڑی صنعتی ترقی کی ہے اور تعلیم و تہذیب میں کہیں سے کہیں پہنچ گئے ہیں بلکہ سوویت حکومت نے ان کی مقامی کلچر اور زبان اور طرزِ زندگی میں کوئی بے جا مداخلت نہیں کی۔

یکم تا ۷ جنوری ۱۹۵۱ء

آج کل زندگی بہت خاموش اور محدود اور خاصی پُرسکون ہے۔ بس دفتر اور مکان۔ مکان بھی چھوٹا سا اور خاندان نصف یہاں، نصف بمبئی، مہمان وغیرہ ندارد! ابھی لوگوں سے ملنا ملانا بھی شروع نہیں کیا۔ اس لیے یا دفتر میں وقت گزرتا ہے۔ یا گھر پر رہتا ہوں چلنے پھرنے پر اب تک کچھ پابندی ہے۔

اس ہفتے میں اپنے دفتر کے ان کاموں کی تنظیم کی جو میرے سپرد ہوئے ہیں۔ وزارت میں ان کا ایک علیحدہ ڈویژن بنایا گیا ہے۔ جس کا نام ہے BUREAU AND DEVELOPMENT DIVISION سیکریٹری اور حکومتِ ہند کے PLANING COMMISSION کے ساتھ اس امر پر مفصل تبادلۂ خیال اور بحث ہوئی کہ حکومت جو منصوبے ملک کی ترقی اور تعمیری کاموں کے لیے "کولمبو پلان" کے تحت بنارہی ہے اس میں سے تعلیمی ترقی اور تعمیرو تنظیم کے لیے کس قدر رقم ملے گی۔ ابتداً میں انھوں نے سوشل اور بنیادی تعلیم کے لیے بہت کم رقم رکھی تھی لیکن کافی گفتگو اور حجّت کے بعد انھوں نے پانچ سال میں ان دونوں شعبوں کے لیے کوئی بیس کروڑ کی رقم مشروط طور پر منظور کی ہے ملک کی ضرورت کے لحاظ سے تو کچھ نہیں لیکن مقابلتاً غنیمت ہے۔

ایک روز مولانا نے مجھ سے اور ڈاکٹر تارا چند سے اس بارے میں تبادلۂ خیال کیا کہ یونی ورسٹیوں میں طلبا کا عام تعلیمی معیار اور معلومات عامہ وغیرہ کو بڑھانے کے لیے کیا کیا جائے اور عوام میں جمود اور از خود کام نہ کرنے اور مجہول طریقے پر ہر بات کے لیے حکومت کی طرف تکنے کی جو ذہنیت پیدا ہوگئی ہے اس کو دُور کرنے کے لیے حکومت اور وزارتِ تعلیم کیا اقدام کرسکتی ہے۔ پہلے سوال کے متعلق تو میں نے یہ مشورہ دیا کہ یونی ورسٹیوں کو GENERAL EDUCATION COURSES جاری کرنے اور اس سلسلے میں مختلف علمی ACTIVITIES چلانے کی طرف توجہ دلائی جائے۔ اور دوسرے مسئلے کا حل کرنے کے لیے تمام غیر سرکاری جماعتوں اداروں، سوشل کارکنوں اور مختلف وسائل پروپیگنڈا (ریڈیو، سینما، پریس وغیرہ) سے ایک منظم طریقے پر کام لینا چاہیے اس کے علاوہ مولانا کا خیال یہ بھی ہے کہ طلباً کو حکومتوں کے ہیڈ کوارٹرز وغیرہ جاکر

ان کے کام کے طریقوں اور تنظیم کو اور مختلف شعبوں کی سرگرمیوں کو دیکھنا چاہیے اور ملک کے مختلف حصوں میں جاکر تاریخی عمارتوں اور یادگاروں وغیرہ کو دیکھنا اور وہاں کے حالات کا مطالعہ کرنا چاہیے ...... دیکھنا ہے کہ کچھ ہوتا بھی ہے یا محض گفتگو ہو کر رہ جاتی ہے۔ ریڈیو کی عربی سروس کے لیے ایک تقریر " مولانا آزاد کے ترجمان القرآن" کے بارے میں لکھی جس کو انھوں نے پسند کیا۔

۷؍جنوری سے ۱۴؍جنوری تک

اس ہفتے میں کشمیر سے کاظمی اور برٹش کونسل کے دو اراکین ڈاکٹر فلپس (جو ہندوستان میں اس انجمن کے نمائندے ہیں) اور پروفیسر ملر (جو کونسل کے شعبۂ سائنس کے ڈائرکٹر ہیں) سے ملاقات ہوئی۔ انھیں مولانا سے بھی ملوایا اور ترجمان کا کام کیا۔ کونسل کی کلچرل اور سائنٹفک سرگرمیاں واقعاً تعریف کے قابل ہیں اگر قومیں ایک دوسرے میں اس قسم کی دل چسپی لیا کریں (خواہ اس کو کلچرل امپریلزم کے نام ہی سے کیوں نہ موسوم کیا جائے!) تو وہ اقتصادی اور سیاسی امپریلزم سے کس درجہ بہتر ہو! کاظمی سے معلوم ہوا کہ وہ کشمیر میں بعض جدید قسم کے ثانوی (ٹکنیکل) اسکول کھول رہے ہیں اور کلچرل پروگراموں کے سلسلے میں کشمیر کے پُرانے مشاہیر کی یادگار میں "حبہ خاتون ڈے" وغیرہ مناتے ہیں۔

۹؍کو دہلی میونسپل کمیٹی کے اراکین سے PILOT LIBRARY PROJECT کے بارے میں گفتگو کی اس منصوبے کو چلانے کے لیے یونسکو سے امداد ملی ہے اور اس کے خرچ پر انگلستان سے (جیساکہ پہلے ذکر کر چکا ہوں) ایک ڈائرکٹر چھ ماہ کے لیے آتے ہیں۔ کمیٹی کو بھی اس کے لیے پچیس ہزار سالانہ کی امداد دینی ہے۔ اس کے اراکین کو بچوں یا ضدی بالغوں کی طرح اصرار تھا کہ بجائے ایک کے ان کے دو نمائندے انتظامی بورڈ میں ہوں اور صدر ان کا صدر ہو۔ اس چھوٹی سی بات میں دو گھنٹے کے قریب ضائع ہوئے! ۱۱؍کو یونین پبلک سروس کمیشن میں ایک فارسی کے لکچرر کی انتخابی کمیٹی میں شرکت کی یہ جگہ DEFENCE DEPARTMENT میں ہے۔ کمیٹی میں اس ڈپارٹمنٹ کے SCHOOL OF LANGUAGES کے ڈائرکٹر مسٹر بینرجی بھی تھے جو

بول چال کی فارسی اور عربی بہت اچھی جانتے تھے۔ یہ دیکھ کر (از سر نو!) تعجب اور افسوس ہوا کہ امیدواروں میں سے تقریباً سب (جن میں سے کئی فرسٹ کلاس تھے) نہایت نالائق اور زبان سے ناواقف تھے۔ آخر ہماری یونی ورسٹیاں کیا کرتی ہیں!

اس ہفتے لندن میں COMMONWEALTH کے پرائم منسٹروں کی کانفرنس ہو رہی ہے۔ اس کی طرف سے صلح و جنگ کے بارے میں جو اعلان شائع ہوا ہے اس کے مرتب کرنے میں نہرو کا ہاتھ صاف نظر آتا ہے۔ جنگ کی ذہنیت کو روکنے میں ان کا بہت بڑا حصّہ ہے۔ لیکن وہ محض اخلاقی اثر ڈال سکتے ہیں۔ فوجیں اور ایٹم بم دوسروں کے ہاتھ میں ہیں!

۱۴ر جنوری سے ۱۲ر جنوری تک

اس ہفتے PLANING کمیشن کے نائب صدر نندا صاحب کے ساتھ ان کی بنیادی تعلیم کے متعلق تجویزوں پر گفتگو کی۔ TEN SIOUS پروجیکٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر مرفی آئندہ سال کا پروگرام اور بجٹ بنانے کے سلسلے میں ایک کمیٹی میں شریک ہونے آئے تھے۔ کمیٹی سے اس کے بارے میں تبادلۂ خیال ہوا۔ اور طے پایا کہ آئندہ سال حکومتِ ہند اس منصوبے کو چلانے کے لیے ایک لاکھ کی رقم منظور کرے اور سات آٹھ پارٹیاں "مناسب اور قابل لیڈروں" کی نگرانی میں اس کام کو جاری رکھا جائے۔ ان TEN SIOUS میں فرقہ وارانہ، مذہبی، لسانی، صوبجاتی تعصبات اور اختلافات سب شامل ہیں۔ ابھی کام کی ابتدا ہے دیکھنا ہے کہ کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ اور اس سے کوئی عملی فائدہ بھی مرتب ہو سکتا ہے یا نہیں۔

اس ہفتے ایک PSYCHOLOGICAL کانفرنس ہوئی تھی جس میں مختلف یونی ورسٹیوں کے نفسیات کے شعبے کے نمائندے جمع ہوئے تھے۔ مقصد یہ تھا کہ یونی ورسٹیوں میں نفسیات کی تعلیم کو کس طرح بہتر تنظیم کیا جائے۔ ریسرچ کو کس طرح آگے بڑھایا جائے اور اس کا ربط زندگی کے مسائل کے ساتھ کیسے قائم ہو۔ میں شریک نہیں ہو سکا لیکن ایجنڈا کو دیکھنے سے معلوم ہوا کہ وہ اس قدر طویل اور بے ربط ہے کہ شاید ہی معقول نتائج مرتب ہو سکیں۔

دہلی کالج میں مجوزہ سپرو اکیڈمی کی طرف سے ایک کانفرنس اور مشاعرہ سپرو ڈے

کے نام سے ہوا تھا۔ لیکن اپنی "طبی" مجبوریوں کی وجہ سے میں شریک نہیں ہوسکا۔ جس کا بہت افسوس ہے۔ (عشق نے غالب نکما کردیا!) مولانا نے اس موقع پر ایک دل چسپ اور اہم تقریر کی اور بتایا کہ ہندی تہذیب کے بارے میں یہ خیال کہ وہ در اصل "قدیم" تہذیب سے عبارت ہے اور اس کے بعد کے اضافے غیر اہم اور بے تعلق ہیں۔ بڑی غلط فہمی ہے۔

بمبئی سے بچوں کے بہت محبت بھرے خط آتے رہتے ہیں۔ وہ خوش اور اپنے کام میں بخوبی مصروف ہیں اور وہاں سب ان سے خوش ہیں۔ یہ بڑے اطمینان کی بات ہے۔ خدا ان سب کو سعادت مندی اور خوش اور کامیابی اور خدمت کی زندگی نصیب کرے! اگر انسان اپنے پیچھے اور کوئی خاص اچھا کام یا چیز نہ چھوڑ سکے بلکہ اچھی اولاد چھوڑ جائے تو یہ بھی بڑی بات ہے......

سفرِ عراق

۱۹۵۱

مارچ

اقوامِ متحدہ کے WORLD BANK کی دعوت پر دو ماہ کے لیے عراق جارہا ہوں عراق نے بنک سے قرضے کی درخواست کی ہے اور ان کے مختلف منصوبوں میں بنیادی دیہاتی تعلیم کا منصوبہ بھی شامل ہے۔ اس سے پہلے کبھی بنک نے تعلیمی کاموں کے لیے قرضہ نہیں دیا۔ اس مرتبہ پہلی بار وہ اس پر غور کرنے کو تیار ہیں۔ بشرطیکہ انھیں یہ اطمینان ہو کہ مجوزہ اسکیم ٹھیک اور قابلِ عمل ہے۔ اس لیے انھوں نے اپنے مشن میں پہلی مرتبہ ایک تعلیمی کارکن شامل کیا ہے۔ یونسکو کے ایما پر انھوں نے اس کام کے لیے میرا انتخاب کیا ہے۔ حکومتِ ہند نے P.M. کے ایما پر میرا اس وفد پر جانا منظور کیا۔ میں ذرا تامل کے بعد اس سفر پر جانے کے لیے تیار ہوا۔ گزشتہ بیماری کے بعد یہ پہلا لمبا سفر ہوگا۔ شاید انکار کر دیتا۔ لیکن عزیز بخوشی راضی ہوگئیں اور مجھے بھی خیال ہوا کہ اگر وہ ساتھ چل کر اس موقع سے فائدہ اُٹھائیں اور زیارات سے مشرف ہوجائیں تو بہت اچھا ہے۔ چناں چہ چند دن کے نوٹس پر روانگی کی تیاری کرنی پڑی۔ اور جلدی جلدی کام سمیٹ کر ۲/ مارچ کو ایک سویڈن کے جہاز NORDOTJERNAN سے روانہ ہوئے۔ ڈاکٹروں کا مشورہ یہ تھا کہ ہوائی جہاز کے مقابلے میں سمندر سے جانا بہتر ہے۔

۲۸ر کو ہم لوگ دہلی سے بمبئی پہنچے۔ ذکیہ کو مصداق کے پاس دہلی چھوڑا اور سیدہ کو ساتھ لیا تاکہ وہ بمبئی میں اپنی بہنوں اور چچا، چچی کے پاس رہ سکے۔ بچیوں کو چھوڑتے بہت دل دکھا۔ لیکن دل کا دکھنا تو زندگی کی قیمت میں شامل ہے۔ سب نے بہت ہمت اور خندہ پیشانی سے ہمیں رخصت کیا۔ یہ سویڈن کا جہاز جس کا نام NORDOTJERNAN ہے۔ سامان کی بار برداری کے لیے ہے۔ لیکن اس میں مسافروں کے لیے بارہ CABIN بھی ہیں۔ جو بہت خوبصورت اور آرام دہ ہیں۔ لیکن ان میں ہمارے علاوہ صرف چھ مسافر اور ہیں۔ جن میں سے تین انگریز ہیں۔ (ایک خاتون اور ان کے دو بچے) جو کراچی میں اتر جائیں گے اور ایک عراقی خاندان ہے ابراہیم بستم جو بصرہ بنک کے منیجر ہیں۔ ان کی بیوی اور پیاری سی چھ سالہ بچی تلافہ۔ سفر سکون اور اطمینان کے ساتھ ہو رہا ہے۔ کھانے کا خاصا انتظام ہے۔ اور صفائی وغیرہ بہت اچھی ہے۔ ملاح چینی اور افسر سویڈش یا چینی ہیں۔ اس جہاز کا بمبئی سے بصرے تک کا کرایہ =/۵۲۰ روپے ہے۔ لیکن سفر میں چودہ دن کے قریب لگیں گے کیوں کہ جہاز راستے میں کئی بندرگاہوں پر ٹھیرے گا۔

۲ر مارچ کو بمبئی کے بہت سے دوستوں سے ملنے کے بعد اور عزیزوں کی محبت اور تواضع کا لطف اٹھانے کے بعد روانہ ہوئے۔ ۴ر کی صبح کو گیارہ بجے کے قریب کراچی پہنچے۔ جہاں ذوالفقار اور اکھن مع بچوں کے (جن میں شیر خوار رعنا بھی شامل تھی!) استقبال کے لیے بندرگاہ پر موجود تھے۔ انھوں نے کراچی میں آنے کے لیے PERMIT کا انتظام کر لیا تھا۔ کراچی میں حسنِ اتفاق سے دو دن قیام کا موقع ملا اور بہت سے دوستوں اور عزیزوں سے ملاقات ہوئی۔ علاوہ بہت سے پانی پت کے عزیزوں اور دوستوں کے، شاہ عالم خان، ڈاکٹر محمود حسین اور پروفیسر حلیم اور آغا تاج محمد (رجسٹرار سندھ یونی ورسٹی) سے ملا۔ سب لوگ بہت ہی تپاک اور خلوص سے ملے اور چاہتے تھے کہ ہم زیادہ عرصے کراچی میں ٹھیریں۔ ایک دل چسپ خبر یہ معلوم ہوئی کہ سندھ یونی ورسٹی کے وائس چانسلری کے لیے میرا نام بھی زیرِ غور ہے! میں نے کہا کہ میں کیسے آسکتا ہوں اور موجودہ حالات میں اربابِ اقتدار ایک ہندوستانی کا انتخاب ہی کیوں کریں گے! عزیز کو کراچی بہت اچھا معلوم ہوا۔ البتہ اس وجہ سے انھیں پریشانی

ہے کہ شاید بوجھ اُٹھانے کی وجہ سے کچھ اندرونی شکایت پیدا ہو گئی ہے! اور جہاز پر کوئی ڈاکٹر نہ ہونے کی وجہ سے عجیب بے بسی کا عالم ہے!۔

۶/مارچ

سفر بہت سکون اور آرام لیکن قدرے بے کیفی کے ساتھ گزر رہا ہے! کھانا ہلکا لیکن جہاز والے کے لحاظ سے معمولی سا ملتا ہے۔ کپڑے دھونے کا انتظام نہیں۔ نمکین پانی سے نہانا پڑتا ہے۔ جس میں صابن کے جھاگ نہیں پیدا ہوتے۔ ہمارے ہم سفروں میں سے تین انگریز تو کراچی میں اُتر گئے تھے۔ وہاں سے ایک ایرانی آغا احمد یزدانی (جو ایک ریٹائرڈ ایرانی افسر ہیں اور چھ ماہ ہندوستان میں گزار کر آ رہے ہیں) اور ایک انگلو انڈین (جو کسی CABLE ، WIRELESS کمپنی میں ملازم ہے) سوار ہوئے ہیں۔ بس کل سات آدمی ہیں۔ زیادہ بات چیت عراقی سے ہوتی ہے۔ آج سے فارسی میں ایرانی ہم سفر سے بھی بات ہوئی۔ وہ بے چارے انگریزی نہ جاننے کی وجہ سے خاموش کھوئے رہتے تھے۔ عراقی کی گفتگو سے معلوم ہوا کہ انھیں ہندوستان سے بوجہ ایک ایشیائی ملک ہونے کے ہمدردی ہے اور وہ پنڈت نہرو کے قائل ہیں لیکن ان کی زیادہ دل چسپی اور ہمدردی پاکستان کے ساتھ ہے۔

۷/تا۱۰/مارچ

جہاز تین روز میں بحرین پہنچا۔ اب سے بیس سال پہلے یہاں کچھ بھی نہ تھا۔ اب پٹرول کی برکت اور نعمت سے خاصی اہم جگہ ہے۔ ہمارا جہاز ایک دن تو بندرگاہ سے خاصے فاصلے پر ٹھیرا رہا۔ کیوں کہ WHARF پر جگہ خالی نہ تھی۔ دوسرے روز وہاں پہنچا۔ یہ ایک بڑا سا لکڑی کا پلیٹ فارم ہے جس کے اِدھر اُدھر جہاز آتے ہیں، سامان اُتارتے اور لادتے ہیں۔ یہ جگہ جزیرہ کے رہائشی حصہ سے کوئی بارہ پندرہ میل دُور ہے اور پٹرولیم RESERVATION کا جزو ہے۔ جہاں مسافروں کو اُترنے کی اجازت نہیں ہے۔ چناں چہ ہم لوگ بھی جہاز ہی پر قید ہیں! (عزیز کو ڈاکٹر کو دکھانا تھا۔ اسے بھی یہاں بلا کر دکھانا پڑا)۔ سامان لادنے کے عمل کو ان لوگوں

نے بہت EFFICIENT اور نہایت درجہ میکانکی بنا دیا ہے۔ پٹرول بھرنے کے لیے تو WHARF کے (تختہ دوز) TANKS میں سے پائپ کو براہِ راست جہاز کے TANK سے ملا دیا گیا اور اس طرح ہزاروں گیلن پٹرول پمپ کر دیا گیا۔ دوسرا سامان (تختے، تیل کے ہزاروں پیپے، سامان کی بوریاں اور بکس وغیرہ جو اُتارنے یا لادنے تھے) کرین کے ذریعہ WHARF کے تختے سے اُٹھایا جاتا ہے اور سیدھا جہاز کے HOLD میں پہنچا دیا جاتا ہے۔ بہت سے مزدور کام کرتے ہیں لیکن انھیں کوئی بھاری چیز سر پر اُٹھانی نہیں پڑتی۔ پیپوں کو لاری سے ایک قسم کی سیڑھی کے ذریعہ نیچے پھسلا دیتے ہیں۔ اور ان کو قطاروں میں ترتیب دیتے ہیں۔ اس کے بعد ایک شخص ایک ہینڈل کے ذریعہ کرین کو حسبِ ضرورت گھماتا، اُوپر نیچے، دائیں بائیں کرتا رہتا ہے۔ اس میں زنجیریں لگی ہیں جن کے کنارے پر گرفت ہے جو پیپوں کے دونوں سروں میں بیٹھ جاتی ہیں اور ہر مرتبہ چھ پیپے بڑی آسانی سے اُٹھا کر لے جاتی ہے۔ کیبن کے دونوں طرف جہاز کا جو غیر رہائشی اور "کاروباری" حصّہ ہے اس میں ایسی CRANES لگی ہوئی ہیں۔ جو صبح سے شام تک بلکہ رات میں بھی یہ کام کرتی رہتی ہیں...... مزدوروں وغیرہ میں عرب، حبشی اور شاید ہندوستانی بھی ہیں جن میں کوئی جماعتی امتیاز یا رنگ کا تعصب بظاہر معلوم نہیں ہوتا۔ کھانے کے وقت ان کی ٹولیاں ساتھ بیٹھ کر کھاتی ہیں اور نماز کے وقت جو نماز گزاراں کشتی یا کسی اور جگہ نماز ادا کرتے ہیں۔ سب عربی بولتے ہیں۔ لیکن اکثر ہندوستانی سمجھتے ہیں .... میں نے دریافت کیا کہ مزدوروں کو روزانہ کیا اُجرت ملتی ہے تو پتہ چلا کہ معمولی UN SKILLED مزدوروں کو (جو دراصل UN SKILLED نہیں ہیں بلکہ اس کام میں کافی سدھے ہوئے ہیں) چار یا پانچ روپیے (یہاں پُرانے ہندوستانی انگریزی روپیے رائج ہیں) اور مشین وغیرہ چلانے والوں کو چھ روپیے یا اس سے زائد روزانہ ملتے ہیں..... جہاز دو روز سے یہاں کھڑا ہے۔ آج تیسرا دن ہے۔ طبیعت اُکتا گئی ہے۔ لیکن بہر حال میں تو کچھ نہ کچھ کام کرتا رہتا ہوں۔ عزیز اور کچھ نہیں تو کپڑے دھوتی ہیں! بعض دوسرے لوگ بہت پریشان ہیں۔ خصوصاً ایرانی ہم سفر احمد یزدانی کو "آغا خیلے خستہ شوم ایں جا می آیم۔ آں جا می روم۔ از کیبن در کمرہ ملاقات می آیم۔ کتاب می گیرم۔ طبیعت مائل نمی شود"! میں نے انھیں اقبال کی مثنویاں (اسرار و رموز) پڑھنے کو دیں۔

ایرانیوں کو ہندوستانیوں کی فارسی کی طرف سے جو ایک قسم کا تعصب اور خفیف سا احساسِ برتری ہے وہ انھیں بھی ہے۔ کہنے لگے ہاں اقبال خاصے شعر کہتے ہیں لیکن بھلا فلاں اور فلاں شاعر سے کیا مقابلہ! ایک لطیفہ یہ ہوا کہ انھوں نے مثنوی کو کھولا اور شروع ہی میں اس کا سرِعنوان جو رباعی ہے وہ نظر پڑی۔ "دی شیخ با چراغ ہمی گشت گرد شہر۔ از دام و دد ملام وانسانم آرزوست" کہنے لگے یہ غلط ہے۔ "دیم و دد" ہونا چاہیے۔ جب نیچے نظر پڑی تو دیکھا کہ جلال الدین رومی کی رباعی ہے! خفیف ہوئے اور خود رومی کی تعریف شروع کر دی، "یک مرد خیلے بزرگ بود شعرِ او درجہ کمال دارد"!! وغیرہ۔

۱۱؍مارچ تا ۱۶؍مارچ

سفر کے آخری چند روز بہت "بارِ خاطر" رہے کیوں کہ جہاز کویت میں دن بھر ٹھیرا رہا اور اس سے نیچے اُترنے کی اجازت نہ ملی۔ عراقی ہم سفر اور بحرین سے دو تین آدمی اور سوار ہوئے تھے۔ وہ وہاں اُتر گئے۔ اور جہاز میں صرف ہم دونوں "ایک اینگلو انڈین جو بندرگاہ FAO میں CABLE CO. میں ملازم ہے اور ایک انگریز اور اس کی بیوی رہ گئے ہیں جن میں سے کسی سے نہ "یاد اللہ" تھی نہ اس کی خواہش۔ پھر جہاز خرم شہر پہنچا، جس کا پُرانا نام محمرہ تھا۔ یہ ایران کی ایک بندرگاہ ہے جو بصرے سے صرف بیس میل ہے۔ فرات کے ایک طرف ایرانی ساحل ہے۔ جس پر یہ واقع ہے اور دوسری طرف کسی قدر شمال کو بصرہ۔ لیکن خرم شہر میں جہاز نے تین دن سامان چڑھانے اور اُتارنے میں لگا دیے اور ہمارے پاس چوں کہ ایرانی VISA نہ تھا۔ اس لیے ہم یہ بھی نہ کر سکے کہ موٹر کے ذریعہ بصرے آجائیں اور یہ وقت بچالیں! اُف یہ بین الاقوامی سفری مزاحمتیں اور حماقتیں!! خرم شہر میں یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ مزدوروں وغیرہ کی کارگزاری اور مستعدی کا معیار گھٹیا تھا اور لوگ اس نظم و ترتیب کے ساتھ کام نہیں کرتے تھے جس طرح مثلاً بحرین میں انگریزی کمپنی کے ملازم۔ وہ عرب تھے، ایرانی مزدوروں سے زیادہ خوانده یا طبعاً مستعد نہ تھے۔ لیکن چوں کہ انھیں ٹریننگ مغربی افسروں نے دی تھی اس لیے وہ کام زیادہ پھرتی سے کرتے تھے۔ ہم مشرقی لوگوں میں احساسِ

فرض کب بیدار ہوگا؟ سمندر سے دریائے فرات میں جہاز تاخیر سے اس وجہ سے داخل ہوا کہ آگے ایک اور جہاز کہیں ریت میں پھنس گیا تھا۔ بڑے بڑے جہاز دریا میں اس وقت داخل ہوتے ہیں جب سمندر کا پانی TIDE اندر کی طرف جاتا ہے اور باوجود اس احتیاط کے بھی کبھی کبھی بڑے بڑے جہاز پھنس جاتے ہیں۔ لیکن کافی انتظار کرنے کے بعد ہمارے جہاز نے دریا کی ایک دوسری شاخ کا راستہ اختیار کیا۔ ابتدائی حصّے میں ایک طرف ایرانی سرحد تھی اور دوسری طرف عراق۔ کچے مکان (کہیں کہیں پختہ عمارتیں بھی نظر پڑتی تھیں) لمبی لمبی عبائیں پہنے ہوئے مرد اور بالعموم اس سیاہ رنگ کی عبائیں (جو گویا ہندوستانی برقع کا بدل ہیں) عورتیں دریا کے کنارے نظر پڑتی تھیں۔ لباس کی یکسانیت کی وجہ سے اکثر یہ اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ یہ مرد ہیں یا عورتیں! البتہ عام طور پر مرد بے کار بیٹھے گپ کرتے نظر آتے تھے۔ اور عورتیں کچھ کام کرتیں، دریا سے پانی بھرتیں یا کپڑے دھوتیں! خدا خدا کرکے ۱۵ر کی شام کو بصرے پہنچے لیکن جہاز ساحل پر نہیں آیا۔ بیچ دریا ہی میں ٹھیرا رہا۔ اگلے روز صبح کو کنارے لگا۔ البتہ رات ہی اس مشن کے صدر IVAR ROOTH کی طرف سے ایک خط مل گیا تھا کہ بصرے سے بغداد تک ہماری سیٹیں وغیرہ ریل میں ریزرو کرانے کا انتظام ہوگیا ہے اور وہ ہم لوگوں کو بغداد اسٹیشن پر ملیں گے۔ یونس نے، جو بغداد میں ہندوستانی CHARGE DES AFFAIR ہیں اپنے دوستوں ڈاکٹر پورن سنگھ اور عبدالکریم کو لکھ دیا تھا کہ وہ بصرے میں ہمارا چارج لے لیں۔ انھوں نے بہت مہربانی کرکے ہمارے معائنہ پاسپورٹ وغیرہ کا سب انتظام بہت سہولت سے کر دیا۔ دن بھر پورن سنگھ صاحب اور ان کی بیوی نے ہمیں اپنے ہاں مہمان رکھا اور بہت خاطر مدارات کی۔ لنچ کی دعوت پر بصرے کے چند ہندوستانی باشندوں سے ملاقات کرائی۔ ڈاکٹر پورن سنگھ تیس سال سے یہاں رہتے ہیں۔ عربی بہت اچھی اور فارسی بھی جانتے ہیں۔ معقول آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ یہاں ابتدا میں ڈاکٹر کی حیثیت سے آئے تھے۔ پھر کاروبار شروع کر دیا۔ اب درآمد برآمد کا کام کرتے ہیں اور اچھی حیثیت پیدا کر لی ہے۔

مسٹر عبدالکریم مدراسی ہیں اور برٹش قونصل خانے میں ملازم (غالباً وائس کونسل) ہیں۔

۱۷ر کو بغداد پہنچے۔ وہاں بنک مشن کے چیف IVAR ROOTH چند اور رفقائے مشن

اور اسٹاف کے ممبر یونس اور ہندوستانی لیگیشن کے دو اور ممبر استقبال کے لیے موجود تھے۔ مسٹر روتھ نے بہت گرم جوشی سے اور یونس نے خلوص اور محبت سے ہم دونوں کا استقبال کیا۔ روتھ تو ایک شفیق چچا کی طرح سے میری صحت اور آرام کرنے کی ضرورت پر بہت زور دیتے رہے جس کی وجہ سے وہ عزیز کو بہت پسند آئے۔ ہمارا قیام یہاں کے ایک اچھے ہوٹل SEMIRAMIS میں ہے جو بالکل دریا کے کنارے ہے۔ اور سروس کھانا وغیرہ بہت اچھا ہے۔ ہم دونوں سے فی کس دو عراقی دینار (جو دو انگریزی پونڈ کے برابر ہیں) لیتے ہیں۔ یعنی کوئی سولہ سو روپیے ماہوار۔ جو بہت زیادہ ہے لیکن یہاں کے اچھے ہوٹلوں کا معمولی نرخ ہے۔ ہماری خواہش یہ ہے کہ کوئی علیحدہ فلیٹ یا کسی جگہ ایک دو کمرے مل جائیں جہاں کھانے کا انتظام حسبِ مرضی ہو سکے۔ لیکن یہ مشکل معلوم ہوتا ہے۔

بغداد بہت رونق کا شہر ہے۔ اس کی آبادی آٹھ اور دس لاکھ کے بیچ میں ہے۔ مغرب زدگی کا اثر بہت کافی معلوم ہوتا ہے۔ مردوں میں بہت بڑی تعداد سوٹ پہنتی ہے اور (شعائر اسلامی کے خلاف) شراب، جوا، لحمِ خنزیر کا استعمال عام ہے۔ اس کو بُرا نہیں سمجھتے ! عورتیں مغربی فیشن کے فراک پہنتی ہیں۔ اور بہت زیادہ غازہ اور پوڈر کا استعمال کرتی ہیں۔ زیادہ تر سیاہ رنگ کی عبا اس لباس کے اُوپر پہنتی ہیں۔ لیکن چہرہ اور ہاتھ وغیرہ نہیں ڈھانپتیں۔ پُرانی نسل اور زیادہ عمر کی عورتیں (یا شاید زیادہ "قدامت پسند" خاندانوں اور مذہبی لوگوں کی عورتیں) چہرے پر بھی نقاب ڈالے رہتی ہیں۔ سُنا ہے کہ وہ بھی گھروں میں بیٹھ کر جوا خوب کھیلتی ہیں اور کام کرنے میں زیادہ مستعد نہیں ! کام میں مستعدی (معلوم ہوا) یہودی عورتوں کا حصّہ ہے۔ جو گھر کا سارا کام خود کرتی ہیں۔ اور اس کو بہت کفایت سے چلاتی ہیں۔ یہاں آج کل یہودیوں کا DENATIONALIZATION کا مسئلہ چھڑا ہوا ہے۔ فلسطین کے معاملے کی وجہ سے عربوں اور یہودیوں کے تعلقات جو مدّتوں تک خاصے خوش گوار رہے ہیں بگڑتے جاتے ہیں۔ یہودیوں نے اپنے علاقے میں عربوں کو اور عربوں نے اپنے علاقے میں یہودیوں کا (یعنی ان یہودیوں کا جو عراقی قومیت چھوڑ کر فلسطین جانا چاہتے ہیں DENATIONALIZATION کر دیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کی جائدادیں وغیرہ اور بنک میں جو روپیہ ہے وہ سب

"منجمد" FREEZE کر دیا گیا ہے وہ صرف ایک تھوڑی سی رقم (شاید سو دینار کے قریب) لے کر جا سکتے ہیں۔ ان کا کاروبار بند ہو گیا ہے البتہ جو یہودی عراقی قومیت اور ملک میں قیام کے خواہش مند ہیں وہ حسبِ دستور کام کرتے ہیں ان کے (یا دوسرے یہودیوں کے ساتھ بھی کسی قسم کی بدسلوکی نہیں ہے۔ ہندوستان اور پاکستان کی طرح مار پیٹ کہیں نہیں ہوتی لیکن وہ ملک کی زندگی کا جزو نہیں رہے۔ جو یہودی جانے والے ہیں وہ سب بالکل بے کار صبح سے شام تک اپنے CAFES میں بیٹھے رہتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ عربوں کے ساتھ بھی فلسطین میں یہی سلوک ہوا ہے لیکن دو طرفہ تنگ نظری کوئی قابلِ تعریف چیز نہیں ہے۔ انھیں اس حالت میں دیکھ کر افسوس ہوتا ہے۔ ان کی ٹولیاں ہوائی جہاز کے ذریعہ روز مرہ فلسطین جاتی ہیں۔ شاید ڈیڑھ لاکھ یہودیوں میں سے ایک لاکھ سے زیادہ نے قومیت چھوڑنے کی درخواستیں دے دی ہیں۔ جن لوگوں کے بڑے بڑے کاروبار ہیں (اور اب تک زیادہ تر بڑے بڑے کاروبار انھیں کے ہاتھ میں رہے ہیں) وہ ابھی تک اپنی جگہ پر قائم ہیں۔

ایران میں تیل کے مسئلے نے نازک صورت اختیار کر لی ہے۔ ان کی مجلس نے یہ ریزولیشن پاس کر دیا ہے کہ پٹرول کے کاروبار کو "قومی" بنا دیا جائے اور جو انگریزی کمپنی اس وقت تک یہ کام کرتی رہی ہے۔ اس کے ساتھ کا معاہدہ فسخ کر دیا جائے۔ اس پر انگریز بہت برہم ہیں۔ حالاں کہ قانوناً مجلس کو ایسا کرنے کا اختیار ہے (بشرطیکہ وہ کمپنی کو اس ضمن میں کوئی ہرجانہ ادا کریں؟) البتہ یہ دوسرا سوال ہے کہ فی الحال ایرانی TECHNICIANS اس کام کو چلا سکیں گے یا نہیں مگر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تمام کنٹرول اور انتظام ایرانی حکومت کا ہو۔ کام کرنے والے بطور تنخواہ دار ملازمین کے انگریز وغیرہ ہوں۔ بہرحال اس کی وجہ سے وزیرِ اعظم اور ایک سابق وزیرِ تعلیم کو قتل کیا جا چکا ہے اور بہت شورش ہے۔ اس میں دوسری حکومتوں کا ہاتھ بھی یقیناً شامل ہو گا...... اس شورش کا کم و بیش اثر دوسرے پٹرول والے ملکوں پر بھی ہے جس میں عراق بھی شامل ہے۔ اس کا ایک لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ عراق کو پٹرول پر جو رائلٹی ملتی رہی ہے (یعنی صرف ٪۲ !!) وہ بہت بڑھ جائے گی۔ عراق پٹرول کمپنی کے انگریز منیجر نے حکومت کو حال ہی میں "پیش کش" کی ہے کہ وہ اتنی ہی رائلٹی دینے کو تیار ہیں جس قدر ایران اور

سعودی عرب وغیرہ میں دی جا رہی ہے۔ ممکن ہے اس کی شرح اس طرح چھ کے بجائے پچاس فی صدی ہوجاتے! ("جب سارا جاتا دیکھے تو آدھے ہی پر راضی ہوجائے") حکومتِ عراق نے پٹرول رائلٹی کی ساری رقم ایک DEVELOPMENT BOARD کے سپرد کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ جو ملک کی ترقی کے لیے مختلف صنعتی اور سماجی (اور خدا کرے تعلیمی) منصوبے بنائے گا اور چلائے گا۔ ہمارا بنک مشن بھی اسی بورڈ کی طلبی پر آیا ہے اور اس کے کام کی نگرانی اسی کے متعلق ہے۔ اس کے نائب صدر ایک سابق وزیر اور یہاں کے بااثر لیڈر ارشد پاشا ہیں اور سکریٹری (یادش بخیر!) ایک انگریز سرایڈنگٹن ملر۔ بورڈ میں ایک امریکی ممبر بھی رکھا گیا ہے۔ لہٰذا بورڈ کے منصوبوں میں جو سیاسی نقطۂ نظر حاوی ہوگا وہ ظاہر ہے۔

میری بہت سے لوگوں سے سرسری ملاقاتیں ہوچکی ہیں۔ تعلیمی کام کرنے والوں سے خود ملا ہوں۔ دوسرے لوگوں سے پارٹیوں وغیرہ میں جن میں ایک پارٹی یونس نے کوئی ڈیڑھ سو آدمیوں کو (میرے اعزاز میں!) دی تھی۔ اس کے علاوہ ہندوستانی سفارت خانے کی قدوائی صاحب (جو رفیع صاحب اور شفیق صاحب کے عزیز ہیں) اور مالک رام بھیجہ صاحب (جو اُردو کے ایک اچھے انشا پرداز اور غالب کی سوانح حیات کے مصنف ہیں) نے دعوتیں دیں۔ مجلس کے صدر ڈاکٹر جمال نے (جو یہاں کے بڑے ماہرِ تعلیم شمار ہوتے ہیں اور بہت خوبیوں کے آدمی ہیں) امریکی سفیر نے اور بعض دوسرے لوگوں نے کھانے وغیرہ پر بلایا۔ لیکن ان بڑے مجموعوں میں سرسری ملاقات کے بعد لوگوں کی صورتوں اور ناموں کو مربوط طریقے پر یاد رکھنا بہت مشکل ہے۔ تعلیمی کارکنوں کے سلسلے میں وزیرِ تعلیم (خلیل کنہ) انسپکٹر جنرل مدارس (یوسف محی الدین) ڈائرکٹر جنرل پرائمری تعلیم (ہاشم الیوسی) ڈائرکٹر جنرل ثانوی تعلیم (حسن جواد) کالج کے ڈین (ڈاکٹر ودری)، انجینیرنگ کالج کے پرنسپل (مسٹر رچی) وغیرہ سے ملا۔ ان سے کچھ تعلیمی مسائل پر گفتگو ہوئی۔ اور اس کے بعد انھیں چند سوالات بھیجے ہیں۔ اور ان کے تحریری جواب مانگے ہیں۔ جو جواب ابھی تک موصول ہوئے ہیں۔ وہ خاصے مایوس کن ہیں!

خدا کا شکر ہے کہ ہم لوگ کربلائے معلیٰ اور نجف اشرف کی زیارتوں سے مشرف ہوچکے ہیں۔ اسلامی تاریخ بلکہ دنیا کی تاریخ میں علیؑ اور حسینؑ کے کارنامے ہمیشہ انسانیت کو سربلند

رکھیں گے۔ ان بزرگوں کے قدموں کی روندی ہوئی خاک کو سُرمۂ چشم بنانا اور ان کی یادگاروں سے آنکھوں کو روشن کرنا بہت بڑی سعادت ہے۔ مزاروں پر ہر وقت زائرین کا ہجوم رہتا ہے جس میں عورتوں کی تعداد مردوں سے زیادہ ہوتی ہے۔ لوگ عام طور پر بہت خلوص اور خضوع سے دعائیں پڑھتے اور دعائیں مانگتے ہیں۔ بدوی عورتیں تو اس قدر خلوص اور بے تکلفی سے یا علیؑ یا عباسؑ یا حسینؑ کہہ کر دعا مانگتی ہیں جیسے اپنا پیدائشی حق مانگتی ہوں! مسجدِ کوفہ کی زیارت بھی کی (کوفہ نجف سے چند میل کے فاصلے پر ہے) جو بہت کچھ اپنی قدیم حالت پر باقی ہے۔ اس لیے تاریخی حیثیت سے اس میں خاص کشش ہے۔ کربلائے معلیٰ اور نجف اشرف میں تو آرائش وزیبائش کا اس قدر اہتمام ہے (مثلاً گنبدوں اور میناروں پر سونا چڑھا ہوا ہے، تربتوں کے گرد چاندی اور سونے کی فریمیں ہیں، اندر چھتوں پر تمام جگہ شیشے کا کام ہے) کہ قرونِ اولیٰ کی سادہ زندگی اور جو تصوّرات اہلِ بیت کے ساتھ وابستہ ہیں وہ اس اہتمام میں چھُپ جاتے ہیں...... اس کے علاوہ ان مقاماتِ مبارک کو خادموں، فقیروں اور شیعوں وغیرہ نے ایک ذریعۂ معاش اور ذریعۂ تجارت بنالیا ہے جو ان کے احترام کے منافی ہے۔ جب انسان وہاں عقیدت کے ساتھ جاتا ہے اور خلوص اور توجہ کے ساتھ خضوع و خشوع کرنا چاہتا ہے تو ان مقامی "ٹھیکے داروں" کی مداخلت گراں گزرتی ہے! (گو میرا خیال ہے، یقین تو نہیں، کہ شاید بیس سال پہلے کی نسبت یہ لوگ کم ستاتے ہیں)۔

جی تو چاہتا تھا کہ کربلائے معلیٰ اور نجف اشرف وغیرہ ہر لحاظ سے معیاری شہر ہوتے۔ جہاں صفائی، معاشرتی حالت، تعلیم، مدنیت وغیرہ کے اعتبار سے بھی لوگ INSPIRATION حاصل کرتے۔ لیکن افسوس کہ یہ صورت نہیں۔ وہی خراب حالت جو دوسرے شہروں میں پائی جاتی ہے۔ یہاں بھی موجود ہے۔ صفائی اور خوش سلیقگی نہیں، افراد کا سہ نہیں، بے کاری اور قہوہ خانوں میں وقت گزاری ہے، شہری احساس کی کمی ہے۔ تعلیم عام نہیں۔ یہاں تک کہ مذہبی تعلیم کا بھی کوئی ایسا معیاری ادارہ نہیں کہ عالمِ اسلامی میں اس کا شہرہ ہو۔ نجف اشرف میں ایک مدرسہ "منتدی النشر" ہے جس کو بعض قدرے روشن خیال علما نے قائم کیا ہے۔ جس کے اساتذہ سے راجہ صاحب محمود آباد کے ذریعہ ملاقات ہوئی لیکن وقت کی کمی اور زبان نہ جاننے کی

وجہ سے اس کے حالات سے زیادہ واقفیت نہیں حاصل کر سکا۔

کربلا میں راجہ صاحب محمود آباد نے بہت اخلاق اور خلوص سے ہماری میزبانی کی ان کا بچہ سلمان بہت پیارا ہے۔ عزیزان کی لڑکی کی بھی تعریف کرتی ہیں۔ راجہ صاحب نے کربلا میں قیام کرنے کا پروگرام بنایا ہے۔ اور ایک اچھا مکان خرید لیا ہے۔ مقامی طور پر کافی اثر پیدا کر لیا ہے۔ کربلائے معلیٰ میں ہمارے زیارت کرانے والے "خادم" سید کاظم (ابن سید عبود) اور نجف اشرف میں سید باتوکمونی تھے۔ جو ہمارے دوسرے تمام عزیزوں اور بزرگوں کو جو یہاں آچکے ہیں۔ بخوبی جانتے ہیں۔ کربلا میں دامن صاحب جونیری کی والدہ صاحبہ نے بھی ہم لوگوں کو بُلایا اور چائے کی دعوت کی۔

کربلائے معلیٰ میں علاوہ راجہ صاحب کے احباب کے اور علما کے وہاں متصرف (گورنر) مکی جمیلی، مدیر معارف (ڈائرکٹر تعلیم) عبدالوہاب رکابی اور مقامی اسکولوں کے صدر مدرسین اور اور دوسرے اساتذہ سے ملاقات ہوئی۔ اور نجف اشرف میں قائم مقام (نائب گورنر) اور ثانوی مدرسے کے ہیڈ ماسٹر وغیرہ سے ملاقات اور گفتگو ہوئی۔ اور وہاں کے تعلیمی حالات کا جائزہ لیا جو چنداں قابلِ اطمینان نہیں ہیں۔ ہیڈ ماسٹر مدرسہ نے ایک طالبِ علم کی بنائی ہوئی تصویر تحفتاً دی جس میں ایک مقامی منظر دکھایا گیا ہے۔ واپسی میں ہم لوگ تھوڑی سی دیر کے لیے حِلّہ میں ٹھیرے جو فراؔت کے کنارے ایک خاصا پُرفضا شہر ہے۔ اور اس کا جدید حصّہ صاف اور کشادہ بنا ہوا ہے۔ بابُل کے مشہور کھنڈر جو اسی راستے میں پڑتے ہیں۔ انھیں بھی جاکر دیکھا اگرچہ اب اس کے آثار کم کم باقی ہیں (میں ٹیلوں پر چڑھ کر زیادہ تفصیل سے دیکھ بھی نہیں سکتا تھا)۔ اور بہت سی چیزیں جو کھود کر نکالی گئی تھیں وہ لندن اور برلن وغیرہ کے عجائب خانوں میں اور کچھ بغداد کے عجائب خانے میں پہنچ گئی ہیں۔ لیکن یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ یہ مقام ایک کافی ترقی یافتہ تہذیب کا گہوارہ اور گزرگاہ رہ چکا ہے۔ شہر بابل کا ایک لکڑی کا ماڈل ان آثار کے مطالعے کی بنا پر تیار کیا گیا ہے جو کافی IMPRESSIVE ہے۔ یوں ہی تہذیبیں بنتی اور بگڑتی رہی ہیں اور بگڑتی رہیں گی اور خدا نے قوموں کے عروج و زوال کے جو نفسیاتی اور تمدنی قوانین بنا دیے ہیں ان کی ترجمانی کرتی رہیں گی، خواہ معاصرین یہ سمجھیں کہ

ان کی خاص ریت کی دیواریں چٹان کی سی مضبوطی رکھتی ہیں! وتلک الایام نداولہا بین الناس!

میں نے وزارتِ تعلیم کے ایک معقول اور خلیق افسر عبداللہ محی الدین کے ساتھ بغداد کے بہت سے ادارے دیکھے جن میں ٹریننگ کالج، ثانوی مدارس، پرائمری مدارس، صنعت وحرفت اور HOME ARTS کے مدارس اور مضافات بغداد کے گاؤں کے مدرسے اور بغداد ضلع (لیوا) کا ایک دیہاتی ٹیچرز ٹریننگ کالج (جو یاذیہ میں واقع ہے۔ بغداد سے پچاس میل) سبھی شامل ہیں۔ اسکولوں اور کالجوں کی مادّی حالت میں کافی فرق ہے۔ بعض کی عمارتیں اور سامان وغیرہ کافی اچھے ہیں اور بعض میں معمولی فرنیچر وغیرہ کی بھی کمی ہے۔ لیکن تعلیمی حیثیت سے کسی مدرسے نے بھی مجھے زیادہ متاثر نہیں کیا۔ تعلیم زیادہ تر نظری اور کتابی ہے۔ مدرسوں میں یہ احساس نہیں کہ ہر اسکول کی اپنی ایک انفرادیت ہوتی ہے۔ اور انھیں طریقۂ تعلیم، نصاب، نظامِ ضبط وغیرہ میں کوئی خاص امتیازی شان پیدا کرنی چاہیے۔ فنی معلومات کی کمی ہے۔ اندازۂ اقدار بھی ذرا غلط ہے یعنی معمولی مدارس میں بھی ہیڈ ماسٹر کا کمرہ الگ ہوگا۔ اس میں ایک اچھا صوفاسٹ ہوگا۔ کبھی کبھی قالین ہوں گے۔ لیکن کتب خانہ اور کتابیں ندارد، لیبارٹری ندارد، دستکاری کا کمرہ ندارد! (عام طور پر عمارتوں کی حالت ناقابلِ اطمینان ہے۔ لیکن ہندوستان میں بھی ایسا ہی حال ہے!)

میں نے ایک ہیڈ ماسٹر سے کہا کہ اگر میں تمھاری جگہ ہوتا تو اپنا کمرہ کتب خانے کے لیے دے دیتا۔ لیکن یہ بات انھیں عجیب معلوم ہوئی!...... اسکولوں میں بچّوں کی بنائی ہوئی چیزوں کے ذریعہ کمروں کی آرائش کا خیال بہت کم ہے۔ ڈرائنگ ہوتی ہے لیکن تقریباً تمام تر نقالی۔ آزاد، خود اظہاری ڈرائنگ کا دستور نہیں۔ لڑکیوں کے اسکول (جن کا معائنہ مرد بغیر کسی دقّت کے کر سکتے ہیں)۔ مقابلتاً زیادہ صاف ستھرے اور باسلیقہ پائے اور استانیوں کا معیار بحیثیت مجموعی (کم سے کم ظاہری حیثیت سے، کیوں کہ طلبا کے تعلیمی معیار کی جانچ کا مجھے موقع نہ تھا) مردوں کے مقابلے میں کم نہیں اور ان کے میل جول میں بھی ایک خود اعتمادی اور مساوات کی شان ہے۔

تعلیمی درسگاہوں کے معائنے کے سلسلے میں بہت سے استادوں اور تعلیمی افسروں

سے ملاقات ہوئی۔ میرا خیال یہ ہے کہ اس قوم میں فطری ذہانت اور شخصیت کی اچھی صلاحیتیں ہیں لیکن تعلیم کی کمی اور عمدہ قیادت کے فقدان کی وجہ سے ان کے جوہر ابھر نہیں سکے۔ بچے روشن جبیں، ذہین، خوش زبان اور اکثر بہت پیارے ہوتے ہیں۔ لیکن اسکولوں کی تعلیم ان کے جوہر کو چمکانے میں کامیاب نہیں ہوتی اور بڑے ہوکر وہ اپنے PROMISE کو پورا نہیں کر پاتے۔ تعلیم کے محکمے میں وزیروں اور اعلا افسران میں اس قدر جلدی جلدی تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں (وزارت کی اوسط عمر چھ ماہ اور ڈائرکٹر جنرل تعلیم کا اوسط زمانہ کارکردگی کوئی سوا یا ڈیڑھ سال بیان کیا جاتا ہے!) کہ کوئی پالیسی استقلال اور یک جہتی کے ساتھ چل ہی نہیں سکتی۔ علاوہ اس کے وزارت کے صدر دفتر میں (شاید مصلحتاً!) اوسط قابلیت اور نرم رائے لوگوں کو رکھا گیا ہے۔ جو منظور شدہ پالیسی اور پروگرام کو ہر جدید وزیر کی آمد پر حسبِ ارشاد بدل دینے کو تیار ہوتے ہیں۔ اپنی رپورٹ میں ایسی بنیادی نقص پر مجھے خاص طور پر زور دینا ہے...... بعض بہت باخبر لوگوں سے بھی ملاقات ہوئی جن میں خاص طور پر قابلِ ذکر ایک ڈاکٹر جمالی ہیں جو پہلے محکمۂ تعلیم میں تھے، وزیرِ خارجہ رہ چکے ہیں۔ U.N.O. میں عراق کی نیابت کی ہے۔ اور آج کل صدر مجلس ہیں۔ امریکہ میں تعلیم کی مخصوص ٹریننگ حاصل کی اور تعلیمی مسائل میں اچھی نظر رکھتے ہیں۔ دوسرے ڈاکٹر تکرادی ہیں جو آج کل یونسکو میں EDUCATIONAL CLEANING SCHEME کے ڈائرکٹر ہیں اور عراقی وزارتِ تعلیم کے رکن (مدیر تعلیمِ اعلا) ہیں۔ یہ عیسائی ہیں۔ یہاں کے ایک اچھے تعلیم یافتہ خاندان سے ہیں۔ کولمبیا میں تعلیم پائی ہے۔ اور عراق کی تعلیم پر کتابیں اور رسالے لکھے ہیں۔ جو کافی اچھے ہیں۔

۱۱/اپریل

آج شمالی عراق کے تعلیمی ادارے دیکھنے کی نیت سے بغداد سے کرکوک اور موصل کے لیے روانہ ہوئے۔ کرکوک۔ وہاں سے دو سو میل سے کچھ زیادہ ہے۔ سڑک کہیں بہت اچھی، کہیں خاصی اور بعض جگہ زیادہ خراب ہے۔ (ایک مقام طاؤق پر محض دریا کے جمع کیے ہوئے پتھروں پر سے چند میل جانا پڑتا ہے جن کو دیکھ کر عزیز کے صبر و استقلال نے

تقریباً ہمت ہی ہار دی!) سب سے پہلے 'بغداد جدید' سے گزرے جہاں بغداد جدید سے ساتھ آٹھ میل کے فاصلے پر ایک نیا شہر بسایا جارہا ہے۔ سڑکیں پختہ بن گئی ہیں۔ جن کے بیچ میں گلاب کی کیاریاں ہیں۔ کچھ مکان بھی بن گئے ہیں۔ جو ایک ہی طرز کے ہیں۔ جب پورا منصوبہ مکمل ہوجائے گا تو یہ ایک صاف ستھرا خوش گوار شہر ہوگا۔ (بشرطیکہ DRAINAGE وغیرہ کا حشر بغداد جیسا نہ ہو!)...... راستے میں جہاں کہیں چھوٹے چھوٹے گاؤں سے بھی گزرے، قہوہ خانے آباد تھے۔ یعنی لوگوں میں بے کاری کا ثبوت موجود تھا! معلوم نہیں مقامی دستکاریوں اور صنعتوں کی طرف توجہ کیوں نہیں کی جاتی؟ ایک مقام طوز پر ایک نیا مدرسہ تعمیر ہورہا تھا۔ طاؤق میں ڈائرکٹر تعلیم صوبہ کرکوک (شاکر علی) نے استقبال کیا اور ایک لڑکیوں کا مدرسہ دکھایا۔ جس کی عمارت ایک خوش حال مقامی شیخ نے بنائی ہے۔ بچیوں کو ٹیکہ لگ جانے کی وجہ سے چھٹی دے دی گئی تھی۔ لیکن اس کی استانی، جو ایک خاصی ذہین نوجوان عورت تھی، اور مدیرِ معارف کا خاندان موجود تھا۔ عزیز بہ اکراہ وہاں جانے پر راضی ہوئیں کیوں کہ اس سے ذرا ہی پہلے طاؤق کا خراب راستہ عبور کیا تھا۔ (جس کو وہ میرے لیے مضر خیال کرتی تھیں)۔ ان لوگوں سے بامشکل انگریزی اور عربی کے چند لفظوں کے ذریعہ بات چیت ہوئی۔

طاؤق سے کرکوک کا راستہ بہت اچھا اور پختہ ہے اور دونوں طرف سرسبز کھیت یا ٹیلے اور خود رو لالے کے سرخ پھول ہیں۔ کرکوک میں ریلوے کے ریسٹ ہاؤس میں جگہ نہ تھی اس لیے عراق پٹرولیم کمپنی کے گیسٹ ہاؤس میں قیام کیا جو ایک بہت خوش گوار اور صاف ستھری جگہ پر واقع ہے۔ اور نہایت سلیقے اور عمدگی کے ساتھ چلایا جاتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ انگریزوں کو رہنے کا ڈھنگ خوب آتا ہے۔ اس کمپنی کا، جو پٹرول کی ایک بہت بڑی کمپنی ہے، گویا ایک اپنا چھوٹا سا شہر ہے جس میں افسروں کے لیے مکان، کلب، اسپتال، اسکول، سینما غرض ہر قسم کی ضرورت اور تفریح کی چیزیں مہیا ہیں۔ گیسٹ ہاؤس کا انتظام بہت اچھا ہے۔ باورچی ایک مرادآباد کا باشندہ ہے۔ جو تیس سال سے یہاں آباد ہے! ہم لوگ دو دن یہاں رہے لیکن 'گیسٹ ہاؤس' نے کچھ چارج نہیں کیا!

کرکوک عراق کا ایک لیوا (ضلع) ہے۔ یہاں کے باشندوں میں کافی تعداد ترکوں اور کردوں کی ہے۔ مدرسے کی ابتدائی جماعتوں میں ترکی اور کردی زبانوں میں تعلیم دی جاتی ہے۔ لیکن عربی درجہ اوّل سے لازمی زبان ہے۔ اُونچی جماعتوں میں ذریعۂ تعلیم عربی ہے۔ کئی مدرسے دیکھے، اچھے بُرے سب قسم کے ہیں۔ لیکن استادوں میں یہاں بھی خاص خوداعتمادی اور SOCIAL POISE ہے جو شاید عربی سیرت اور اسلامی جمہوری روایتوں کا اثر ہے۔ افسروں اور معمولی استادوں میں گفتگو اور میل جول میں مساوات کی شان ہوتی ہے۔ احساسِ برتری اور احساسِ کم تری کی ناگوار ٹکر نہیں پائی جاتی جو ہمارے ہاں عام ہے۔ لیکن فنّی اعتبار سے مدرسوں میں ابھی بہت ترقی کی گنجائش ہے۔ جدید خیالات کا رواج نہیں ہوا۔ مدرسوں میں ابھی تک تعلیم تمام تر نظری اور کتابی ہے۔ اور اس کا تعلق زندگی کے جیتے جاگتے مسائل کے ساتھ قائم نہیں ہوسکا۔

۱۴ اور ۱۵ اپریل موصل میں گزارے۔ یہ سارا راستہ پختہ اور پُرفضا ہے۔ کہیں کہیں ایسا معلوم ہوتا ہے گویا کشمیر پہنچ گئے۔ موصل بغداد کے بعد عراق کا سب سے بڑا شہر ہے۔ اس کی حالیہ ترقی اور آبادی میں اضافہ زیادہ تر پٹرول کے کاروبار کی وجہ سے ہے۔ یہاں ریلوے کے ریسٹ ہاؤس میں قیام رہا۔ جو اچھا خاصہ ہے۔ لیکن کرکوک کے .I.P.C گیسٹ ہاؤس کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ مقامی مدیرِ معارف (ابراہیم مفتی) نے علاوہ مدرسے دکھانے کے، موصل سے دو تین میل باہر نینوا کے قدیم کھنڈر (اور کھنڈر کیا، شہر کی چار دیواری جو اب ٹیلوں کی شکل میں میلوں تک پھیلی ہوئی ہے) دکھائے جو تین ہزار سال سے زیادہ پُرانے ایک قدیم تہذیب کی یاد زندہ کرتے ہیں۔ لیکن کھدائی کرنے کے بعد جو چیزیں ملی تھیں ان میں سے بیشتر لندن، پیرس، برلنگ کے عجائب خانوں میں پہنچ چکیں کچھ بغداد کے عجائب خانے میں ہیں۔ اس جگہ تو ایک بہت بڑے سائز کا پتھر کا سلامت بُت (جس کا منہ اور داڑھی انسان کا سا اور جسم شیر کا سا ہے) اور ایک ٹوٹا ہوا بُت موجود ہیں۔ مقامی میونسپل باغ دکھایا جس میں اسی روز "یوم سیّدات" تھا۔ اور سیّدات مع اپنے بچوں کے ہزاروں کی تعداد میں ٹولیوں میں پک نک منا رہی ہیں۔ پک نک یوں بھی مقبول معلوم ہوتا ہے۔ کیوں کہ

دریا کے کنارے اور نینوا کی طرف بھی بہت سے خاندان پک نک کر رہے تھے۔ لوگوں کے رنگ عام طور پر صاف اور ناک نقشے خوش نظر ہیں مدرسوں میں بھی بچے اور بچیاں (خصوصاً اسکول کی یونی فارم میں جن کا رنگ بالعموم سیاہ ہے) دیکھنے میں مغربی ملکوں کے بچوں کی طرح پیارے معلوم ہوتے تھے۔ ایک بچوں کے پرائمری اسکول میں ڈرل کا بہت اچھا انتظام تھا۔ پبلک گارڈن کا ایک حصہ بچیوں کی باغبانی کے لیے مخصوص کر دیا گیا تھا جہاں ان اسکولوں کے بچے ہفتے میں دو بار اپنے اپنے پلاٹ میں کام کرتے ہیں۔ جن کے پاس اپنی زمین باغبانی کے لیے نہیں ہے۔ ایک استادوں کا کلب ہے جس کی کافی معقول عمارت (اور باغ) خود ان کے چندے سے بنائی گئی ہے جس میں ہر شام کو کم از کم سو استاد جمع ہوتے ہیں۔ کلب کا خیال بہت اچھا ہے۔ اگرچہ ابھی تک اس کی حیثیت ایک سوشل کلب ہے۔ وہ ان کی فنی اور تہذیبی سرگرمیوں کا مرکز نہیں بن سکا۔ ایک پبلک لائبریری بھی ہے۔ لیکن ان اداروں میں زیادہ جان ڈالنے کی ضرورت ہے۔ تاکہ وہ مقامی علمی زندگی میں فعال حیثیت سے اپنا وظیفہ انجام دے سکیں۔ (کیسا ثقیل اور غیر ہندوستانی جملہ لکھا گیا ہے!)۔

۱۷ر کو بغداد واپس ہوئے۔ قدوائی صاحب کے مکان کے نیچے کے حصے میں قیام کیا۔ ہوٹل سے جی اکتا گیا تھا۔ یہ انڈین لگیشن میں پریس اٹاچی ہیں۔ ہندوستان سے بچیوں کے اور عابد صاحب، مصداق، اظہر کے خط آئے ہیں۔ جن سے خیریت معلوم کرکے اطمینان ہوا اور خدا کا شکر ادا کیا۔

اس مکان میں تقریباً ایک ماہ قیام رہا۔ اور اس عرصے میں (علاوہ کفایت کے!) ہم لوگ بہت اطمینان اور خاطر جمعی سے رہے۔ قدوائی صاحب اور ان کی بیوی نے بہت خلوص اور محبت کا سلوک کیا جس کی وجہ سے معلوم ہوتا تھا کہ گویا ہم لوگ اپنے عزیزوں کے ساتھ مقیم ہیں۔ ان کی ایک چھ سات سال کی بچی TONY ہے جو شروع میں تو بہت "لیے دیے" اور الگ الگ رہی اور سر اور آنکھوں سے بولتی تھی، زبان نہ کھولتی تھی ("بازاری عربی، اچھی خاصی سیکھ گئی ہے")۔ لیکن ایک روز میں نے اسے ایک مقناطیسی کھلونے کے چند کھیل سکھائے۔

اور اس کے بعد کافی دوستی ہوگئی۔ ایک دفعہ میں نے اس سے عربی میں پوچھا کہ تمھارے ابا کہاں ہیں۔ کہنے لگی، "آپ تو نحوی عربی بولتے ہیں"!.....

واقعہ یہ ہے کہ کلاسکی اور بول چال کی زبان میں کافی فرق ہوگیا ہے۔ اور شاید لفظوں کا فرق اس قدر نہیں ہے جس قدر تلفّظ کا ہے۔ اس لیے ہندوستان کی سیکھی ہوئی کتابی عربی لوگوں کے کام نہیں آتی۔ مثلاً "مایکون" (نہیں ہوتا یا نہیں) کو "ماکو" کہتے ہیں۔ "آیکون" کو "اکو"۔ اگر "مایکون" وغیرہ کہیں تو لوگوں کی سمجھ ہی میں نہیں آتا۔ ق کی آواز کو گ کی آواز میں بدل دیا ہے مثلاً "قل" کا تلفظ "گل" ہے۔ خربوزے کو "رگی" (رقی) کہتے ہیں۔ چ اور پ کی آوازیں زبان میں شامل ہوتی ہیں اس میں کچھ عربی کا اثر ہے، کچھ مغربی زبانوں سے لفظوں کو معرّب کرنے کی وجہ سے ایسا کیا ہے۔ برخلاف ہمارے ہاں کی موجودہ رجعت پسندانہ تحریک کے عربی میں نئے الفاظ اور اصطلاحیں حسبِ ضرورت مغرب کی زبانوں سے کھُلے دل کے ساتھ لی گئی ہیں۔ مثلاً TYRES کو "تارات" کہتے ہیں۔ (جمع عربی طریقہ پر بنائی جاتی ہے) جن لفظوں کو آسانی سے ادا نہ کیا جا سکے ان کو زیادہ سلیس کر دیا گیا ہے۔ ایک ساخت کے BERGOUGNAN ہوتے ہیں جو انگریزی میں VENUS کہلاتے ہیں۔ وہ برکونیان بن گئے ہیں۔ بعض تبدیلیاں دل چسپ ہیں فینس کو فینس (تین نقطوں کے ساتھ، تلفظ فینس) لکھا جاتا ہے تاکہ معلوم ہو جائے کہ اصل زبان میں ہجّے V سے کیے گئے ہیں۔ ساتھ ساتھ روز مرّہ کی جدید چیزوں کے لیے اپنے الفاظ بھی بنائے ہیں۔ موٹر کو "سیارہ" یا مشین کہتے ہیں۔ TELEVISION معرّب شکل میں تیلی ہے LAUNDRY (سکوی) STORE (مخزن) قینٹر-لون (محامی) ADVOCATE-

اس عرصے میں ہندوستانی سفارت خانے کے تجارتی سکریٹری مسٹر مالک رام۔ لو۔ بجہ اور ان کے خاندان سے ملاقات ہوئی یہ کوئی ۱۶ رسال سے ہندوستان سے باہر ہیں۔ عراق میں تو ڈیڑھ سال سے ہیں لیکن اسکندریا میں تیرہ سال کے قریب رہے۔ ایک عرصہ ہوا نیرنگِ خیال کے ایڈیٹر تھے۔ ادبی ذوق بہت اچھا ہے۔ غالب پر ایک اچھی کتاب لکھی ہے۔ جس کا دوسرا ایڈیشن جامعہ سے ابھی شائع ہوا ہے۔ اپنا مطالعہ اور لکھنے پڑھنے کا شغل

حتی الامکان جاری رکھا ہے۔ ع.ب. خوب بولتے ہیں۔ اپنے ایک لڑکے کا نام سلمان اور لڑکی کا نام بشریٰ رکھا ہے۔ اسلامی ادب اور مذہب سے اچھی واقفیت ہے۔ ہم لوگوں سے بہت خلوص سے ملے۔ افسوس ہے کہ ہمارے قیام کے دوران ہی میں ان کا تبادلہ دوبارہ اسکندریا ہوگیا۔

اس زمانے میں یونس اور ان کی بیوی لاج سے بہت ملاقات رہی دونوں بہت شریف، مخلص اور محبت کے انسان ہیں۔ لاج لاہور کے مشہور ہیڈ ماسٹر رلیارام کی بیٹی ہیں۔ جو ایک مشن اسکول کے ہیڈ ماسٹر اور خود عیسائی تھے۔ میں انھیں اچھی طرح جانتا تھا۔ لاج خود ایم اے پاس ہیں اور بہت ذہین، خوش گفتار (اور قدرے خودرائے!) خاتون ہیں۔ عزیز کو اور مجھے دونوں میاں بیوی بہت پسند آئے ان کا ایک لڑکا عادل ہے جو کوئی پانچ برس کا ہے اور بہت پیاری باتیں کرتا ہے .... یونس اپنے کام میں ہوشیار اور ہونہار ہیں۔ ان کے پیروں جن سے انھیں والہانہ عقیدت ہے دو ہیں۔ جواہرلال اور بادشاہ خاں۔ لاج محض بُت شکن ہیں (لیکن یہ شاید عمر کا تقاضہ ہے)۔

سفرِ فرانس

۱۹۵۲

۲ر نومبر

ایک اور سفر در پیش ہے۔ اِس دفعہ یونسکو کانفرنس میں شریک ہونے کے لیے پیرس کا۔ گزشتہ مرتبہ مَیں کانفرنس میں حکومتِ ہند کے نمائندے کی حیثیت سے ۴۶ء میں شریک ہوا تھا۔ اُس کے بعد یونسکو سے گو راہ و رسم رہی لیکن سرکاری حیثیت سے نہیں ہندوستانی وفد کے لیڈر ڈاکٹر رادھاکرشنن ہیں اور علاوہ اور لوگوں کے ہندوستان کے سفیر، فرانس سردار ملک، مسٹر کریم بھائی، پروفیسر واڈیہ، این۔ سی۔ مہتا، فضل رحمت اللہ اُس کے ممبر ہیں مجھے ڈاکٹر مُدلیار کے بجائے یونسکو کے ایگزکٹو بورڈ میں بھی شامل ہونا ہے جو ۵ر نومبر سے شروع ہے۔ کانفرنس ۱۲ر نومبر سے ۱۰ر دسمبر تک ہوگی۔

سفر B.O.A.C. کے جدید جٹ پلین COMET میں کرنا ہے جو ہوائی سائنس کا تازہ ترین شاہکار ہے اور حوادث طوفان اور بادلوں کی دسترس سے آگے یعنی کوئی ۳۸ یا ۴۰ ہزار فٹ کی بلندی پر اُڑتا ہے یعنی زمین سے کوئی چھ میل بلند! سوچا جائے تو کیسا عجیب

معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہزاروں من کی مشین ہوا کے پروں پر سوار اتنی بلندی پر اُڑی جارہی ہے اور انسان کی زندگی کا انحصار ہر اس چھوٹے سے کیل پُرزے کی مضبوطی اور "صحت" پر ہے جو اس میں استعمال کیے گئے ہیں! کہتے ہیں کہ یہ جہاز، "ذوالفقار علی خاں کی موٹر کی طرح خاموش اور آواز سے زیادہ سریع رفتار ہے۔

ہوائی اڈے پر بہت سے عزیز چھوڑنے آئے۔ عزیز، اظہر، مصداق، اتمن، بچیاں وغیرہ۔ چند سال پہلے جب میں بیس سال کے بعد ولائت دوسری دفعہ آیا ہوں (یعنی طالبِ علم کے قیام کے بعد) تو اس سفر میں بہت دل چسپی اور ایک طرح کی EXCITEMENT محسوس ہوئی تھی اور ہر چیز نئی معلوم ہوتی تھی۔ اب کئی مرتبہ آنے کے بعد "مساوات" کا سا احساس ہوتا ہے۔

سفرِ ایران

۱۹۵۸

تیس سال بعد!

۶ ستمبر

۱. تیس سال پہلے میں ایران آیا تھا۔ تیس سال! ایک پوری نسل کی زندگی بیت گئی اور دنیا کی تاریخ میں ایسے ایسے حادثے اور کارنامے پیش آئے جن کی نظیر زمانۂ ماضی میں نہیں ملتی۔ اس وقت میرے ساتھ چچا ابا تھے جو اب خدا کو پیارے ہو چکے لیکن جن کی پختہ اور بلند سیرت کا نقش ہم سب پر ثبت ہے۔ زیدی صاحب ساتھ تھے جو اپنی زندگی کی بہت سی کامیاب منزلوں کو ختم کرنے کے بعد علی گڑھ میں وائس چانسلر ہیں اور اس وقت وہاں ہیڈ ماسٹر تھے۔ اب میرے ساتھ عزیز ہیں جو باوجود بچوں اور عزیزوں کی سخت محبت اور یاد کے میرے ساتھ حقِ رفاقت ادا کرنے آئی ہیں ـــــ

۲. دہلی میں دن بھر دوست، عزیز، ملاقاتی آتے رہے اور اپنی نیک تمنائیں بھینٹ کرتے رہے (خدا کرے جو کام کرتا ہے وہ کامیابی کے ساتھ انجام پائے) ایر پورٹ پر

بہنیں، بچیاں، غفران، اظہر، عابد صاحب، ساجدہ، زاہدہ، امتن اور بچے اور بعض منسٹری کے رفقائے کار وغیرہ غرض بہت سے لوگ آئے تھے اور سب نے بہت محبت سے الوداع کہا سفر B.O.A.C کے ایک آرام دہ جہاز میں ہو رہا ہے جس میں جاننے والے کوئی نہیں۔ روانگی مقررہ وقت سے چار گھنٹے بعد ہوئی۔

۳۔ رات کے بارہ بجے کے بعد کراچی پہنچے جہاں بہت سے عزیزوں، حامد صاحب، ذوالفقار بھائی، صادق، واثق، مرتضیٰ، الکن، عذرا، صفیہ، مسز واثق، طیبہ اور اُن کے شوہر اور بچے تنویر وغیرہ سب موجود تھے۔ رات کو نیند خراب کر کے ان سب عزیزوں نے اپنی محبت کا دل نشین ثبوت دیا واقعہ یہ ہے کہ زندگی میں محبت کے سوا اور کون سی قدر مستقل ہے؟ اس سے زندگی کے سیاہ خانے میں چراغ روشن ہوتے ہیں۔ اقبال نے لکھا ہے کہ" اس کی (مردِ مومن کی) نفرت بھی عمیق ...... اس کی محبت بھی عمیق"۔ ابھی تک تو ہند و پاکستان کی تقسیم کی وجہ سے کم سے کم ہمارے عزیزوں کے دلوں کی تقسیم نہیں ہوئی لیکن یہ اندیشہ ضرور ہے کہ آئندہ نسل تک اجنبیت بڑھ جائے گی (چلتی ریل میں خط لکھنا محال ہے!)۔

۱۷ ستمبر

۴۔ ۱۷ کی صبح کو پانچ بجے کے قریب طہران پہنچے جہاں قدوائی صاحب نے اور وزارتِ خارجہ کی طرف سے آغائے فریدانی نے (جو ہندوستان میں کلچرل کونسلر رہ چکے ہیں) اور آغائے فرجادنے (جن کو ہمارا GUIDE مقرر کیا گیا ہے) اور وزارتِ تعلیم کے ایک افسر نے ہمارا استقبال کیا۔ باہر نکلتے وقت جب سامان اور پاسپورٹ دیکھنا چاہا تو فریدانی نے کہا کہ یہ حکومت کے مہمان ہیں" مدیر کل وزارتِ فرہنگ" ہیں وغیرہ وغیرہ جس کی وجہ سے انھوں نے بغیر معائنہ جانے دیا (شاید ہندوستان میں اس قدر آسانی کے ساتھ قاعدے قانون سے مفر نہیں مل سکتا) معلوم ہوا کہ ڈاکٹر اصغر علی حکمت، وزیرِ خارجہ کے ایما سے (جو پہلے ہندوستان میں ایران کے سفیر تھے) ہم لوگوں کو سرکاری مہمان تصور کیا جائے اور جہاں کہیں سیر و سیاحت کے لیے جانا چاہیں گے اس کا انتظام کیا جائے گا۔ ہمارے قیام کا انتظام " ہوٹل جم " میں کیا گیا ہے قدوائی صاحب ہمیں

اپنے ساتھ ٹھیرانا چاہتے تھے لیکن اس "پروٹوکول" کے خیال سے مجبور ہو گئے لیکن جب معلوم ہوا کہ کمرہ تیسری منزل پر ہے تو عزیز کے شور و غل پر یہ طے پایا کہ قدوائی صاحب کے ہاں ٹھیرا جائے (جس پر ان کی بیگم کا بھی اصرار تھا) نیچے کی منزل میں کمرہ خالی ہونے میں دو روز لگتے جو انھیں گوارا نہ تھا۔ چناں چہ ہم شام تک ان کے ہاں پہنچ گئے۔

۵۔ آج دن میں ڈاکٹر حکمت سے ملاقات کی جو بہت دیر تک مولانا آزاد کا ذکر کرتے رہے۔ ان کی خواہش ہے کہ ترجمانُ القرآن کا فارسی ترجمہ شائع کیا جائے اور وہ خود اس فرض کو انجام دینے کے لیے تیار ہیں بشرطیکہ ان کے ساتھ ایک اچھا اُردو داں شخص لگا دیا جائے جس کے لیے انھوں نے ڈاکٹر جعفری کا نام تجویز کیا ہے جو آج کل یہاں یونی ورسٹی میں انگریزی کے معلّم کا کام کر رہے ہیں یہ خود ہندوستانی ہیں لیکن حکومتِ ایران کے وظیفے پر انھوں نے فارسی ادب میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ تجویز اچھی ہے اور اس کو چلانا چاہیے۔ آغائے فرجاو کے ساتھ وزارتِ فرہنگ (ایجوکیشن منسٹری) کے بہت سے افسروں سے ملاقات ہوئی ان میں آغا شائی (جو ابھی ہندوستان کے سیمنار میں شریک ہوئے تھے) اور ٹکنیکل ایجوکیشن کے ڈائرکٹر اور وزارت کے پارلیمنٹ سکریٹری جناب آغا فریدانی وغیرہ شامل ہیں۔ ان سب میں مجھے ٹکنیکل ایجوکیشن کے ڈائرکٹر باخبر معلوم ہوئے۔ باقی حضرات بہت خلیق تھے لیکن کسی کے دفتر میں یا میز پر کام کا ہجوم یا کام کی فضا نہ تھی۔ فریدانی صاحب آدھ گھنٹے تک مختلف لوگوں کو فون کرکے ہمارا پتہ دیتے رہے گویا "کرنا انھیں باقی یہی اک کام ہے گویا" (حالی)۔ میرا جو اندازہ اب سے تیس سال قبل تھا اس کی کم سے کم سرسری طور پر دوبارہ تصدیق ہوتی ہے۔ یعنی ایرانیوں میں ذہانت اور اخلاق ہے لیکن فعالیت کی کمی ہے۔ خوش باش، خوش پوش، خوش فکر اور خوش صورت لوگ ہیں۔ کام کی زیادہ لگن نہیں۔ رات کو آغائے حکمت نے ہم لوگوں کے اعزاز میں طہران سے بارہ میل باہر ایک شمران HILL STATION میں شاندار ڈنر دیا۔ جس میں وزارتِ خارجہ اور وزارتِ فرہنگ کے نمائندے اور بعض دیگر اکابر شامل تھے۔ ان میں قابلِ ذکر ڈاکٹر نقی زادہ (معروف عالم اور سیاست دان) ہیں جن کا ذکر آبا میاں نے اپنے سفرنامے میں جو ۴۰ سال قبل لکھا گیا تھا کیا

ہے۔ پروفیسر صورت گر جو یونی ورسٹی میں معلّم ہیں اور میسور کے سیمنار میں ۱۹۴۸ء میں ایران کی طرف سے شریک ہوئے تھے، پروفیسر سعید نفیسی تھے جو علی گڑھ میں معلّم رہ چکے ہیں۔ ڈاکٹر فرہاد جو یونی ورسٹی کے وائس چانسلر ہیں۔ اور قابل آدمی معلوم ہوتے ہیں (پیشے کے اعتبار سے ریڈیو لجسٹ ہیں)۔ سفارتِ ہند کے چند افسر بھی شامل تھے۔ آغائے حکمت دو تین روز کے بعد U.N میں شریک ہونے امریکہ جا رہے ہیں۔

۸ ستمبر

آج صبح آغائے فرجاد کے ساتھ ہم لوگ ہوائی جہاز سے مشہدِ مقدّس کے لیے روانہ ہوئے جہاز ساڑھے تین گھنٹے میں پہنچتا ہے "ایران ایر" کا ذرا چھوٹا جہاز ہے جس میں دو پنکھے لگے ہیں۔ سفر اچھا کٹا لیکن آخر وقت میں عزیز نے عادت کے تقاضے سے جہاز پر تبرا (ایق بینی) کیا ہوائی اڈّے پر ہمیں لینے کے لیے رئیس فرہنگ مشہد آغائے بہادری اور چند اور حضرات آئے تھے۔ پہلے سیدھے آستانۂ قدسی گئے جہاں جاکر زیارت پڑھی اور اس عالی مرتبت امام کے روضے کو دیکھا جن کی ذات اسلام کی ابتدائی تاریخ میں آفتاب کی طرح روشن ہے۔ اس روضے کو ایران کے بادشاہوں نے صدیوں تک بڑی محبت اور عقیدت کے ساتھ تعمیر کیا ہے۔ اور عمارت نہ صرف اندر سے شاندار ہے بلکہ باہر سے بھی بہت صفائی کی گئی ہے جو پہلے نہ تھی کیوں کہ پُرانے پُرانے مکان روضے کے دروازے تک بنے ہوئے تھے۔ وہ اب ہٹا دیے گئے ہیں اور ان کی جگہ چمن بندی کر دی گئی ہے روضے کی بہت سی اِملاک یعنی زمینیں اور عمارتیں وغیرہ ہیں جو لوگوں نے اور بادشاہوں نے روضے کے لیے وقف کی ہیں زیادہ تر خراسان کے صوبے میں ہیں لیکن اس سے باہر بھی ہیں۔ ایک کروڑ روپیہ سالانہ سے زیادہ آمدنی ہے جس کے علاوہ روضے کے تمام اخراجات کے، اسپتال، تعلیم گاہیں وغیرہ بھی چلائی جاتی ہیں۔ کتاب خانہ اور میوزیم کا انتظام کیا جاتا ہے جو ایک نئی اور شاندار عمارت میں ہے جو روضے کے برابر میں ہے اس روضے کا متوّلی خود شاہ ایران ہے لیکن وہ اپنی طرف سے ایک نائب متولّی کو مقرّر کرتا ہے۔ آج کل نائب متولّی ایک شخص ڈاکٹر شادمان ہیں

جو بہت عرصے تک ایران کی طرف سے اینگلو پرشین آئیل کمپنی میں ڈائرکٹر رہ چکے ہیں اور پندرہ سال کے قریب انھوں نے انگلستان میں گزارے ہیں وہ اور ان کی بیوی جو بہت تعلیم یافتہ اور شائستہ معلوم ہوتی ہیں شہر سے بارہ میل دُور ایک بہت بڑے باغ میں رہتے ہیں۔ جو روضے کی ملکیت ہے۔ اور جہاں نائب متولی کی قیام گاہ بھی ہے۔ زیارت کے بعد ہم ان کے مکان پر لنچ کے لیے مدعو تھے۔ اور آغائے فرجاد اور آغائے بہادری بھی ساتھ تھے۔ انھوں نے بہت خلوص کے ساتھ پذیرائی کی۔ اس قدر خلوص سے کہ کم آمیز عزیز جہاں بیگم بھی ان کی بیوی کی قائل ہوگئیں بےتکلف کا کھانا کھلایا اور بہت سی باتیں کیں۔ یہ ایک وفد کے ساتھ روس بھی ہو آئی ہیں کہتی ہیں کہ روسی بہت اخلاق سے ملتے تھے لیکن اپنے گھروں پر کسی کو نہیں بلاتے تھے۔ شاید حکومت کو یہ ناگوار ہو! مشہد میں پھل اس قدر عمدہ (اور سستے!) ہیں کہ عزیز نے بھی اپنے تعصب کو توڑ کر انگور اور خربوزہ کھایا جس کی شادابی اور شیرینی قابلِ ذکر ہے!

۲۔ شام کو دوبارہ روضہ کی زیارت کی چوں کہ ہم لوگ سرکاری مہمان کی حیثیت سے آئے تھے اس لیے ہر کام میں بڑی سہولت رہی (ضرورت سے زیادہ سہولت! وہ یوں کہ حرم مبارک میں بےحد ہجوم تھا اس قدر کہ مزار کے کٹہرے کو ہاتھ تک نہ لگا سکتے تھے لیکن ہمارے ساتھ جو لوگ تھے وہ اصرار کرتے تھے کہ لوگ راستہ چھوڑ دیں جو مجھے چنداں پسند نہیں) اندازہ ہوا کہ صبح سے شام اور شام سے رات تک ہر وقت ہزاروں آدمیوں خصوصاً عورتوں کا ہجوم رہتا ہے جو بہت خلوص و خضوع سے دُعائیں پڑھتیں اور مانگتی ہیں یا زیارت خواں اپنے اپنے گروہ کو زیارت پڑھاتے ہیں اگر مذہبیت کا اندازہ خلوص کے اس اظہار سے کیا جائے تو یہاں عام لوگوں میں کافی جذبۂ مذہب ہے لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ مذہب کی روح اور اس کے عملی ارکان کہاں تک ان لوگوں کی زندگی کا جزو ہیں۔ بظاہر امرا اور رؤسا اور عواص پر تو مغربی تہذیب کا ابھی تک بہت کافی اثر ہے۔ معیارِ زندگی غالباً حیثیت سے زیادہ بلند ہے۔ معاشرت کا انداز وہی ہے۔ سوچتا ہوں کہ اس طبقے کے پاس اس قدر دولت کہاں سے آئی۔ خیال ہے کہ دوسرے مشرقِ اقصیٰ کے ملکوں کی طرح ملک کی ساری دولت سمٹ کر طہران میں آگئی ہے۔ اور طہران کی دولت ان چند سو خاندانوں میں جو بیشتر وسائل اور ذرائع اور اُونچی ملازمتوں

اور (غالباً) صنعت و تجارت کے مالک ہیں۔ ابھی تک ملک میں یہ کوشش نہیں کی گئی کہ عوام کی زندگی کے معیار کو بلند کیا جائے، گاؤں اور چھوٹے چھوٹے قصبوں میں عام لوگوں کی زندگی کے سُدھار کے کام کیے جائیں جس طرح ہندوستان میں کوشش ہو رہی ہے۔ خود صدر مقام اور چند بڑے شہروں میں عالی شان عمارتیں ہیں، بجلی ہے، بڑی بڑی موٹریں دہلی سے زیادہ موجود ہیں، بیرونی ممالک کا آیا ہوا ہر قسم کا مال بے اندازہ دوکانوں میں بھرا ہوا ہے، شاید اپنی صنعت و حرفت کو ترقی دینے کی کوئی باضابطہ کوشش نہیں کی گئی۔ اس کی وجہ کچھ تو یہ ہے کہ اہلِ مغرب نے اپنے تصرف کے زمانے میں ان صنعتوں اور مشینی کاموں کو اُبھرنے نہیں دیا اور دوسرے ان کاموں کو ہمت، صبر اور استقلال کے ساتھ انجام دینے کے لیے ایک ایسی ذہنیت کی ضرورت ہے جو حال کے مفاد اور آرام کو مستقبل پر قربان کر سکے۔ یہ ابھی ایران میں عام نہیں ہوئی۔ لیکن ساتھ میں یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ بعض لحاظ سے کافی ترقی ہوئی ہے۔ طہران میں ایک اعلا درجے کی یونی ورسٹی ہے جس پر گزشتہ سال محکمۂ تعلیم کی رپورٹ کے مطابق ۴ کروڑ کے قریب روپیہ صرف ہوا! (ابھی تک اس رقم پر یقین نہیں آتا۔ کیوں کہ کالج اس کے علاوہ ہیں۔ ان کا خرچ یونی ورسٹی کے بجٹ میں شامل نہیں۔ یہ تو صرف یونی ورسٹی کے تیرہ یا چودہ کالجوں (ڈپارٹمنٹ) کا خرچ ہے جو خاص طہران میں واقع ہیں) ایک شاندار ہوائی اڈا طہران میں بنایا گیا ہے اور بہت سے حصوں میں ہوائی سروس ہوگئی ہے۔ مشہد سے طہران تک ریل قائم ہوگئی ہے جو خاصی آرام دہ ہے۔ فرسٹ کلاس کے ڈبے ہمارے ہاں کے .A.C.C کی طرح ہیں! اسی طرح سڑکیں بہتر بن گئی ہیں اور وسائل نقل و حرکت بہت بہتر ہو گئے ہیں۔ غالباً ان کاموں میں تیل کی بے اندازہ آمدنی صرف ہوئی ہے۔ ایران کو اب کل آمدنی کا $\frac{1}{2}$ ملتا ہے۔ ڈاکٹر مصدق کی تحریک سے پہلے ایران کو شاید ایک تہائی سے کچھ ہی زیادہ نصیب ہوتا تھا۔

۳۔ یہ میں کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ مشہد کے روزِ اوّل کا ذکر کر رہا تھا۔ شام کو مشہد کے گورنر (جس کو استندیار کہتے ہیں) آغائے جعفری سے ملنے گئے۔ جو ایک قدرے "رُعب دار" انداز میں رہتے ہیں۔ یہ ہند کی تعلیم کے بارے میں بہت سی باتیں پوچھتے رہے لیکن چوں کہ

"زبانِ یارِ من فارسی است و من بہ زبانِ فارسی بہ فصاحتِ حرف نمی دانم" لہٰذا جہاں تک ہوسکا اُن کے سوالوں کے جواب دیتا رہا۔ خود ان کے جوابوں سے (اور بعض دوسرے لوگوں کی باتوں سے بھی) مجھے یہ شبہ ہوتا ہے کہ غالباً یہ لوگ اپنی ہر چیز کو اچھا اور بڑھا کر بیان کرتے ہیں (دہلی کے سیمنار میں بھی ایسا اندازہ ہوا تھا) یہ پہلے وزیرِاعظم رہ چکے ہیں لیکن ہندوستان سے ناواقف ہیں۔ یوں ذہین آدمی ہیں۔ اگلے روز ہماری روانگی سے پہلے ملاقاتِ بازدید کے لیے آئے تھے۔

۴۔ شام کو باغ ملی کی سیر کو گئے جہاں جاکر گزشتہ سفر کی یادیں تازہ ہوگئیں۔ یہ ان چند مقامات میں سے ہے جو میرے ذہن میں تازہ تھے۔ یہاں لوگ شام کو سیر کے لیے آتے ہیں اور ریسٹوراں وغیرہ میں کھاتے اور تفریح کرتے ہیں۔ کیوں کہ "خانم محترم" ساڑھی میں ملبوس تھیں اس لیے گویا "شہر کے لڑکوں کی برآئی مراد" اور جا بجا ساڑھی کے اعجاز سے ٹریفک بند ہوگیا! باغ ملی میں (بلا مبالغہ) یہ کیفیت تھی کہ سب لوگ بالخصوص خواتین اپنی تفریح کو چھوڑ کر اس طرف متوجہ تھیں چناں چہ ایک میاں بیوی آپس میں لڑتے جھگڑتے جارہے تھے۔ اس ہندوستانی "مہارانی" کو دیکھا تو آپس کے جھگڑے کو بھول گئے اور تعلقات خوش گوار ہوگئے! رات کو کھانا کھانے کے بعد دوبارہ حرم مقدس گئے جہاں استعمال کے لیے عزیز طہران سے ایک چادر لے آئی تھیں جو قدوائی صاحب کی ایرانی خادمہ صغرا کی ملکیت تھی۔ اس وقت اس امید میں آتے تھے کہ ذرا حضورِ قلب کے ساتھ دُعا کرنے کا موقع ملے گا لیکن اس وقت بھی حرم میں اتنا ہی ہجوم تھا اور جو کیفیت تنہائی میں پیدا ہوتی ہے پیدا نہ ہوسکی۔ حرم کے بالکل برابر میں ایک کمرہ ہے جہاں گویا حرم کا دفتر ہے جس میں چند آدمی کام کرتے ہیں۔ یہاں بھی چائے پلائی گئی اس کا دستور ہر جگہ چلتا ہے۔ طہران کی گرمی اور مچھروں سے نجات پاکر رات کو خاصے آرام سے سوئے البتہ ایک لطیفہ رہ گیا خانم غسل خانے میں تشریف لے گئیں تھوڑی دیر کے بعد گویا ایک چھوٹے بم کے پھٹنے کی آواز آئی میں نماز ختم کرکے اس طرف دوڑا، ہوٹل کے ملازمین پہلے ہی سے دروازے پر پہنچ چکے تھے، اور خیریت دریافت کررہے تھے۔ دروازہ کھولا تو دیکھا خانم کھڑی کانپ رہی ہیں، چہرے کا رنگ اُڑا ہوا ہے اور مجرم کی سی کیفیت ہے اور منہ ہاتھ

دھونے کا برتن ٹکڑے ٹکڑے زمین پر پڑا ہوا ہے۔ عینک اور گھڑی اس کے ٹکڑوں میں غائب ہیں معلوم ہوا اس برتن پر ہاتھ یا کہنی رکھی تھی کہ وہ زمین پر آرہا اور حادثے کو پیارا ہوا لیکن اس بات کی داد دوں گا کہ ملازمین نے اپنی طرف سے معذرت کی مزاج پُرسی کی اور کسی طرح یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ مہمان خانے کا نقصان ہوا ہے!۔

۹، ستمبر

آج صبح طوس گئے تاکہ فردوسی کے جدید مزار کو دیکھیں جو چند سال قبل بنایا گیا ہے۔ سنگِ مرمر کی عمارت ہے بڑی عالی شان۔ باہر فردوسی کے چیدہ چیدہ اشعار پتھر میں کندہ ہیں اور اندر تہ خانے میں جہاں قبر ہے دیواروں پر شاہنامے کے سین پتھر میں کھدے ہوئے ہیں۔ اس کے قریب ایک چھوٹا سا فردوسی کا میوزیم بھی ہے جس میں بہت سی چیزیں ہیں مثلاً خوش نویسوں کے لکھے ہوئے کتبے، کپڑے میں بہت خوبصورتی سے کڑھے ہوئے فردوسی کے اشعار، اس کے زمانے کی بعض مصنوعات وغیرہ۔ یہ عمارت آغائے حکمت کے زیرِ اہتمام بنی ہے۔ انھوں نے فردوسی کی ہزار سالہ یادگار منانے میں بڑا نمایاں حصہ لیا تھا اور وہاں تمام مستشرقین کی ایک کانفرنس کی تھی جس میں ہندوستان سے بھی چند نمائندے شریک ہوئے تھے۔

۲۔ راستے میں رضا شاہ کا مزار دیکھا یہ بھی سنگِ مرمر کا بنا ہوا ہے اور اسی انداز کا ہے۔ ایک زیارت خواجہ ربیع کی ہے جو امیر المومنین علی مرتضیٰ کے اصحاب میں سے تھے اس کی مرمت ہو رہی ہے وہاں ایک ایرانی انجینیر نے دکھایا اور سمجھایا کہ ایرانی کاری گر کس طرح پچی کاری کا کام کرتے ہیں اور اینٹوں کو کاٹ کر اور نیلا رنگ لگا کر ان سے حروف بناتے ہیں جو دیواروں اور محرابوں میں نصب کیے جاتے ہیں اور قرآن مجید کی آیات یا اشعار وغیرہ عمارتوں پر لکھے جاتے ہیں واقعاً کمال کی کاری گری درکار ہے۔ جس طرح تاج محل میں پتھروں کو کاٹ کر آیات قرآنی کو کندہ کیا گیا ہے اس طرح یہاں یہ کام اینٹ میں بڑی عمدگی اور سلیقہ کے ساتھ کرتے ہیں مشہد اور اصفہان وغیرہ میں اس قسم کا کام خصوصیت کے ساتھ بہت اچھا

کیا جاتا ہے۔

۳۔ روانگی سے پہلے کچھ خریداری کی کوشش کی لیکن ناواقفیت کی وجہ سے چنداں کامیابی نہ ہوئی۔ یہاں کے فیروزے بہت مشہور ہیں لیکن نہ زبان کی سہولت نہ قیمتوں کا اندازہ نہ اچھے بُرے کی پہچان چناں چہ کچھ نتیجہ نہ نکلا۔ یہاں کا مسقف بازار مختلف چیزوں سے جو زیادہ تر بیرونی ہیں بھرا ہوا ہے۔ ایک استادوں کی COOPERATIVE دوکان کو دیکھنے کا موقع ملا جس کا قصہ دل چسپ ہے۔ صبح طوس جانے سے قبل خانم مہمان خانے سے نکلیں۔ موٹر میں بیٹھنے والی تھیں کہ دہلی کے ناہنجار جوتے بنانے والوں نے اپنی ذات دکھائی اور (مثل سابق) ایک دم جوتہ ٹوٹ گیا۔ اب کیا کریں؟ نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن۔ موٹر میں بٹھا کر ہمارے میزبان عارضی طور پر ہمیں ایک دوکان پر لے گئے اور ایک عدد جوتا انھوں نے (باوجود احتجاج) خانم کو پیش کیا جو انھوں نے زیبِ پا فرمایا (لطف یہ ہے کہ اپنا پہلا جوتہ دوبارہ اسی روز ٹوٹ گیا یہ ہے کارکردگی کا معیار!)۔

۴۔ دو پہر کو ریل سے روانہ ہوئے جو ۱۹ گھنٹے میں طہران پہنچاتی ہے۔ فرسٹ کلاس کے ڈبے کم و بیش A.C.C. درجوں کی طرز کے ہیں لیکن غسل خانوں کی کمی کی وجہ سے تکلیف ہوتی ہے۔ آغائے فرہاد ہمارے ساتھ اور ہمارے منتظم ہیں اور ان کی وجہ سے اس لمبے سفر میں کھانے وغیرہ کی سہولت رہی۔ اگلے دن صبح کے سات بجے طہران پہنچے راستے میں ہم سفروں کی وجہ سے جس میں بچے، مرد، عورتیں سب شامل تھے بہت رونق رہی۔ دن میں زیادہ تر آرام کیا۔

۱۱، ۱۲ ستمبر

اصفہان کا سفر در پیش ہے جو "نصف جہاں" ہے بقول ایرانیوں کے۔ سفر میں ہوائی جہاز سے ڈیڑھ گھنٹہ لگتا ہے۔ "ایران ایر" کی سروس ہے۔ ہوٹل اصفہان میں قیام کیا اور اس روز اور اگلے روز دو پہر تک آغائے ہنر فر نے جو ادارہ باستان شناسی ARCHAEOLOGY کے رئیس ہیں ہمیں اصفہان کی مسجدیں، ارمنی عیسائیوں کا کلیسا، مدرسہ چہار باغ، مینارِ لرزاں،

"چہل ستون" وغیرہ قابلِ دید چیزیں دکھائیں۔ اس میں شک نہیں کہ اصفہان میں واقعاً ایرانی تہذیب کا جلوہ نظر آتا ہے جو عمارتیں وغیرہ وہاں دیکھیں ان کی مندرجہ ذیل چیزیں قابلِ ذکر ہیں۔

۱۔ چہل ستون جو ایک پُرانی غالباً شاہ عباس کبیر کے زمانے کی عمارت ہے اس میں بیس ستون ہیں جن میں سے ہر ایک چنار کے درخت کا تنا ہے اور چوں کہ پانی میں ان کا عکس نظر آتا ہے اس لیے اس عمارت کو چہل ستون کہتے ہیں۔ اس میں دیواروں پر بڑی بڑی تصویریں گچ میں بنی ہوئی ہیں جس میں ایرانی تاریخ کے بہت سے دل چسپ رقعے خوبصورتی کے ساتھ دکھائے گئے ہیں مثلاً ایک تصویر ہے جس میں ہمایوں اور شاہ عبّاس کی ملاقات ہو رہی ہے۔ یہ بہت سا کام امتداد زمانہ کی وجہ سے مٹ گیا تھا یا اس کے اُوپر سیمنٹ اور چونا وغیرہ لگا دیا گیا تھا۔ آغائے ہنرفر نے جو باستان شناسی ARCHAEOLOGY کے رئیس ہیں اور ایک ہنر مند نوجوان ہیں دو سال کی قابل قدر محنت کے بعد ان تصویروں کو دوبارہ نمایاں کیا ہے اور ان کے رنگ اور طلا کے کام کی جِلا واقعاً قابلِ داد ہے۔ سینکڑوں سال کے بعد بھی ان کی آب و تاب میں فرق نہیں آیا۔ البتہ کہیں کہیں سے کچھ حصّے بالکل ٹوٹ گئے ہیں جس کا کچھ علاج نہیں ہو سکتا۔ مجھے یہ تو معلوم ہوا تھا کہ پُرانی روغنی تصویروں کو جو وقت گزر جانے کی وجہ سے تقریباً مسخ ہو جاتی ہیں خاص خاص مصالحوں کے ذریعے دوبارہ نمایاں کیا جاتا ہے۔ لیکن گچ میں بنی ہوئی تصویروں میں اس قسم کا کام میں نے پہلی مرتبہ دیکھا۔ بعض جگہ شیشے کا کام بھی بہت دل کش تھا۔

۲۔ منارۂ لرزاں۔ یہ ایک کسی پُرانے بزرگ کی قبر ہے جس پر دو منارے ہیں اور وہ کچھ ایسی حکمت سے بنائے گئے ہیں کہ اگر ایک منارے کو ہلاتے ہیں تو دوسرا منارہ بھی ہلتا ہے حالاں کہ دونوں میں کوئی تعلق نہیں سوائے اس چھت کے جو ان کے درمیان ہے۔

۳۔ مسجدیں واقعاً کاشی کاری کا نہایت حسین نمونہ ہیں۔ ان کے گنبد اصفہان کی تازہ اور روشن فضا میں جواہر کی طرح دمکتے ہیں۔ ان میں قرآن شریف کی آیات اور حدیثیں وغیرہ کاشی کے کام میں بڑی دل آویزی کے ساتھ لکھی ہیں۔ مسجد جمعہ ایک بہت بڑی اور عالی شان قدیم

مسجد ہے جس میں گویا ایرانی فنِ تعمیر کی پوری تاریخ کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ کیوں کہ مختلف بادشاہوں کے زمانے میں اس کی توسیع ہوئی ہے اور ہر ایک نے اپنے اپنے طرز میں یہ اضافے کیے ہیں۔ بعض حصّے ذرا ابتدائی طرز کے ہیں اور بعض میں فن کاری کا کمال نظر آتا ہے۔ جا بجا پتھر کے بہت بڑے بڑے خوبصورت پیالے URN نصب ہیں جن پر نقاشی ہے اور جا بجا آیات اور اشعار کھُدے ہوئے ہیں۔ ان میں پینے کا پانی بھرا جاتا تھا نمازیوں کے لیے۔ ان میں بھی یہ صفت ہے کہ اگر ان پر ہاتھ مارو تو ایسی آواز آتی ہے جیسی کسی چاندی یا سونے کا سکّہ زمین پر گرے اور اس میں سے ٹھن سے آواز نکلے۔ مسجد شاہ میں ایک مقام ہے جہاں زمین پر زور سے پاؤں مارنے سے چھ مرتبہ گنبد سے ECHO گونج سنائی دیتی ہے! شاید سب سے زیادہ حسین ایک چھوٹی مسجد لطف اللہ ہے جس میں اندر کا تمام کاشی کاری کا کام اپنے اصل حُسن کے ساتھ قائم ہے اور آیاتِ قرآنی کی شانِ تحریر بہت دل کش ہے۔ ایک صاحب نے جو ہمارے ساتھ تھے، یہ دل چسپ لیکن عجیب لطیفہ سنایا کہ پاکستان کے ڈاکٹر داؤد بوٹا اصفہان آئے تھے تو انھوں نے مسجدوں میں "انا مدینۃ العلم وعلی بابہا" وغیرہ لکھا دیکھا تو ان پر سخت سوختنی کیفیت طاری ہوئی اور انھوں نے ایرانیوں کو بہت بُرا بھلا کہا (اس کا انھیں کیا حق تھا؟) کہ یہ کیوں لکھا ہے "ابو بکر بابہا" کیوں نہیں لکھا۔

۴۔ اگلے روز یعنی ۱۱ر کو ہم نے اصفہان کے ایک محلے میں جس کو جوصفا کہتے ہیں ارمنی عیسائیوں کا ایک کلیسا دیکھا جس میں کاشی کاری کا بہت اچھا کام تھا۔ اور دیواروں پر عیسوی تاریخ کے مشہور واقعات کی تصویریں بنی ہوئی تھیں۔ ان کے رنگ اور طلائی کام کی شوخی اب تک برقرار تھی۔ بعض تصویروں میں اس تمام تعذیب TORTURE کی تصویر کشی کی گئی تھی جو انبیائے بنی اسرائیل وغیرہ پر گزر چکی ہیں۔ اس کے ساتھ ایک میوزیم بھی ہے، جہاں نہ صرف پُرانے ارمنی لباس اور صنعتوں کے نمونے ہیں بلکہ کوئی بارہ پندرہ فرامین ایران کے مسلمان شہنشاہوں کے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ارمنیوں کو کس طرح تمام شہری حقوق دیے تھے اور اس کے علاوہ کلیسا کو جاگیریں وغیرہ بھی عطا کی تھیں۔ یہ رواداری کا ثبوت دیکھ کر دل خوش ہوا۔ تاریخ میں اس قدر نارواداری کی تاریکی ہے کہ کہیں بھی روشنی کی جھلک نظر آئے

تو غنیمت معلوم ہوتا ہے۔ ۱۱ کی شب کو اصفہان میں ایک ڈراما "تیرِ مژگاں" دیکھا جو بہت پسند نہیں آیا اس میں ایک دو اداکار بہت اچھے تھے لیکن مبالغہ اور طوالت اور ظرافت پیدا کرنے کی شعوری کوشش بہت تھی۔ ۱۰ کو یہ ذکر کرنا یاد نہیں رہا کہ INDO-IRANIAN سوسائیٹی کی طرف سے ہم لوگوں کو ایک ایٹ ہوم دیا گیا تھا جس میں علاوہ یونی ورسٹی اسٹاف اور ماہرینِ تعلیم کے پریس کے بہت سے نمائندے تھے جو خاص طور پر بلائے گئے تھے اور دیر تک ہندوستان کے تعلیمی مسائل کے متعلق سوال پوچھتے رہے۔ وہاں علاوہ اور لوگوں کے ایک دل چسپ بڑے میاں سے ملاقات ہوئی جن کا نام سیف آزاد ہے۔ ہندوستان میں رہ چکے ہیں۔ اُردو بولتے ہیں۔ ظرافت فرماتے ہیں اور ایران کے سب سے پُرانے صحافی ہیں۔ ہفتہ وار "ایران باستان" نکالتے ہیں۔ ہندوستان کے بہت سے لیڈروں کو جانتے ہیں۔ کہتے تھے کہ ان کے ساتھ کام بھی کیا ہے۔ مسز قدوائی سے سنی شیعہ مسئلے پر مذاق کرتے رہے! مجھے عارف قزوینی اور فروغی بسطامی کے بہت خوبصورت چھپے ہوئے دیوان نذر کیے اور "زبدہ شاہنامہ" (یعنی انتخاب) کاایک مصور نسخہ جو ایک قابلِ قدر تحفہ ہے۔

رات کو یونی ورسٹی کے ریکٹر ڈاکٹر فرہاد کی طرف سے ڈنر تھا۔ یہ دراصل میڈیکل ڈاکٹر ہیں اور غالباً خاصے نامور شخص ہیں۔ بہت سے یونی ورسٹی کے اساتذہ اور نائب وزیر تعلیم وغیرہ موجود تھے۔ طہران یونی ورسٹی کا بجٹ پچاس ملین تومان بیان کیا جاتا ہے بہت معلوم ہوتا ہے لیکن جس سے پوچھا اور ایک مطبوعہ رپورٹ نے یہی رقم بتائی۔ غالباً بعض شعبوں میں (یہاں کل ۱۴ شعبے ہیں جن میں سے ۷ شعبے تو یونی ورسٹی کے نئے CAMPUS پر ہیں جو ہندوستانی سفارت خانے کے بالکل سامنے ہے اور باقی مختلف عمارتوں میں) کام اچھا ہوتا ہے۔ ایک دل چسپ بات یہ معلوم ہوئی کہ یہاں کے پروفیسر خصوصاً زیادہ سینئر اور معروف پروفیسر ایک مد سے نہیں بلکہ مختلف مدوں سے تنخواہ پاتے ہیں مثلاً پروفیسر صورت گر جو انگریزی کے اُستاد ہیں یونی ورسٹی میں پروفیسر ہیں۔ ایک بنک کے مشیر ہیں، دوسرے مترجم INTERPRETER ہیں، شیراز یونی ورسٹی کے شعبۂ انگریزی کے ڈین ہیں، اشرف پہلوی ٹرسٹ کے صدر ہیں اور ان

میں سے ہر کام کے لیے تنخواہ پاتے ہیں۔ ایسی حالت میں یہ لوگ کس طرح اپنے خاص کام کی طرف پوری توجہ دے سکتے ہیں۔ لیکن یہ عام بات ہے۔ وزراء کاروبار بھی کرتے ہیں اور اس سے (براہِ راست اور بالواسطہ) آمدنی حاصل کرتے ہیں۔ بظاہر اور مقابلتاً یہ تنخواہیں کم ہیں مثلاً پروفیسر غالباً ہزار تومان اور وزیر پندرہ سو تومان پاتے ہیں لیکن آمدنی کے دوسرے ذرائع سے اپنے بلند معیارِ زندگی کو قائم رکھتے ہیں۔ سُنتا ہوں کہ سرکاری ملازمین کی کم سے کم تنخواہ دو سو تومان ہے۔ یعنی ایک چپراسی اس سے کم تنخواہ نہیں پاتا۔ اس لیے ذاتی ملازمین ملنا مشکل ہے۔ اگر ملتے ہیں تو تنخواہیں بہت دینی پڑتی ہیں اور اللہ آمین کرنی ہوتی ہے کہ کہیں اور نہ چلے جائیں..... ڈاکٹر فرہاد وغیرہ نے دعوت دی کہ کبھی طہران یونی ورسٹی میں آکر لکچر دوں۔

۱۳ ار ستمبر

آج یہاں کا انڈین اسکول دیکھا جس کو ہندوستانی لوگ چلاتے ہیں۔ ۱۶۰ کے قریب طلبار ہیں تیس جن میں پاکستانی بچے ہیں۔ زیادہ تر سکھ کاروباری لوگوں کے ہاتھ میں انتظام ہے جو شریف لوگ معلوم ہوتے ہیں۔ وہ اس پر پچاس ہزار روپیہ سالانہ کے قریب خرچ کرتے ہیں۔ عمارت کرایے کی ہے لیکن اچھی۔ اسٹاف ہندوستانی ہے لیکن ٹرینڈ نہیں۔ اسکول کا الحاق پنجاب یونی ورسٹی سے ہے اور گزشتہ ہائی اسکول کے امتحان میں سب طلبا کامیاب ہو گئے تھے! اگر یہ اسکول نہ ہو تو ہندوستانی بچے جو فارسی نہیں جانتے تعلیم حاصل نہیں کر سکتے۔ انگریزی اور امریکن اسکولوں میں ان کے لیے گنجائش برائے نام ہے اور فیس بہت زیادہ۔ نئی عمارت بنانے کے لیے حکومتِ ہند سے امداد کے طالب ہیں۔

آج خاص طور پر پتہ معلوم کر کے (سرآسیائے دولاب۔ طہران) آغا مترجم نظام سے ملنے کے لیے گیا یہ والد مرحوم کے دوست ہیں جن سے وہ ۱۹۱۱ء میں ایران کی سیاحت کے دوران میں ملے تھے۔ میں ان کا ذکر اپنے ۱۹۲۹ء کے سفر میں کر چکا ہوں۔ خیال تھا کہ کہیں خدا کو پیارے نہ ہو چکے ہوں لیکن معلوم ہوا کہ حیات ہیں اور مستعد۔ بدقسمتی سے جب ہم وہاں گئے تو وہ خود موجود نہ تھے مگر ان کے لڑکے اور داماد تھے۔ ان سے دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔

ان کی گفتگو سے معلوم ہوا کہ نہ صرف آغا نے مترجم نظام پر بلکہ ان کے تمام خاندان پر اور دوستوں اور شرکائے کار پر والدِ مرحوم کی ذات کا بہت گہرا اور اَنمٹ اثر ہے۔ اوّل تو وہ لوگ نام اور پتہ معلوم کرتے ہی اس قدر خلوص اور محبت سے ملے جس کا بیان مشکل ہے۔ پھر انھوں نے (ان کے بیٹے) بتایا کہ مشروعہ کے اس دور میں جس قدر مفید قومی تحریکیں شروع ہوئیں ان کو چلانے میں اور اس زمانے کے نوجوانوں کے ایک گروہ کو اس کے لیے آمادہ کرنے میں والدِ مرحوم کا بڑا ہاتھ تھا۔ ان کی قائم کی ہوئی نوجوانوں کی ایک جماعت آج تک قائم ہے اور مفید کام کر رہی ہے۔ (اس کا سائن بورڈ اور رجسٹر بھی انھوں نے ثبوت کے طور پر دکھایا!)

انھوں نے بتایا کہ اس زمانے میں طہران میں کسی شخص کو (ایرانی یا غیر ایرانی) یہ ہمت نہ ہوسکتی تھی کہ آزادیٔ تقریر کی حمایت میں یا حکومت پر تنقید کرنے کے لیے آواز بلند کرے لیکن والدِ مرحوم نے مسجد شاہ میں تقریروں کا ایک سلسلہ پیش کیا جس میں بہت جرأت کے ساتھ حکومت اور عوام و خواص پر تنقید کی اور ان کو اصلاحِ معاشرت اور سچی سیاست کا راستہ دکھایا اور سُستی، جھوٹ، مبالغہ، رشوت ستانی کو چھوڑ کر فعالیت اور صداقت کی طرف آنے کی دعوت دی۔ بہت دیر تک وہ اس موضوع پر گفتگو کرتے رہے جس کا میرے دل پر بہت گہرا اثر ہوا.... پدرم سلطان بود تراچہ؟ لیکن اس سے یہ اندازہ ضرور ہوا کہ خود ان کی زندگی قرآن شریف کی اس آیت کی تفسیر ہے جو ان کو بہت عزیز تھی ومن اراد الاخرۃ وسعیٰ لھا سعیھا وھو مومن فاولئک کان سعیھم مشکورا۔ (جو لوگ سعادتِ آخرت کی نیت کرتے ہیں اور اس کے لیے سعیِ تمام کرتے ہیں اور ان کا دل ایمان سے روشن ہے ان کی کوششیں ہمیشہ بارآور ہوتی ہیں)....میرے ساتھ موٹر میں ایک سکھ صاحب (ڈرائیور کے طور پر).... گئے تھے۔ ان سے وہ بہت دیر تک مذہب اور سکھوں کے عقیدے توحید کا ذکر اور ہندوستانی فلسفہ کی گہرائی پر بات کرتے رہے (اور وہ غریب اپنا سر ہلاتے رہے!) اس ضمن میں انھوں نے اقبال کی اس نظم کا حوالہ دیا جس کے پہلے شعر میں "شب زار نالیہ ابر بہار کہ این زندگی گریہ پیہم است درخشید برقِ سُبک سیر و گفت۔ خطا کردۂ خندہ یک دم است" ان سبھوں کو اقبال کے کلام سے خاص دل چسپی ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ ایک حد تک اقبال کو ۱۹۲۹ء میں مَیں نے ایرانیوں کو متعارف کرایا تھا ورنہ اس وقت ان کا رجحان ایک غلط

قسم کی وطنی SNOBBERY کے زیر اثر یہ تھا کہ "اونا ایں کلام ہندی است" یعنی اس میں فارسی کی خوبی کہاں سے آئے گی! لیکن اب قائل ہیں. رات کو ڈاکٹر جعفری کے ہاں کھانا کھایا جہاں بہت سے ایرانی حضرات اور خواتین (بہ لباس فاخرہ!) موجود تھیں. لوگ تپاک سے ملے اور رخصت ہوئے. ڈاکٹر اندو شیکر اور ان کی بیوی سے بھی ملاقات ہوئی. یہ انڈین کونسل آف کلچرل ریلیشنز کی طرف سے طہران یونی ورسٹی میں سنسکرت اور انڈولوجی کے لکچرر ہیں.

طہران کے قیام میں قدوائی اور ان کی بیوی نے بہت خلوص اور محبت سے پزیرائی کی جس کی وجہ سے عزیز کو بالکل اجنبیت محسوس نہیں ہوئی (مجھ بے حس کو تو کہیں بھی نہیں ہوتی!) خوبی کے لوگ ہیں. نئے سفیرِ ہند ٹی. کے. کول نے کھانا کھلایا. خلیق آدمی ہیں عزیز بھی ان سے مل کر خوش ہوئیں. مجھ سے پوچھا کہ ایرانیوں کو خوش کرنے اور ان کا دل موہنے اور خوش گوار تعلقات قائم کرنے کے لیے کیا کرنا چاہیے. میں نے کہا کہ ان میں اپنی تہذیب کی بزرگی اور عمدگی کا ایک خاص احساس ہے. اس کو سراہنا اور اس سے اچھی واقفیت پیدا کرنا ضروری ہے ...... اندازہ ہوتا ہے کہ ڈاکٹر تاراچند اور علی ظہیر دونوں یہاں اپنے اخلاق اور ایرانی تہذیب سے واقف ہونے کی وجہ سے کافی مقبول تھے. طیب جی نے غالباً انتظامی حیثیت سے اچھا کام کیا لیکن وہ دفتری ذہنیت کی وجہ سے اس درجہ ہر دل عزیز نہ تھے. کول غالباً خاصے کامیاب رہیں گے.

۱۴ کی دوپہر کو دوستوں سے رخصت ہو کر اور ایران کی تہذیب و اخلاق کا نقش دل پر لیے ایر فرانس سے رخصت ہوئے اور راہِ وفا کی منزل اوّل ہوئی تمام!

سفرِ فرانس

۱۹۵۸

۱۵ ستمبر سے ۲۰ تک

۱. آج صبح کے ساڑھے تین بجے، جب پیرس تک سویا ہوا ہوتا ہے۔ اور سڑکوں پر موٹریں پانی میں مچھلیوں کی طرح تیرتی نہیں ہوتیں. ہم دونوں پیرس پہنچے. ہوائی اڈے پر ہمارے میزبان پانیکار صاحب کی مہربانی کی بدولت ان کے سفارت خانے کے دو آدمی، ان کی اسٹاف کار اور حامد صاحب کے صاحبزادے مع اپنے ایک دوست کے موجود تھے! ایسے غیر وقت میں ان لوگوں کا آنا بہت مہربانی تھی۔ اور اس کی وجہ سے سامان وغیرہ نکالنے میں سہولت بھی ہوئی. ہم لوگ اس خیال میں تھے کہ اس وقت دانت سے دانت بجانے کی نوبت ہوگی لیکن موسم بالکل معتدل سا تھا اور قیام کے دوران میں ایسا ہی رہا. رات کو کمرے کی کھڑکی کھولنے کی ضرورت محسوس ہوتی تھی. سفیر کی رہائش گاہ ایک پرانی لیکن شاندار عمارت ہے جو حکومتِ ہند نے خرید لی ہے.....

۲. صبح کو مسٹر اور مسنر پانیکار سے ملاقات ہوئی. انھوں نے بہت تپاک سے نہ صرف میرا بلکہ عزیز کا خیر مقدم کیا. اس میں "نہ صرف" کا ٹکڑا اس وجہ سے لگایا ہے کہ میری اور پانیکار کی ملاقات تو ۳۵ سال کی ہے جب وہ مجھے علی گڑھ میں پڑھاتے تھے. لیکن عزیز ان سے کبھی نہ ملی تھیں۔ اور یوں بھی وہ نئے لوگوں کے ساتھ بہت دیر آمیز ہیں. لیکن انھوں نے اپنے خلوص اور بے تکلفی سے ان کو بھی بالکل "ایٹ ہوم" بنا دیا اور وہ ان کی دل چسپ گفتگو میں بہت دل چسپی لینے لگیں...... گفتگو پانیکار کا خاص فن ہے. ان میں بلا کی ذہانت ہے، وسیع معلومات ہیں، حافظہ غیر معمولی طور پر اچھا ہے اور خود اعتمادی فراواں ہے. اس ترکیب کی

وجہ سے ان کی گفتگو بہت دل چسپ، فکر انگیز اور اکثر علمی اعتبار سے قابلِ قدر ہوتی ہے۔ وہ تاریخ، سیاسیات، فرانسیسی ادب، اسلامی فقہ، سنسکرت، ملیالم، مغربی ذہنی تحریکوں غرض ہر میدان میں کچھ نہ کچھ اور اکثر میں بہت کچھ دسترس رکھتے ہیں۔ ان کے میدان کی وسعت کسی قدر راس مسعود سے ملتی ہے لیکن بیان میں ادعا زیادہ ہے اور ظرافت کم اور RACONTEUR کی حیثیت سے ان کے معیار تک نہیں پہنچتے۔ لیکن علمی معلومات میں ان کا پایہ اچھا بلند ہے۔ بعض لوگ انھیں محض "ایک جرنلسٹ" کہہ کر ان کو کم درجہ دیتے ہیں۔ لیکن مجھے اس سے اتفاق نہیں۔ وہ ایک علمی محقق نہیں لیکن نقاد ہیں اور تحریکوں کی ترجمانی اور "قدر" کا حق ادا کرتے ہیں۔ ان کی تیس سے زیادہ کتابیں ملیالم میں ہیں۔ اور شاید ہی اتنی چھوٹی بڑی انگریزی میں ...... رائے کو بے خوفی کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ اور اس وجہ سے بہت سے حلقوں میں مقبول نہیں۔ کہتے ہیں کہ جب مجھے نہ نوکری چاہیے نہ پارلیمنٹ کی ممبری تو رو کے ساتھ کیوں نہ جاؤں! بلکہ ان کا خیال یہ ہے (اور یہ صحیح ہے) کہ ہمارے ملک میں ایسے لوگوں کی خاص ضرورت ہے جو رُجعت پسند میلانات کی حفاظت کریں اور ہر دل عزیزی کو ایک بیماری سمجھ کر اس سے بچیں!...... مگر میرا خیال یہ ہے کہ اگر وہ اپنی تنقیص کو افراد کے بجائے تحریکوں تک محدود رکھیں تو ان کا حلقۂ اثر بڑھ جائے گا اور ان کے خیالات کا زیادہ اثر ہوگا......

۳۔ خیر یہ تو خواہ مخواہ پانیکار پر ایک تبصرہ ہوگیا۔ مگر بہرحال ہم ان کے اور ان کی بیوی کے بہت احسان مند ہیں کہ انھوں نے خلوص سے پذیرائی کی۔ ان کے بیٹے سے بھی ملاقات ہوئی جو مغربی افریقہ پر ریسرچ کر رہے ہیں اور ان کے داماد سے جو غالباً STATISTICIAN ہیں (نام ہیمنن ؟) اور کسی کانفرنس میں شریک ہونے آئے ہیں۔

میری کمیٹی آج سے (۱۵) شروع ہوگئی ہے۔ اس میں کل .... ممبر ہیں۔ جن میں انگریز، امریکی، فرانسیسی، جرمن، چیک، روسی اور جاپانی شامل ہیں۔ ان کے علاوہ کچھ بین الاقوامی جماعتوں کے نمائندے ہیں جو OBSERVERS کی حیثیت سے شامل ہوئے ہیں۔ کمیٹی کا موضوعِ بحث SOCIAL AND MORAL IMPLICATIONS OF THE PEACEFUL USES OF ATOMIC ENERGY اور اس

میں انھوں نے علاوہ سائنس کے ماہروں کے، سوشل سائنسیز کے ماہروں (اکنومسٹ، سائیکولوجسٹ، معلم صحافی وغیرہ) کو شامل کرکے ایک قسم کی INTER DISCIPLINARY کمیٹی بنائی ہے۔ مجھے تو اس میں شریک ہونے میں تامل تھا کہ میں اٹومک اِنرجی کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا۔ لیکن چوں کہ میں ایک دوسری کمیٹی میں شریک ہونے کے لیے پیرس آرہا تھا یونسکو نے دعوت دی کہ اس میں ایک نام نہاد "ماہرِ تعلیم" کی حیثیت سے شریک ہوجاؤں۔ کمیٹی میں بعض دل چسپ بحثیں رہیں۔ ایک سوال یہ تھا کہ آیا اس نئی تحقیق نے دنیا کی صورتِ حال کو بالکل بدل دیا ہے یا یہ اس سائنٹیفک اور ٹکنیکل ترقی کی ایک ذرا زیادہ ڈرامائی سیڑھی ہے جو سو یا ڈیڑھ سو برس سے ہورہی ہے۔ ماہرین کی رائے یہ تھی کہ دراصل اس چیز کو اس کے وسیع ترپس منظر میں اور اس ارتقائی سلسلہ کا ایک جزو سمجھ کر دیکھنا چاہیے۔ بعض لوگوں نے یہ سوال بھی اُٹھایا کہ ایٹم بم یا اس کے دوسرے زیادہ بھیانک بھائی بند ساری دُنیا کو تباہ نہیں کرسکتے اس لیے زیادہ گھبرانا اور دہشت کی فضا پیدا کرنا غلط ہے۔ میرا خیال یہ تھا کہ یہ ایک جزوی چیز ہے کہ ایٹم کی طاقت پوری دنیا کو تباہ کرے گی یا اس کے نصف یا چوتھائی حصے کو۔ اگر وہ دنیا کے بڑے بڑے آبادی اور سائنس اور تہذیب کے مرکزوں کو تباہ کر دے، نقل و حرکت کے سامان کو تباہ کردے، لاکھوں آدمیوں کو عذاب کے ساتھ مارے اور اس سے زیادہ کی زندگی کو موت سے بدتر بنادے تو اس خیال سے زیادہ تسکین نہیں ہونی چاہیے کہ پُوری دنیا تباہ نہیں ہوگی! میں نے اس سے یہ نتیجہ نکالا کہ گو ہمارا خاص موضوع بحث یہ ہے کہ اس جدید صورتِ حال کے (جو ایٹم کے تعمیری استعمال سے پیدا ہورہی ہے) اخلاقی اور سماجی نتائج کیا ہیں اور اس کا اثر ہماری تعلیم وغیرہ پر کیا پڑے گا لیکن جب تک ہم اس کی تخریبی قوت کے اثرات پر غور نہ کریں، ان کے سیاسی نتائج کو نہ پہچانیں اور امن اور جنگ کے مرکزی اور بنیادی مسئلے کو حل کرنے کی کوشش نہ کریں۔ ہماری تمام کوششیں اور بحث و مباحثے غیر واقعی اور غیر حقیقی سے رہیں گے یعنی ؎

مثال یہ میری کوشش کی کہ مُرغِ اسیر　　کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لیے

بعض ممبران کا اصرار تھا (خصوصاً امریکی اور انگریز ممبر) کہ کوئی سیاسی موضوع زیرِ بحث نہ آنا چاہیے! لیکن بحث کے بعد ان کو تسلیم کرنا پڑا کہ گو ہم اس کے بارے میں یہاں سے خاص

سفارشیں نہیں کر سکتے لیکن اس پہلو کو نظر انداز کرنا کسی طرح جائز نہیں۔ ایک اور دل چسپ سوال یہ اٹھا تھا کہ اس ایٹمی ترقی کا اثر ان ملکوں پر کیا پڑے گا جو کافی ٹکنیکل ترقی کر چکے ہیں اور جو ابھی اس اعتبار سے پس ماندہ ہیں۔ اس بارے میں اتفاق رائے تھا کہ ان سے اُوپر اُٹھ کر ملک زیادہ فائدہ اُٹھائیں گے۔ میں نے اس بارے میں یہ بحث اُٹھائی کہ اس وجہ سے دنیا کے مختلف ملکوں میں مادّی اور ٹکنیکل ترقی کے اعتبار سے جو فصل ہے وہ اور زیادہ بڑھ جائے گا اور اس خلیج کو پاٹنا دنیا کے نیتاؤں اور سیاست دانوں کے لیے ایک چیلنج ہے۔ اس ضمن میں بھی کافی دل چسپ بحث رہی مثلاً سر آرنلڈ پلانٹ نے (جو لنڈن اسکول آف اکنامکس سے متعلق ہیں) یہ دل چسپ رائے ظاہر کی کہ اس فصل کے بڑھنے کی پرواہ نہیں کرنی چاہیے۔ اگر مغرب کے ملک زیادہ ترقی کریں گے تو اس سے بالواسطہ مشرق اور افریقہ کے ملکوں کو بھی فائدہ پہنچے گا۔ لہٰذا انھیں کوئی وجہ شکایت نہیں ہو سکتی۔" میں نے یہ نہیں دیکھا کہ اگر زیادہ دولت مند لوگ سونے کی تشتریوں میں کھانا کھانے لگیں تو اس کی وجہ سے سناروں کو شکایت ہوگی کہ ہم ایسا کیوں نہیں کر سکتے۔ انھیں تو زیادہ کام کرنے کو ملے گا اور وہ خوش ہوں گے"۔ میں نے اور بعض دوسرے ممبران نے اس سے اختلاف کیا اور ہمارا اختلاف تسلیم کیا.... بحیثیت مجموعی کمیٹی کے مباحثے دل چسپ اور فکر انگیز رہے۔ میں تو اس میں ذرا تذبذب کے ساتھ شریک ہوا تھا لیکن خلافِ توقع دوسرے ممبران اور یونسکو کے متعلقہ افراد نے کام کی قدر کی اور کہا کہ اگر یہ خاص نقطۂ نظر نہ پیش کیا جاتا تو کمیٹی کا کام ناکام رہتا..... کمیٹی میں بعض ممبر بہت قابل اور ذہین تھے اور برخلاف ہمارے اکثر پروفیسروں کے، ان میں انگلستان، امریکہ وغیرہ کے جو پروفیسر شامل تھے وہ علاوہ اپنے مضمون کے اچھی عام معلومات رکھتے تھے۔ مثلاً ایک امریکی پروفیسر HESSIELIS نہ صرف سائنس میں اچھی نظر رکھتے تھے (ان کا کولمبیا یونی ورسٹی کے SCHOOL OF MINING سے تعلق تھا) بلکہ سوشیالوجی، نفسیات، تعلیم وغیرہ کے مسائل سے بھی باخبر تھے۔ کاش ہمارے ہاں کی تعلیمی فضا میں بھی سنجیدگی اور خلوص اور علم سے شغف پیدا ہو جائے۔

۱۳/ نومبر

آج پروفیسر ریڈیفورڈ (نیویارک یونی ورسٹی) سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے لنچ پر بلایا تھا۔ ان کا ایک زمانے میں N.E.F اور PROG: EDU: ASSOC: سے بہت قریبی تعلق رہا ہے۔ سلجھے ہوئے خیالات رکھتے ہیں۔ آج کل دو مسائل میں خاص دل چسپی رکھتے ہیں۔ استادوں کا MORALE کن چیزوں سے مرتب ہوتا ہے اور ORGANIZATIONAL نظام کا اس پر کیا اثر پڑتا ہے اور صحیح بین الاقوامی تعلیم اور اسکولوں کا مقصد اور تشکیل ہونی چاہیے تاکہ اس کے ذریعہ سے تربیت کی افراط و تفریط کا مداوا ہو سکے۔ چاہتے ہیں کہ N.E.F اس دوسرے مسئلے میں زیادہ دل چسپی لے۔

ذاتی تاثرات

۱۹۶۰

۹, فروری

دفتر کے کام کا چکر جاری ہے۔ گزشتہ چند روز کانفرنسوں وغیرہ کا ہجوم رہا اور اس کی وجہ سے زندگی کا کاغذی بوجھ بڑھتا رہا۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ کاغذوں کے اس انبار اور یورش میں کتنے "افراد" ہیں اور کتنے خس و خاشاک تو حیرت ہوتی ہے۔ لیکن ایسے بندگان خدا بھی ہیں جو ہر کاغذ کو گویا فرمانِ الٰہی کا حامل سمجھتے ہیں اور کاغذوں کی خدمت کو زندگی کا حاصل اور حاصل سے ہاتھ دھو بیٹھنے کا خیال بھی نہیں کر سکتے۔

آج P.M. سے ملاقات ہوئی تھی اور ان سے اپنے آئندہ کام کا ذکر آیا تھا۔ موجودہ حالات میں سکونِ قلب ناممکن ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ وہ غور کر کے کوئی صورت بتائیں گے۔ ان پر ہر قسم کے کاموں کا اس قدر بار ہے کہ اس میں اضافہ کر کے بڑا تامل ہوتا ہے۔ (لیکن جب ان کا موڈ ٹھیک ہو جیسا آج تھا) تو وہ ایسی توجہ اور ہمدردی کے انداز میں بات سنتے ہیں اور چہرے پر ایک معصومیت اور (تقریباً) مظلومیت کی کیفیت ہوتی ہے کہ اسی سے ایک گونہ اطمینان ہو جاتا ہے۔

آج شام کو ہمارے ہاں چند امریکی دوست (ڈاکٹر فاکس، ڈاکٹر لیڈل، ڈاکٹر نلسن) اور چند ہندوستانی شرکائے کار (رام چندرن، ملہن، مسز مہتا) اور جسٹس بشیر احمد سعید چائے پر آئے تھے۔

یہ تقریب عزیز اور دوسرے گھر والوں کی توجہ اور دل چسپی کی وجہ سے ہمیشہ ہمارے ہاں بہت خوش آئند ہوتی ہے۔ اور بچوں وغیرہ کی شرکت سے اس میں ایک ایسی بے تکلفی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے کہ (بالخصوص) غیر ملکی مہمان اس سے بہت متاثر ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر فاکس (جو وسکونسن یونی ورسٹی کے ڈین ہیں اور ان کی بیوی تو خاص طور پر اثر پزیر ہیں۔ اور کہنے لگے کہ یہ سب سے زیادہ INSPIRING ہندوستانی خاندان ہے جو میں نے کہیں نہیں دیکھا ہے۔ ڈکا ہے کا الہام!

ضمناً یہ قصّہ سنایا کہ جب میں نے وسکونسن یونی ورسٹی میں تقریر کی تھی اور انھوں نے اس کا شکریہ وغیرہ ادا کیا تو بہت سی (رسمی) تعریف کے بعد دفعتاً عزیز کی طرف اشارہ کیا اور کہا کہ خواتین اور حضرات میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ 'THIS IS THE WOMAN BEHIND THE MAN" دفعتاً اس عورت نے کہاں کہاں دستگیری اور پشت پناہی نہیں کی ؟

۱۰ فروری

آج نرسنگ ہوم میں پہلا دن ہے۔ رات بھر بے خوابی رہی، زکام کی برکت، لیکن اس کی وجہ سے جس قدر سستی اور پستی طبیعت میں ہونی چاہیے اس قدر نہیں ہے۔ دن کا کچھ حصّہ "خون دان" کرنے اور ایکس رے فوٹو میں گزرا کچھ دفتر کا ضروری کام کرنے میں اور کچھ مہربان عزیزوں اور دوستوں کی ملاقات میں۔ ہماری تہذیب کی ایک دل کش رسم یہ ہے کہ لوگ بیماروں میں یا بیمار عورتوں میں تندرستوں سے زیادہ دل چسپی کا اظہار کرتے ہیں۔ اس کا مثبت پہلو تو ظاہر ہی ہے اور بہر حال محبت اور ہمدردی سر آنکھوں پر رکھنی چاہیے۔ جہاں کہیں بھی اس بے مہر دنیا میں ملے لیکن شاید برناڈ شا کو موقع ملتا تو وہ پوچھتا (بلکہ اس نے پوچھا بھی تھا) کہ کیا تم لوگ تندرستی سے زیادہ بیماری کی اور تندرستوں سے زیادہ بیماروں کی قدر کرتے ہو! ...... مجھے اگلے ماہ بڑودہ یونی ورسٹی میں "سایاجی میموریل لیکچر" دینے ہیں۔ سوچتا ہوں کہ ان کے لیے کوئی ایسا موضوع تلاش کروں جس کا تعلق مولانا آزاد کے تعلیمی تصوّرات سے ہو۔ اس کے لیے آج کچھ پڑھنا شروع کیا ہے۔ لیکن ہمیشہ کی مشکل اب بھی "زنجیرِ پا" ہے یعنی کام کی زیادتی اور وقت کی کمی۔ کیا اس عصر کی بنیادی خصوصیتوں میں سے یہ ایک ضروری

خصوصیت ہے؟

آج پارلیمنٹ کے ممبر اور سابق گورنر آسام جے رام داس دولت رام سے بھی یہاں ملاقات ہوئی۔ میرے بلڈ پریشر کا ذکر سُن کر بتا رہے تھے کہ گاندھی جی نے اس کا علاج کچھ تو ایک دوا کے ذریعہ کیا تھا۔ لیکن بعد میں مستقل طور پر اپنی قوتِ ارادی کے ذریعہ کیا کہ وہ ذہنی کوشش کے ذریعہ خود کو اپنی پریشانیوں سے الگ کر لیتے تھے (کاش میں بھی کر سکتا! لیکن اس کے لیے جس ضبطِ نفس کی ضرورت ہے وہ کہاں سے آئے؟) پھر ہفتے میں ایک دفعہ "مون برت" رکھنے سے بھی انھیں فائدہ ہوتا تھا...... جے رام صاحب نے یہ بھی کہا کہ قرآن شریف زیادہ پڑھا کرو۔ اس بات کو سُن کر خوشی ہوئی کہ "اکبر نام لیتا ہے خدا کا اِس زمانے میں"!

۱۱رفروری

آج دن میں بھی کچھ ٹسٹ وغیرہ ہوتے رہے۔ علی گڑھ سے اچانک عابد صاحب اور مصداق آگئے۔ معلوم ہوا کہ مصداق کا نیا ناول جس کا نام ابھی تک طے نہیں ہوا، لکھا جا رہا ہے اور عابد صاحب جنرل ایجوکیشن کے لیے جو کتابیں لکھ اور لکھا رہے ہیں ان کا منصوبہ آخر اپریل تک مکمل ہو جائے گا۔ یہ ایک مفید کام ہے جو ان کی بدولت ہو جائے گا۔ اس ضمن میں ایک باب مجھے بھی لکھنا ہے۔ یعنی MAN IN THE MODERN WORLD لیکن ابھی تک نہ اس کی داغ بیل پڑی ہے، نہ اس پر غور کرنے کا موقع ملا ہے......

گزشتہ دنوں تیسری پلین کی تیاری میں بہت مصروف رہا۔ اب معلوم ہوا ہے کہ پلیننگ کمیشن توقع سے نصف سے بھی بہت کم، تقریباً ایک تہائی رقم دینا چاہتا ہے۔ ان کی مشکلات مسلّم لیکن بہرحال اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی نظر میں تعلیم کی اہمیت کس قدر ہے۔ مولانا اس بات کی شکایت کرتے کرتے اپنے خالق کے پاس پہنچ گئے۔ شاید یہی دوسروں کا حال ہوگا۔ بڑودہ کے لیکچروں کے سلسلے میں ان کی تقریروں کا مجموعہ پڑھ رہا تھا۔ اس میں نہایت وضاحت کے ساتھ، اس بات کا اعتراف ہے کہ تعلیم ہر قسم کی ترقی کے لیے بنیادی چیز ہے۔ لیکن اِدھر معلوم ہوتا ہے کہ ریت پر عالی شان عمارت کی تعمیر ہو سکتی ہے!

خلیل جبران کی ایک کتاب BROKEN WINGS پڑھی ایک دل نشین داستان ہے۔ سیدھی سادھی ناکام محبت کی، جس میں دولت کی حرص اور گرجا کا اثر دو محبت کرنے والے دلوں کو علیحدہ کرکے ایک نامبارک شادی کی بنا ڈالتا ہے جس کا انجام المیہ ہے۔ لیکن بیان کی شاعری اور حُسن سے جبران نے اس بالکل معمولی پلاٹ میں جان ڈال دی ہے۔

آج اجمل خاں (سابق سکریٹری مولانا آزاد) ملنے آتے تھے۔ دورانِ گفتگو میں کہنے لگے کہ اصلی چیز قرآن کی ترتیبِ نزول ہے جو میں نے کی ہے اور اس سے در اصل اسی کی تعلیم پر روشنی پڑ سکتی ہے۔ مولانا نے سورۂ فاتحہ کو قرآن کی بنیاد سمجھا اور اس کی تفسیر لکھ ڈالی۔ حالاں کہ قرآن کی بنیادی تعلیم اس کی سورت " اقرا باسم ربک الذی خلق " میں ہے۔ جس کا اصل اُصول یہ ہے کہ علم اور تعلیم کو عام کیا جائے اور ضرورت مندوں کی مدد کی جائے۔ یہ ضرورت مندوں کی مدد انھوں نے اس آیت میں سے نہیں بلکہ "لیس البر ان تولو وجوھکم قبل المشرق و المغرب سے نکالی ہے۔ جس کو وہ بطور ایک چارٹر کے اپنے بٹوے میں رکھتے ہیں۔ وہ خود کو ایک حد تک مولانا سے بہتر مفسّر سمجھتے ہیں اور یہی خوش فہمی کا اعجاز ہے!۔

۱۲ر فروری

آج ایک نامعقول ٹسٹ ہوا۔ جس کو B.M.R. کا ٹسٹ کہتے ہیں۔ اس کا مقصد ہوتا ہے۔ یہ معلوم کرنا کہ جسم میں آئیڈین کی کمی ہے یا نہیں اور کس قدر ہے۔ اس کا ذکر اس لیے نہیں کرتا کہ کسی ٹسٹ کا ہونا بجائے خود ایک قابلِ ذکر واقعہ ہے بلکہ اس کے ضمن میں جو تجربہ ہوا وہ قابلِ غور ہے۔ مجھے یہاں سے ہارڈنگ اسپتال امبولنس میں لے گئے۔ وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ ڈاکٹر کو جو کاغذ دینا چاہیے تھا وہ ساتھ نہیں تھا۔ اس پر دونوں اسپتالوں کے چپراسیوں میں دس منٹ جھگڑا ہوا!۔ اس کے بعد قاعدے کی رو سے مجھے ٹسٹ سے پہلے خود اُٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے کی اجازت نہ تھی) مجھے اُوپر کی منزل میں جہاں ٹسٹ ہونا تھا۔ سٹریچر پر لے جانے کے لیے لوگ موجود نہ تھے۔ آدھا گھنٹہ اس میں ضائع ہوا۔ جب اُوپر پہنچا تو جس کام میں کُل ایک گھنٹہ صرف ہونا چاہیے تھا ۲½ گھنٹے صرف ہوئے (بیچ میں امبولنس

غائب تھی!) کمرے میں مکڑی کا ایک زبردست جالا بھی تھا۔ ان سب باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم لوگوں میں اب تک کارکردگی اور SENCE OF URGENCY کی کس قدر کمی ہے۔ ملک کی نئی تعمیر ان سست عناصر لوگوں سے کیوں کر ہوتی؟۔

آج ذکیہ کو لکھنؤ اور زہرا کو کیمبرج خط لکھے۔ کاش زہرا تعطیل بھر کے لیے ہندوستان آسکے۔ اس کا داخلہ PH.D. میں ہوگیا ہے لیکن اس کا مطلب ہے سوا سال کا مزید قیام اور یہاں سب عزیزوں کا یہ حال کہ ؎

عاشقی صبر طلب اور تمنّا بے تاب — دل کا کیا حال کروں خونِ جگر ہونے تک!

۳/مارچ

آج بھی دن کا کافی حصّہ آرام کے علاوہ بڑودہ کے لیکچروں کی تیاری میں گزرا۔ میرا یہ خیال مستحکم ہوتا جاتا ہے کہ خواہ تعلیمی نظام پر مولانا آزاد کی چھاپ بہت واضح نہ ہو۔ لیکن ان کے خیالات میں جو عدل اور توازن تھا اس کی وجہ سے ہماری قومی تعلیم اور قومی زندگی کو صالح رکھنے میں بہت مدد ملی۔ اور اس کی صورت مسخ نہیں ہونے پائی۔ اگر گاندھی جی کے بعد ملک کی تعمیرِ نو میں نہرو اور آزاد کا ہاتھ اور دماغ نمایاں نہ ہوتے تو خدا جانتا ہے اس کی کیا شکل بنتی۔ تعصب اور تنگ نظری تو ہر نقشے کو بگاڑ سکتے ہیں۔

کل پارلیمنٹ میں علی گڑھ یونی ورسٹی کے بارے میں آدھے گھنٹے کی ہنگامی بحث ہوئی تھی۔ اس میں ایک طے شدہ سازش کے ماتحت وہاں کی صورتِ حال پر جائز اور ناجائز اور مبالغہ آمیز اعتراضات کیے گئے۔ خیر یہ تو خلافِ توقع نہیں تھا لیکن افسوس یہ ہے کہ اس کے حق میں کسی غیر مسلم ممبر کو کلمۂ حق کہنے کی توفیق نہیں ہوئی حالاں کہ ان میں سے بہت کو وہاں کی اچھی باتیں بھی معلوم ہیں۔ ایک ممبر پرکاش ویر شاستری نے، جو اس محاذِ مخالف کے گویا لیڈر ہیں۔ منجملہ اور باتوں کے یہ بھی بیان کیا کہ یونی ورسٹی نے ایجوکیشن سکریٹری کا مکان اصل سے بہت زیادہ داموں پر خریدا ہے اور اس طرح گویا یونی ورسٹی کی اور بالواسطہ میری دیانت پر حملہ کیا۔ خدا کا شکر ہے کہ اس نے اس قسم کے تجربے کی چاشنی بھی ہاتھ کی لکیر میں لکھی۔ ورنہ بعض

دفعہ خیال ہوتا تھا کہ باوجود حتی الامکان ایمان داری اور آزادی کے ساتھ کام کرنے کے اب تک زندگی میں نیک نامی کیوں حصے میں آئی۔ عام طور پر تو ایسا نہیں ہوتا جن لوگوں کی دُور سے پیروی کی خفیف سی کوشش کی ہے ان کو تو ہمیشہ مخالفت اور بدگمانی ہی کا شکار ہونا پڑا ہے۔ (بقول مولانا آزاد کے) سوچتا تھا۔ "دیوانہ بہ را ہے رود و طفل براہے یاراں مگر ایں شہر شما سنگ ندارد" اچھا ہوا کسی کو پتھر پا گیا!

قیامِ شملہ، تارا دیوی

۱۹۶۰

شملہ ۳ مئی

آج دن کے ڈیڑھ بجے بمبئی (غفران اور بلقیس کی پیاری بچی) کی پیدائش ہوئی۔ خدا اسے سب عزیزوں کے لیے برکت کا سبب بنائے ..... آج عابد صاحب بھی دہلی سے آئے اور وہاں کی خیریت لائے۔ وہ آج کل ٹیگور کی کتاب BAUBDINI کا اُردو ترجمہ کر رہے ہیں۔ میں نے گزشتہ دس روز کے قریب یہاں تارا دیوی میں گزارے ہیں۔ اور اس میں علاوہ کچھ کتابیں پڑھنے، آرام کرنے، خطوں کا قرضہ اُتارنے کے دو مضمون لکھے ہیں (ایک تو مولانا آزاد کے بارے میں بڑودہ یونی ورسٹی کا دوسرا لیکچر لکھا ہے۔ جس میں ان کے تعلیمی پروگرام اور پالیسی سے بحث کی ہے اور دوسرا مضمون پروفیسر KLEIN BERG کی مجوزہ کتاب کے لیے لکھا ہے۔ جس کا موضوع اٹومک انرجی کا پُر امن استعمال اور اس کے تعلیمی اور ثقافتی تقاضے ہیں ...... صحت ابھی تک پوری اعتدال پر نہیں آئی اور کیوں آئے؟ اس عمر میں "عناصر میں اعتدال کہاں؟"

۳۱ مئی تارا دیوی کے قیام کے دوران ایک مضمون اور لکھنے کا موقع مل گیا۔ یعنی منسٹری کے نئے رسالے JOURNAL OF EDUCATION : ADMINISTRATION کے لیے ایک مضمون "تعلیمی نظم و نسق" کے بارے میں۔ جوں جوں ملک میں پلیننگ وغیرہ کا سلسلہ بڑھتا جاتا ہے اور سوشل ویلفیر سٹیٹ قائم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ حکومت کے فرائض اور انتظام کی پیچیدگیاں بڑھتی جاتی

ہیں اور اس کی وجہ سے جو مسائل پیدا ہوتے ہیں ان پر غور کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ چناں چہ یہی حال تعلیم کے میدان کا ہے۔ اس میں بھی انتظامی بندوبست کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے۔ اس خیال سے یہ نیا رسالہ نکالنے کی تجویز کی گئی ہے۔ باوجود مقاصد اور تعلیمی نظام کا تعین ہوجانے کے، عمل اور خیال میں ایک وسیع خلیج حائل ہے اور وہ زیادہ تر اس وجہ سے نہیں پٹتی کہ طریقۂ نظم ونسق ڈھیلا اور ناقابلِ اطمینان ہے..... میں نے اس مضمون میں پہلے نئی دنیا اور نئے ہندوستان کے بعض جدید تقاضوں کا مختصر ذکر کیا ہے اور اس کے بعد چند اصولوں کی وضاحت کی ہے۔ جن پر عمل کرنا ضروری ہے۔ مثلاً ایڈمنسٹریشن کو "انسانی" قدروں سے آراستہ کرنے کی ضرورت HUMANIZATION ذاتی مراسم کی پختگی، کارکردگی پر زور دینا، ماتحتوں سے زیادہ خود کام کرنے پر آمادگی۔ عوام اور اہل کاروں میں قریبی تعلقات قائم کرنا متوسط درجے کی لیڈر شپ، کا عام کرنا تاکہ انتظام میں زیادہ سے زیادہ مقامی لیڈروں سے کام لیا جاسکے، باہمی اعتماد اور بھروسے کی فضا میں کام کرنا، حکومتوں کے مختلف دفتروں کی باہمی رسّا کشی کو دُور کرنا اور فرد اور جماعت ORGANIZATION کے تعلقات میں افراد کی آزادی اور اُپج کا اہتمام، اس ضمن میں مَیں نے ولیم۔ جے وہائٹ کی ایک اہم تصنیف THE ORGANIZATION MAN کا بھی حوالہ دیا ہے جس میں افراد کی انفرادیت پر زور دیا گیا ہے اور اس بات کو غلط بتایا گیا ہے کہ فرد اور جماعت میں ایسی ہم آہنگی پیدا ہوجائے کہ کسی قسم کا TENSION باقی رہے۔ جس کے بغیر جدّت کا اظہار نہیں ہوسکتا..... تارا دیوی کے قیام میں مندرجہ ذیل کتابیں پڑھنے کا موقع ملا۔

۱- HAW SUYIN: THE MOUNTAIN IS YOUNG نیپال کے بارے میں اس چینی مصنف کا ایک کافی زوردار ناول جس میں وہاں کی زندگی اور محبت کے مجازی اور حقیقی پہلو دکھائے گئے ہیں۔ اس کی زبان اور بیان میں بڑی قوت ہے اور کہیں کہیں انسانی جذبات کی بڑی پُرزور نقاشی کی گئی ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ اب اس نے غالباً اپنی تیسری شادی کسی مدراسی سے کرلی ہے!)

۲- WILLIAM J. WHYTE: THE ORGANIZATION MAN امریکہ کی ایک مبصرانہ معاشیاتی تنقید جس میں فرد اور جماعت کی اٹل کش مکش کی ایک نئی تصویر دکھائی گئی ہے۔ جہاں ایک سطحی نظر فرد اور جماعت کی ہم آہنگی میں فرد کی عافیت اور ترقی کا مژدہ پاتی ہے۔ وہاں ایک

مبصّر کی نگاہ اس کے خطروں سے آگاہ کرتی ہے۔

۳- THE VILLAGE HAS NO WELLS

مغربی ممالک کے سفر

۱۹۶۰

زیگرب ۲۲ جولائی آج دوپہر زیگرب سے روانگی ہوئی۔ میری مترجم مس فشر اور سکریٹری کونسلِ تعلیمی و ثقافتی (جو گویا اس حکومت کے ایجوکیشن سکریٹری ہیں) چھوڑنے آئے اور کافی گرمجوشی کے ساتھ رخصت کیا حالانکہ کل محترمہ کا انداز کسی قدر ناصحانہ اور استانیوں کا سا تھا۔ روانگی سے پہلے مقام SKYSCRAPER پر سے زیگرب کا پورا منظر دیکھا۔ سارا شہر خوش نما پارکوں سے بھرا ہوا ہے اور اس کا دل وہ جنگل ہے جو شہر کے بیچ سے شروع ہو کر قریب کی پہاڑیوں پر جا کر ختم ہوتا ہے۔ پہاڑی پر بسا ہوا پرانا شہر گو صدیوں کی یادگار ہے۔ لیکن جدید عمارتیں مع PREFABRICATED مکانوں کے تیزی کے ساتھ بن رہی ہیں اور معلوم ہوا کہ کامیاب ثابت ہوئی ہیں۔ (نہ معلوم دہلی میں ہمارا تجربہ کیوں ناکام رہا) ہر نئے محلے میں اسکول کے لیے مناسب جگہ تجویز کرنا لازم ہے۔ (بلکہ مہیا کرنا) اور جس عمارت میں (شاید) ۹۰ فلیٹ ہوں یا زیادہ اس میں ایک نرسری اور ایک مرکز صحت کا ہونا ضروری ہے..... مقامی یونی ورسٹی شہر بھر میں "بکھری ہوئی" ہے اور بہت بڑھ رہی ہے۔ مثلاً VETERINARY FACULTY کی بہت سی عمارتیں ہیں۔

ایک خاص چھوٹے سے سینما حال میں ایک بچوں کی بنائی ہوئی تصویروں کا فلم دیکھا جو بہت حسین اور کامیاب تھا۔ اور اس پر COMMENTORY بہت مزیدار، دلچسپ اور سبق آموز۔ (شنکر کو اس کے بارے میں لکھنا چاہیے)۔ اس میں دنیا بھر کے بچوں کی منتخب تصویریں تھیں۔ اور گویا ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو دکھایا گیا تھا۔ مقامی سائنس اور کلچرل کانسل (جو گویا میری میزبان تھی) اچھے اور مفید فلموں کی مدد کرتی ہے۔ ایک بازار میں بھی گھوما جو عام لوگوں کے لیے لگتا ہے۔ اور اس میں دستکاری کے بعض اچھے نمونے دیکھے۔ لیکن خدا ہوائی سفر کو معاف کرے کہ کچھ خریدنا ممکن نہیں معلوم ہوتا!

بون (جرمنی)

زیگرب سے بون تک کو اُڑان کا کُل وقت مشکل سے تین گھنٹے ہے۔ لیکن راستے میں دو مرتبہ جہاز بدلنے پڑے اور کئی کئی گھنٹے ٹھیرنا پڑا۔ جس کی وجہ سے ساڑھے بارہ بجے کے چلے ہوئے یہاں کے مسافر کو لون ۹½ بجے رات کو پہنچے اور وہاں سے موٹر کے ذریعہ بون پونے گیارہ بجے! کولون پر سفارت خانے سے ڈاکٹر بالیگا اور چٹرجی اور فارن منسٹری سے ڈاکٹر فریزر FRIEZE نے استقبال کیا اور بون کے سب سے اچھے (اور بالا خرچ) ہوٹل کونگس ہوف KONIG S HOF میں ٹھیرایا۔ اب دیکھیے یہاں کیسی گزرتی ہے۔ آثار تو اچھے ہیں!

یہ ہوٹل دریا کے کنارے واقع ہے۔ جو میری کھڑکی کے سامنے بہہ رہا ہے۔ یورپ کا مشہور دریا رائن جس کے ساتھ اس برِ اعظم کی تاریخ اور تقدیر وابستہ رہی ہے۔ اور جس کے بہتے پانی نے گزشتہ بیس صدی میں کیا کچھ نہیں دیکھا! ہوٹل شاندار اور آرام دہ ہے لیکن اس کا جرمانہ یہ ہے کہ اس میں بہت دولت مند اور SOPHI STICATED لوگ ہی ٹھیرتے ہیں جن سے سوشل مراسم نہ قائم ہوتے ہیں نہ قائم کرنے کو جی چاہتا ہے! لیکن سکون کی کیفیت ضرور ہے۔ اگر خدا نے "دلِ بے قرار" نہ دیا ہوتا اور آرام لینے کا نسخہ معلوم ہوتا تو ضرور آرام لیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ "سوادِ رومۃ الکبریٰ میں دلّی یاد آتی ہے۔" اور اپنا آدمیوں سے بھرا ہوا گھر جس میں خاموشی اور تنہائی کا احساس نہیں ہوتا! آج دن میں یہاں کی تعلیمی اور ثقافتی کمیٹی کی سکریٹری DR. KNOBE سے ملاقات کی جو کافی باخبر اور خوش گوار خاتون ہیں نام سے تو جنس آشکار نہ ہوتی تھی۔ لہٰذا ابتدائے گفتگو ہی سے اس جملے نے مراسم خوش گوار کر دیے کہ

'I SHOULD HAVE BEEN WARNED THAT I SHALL BE MEETING A CHARMING LADY'

ان سے جرمنی میں تعلیمی اصلاح کے بارے میں بات چیت ہوئی۔ میں نے انھیں بتایا کہ جو اصلاحیں وہ کرنا چاہتی ہیں وہ کوئی نیا فلسفۂ تعلیم نہیں (خود جرمنی میں اس نقطۂ نظر کی مدتوں تلقین ہوئی ہے) بلکہ بعض بنیادی خیالوں کو عمل کا جامہ پہنانے کا مسئلہ ہے۔ اس کے بعد میونسپل کمیٹی کے ثقافتی محکمے کے صدر DR. SHEOCES اور مقامی انسپکٹر مدارس DR.OYEN سے

گفتگو ہوئی۔ جرمنی میں اب COMPULSARY LABOUR SERVICE مطلق نہیں بلکہ نامقبول ہے اور اختیاری طور پر بھی بہت کم ہے۔ ایک تو ملک میں بے کاری مطلق نہیں۔ اس لیے اس قسم کے کاموں کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ دوسرے اس جبری اسکیم کے ساتھ (یادش بہ شر) ہٹلر کی یاد وابستہ ہے۔ تیسرے جیسا ایک صاحب نے کہا جرمن کیرکٹر ایسا ہے کہ یا تو بالکل آزاد رہنا چاہتا ہے یا پھر اس درجہ پابند ہوگا۔ جیسا نازیوں کے سامنے تھا۔ ہم ان دونوں مدوں میں LESSER EVIL یعنی بے جا حد تک آزادی کو ترجیح دیں گے۔ اگر بڑے پیمانے پر ایسی اسکیم کو چلایا جائے تو ایک مستحکم جمہوریت لازم ہے جو ابھی قائم نہیں ہوئی۔ جرمنی میں ایسی اسکیم اختیاری طور پر بھی بہت کم ہے۔ وہ مقاصد پیشِ نظر کو تعلیمی اصلاح کے ذریعہ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

۲۳ر کو تیسرے پہر میں بون سے پچاس میل پر ڈاکٹر PFONTIER (جرمن کلچرل اتاشی نئی دہلی) ڈاکٹر ERICHLER اور مسٹر REINHOLD اور مس شلز کی (مترجم) کے ساتھ ایک HEIM VOLK SCHOOL (PEOPLES HOME SCHOOL) دیکھنے گیا جو دائمار ریپبلک کے نامور صدر ڈاکٹر EBUT کے نام کے ساتھ وابستہ ہے اور EBUT FOUNDATION نے اسے قائم کیا ہے۔ یہ ایک قسم کا جنتا کالج سمجھنا چاہیے اس قسم کا جیسا انگلستان میں سارجنٹ نے مجھے ABBEY میں دکھایا تھا جب وہ اس کے پرنسپل تھے۔ لیکن کیسی خوبصورت SETTING ہے۔ اس کی پہاڑیوں کے بیچ میں جس کے چاروں طرف دل فریب منظر ہے اور عمارت ایسی شاندار اور خوبصورتی کے ساتھ تجویزی اور بنائی ہوئی کہ بھوک بھاگے! ہمارے ہاں یادش بخیر دلّی کا جنتا کالج ایک گاؤں کے مستردِ شدہ پولیس اسٹیشن میں قائم کیا گیا تھا۔ مجھے پنڈت جی کے اس خیال سے کبھی اتفاق نہیں ہوا کہ تعلیمی عمارتیں (ہماری غریبی کی وجہ سے) اگر گھٹیا قسم کے یتیم خانے معلوم ہوں تو کوئی حرج نہیں! خوش منظر آرٹسٹک، صاف ستھری، آرام دہ عمارت اور فرنیچر بجائے خود ایک تعلیم دینے والی چیز ہے۔ اور اگر کفایت بھی مقصود ہے تو چھری تعلیمی عمارتوں پر کیوں چلتی ہے؟...... اشوکا ہوٹل ہے نیشنل لیبوریٹریاں ہیں۔ سکریٹریٹ کے شاندار بلاک ہیں۔ ان کو کیوں نظر انداز کیا جاتا ہے..... افسوس کہ یہ یادداشت محض واقعات نگاری پر محدود ہے انشاء اللہ پھر کبھی عام تاثرات لکھوں گا۔

۲۴؍تا ۲۹؍جولائی

۲۴؍آج اتوار کا دن ہے۔ ملاقاتوں کے بجائے (بلکہ ساتھ ساتھ) دو نوجوانوں کے کیمپ دیکھے جن میں سے ایک انٹرنیشنل کیونٹی سروس کی طرف سے BAD HEMBURG میں ہورہا تھا اور دوسرا ایک اور جماعت کی طرف سے اس کے قریب ہی۔ دونوں میں بیس پچیس نوجوان طلبا (جن میں مختلف ملکوں کے لڑکے لڑکیاں شامل تھیں) شریک تھے۔ اور مختلف قسم کا کام کررہے تھے۔ مثلاً اس خوبصورت جنگل سے ڈھکی پہاڑی میں نالیاں کھودنا اور صاف کرانا تاکہ بارش کا پانی جمع ہوکر کام میں آسکے۔ قریب کے اٹھارہ سو سال پرانے رومن قلعے میں صفائی اور کھدائی، ہمبرگ کے پبلک پارک میں (جو جرمنی کا سب سے مشہور پارک سمجھا جاتا ہے اور جہاں گندھک وغیرہ کے چشمے ہیں جن کی وجہ سے بہت سے سیاح اور مریض سال بھر آتے رہتے ہیں) باغبانوں کے ساتھ کام۔ دوسرا کیمپ ایک اسپتال کے اندر واقع ہے۔ اس میں ڈاکٹر نے نوجوانوں کو رہنے کے لیے دو کمرے دے دیے ہیں۔ کھانا اسپتال کے باورچی خانے میں پکتا ہے۔ کام میں اسپتال کی صفائی، کار پارکنگ کی جگہ کو وسیع کرنا، ایک کیونٹی حال کی تعمیر جہاں نرسیں آسکیں (اس کا ڈھانچہ تیار ہوچکا ہے) اور مریضوں کی خدمت شامل ہیں۔ ڈاکٹر انچارج کام میں بہت دل چسپی لیتا ہے اور اس سے خوش اور مطمئن ہے۔ طلبا بھی کافی مطمئن معلوم ہوتے تھے اور آپس میں مراسم بہت خوش گوار تھے۔ ان میں ایک ناگانیکا ہندوستانی بھی تھا جس کو یہ بتانے پر اصرار تھا کہ یہ ڈنمارک کی لڑکی میری GIRL FRIEND ہے!..... اس سے زیادہ محنت مزدوری کا کام یہاں کے کیمپوں میں طلبا نہیں کرتے۔ ان کا اصلی مقصد بین الاقوامی مفاہمت ہے نہ کہ تعمیری منصوبوں میں شریک ہوکر بڑے پیمانے پر ہاتھ سے کام کرنا جو یوگو سلاویہ میں ہورہا ہے اور ہندوستان میں ہم کرنا چاہتے ہیں۔ جرمنی میں جہاں کہیں لوگوں سے گفتگو ہوئی انھوں نے کہا کہ جبری طور پر LABOUR کا نافذ کرنا تو بالکل خارج از بحث ہے اختیاری طور پر بھی اس کی کوئی بہت ضرورت نہیں۔ ایک تو ملک میں پوری باکاری ہے اور ہر تعلیم یافتہ اور نیم تعلیم یافتہ نوجوان کو کام مل جاتا ہے۔ دوسرے، جبری مزدوری

کے ساتھ ہٹلر کی اور نیز اطالی کمیونسٹ جرمنی اور روس کی یاد وابستہ ہے جس کو ارباب اقتدار ناپسند کرتے ہیں۔ تیسرے حالات ایسے ہیں جس میں اعزازی سوشل سروس کی ضرورت نہیں۔ ٹکنیکل کام اور محنت مزدوری کرنے والے اکثر تعلیم یافتہ نوجوانوں سے بہتر روزی کما لیتے ہیں اور خود کو ان سے کم نہیں سمجھتے بلکہ بعض دفعہ ان پر رحم کھاتے ہیں (مثلاً برلن یونی ورسٹی کے رکٹر نے جن کا نام ہے DR. NEREMAM اور دوسرے وائس چانسلروں کی طرح SAIN MAGNIFICANCE (یعنی اعلا حضرت!) کہلاتے ہیں، جو ایک عجیب سا لقب معلوم ہوتا ہے لیکن بہرحال اس سے پروفیسروں کے سماجی مقام کا اندازہ ہوتا ہے) اسی خیال کو ظاہر کیا۔

بعض طلبا تعطیل کے مہینوں میں مشاہرے کے ساتھ سوشل کام کرتے ہیں۔ لیکن اس کی نوعیت مختلف ہے۔ ایک اور دل چسپ بات جس کا ذکر برلن کے ناظم تعلیمات DR. RAN کے ڈنر پر آیا۔ (جہاں سابق جرمن سفیرِ ہند ڈاکٹر MEYER اور مسٹر کامتھ M.P. محبوب احمد قونصل جنرل وغیرہ بھی موجود تھے) یہ تھی کہ ”جرمن طلبا اس درجہ ضبط اور نظم پر قائم ہیں کہ کاش کبھی کبھی بدنظمی کا مظاہرہ بھی ہو جایا کرے“! میں نے کہا کہ ہندوستان کے STUDENTS LEADER منگالو اور چند اپنے ہندوستان بھیج دو، تاکہ ہمارے طلبا میں کچھ نظم پیدا ہو جائے اور تمہارے ہاں قدرے بدنظمی! علاوہ اس کے طلبا سیاسیات میں (خواہ وہ ملکی اور بین الاقوامی ہو یا اپنے کالج اور ہوسٹل وغیرہ کا نظم ونسق) بہت کم دل چسپی لیتے ہیں۔ انھیں فکر یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ جلد ڈگری لیں اور اچھی ڈگری لیں اور کام کرنا شروع کریں۔ اس بامقصد تعلیم کی وجہ سے ان کو ایجی ٹیشن وغیرہ کرنے کی فرصت یا دماغ ہی نہیں۔ اسی وجہ سے طلبا پر یونی ورسٹی میں کسی قسم کا ڈسپلن نہیں ہے (اسکول میں جو کچھ ہے وہی ہے)۔ ان کو اختیار ہے کہ وہ لیکچر میں شریک ہوں یا نہ ہوں۔ امتحان دیں یا نہ دیں...... ETERNAL طالبِ علم“ یہاں بھی ہوتے ہیں۔ لیکن ان کو کوئی خارج نہیں کرتا۔ مشورہ دیا جا سکتا ہے کہ اب یونی ورسٹی چھوڑ دو لیکن وہ چاہیں تو رہ سکتے ہیں۔ ان پر ڈسپلن خود عاید کیا ہوا اور نام کا ہے۔ ارباب یونی ورسٹی ان پر کوئی پابندیاں عاید کرنا پسند نہیں کرتے۔ ہمارے ہاں کا حال کس درجہ مختلف ہے! پھر وہی تصویر بنانے اور صورت بگاڑنے والی بات آجاتی ہے۔

مجھے دوسری قوموں کی تعریف یا خود کو ان سے گھٹیا سمجھنے میں (بعض اعتبار سے) تکلیف ہوتی ہے، لیکن سچی بات تو کہنی پڑتی ہے!)۔

ڈنمارک

آج صبح برلن سے ہمبرگ کے لیے روانگی ہوئی۔ برلن اسٹیٹ کی طرف سے ایک خاتون اور مسٹر اور مسز محبوب احمد چھوڑنے آئے۔ میرا سامان کسی قدر زیادہ تھا (کوئی چار پانچ پاؤنڈ)۔ جب اہل کار متعلقہ نے بتایا اور میں نے رقم دریافت کی تو ان خاتون نے جرمن زبان میں کچھ تقریر فرمائی اور کہا کہ تم "STATE SAKRETAR سے اتنی رقم کیا وصول کرو گے"! اس کی ضرورت نہیں اور ادا نہیں کرنے دی! دوسرا لطیفہ یہ ہوا کہ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ میں زینے پر سے چڑھ کر نیچے اُتروں بلکہ موٹر ہوائی جہاز تک پہنچ جائے۔ اہلِ ایر پورٹ کو اس میں کچھ تامّل تھا۔ چناں چہ محترمہ نے یہ عذر تراشا کہ ان کو ایک خفیف سی دل کی بیماری حال ہی میں ہوئی ہے لہٰذا یہ ضروری ہے۔ چناں چہ انھوں نے مجھ سے ایک فارم پر دستخط کرائے کہ اگر برلن اور ہمبرگ کے درمیان کچھ ہو گیا تو کمپنی ذمہ دار نہیں۔ صرف گھنٹے بھر کی اڑان تھی اور زندگی کا ذمہ دار کون ہے سوائے بنانے والے کے؟۔

ہمبرگ میں ہمارے قونصل جنرل مسٹر و مسز آر، ڈی، ساٹھے چند گھنٹے کے میزبان تھے۔ دونوں میاں بیوی نے خاصے تپاک سے استقبال کیا۔ ایک صاف ستھرے، باغ والے، علیحدہ چھوٹے سے مکان میں رہتے ہیں جس میں ملازمہ کا کمرہ ہمارے کمروں سے غنیمت ہے۔ دونوں میاں بیوی اور دو بچے جو جرمن زیادہ اور اپنی زبان بہت کم جانتے ہیں۔ کھانا وہ خود پکاتی ہیں۔ سالن غنیمت، روٹیاں ناگفتہ بہ۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ کہنے لگیں کہ پہلے جب میں آٹا یہاں سے منگاتی تھی تو روٹیاں اچھی نہیں پکتی تھیں اب بہت بہتر ہیں! میں نے دبے لہجے میں کہا کہ پھر تو پہلا آٹا بہت ہی بُرا ہوتا ہوگا۔ (روٹیاں ایک طرف سے بالکل کچّی دوسری طرف سے خاصی جلی ہوئی۔ بس ان کا "خیالی اوسط" ہی ٹھیک ہوتا ہوگا)۔۔۔۔ یہاں تین اشخاص سے ملاقات ہوئی، ایک یونی ورسٹی پروفیسر BONDY ایک یونسکو انسٹی ٹیوٹ کے

قائم مقام ڈائرکٹر HENNION اور ایک میرے سابق ملاقاتی DOHREN DARF تینوں جبری لیبر سروس کے بالکل خلاف تھے اور اس کو جرمنی کے لیے ناممکن سمجھتے ہیں۔ موخرالذکر خاص طور پر تیز اور ذہین آدمی ہیں۔ یہ وہی شخص ہیں جنھوں نے میرے ساتھ یونسکو کی ایک "اٹومک انرجی" کمیٹی میں کام کیا تھا۔ اور ہندوستان کے تعلیمی نظام کے متعلق میرا مضمون اپنے ایک مجموعے یا YEAR BOOK میں شائع کیا ہے۔ ساٹھے نے ہمبرگ کی سیر کرائی۔ دوسرے جرمن شہروں کی طرح باغات، پارک، جنگل اور دریائے رائن نے مل کر اس کو ایک حسین شہر بنا دیا ہے۔ جا بجا جھیلیں بھی ہیں۔ یہ یورپ کا (شاید دنیا بھر کا) سب سے بڑا SHIPYARD ہے جہاں بے شمار جہاز (تجارتی) آتے ہیں اور دنیا بھر سے چیزیں لاتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ یہاں شاید تیس کروڑ ٹن مال ہر سال آتا ہے جب کہ بمبئی اور کلکتہ کی بندرگاہیں شاید دو اور تین کروڑ ٹن مال کی درآمد برآمد کا انتظام کرتی ہیں۔ بہت سے جہاز دنیا کے مختلف ملکوں کے لیے بنائے جاتے ہیں اور بن رہے تھے۔ ایک پرانی یونی ورسٹی ہے اور شہر خود کافی پرانا ہے۔ ساٹھے کے ہاں سے ایک کتاب VERNELLION GOTE (لن یوٹانگ کی تصنیف) لایا۔ لیکن خوبیٔ قسمت کہ وہ بھی پڑھی ہوئی نکلی!۔

۵۵ فٹ کی اڑان کے بعد ۳۰ کی شام کو ہمبرگ سے کوپن ہاگن پہنچ گئے۔ یورپ میں یہ بڑی آسانی ہے کہ قدم قدم پر دوسرے ملک! ابھی جہاز میں سے صرف اتنا دیکھا ہے کہ تقریباً ہر مکان اپنے باغیچے میں واقع ہے اور سارا علاقہ سرسبز اور نظر فریب ہے ....

یہاں پہنچ کر پتہ چلا کہ ڈنمارک یا ہندوستانی سفارت خانے کی غلطی سے یہاں یہ اطلاع ملی تھی کہ میں سابق پروگرام کے مطابق ۲۹ کی شام کو پہنچوں گا۔ لہٰذا ہوٹل میں کمرہ ایک دن پہلے سے ریزرو تھا۔ اور ۳۰ کا جو پروگرام بنا تھا (جس میں ایک ضابطہ کا ڈنر بھی شامل تھا) وہ "فالتو" ثابت ہوا۔ یہ نقصان مایہ و شماتت ہمسایہ کی ایک اچھی مثال ہے! یہاں ہمارا اپنا کوئی سفیر نہیں ایک مقامی صاحب "اعزازی سفیر" ہیں جن سے کوئی خاص ربط ہوا نہ مدد ملی۔ البتہ سب سے پہلے ایک صاحب سے ۳۱ کو ملاقات ہوئی جن کا نام ہے مسٹر DROTOLY وہ ڈنمارک کے بہترین CONTACT اور ایک باخبر شریف اور "قدروں" کے قائل شخص ثابت ہوئے۔ انھوں نے اتوار

ہی کو مجھے اپنی گاڑی میں بٹھا کر گرد و پیش کے علاقے کی سیر کرائی. کوئی پچاس ساٹھ میل اور راستہ بھر ڈینش تعلیم کے بارے میں مجھے باخبر کرتے رہے اور اس مسئلے میں انھیں ایسی دل چسپی تھی کہ بعض "چیزیں" دکھانے کا وعدہ کر کے بھول جاتے تھے! لیکن اس گفتگو سے کافی فائدہ ہوا یعنی ڈینش زندگی، تہذیب کے بعض مسائل سے آگاہی ہوئی، ایک SENSITIVE ڈین کے نقطۂ نظر سے. تعلیم کا ذکر تو اور کہیں آئے گا لیکن اور چند باتیں قابلِ ذکر ہیں. اس ملک نے کافی ترقی کی ہے گزشتہ ڈیڑھ سو برس میں. یہاں تعلیم شاید دو سو سال ہوتے لازمی کی گئی تھی. جو شاید یورپ میں پہلا اقدام تھا. یہاں کے مشہور FOLK HIGH SCHOOL میں سے پہلا ..... میں قائم ہوا اور اس نے کسانوں میں ایک نئی زندگی اور ولولہ پیدا کرنے کی کوشش کی. لیکن بجائے فنی اور صنعتی تعلیم پر زور دینے کے ان کو عام تہذیبی تعلیم اور دل چسپیوں کی طرف توجہ دلائی اور شخصیت اور کیرکٹر کی تربیت کو اپنا مقصد بنایا. بیان کیا جاتا ہے کہ اس کی وجہ سے یہاں کی دیہاتی آبادی کا سیاسی اثر بھی بڑھا اور ان میں سے قومی لیڈر شپ بھی پیدا ہوئی. چناں چہ بہت سے M.P. اور بعض وزیر انھیں کالجوں میں پڑھے ہوئے ہیں (حالاں کہ یہ نہ "کالج" ہیں عام معنی میں، نہ یہاں ڈگری وغیرہ کے لیے کورس ہیں بلکہ ۳ یا ۵ ماہ کے کلچرل کورس عام لوگوں کے لیے مرتب کیے گئے ہیں. البتہ ان کی روایات، ان کی فضا، ان کے خوبصورت پارک اور غیر رسمی آب و ہوا قابلِ ذکر ہیں). ڈنمارک کے نظامِ تعلیم اور عام سیاسی حالات کا یہ نتیجہ ہے کہ یہاں نہ کوئی غریب ہے نہ زیادہ دولت مند. ایک مساویانہ سا سماج ہے. جس میں معیارِ زندگی خاصا خوش حال ہے. کاشت کار اپنے اپنے کھیتوں میں کام کرتے ہیں جن میں اب پرانا FRAGMENTATION نہیں رہا بلکہ وہ VIOBLE UNITS ہیں. امدادِ باہمی کی تحریک نے بے حد ترقی کی ہے. گاؤں در اصل مدرسہ، گرجا، امدادِ باہمی کے مرکز، سماجی مرکز اور چند اہل کاروں کے مکانوں کا نام ہے ورنہ کاشت کار تو اپنے اپنے کھیتوں کے درمیان چھوٹے چھوٹے (یا ذرا بڑے) خوش نما مکانوں میں رہتے ہیں (جو "دکھاوے" کے اعتبار سے غیر معمولی نہیں ہیں) ملک میں سوشل ڈماکرسی کے ساتھ ساتھ پوری بیکاری ہے. نوجوانوں کو ۸ یا ۹ سال کی تعلیم کے بعد UNSKILLED کام فوراً مل جاتا ہے اور ۳ یا ۴ سال کی مزید ٹکنیکل تعلیم

کے بعد SKILLED کام. تعلیم تقریباً ہر منزل پر مفت ہے۔ اور اسکولوں کی جو نئی عمارتیں بن رہی ہیں مثلاً ۸ یا ۹ سال کے میونسپل اسکول ان میں سے چند کو دیکھا۔ ہمیں تو خواب میں بھی ایسی عمارتیں مدرسوں کے لیے نصیب نہیں۔ مثلاً ایک اسکول خاص کوپن ہاگن میں ۴ لاکھ پونڈ میں بنا ہے جس کو یہاں کے سب سے مشہور بین الاقوامی ARCHITECT پروفیسر یاکوبسن نے بنایا ہے۔ کیا عمارت ہے جس میں ہر چیز اور ہر پہلو میں سلیقہ، احتیاط، آرام اور خوبصورتی کا ثبوت ملتا ہے!۔ (بتایا گیا کہ یہ اسکول غیر معمولی نہیں بلکہ بہت سے نئے اسکول اس پیمانے پر بڑے یا چھوٹے بنائے گئے ہیں۔ پرانے اسکولوں کی عمارتیں معمولی ہیں لیکن فراخ اور آرام دہ اور اندر سے خاصی آراستہ)۔ اسی نئے اسکول میں اسکول کے پارک بھی دیدنی ہیں۔ میں نے گاؤں کے ایک دو اسکول بھی دیکھے جو ہمارے کالجوں سے شاندار تھے۔ استادوں کے مکان ان کے قریب ہی بنے ہوتے تھے۔ اور عام طور پر استاد ایک مقام سے دوسرے مقام تبدیل نہیں کیے جاتے۔

لیکن باوجود تعلیمی سہولتوں، سماجی مساوات، سوشل سروس کی فیاضی اور خاصے اُونچے معیارِ زندگی کے میں نے علمی حلقوں میں ایک بے چینی پائی۔ اس لحاظ سے کہ لوگوں، خصوصاً نوجوانوں میں، خوشی اور توازن کی کمی ہے۔ ان کی زندگی میں افسردگی اور دل گرفتگی ہے جس کی وجہ سے خودکشی، شراب خوری اور جرائم کی شرح کافی بڑھی ہوئی ہے۔ ایسا کیوں ہے۔ اس کا جواب شافی نہیں ملتا۔ جتنے منہ اتنی باتیں، اتنے اسباب! ایک معمر ماہرِ تعلیم مسٹر ROSINKOER ہیں جن کی عمر ۷۷ سال کی ہے، بڑی عزت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ جیسے ہندوستان میں ٹیگور یا امریکہ میں پروفیسر کلپٹرک ان کا کہنا ہے کہ WE HAVE GIVEN THE YOUTH ENOUGH TO LIVE BY BUT NOT ENOUGH TO LIVE FOR مادّی خوش حالی کی تلاش میں روحانی قدروں کو بھلا دیا ہے۔ جب وہ کسی CRISIS کا مقابلہ کرتے ہیں تو اس کے لیے اپنے اندر قوت پیدا نہیں کرتے۔ انھیں ہندوستان میں بہت دل چسپی ہے۔ اس کی "روحانیت" کے قائل ہیں اور چاہتے ہیں کہ وہ محفوظ رہے۔

آج تین چیزیں FOLK HIGH SCHOOLS جیسے جو ڈنمارک کے نظامِ تعلیم کا خاص فیچر ہیں۔ گو تقریباً

سب کی عمارتیں پُرانی ہیں۔ اور یہاں کے لوگ ان سے مطمئن نہیں لیکن ہمارے ہاں کے مقابلے میں یہ عمارتیں، خصوصاً اندر سے کمروں کی آرائش اور ترتیب اور فرنیچر وغیرہ میں بڑا سلیقہ اور خوش نمائی ہے۔ اور ان کے گردونواح کا علاقہ بہت خوبصورت ہے یعنی لان اور باغیچے وغیرہ جن کی مدد سے آسانی کے ساتھ ایک تعلیمی، ثقافتی اور جمالی فضا پیدا کی جاسکتی ہے اور کی جاتی ہے۔ ان کا مقصد ہے کہ عام لوگوں کی لبرل اور جنرل تعلیم کا انتظام کیا جائے تاکہ ان کی شخصیت کی تربیت ہو سکے۔ یعنی ۱۸ برس کی عمر کے بعد شہروں اور گاؤں سے، غریب اور خوش حال، تعلیم یافتہ اور نیم تعلیم یافتہ، ذہنی اور عملی کام کرنے والے غرض ہر قسم کے آدمی یہاں آکر یا تو چند روز کے لیے یا ۳ اور ۵ مہینے کے پورے کورس کے لیے شامل ہوتے ہیں اور انھیں اپنی عملی کارکردگی بڑھانے کی اتنی فکر نہیں جس قدر نئی زبانیں سیکھنے اور عام ذہنی اور جذباتی تربیت پانے کی۔ ہمارے ہاں کے جتنا کالج ان کے مقابلے میں کس قدر بے کشش ہیں۔ ماحول کے اثر سے کیسے انکار کیا جاسکتا ہے؟ میرے ساتھ محکمۂ تعلیم کے ایک مقابلتاً نوجوان سکریٹری GUNNARSON اور دو امریکی میاں بیوی تھے۔ گنارسن ذہین، خود اعتماد اور کارگزار شخص ہے جو بہت باخبر ہے اور امریکی مہمانوں کے NAIVE سوالوں کا جواب بڑے مزے دار طریقے پر ایک احساس برتری کے ساتھ دیتا رہا۔ امریکی شوہر صحافی ہے اور بیوی معلّم۔ دونوں شریف، قدرے غریب مزاج اور ہر چیز کو خوبصورت کہنے والے (اور بار بار!) اور جلد خوش ہونے والے، روس بھی گئے تھے۔ اور وہاں کے حالات سے متاثر تھے اور سیاسی تعصبات سے مقابلتاً پاک۔ اپنے وطن کے آنے والے انتخاب میں KENNEDY کو NIXON پر اور دونوں پر ADLAI STEVENSON کو ترجیح دیتے تھے۔ جو گویا ترقی پسندی کا ثبوت ہے۔ تاہم یہ خیال تھا کہ جیت اس کی ہوگی جو زیادہ یقین کے ساتھ کرشچیف کو شکست دینے کا دعویٰ کر سکے گا! اس پر یاد آیا کہ NEW STATESMEN کے ایک حال کے نمبر میں لکھا تھا کہ آج کل سیاسی عقیدوں DOCTRINES کی جو جنگ ہو رہی ہے۔ اس میں جیت اس کی ہوگی جو سب سے کم کٹر DOCTRINAIRE ہوگا۔ اور ایک دوسرا دلچسپ ریمارک کہیں یہ پڑھا (حال میں برٹش پارلیمنٹ تین ماہ کے لیے ملتوی ہوئی ہے۔ جس پر بعض ممبروں نے سخت اعتراض کیا کہ دنیا کی حالت

اس قدر نازک ہے اور اہم معاملات روز پیش آرہے ہیں. پھر ایسی صورت میں پارلیمنٹ کا التوا کہاں جائز ہے) کہ بھلا دنیا کا جو بھی حال ہو وزیرِ اعظم اور دوسرے رؤساGROUSE MOOR کی اپیل کو کس طرح مسترد کر سکتے ہیں۔ یعنی GROUSE کے شکار کا زمانہ تو یہی ہے۔ اس کے بغیر زندگی کیسے ممکن ہے !!

دن تو جوں توں گزر جاتا ہے لیکن بقولِ غفران" شام ہوتے ہی چراغ کی طرح جلنے لگتا ہوں کہ اس وقت کی تنہائی میں (خواہ وہ ہوٹل کے کمرے میں ہو یا "مجمع میں تنہائی" کی صورت میں) عزیزوں کی یاد بہت ستاتی ہے۔ یا بقولِ میرؔ :-

شام ہی سے بجھا سا رہتا ہے　　　دل ہوا ہے چراغ مفلس کا !

۳ / اگست

۳/اگست کو صبح کو مقامی اسکول دیکھے جن کو دیکھ کر خاصی عبرت ہوئی یعنی شفاخانے، رشک اور مقابلہ۔ ایک تو ثانوی مدرسہ تھا جو کوئی ۳۵ یا ۴۰ سال پرانی عمارت میں تھا۔ اس میں تو کوئی خاص بات نہ تھی۔ "خاصی بھاری" عمارت تھی اور باہر سے نظر فریب کسی طرح نہ تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ "صدیوں کو پیشِ نظر رکھ کر" بنائی گئی ہے۔ اندر سے اچھی حالت میں تھی مثلاً سنگِ مرمر کا ہال۔ دیواروں پر اچھا دیوار کا غذ، ضروری سامان وآلات موجود، جمنازیم، غسل خانے وغیرہ، لیکن فرنیچر وغیرہ پرانی قسم کا۔ لیکن اس تھوڑے سے عرصے میں کس قدر انقلاب ہوا ہے۔ یہاں کا پرائمری مدرسہ (جو میونسپل کمیٹی کا بنایا ہوا ہے اور جس میں ۸ یا ۹ کلاسیں ہیں) ایک الف لیلیٰ کا خواب سا معلوم ہوتا ہے۔ کسی غریب ہندوستانی معلّم کو۔ ڈنمارک کے بہترین "آرکی ٹکٹ" نے بنایا ہے جو بین الاقوامی شہرت کا مالک ہے۔ مکان کا نقشہ، رنگوں کا انتخاب، ہوا، روشنی اور آواز کی پاسداری، ہر دو کمروں کی قطاروں کے بیچ میں چمن جن میں سے ہر ایک کا نقشہ جدا جدا ہے (ایک جگہ پارک کے بجائے حوض ہے) ہر کمرے میں ریڈیو، آرام اور سہولت کی تمام چیزوں پر غور کرنے کے بعد ان کی ترتیب چھوٹی چھوٹی چیزوں پر نظر، فرنیچر اور سامان وآلات کی نہ صرف فراوانی بلکہ خوش سلیقی اور مجوزہ کام کرنے کے لیے موزونیت،

غسل خانے، باورچی خانے، لڑکیوں کو گھر داری کی مشق کرانے کے لیے ایک کمرہ، دستکاری کے کمرے (لیکن اس قدر صاف ستھرے کہ شاید ان میں بڑے پیمانے پر کام نہیں ہوتا!) مدرسہ بند تھا لہٰذا محض عمارت ہی دیکھ سکا۔ لیکن اسے دیکھ کر یہ خیال ضرور ہوتا ہے کہ سادگی اور کفایت اپنی جگہ ٹھیک ہیں لیکن اپنی بساط بھر بچوں کی تعلیم و تربیت کے مرکز کو جہاں تک ہو سکے خوبصورت اور خوش منظر بنانا چاہیے تاکہ اس اثر پزیر عمر میں احساسِ خوبصورتی ان کے اندر جا کر بس جائے۔ آخر کفایت کرنی ہے تو اور بہت سی چیزیں اس کے لیے موجود ہیں۔ البتہ ہمارا اور ان ملکوں کی مادی دولت کا کچھ مقابلہ نہیں ہے۔ اس اسکول کی تعمیر پر (بتایا گیا) کہ ۴ لاکھ پونڈ صرف ہوئے ہیں جن میں سے نصف (یا کچھ رقم) میونسپل کمیٹی کے پاس سے آئی ہے۔ (یعنی اس محلے کی کمیٹی سے!) باقی حکومت کی امداد ہے .... یوں بھی سکنڈے نیویا کے ان تینوں ملکوں میں (دو دیکھے ہیں ایک باقی ہے) گاؤں کی بہترین عمارتیں اسکول اور چرچ ہوتی ہیں۔ یہ اس سے تو بدرجہا بہتر ہے کہ دولت کا مظاہرہ صرف شراب خانوں، سینما گھروں اور پرائیویٹ مکانوں میں ہے...... اسکول کے سابق ہیڈ ماسٹر ایک کافی بارعب آدمی ہیں جو نائب سکریٹری تعلیمات ہے۔ برابری کے انداز میں نہیں بلکہ برتری کے احساس کے انداز میں گفتگو کر رہے تھے (اس میں کچھ ان کے قدوقامت اور وجاہت اور عمر کو بھی دخل ہوگا) لیکن ہمارے ہاں کے استاد جو احساسِ کم تری کا شکار ہیں اور SIR, SIR کہتے اپنے دل اور دماغ اور زبان اور ہونٹوں کو خشک کر لیتے ہیں! ہمارے ہاں سوشل برابری کا احساس کب پیدا ہوگا؟

آج دو شریف اور دل چسپ آدمیوں سے ملاقات ہوئی۔ ایک HEBRIG RETERSON ابتدائی اور استادوں کی تعلیم کے مشیر ہیں (یہاں معلّین اور ماہرینِ تعلیم صرف مشیر ہو سکتے ہیں CORIL SEWOUTS سب باضابطہ سروس کے آدمی ہیں لیکن ان میں بھی جن لوگوں نے کام لیا ہے وہ خاصے باخبر ہیں، گو زیادہ ذہین لوگ فنی اعتبار سے کم ہی ملے) ان کے ساتھ دیر تک بحث بھی رہی اور ان کے گھر جا کر کھانا بھی کھایا۔ جہاں ان کی بیوی، لڑکی اور ایک انگریز مہمان لڑکی سے ملاقات ہوئی۔ دوسرے ایک پرانے اور نیک نام ستتر سالہ معلّم مسٹر JEWS ROSENKIER

ہیں جو ابھی تک مشورتی حیثیت سے وزارتِ تعلیم میں کام کرتے ہیں اور ان کی حیثیت ایسی ہے جیسے مثلاً امریکی تعلیمی حلقوں میں ڈاکٹر، کلپٹرک کی۔ انھیں ہندوستان سے اور روحانی مسائل سے دل چسپی ہے اور چاہتے ہیں کہ یہ دونوں ایک دوسرے کو نہ بھولیں۔ اچھی اچھی باتیں بھولے انداز میں کرتے ہیں اور ہر بات پر معذرت کرکے کہتے ہیں کہ معاف کرنا بوڑھوں کو بولنے کا خبط ہو جاتا ہے! انھوں نے ان ملکوں کے نئے پیدا شدہ مسائل کے سلسلے میں ایک دل چسپ بات سنائی (یاد پڑتا ہے کہ ان کا کچھ ذکر پہلے کر چکا ہوں۔ ہاں یکم اگست والے صفحہ پر۔ اپنی یادداشت کی کمزوری ملاحظہ ہو کہ پھر اس قصّے کو لے بیٹھا۔ لیکن کئی جگہ یادداشتیں لکھنے میں یاد نہیں رہتا!) ایک دفعہ پچاس ساٹھ سال قبل کسی سوشلسٹ پارٹی کا جلسہ ہو رہا تھا جس میں سات کے قریب نمائندے شریک تھے اور ان میں کسی طرح آٹھ دس عورتیں بھی کسی کونے میں دُبکی دُبکائی بیٹھی تھیں ان دنوں وہ کہاں شریک ہوتی تھیں؟ مردوں نے دُھواں دھار تقریریں کیں اور مطالبہ کیا کہ ان کی تنخواہیں بقدر معلوم نہیں کتنی (کوئی معمولی سی رقم) بڑھنی چاہئیں تاکہ ہم میں سے ہر ایک فی گھنٹہ اتنے ORE (یہاں کا سکّہ) اپنی جیب میں رکھ سکے۔ اس پر ایک عورت اُٹھی، پلیٹ فارم پر گئی اور اس نے کہا کہ ہم صرف اتنے ORE ہی زائد نہیں چاہتے "ہم چاہتے ہیں کہ ہم میں سے ہر ایک کی میز پر ایک گلاب کا پھول بھی ہو" اس جملے سے پہلے تو حاضرین پر سنّاٹا طاری ہو گیا اور اس کے بعد بہت تالیاں بجیں اور بحث کی آب و ہوا ہی بدل گئی!

چند اور باتیں جو ڈنمارک میں قابلِ ذکر معلوم ہوئیں صرف اشارتاً ہی لکھ سکتا ہوں۔ تفصیل کا موقع نہیں۔ ڈنمارک میں ان ملکوں سے کافی دل چسپی ہے۔ جو آج کل اپنی اقتصادی اور صنعتی ترقی کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں۔ (اور جن کو یورپ کے بعض لوگ اب UNDER DEVELOPED ممالک کے بجائے DEVELOPING ممالک کے نام سے پکارتے ہیں)۔ اسی مقصد سے مشرق اور مغرب کے ملکوں میں رابطہ قائم کرنے کے لیے وہ طلبہ وغیرہ کے لیے مزید وظائف قائم کرنا چاہتے ہیں۔

ان کے ہاں کی قومی زندگی میں امدادِ باہمی کی تحریک COOPERATIVE MOVEMENT کا بہت

کافی دخل ہے۔ اور وہ دیہات کی زندگی کے تقریباً ہر پہلو پر حاوی ہے، خرید و فروخت، زراعتی مشینری کی فراہمی، قرضوں کا انتظام۔ مجھے بتایا گیا کہ شہروں میں جو بڑے بڑے کاروبار اور کارخانے ہیں ان میں سے شاید ایک تہائی COOPERATIVES کی شکل میں چلتے ہیں۔ کاشت کار خاصے خوش حال معلوم ہوتے ہیں۔ اور خود زمین کے مالک ہیں۔ ان کی اراضی کی تقسیم اس طرح ہے کہ نہ بہت بڑے زمین کے ٹکڑے ہیں، نہ بہت چھوٹے۔ اوسط سائز کے ہیں۔ مویشیوں کی پرداخت کا بہت اچھا انتظام ہے۔ اور اس ملک کی DAIRY PRODUCTS دنیا بھر میں مشہور ہیں۔ اچھی نسل کا بیل پچاس ہزار پونڈ تک قیمت حاصل کر سکتا ہے! جب میں نے پوچھا کہ یہ کیسے ممکن ہے تو مجھے بتایا گیا کہ ایسے بیل کی ملک میں پچاس ہزار "پینیاں" ہو سکتی ہیں اور اس طرح قیمت وصول ہو جاتی ہے....

ڈنمارک میں بڑی حد تک اقتصادی مساوات ہے اور آمدنی کا فرق، امیروں اور غریبوں میں مقابلتاً بہت کم ہے۔ شاید چند بہت دولت مند INDUSTRIALISTS وغیرہ کو چھوڑ کر یہ فرق ایک اور تین کے درمیان ہے۔ انکم ٹیکس کافی "اُونچا" ہے۔ آمدنی کا نوّے فی صدی تک ہو سکتا ہے۔ لوگوں کی اوسط عمر ۶۹ سال تک پہنچ چکی ہے اور ملازمت سے سبک دوشی کی عمر ۷۰ سال ہے۔ عام طور پر صحت اچھی ہے۔ اور یورپ کے بہت سے دوسرے ممالک کی طرح متعدی امراض کا انسداد ہو چکا ہے۔ اور اب موت کا سبب زیادہ تر وہ امراض ہیں جن کو ڈاکٹر DEGENRATION امراض کہتے ہیں۔ یعنی دل کی بیماری یا سرطان وغیرہ۔ عمر کے اضافے کے ساتھ بڑی عمر کے لوگوں کی دیکھ بھال اور ان کی زندگی کے خاص مسائل کا حل بھی تلاش کرنا ضروری ہے۔ تمام ملک میں جا بجا "معمر لوگوں کے گھر" بنائے گئے ہیں جن میں ساٹھ سال سے زیادہ عمر کے مرد اور ۶۲ سال سے زیادہ عمر کی عورتیں، جو اپنے خاندان کے ساتھ نہیں رہ سکتیں یا نہیں رہنا چاہتیں۔ قیام کر سکتی ہیں اور اپنے لیے ایک گوارا زندگی کا نظام قائم کر سکتی ہیں۔

سویڈن۔ ۷راگست

میں اس وقت سویڈن کے ایک جزیرے میں بیٹھا ہوا لکھ رہا ہوں۔ یہاں ایک صاحب نے اتوار کے دن کے لیے مجھے مہمان کے طور پر بلایا ہے۔ (ان کا نام مسٹر سٹروم گرین STROM GREEN ہے اور یہ ہندوستان میں ۱۹۶۱ء تک ۷ سال بحیثیت ایک انجینیر کے رہ چکے ہیں۔ اور میسور کی جانے کے کارخانوں وغیرہ میں کام کیا ہے۔ اب بھی کارو بار کرتے ہیں اور انڈو سویڈش سوسائٹی کے سکریٹری ہیں اور ہندوستانیوں میں بہت دلچسپی لیتے ہیں)..... یہ تو دنیا ہی نرالی ہے۔ اس مجمع الجزائر ARCHIPELAGO میں ایک لاکھ چھوٹے بڑے جزیرے ہیں۔ جن میں سے بعض تو محض بڑے بڑے پتھر ہیں۔ اور بعض میلوں لمبے جن میں لوگ سمر ہاؤس بنا کر رہتے ہیں۔ شاید دو تین ہزار سے زیادہ جزیرے آباد ہیں۔ جن میں پچاس ہزار کے قریب مکان ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اسٹاک ہوم کی آبادی میں سے تقریباً ہر چار خاندانوں میں سے ایک کے پاس جزیرے میں سمر ہاؤس موجود ہے اور کشتی ہے جس کے ذریعہ وہ اس فرصت اور خواب کی دنیا میں منٹوں میں (یا گھنٹے بھر میں) پہنچ جاتے ہیں۔ دُور دراز کے جزیروں میں بھی فون اور بجلی کی روشنی ہے۔ ایک جزیرہ ہے جس پر ایک ہی ماہی گیر رہتا ہے۔ اس کے پاس میلوں سے آیا ہوا فون ہے (بجلی نہیں ہے) اور اگر بیمار ہو جائے یا اور کوئی فوری ضرورت پیش آئے تو HELICOPTER کی میڈیکل سروس مفت حاصل ہے یہ سمر ہاؤس عام طور پر PREFABRICATED میٹریل سے بنائے جاتے ہیں اور چھوٹے سے مکان کے لیے تین سے پانچ ہزار روپیے میں یہ مل جاتا ہے۔ باقی کام لوگ اپنے ہاتھ سے کر لیتے ہیں۔ (ریل میں لکھ رہا ہوں اس لیے خط اور بھی حسین ہو گیا ہے!) میزبان نے اپنی کشتی میں بٹھا کر کوئی ایک سوا گھنٹے تک اس پانی کی دنیا کی سیر کرائی (ان کا اٹھارہ سال کا لڑکا کشتی کو چلانے وغیرہ کا سارا کام کرتا ہے۔ مکان میں میاں، بیوی (نمبر ۲۔ نمبر ۱ طلاق کھا چکی ہیں) اور یہ لڑکا ہیں اور باوجود کافی خوش حال ہونے کے سارا کام خود کرتے ہیں۔ باغ، لکڑی کاٹنا

مکان کی مرمت، مکان میں تبدیلی وغیرہ..... سٹروم گرین کا کہنا ہے کہ ہندوستانی ٹکنیکل طلبا بھی ہاتھ سے سخت کام کرنے کو تیار نہیں ہوتے جس کے بغیر ٹریننگ نامکمل رہتی ہے۔ لڑکیوں سے مراسم پیدا کرتے ہیں۔ (جن میں ہندوستانی بہت مقبول ہیں) اور پھر انھیں چھوڑ کر، بعض دفعہ بچوں کو چھوڑ کر گھر چلے جاتے ہیں۔ یا سویڈن میں رہ جانے پر اصرار کرتے ہیں۔ جب کہ ضرورت ہے کہ وہ اپنے ملک میں جاکر کام کریں۔ خواہ ان کو تنخواہ کم ملے۔ (لیکن افسوس ہے کہ یہ باتیں اب بھی غیر ہمیں بتائیں)....... (تھیکر کو لکھنا چاہیے)۔

یہاں کے معلموں سے گفتگو جاری ہے لیکن زیادہ حاصل نہیں ہوا۔ ایک دو شخص مثلاً تعلیمِ بالغان کے MR. STAPRE کو میں نے باخبر پایا لیکن دوسرے لوگ زیادہ واقف کار نہ تھے۔ شاہی بورڈ آف ایجوکیشن کے صدر اور بعض ممبروں سے گفتگو ہوئی۔ صدر تو عام باتیں کرتے رہے اور دوسرے ممبر ذرا نوجوان اور نروس اور "مرعوب" معلوم ہوتے تھے۔ لہٰذا میں ہی ان سے گفتگو کرتا رہا۔ اور وہ ہاں میں ہاں ملاتے رہے! ایک انٹرنیشنل ورک کیمپ جاکر دیکھا جس میں کوئی پندرہ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں (پانچ چھ مختلف ملکوں سے) ایک اسکول کے احاطے میں زمین صاف کرنے، درخت کاٹنے، نالیاں بنانے کا کام کر رہے تھے تاکہ اس اسکول میں (خود ذہنی طور پر پچھڑے ہوئے بچوں کے لیے ہے) بچوں کے لیے زیادہ کھیلنے کی جگہ کا انتظام ہو سکے۔ بین الاقوامی مفاہمت کے اعتبار سے تجربہ مفید ہے۔ لیکن کام محدود ہے..... ایک میونسپل پرائمری اسکول دیکھا۔ جس میں کُل چھ جماعتیں ہیں اور کوپن ہگن وغیرہ کے مدرسوں کی طرح اس کی عمارت بھی مستقبل کا ایک حسین خواب ہے ہمارے لیے! اس پر ۴۰ لاکھ روپیے کے قریب لاگت آئی ہے۔ اور بچوں کی ذہنی اور جمالی تربیت کے لیے اس سے زیادہ سازگار مادی ماحول ذہن میں نہیں آسکتا۔ یہ کہنا میرے لیے مشکل ہے کہ ظرف میں مظروف بھی شایانِ شان ہے یا نہیں۔ ایک کمزوری البتہ ان ملکوں کی تعلیم اور فکر میں یہ محسوس ہوتی ہے کہ ان کا خیال ہے کہ جو کچھ کرنا تھا وہ زیادہ تر کر چکے۔ اب محض اس ترقی کو قائم رکھنا ہے۔ سوشل ویلفیر اسٹیٹ کا کام ہے، کہ وہ لوگوں کی دیکھ بھال کرے اور کرتی ہے۔ اب یہ افراد کا کام نہیں۔ چناں چہ لوگ ٹھیر کر راہ چلتوں کو "لفٹ" نہیں دیتے۔ موٹر رُک جائے

تو مدد نہیں کرتے۔ (میں نے چند ایسی مثالیں دیکھیں۔ لہٰذا میں انھیں زیادہ GENERALIZATION کرنا ٹھیک نہیں سمجھتا)۔

۹؍اگست

آج اسٹاک ہوم سے باہر ایک صاحب سے ملنے گیا۔ جن کا نام SOUNTAG ہے۔ کوئی گھنٹہ بھر سے کچھ زیادہ ریل کا سفر اور پھر دس میل موٹر۔ پرائم منسٹر کے COUNTRY HOUSE کے برابر میں رہتے ہیں۔ WORK CAMP کی مقامی تحریک کے بانی اور خاصے باخبر اور حساس آدمی ہیں۔ ہٹلر کے زمانے میں جرمنی سے بھاگ کر ناروے میں پناہ لی اور جب ہٹلر کا سایہ طویل ہوتا ہوا اس ملک پر بھی چھا گیا تو سویڈن میں آکر بس گئے۔ چار بچے ہیں اور ایک بیوی (دو کیسے ہوتیں؟) دونوں خصوصاً ان کی بیوی بہت تپاک سے ملیں۔ "اللہ کی بندیوں" کی سی صورت کے نیچے بہت پُرخلوص اور تپاک بھرا دل ہے۔ زون ٹاگ سے کافی دل چسپ اور فکر انگیز گفتگو رہی۔ یہاں ان کو ذرا زیادہ آئیڈیلسٹ سمجھا جاتا ہے۔ لیکن میں نے انھیں بہت سفید پایا اپنے مقصد کے لیے.......

کل رات مادام مرڈال (ہندوستان میں سفیر سویڈن) اپنے ساتھ لے گئیں۔ اپنا "نیا" فلیٹ دکھایا جو ایک پندرھویں صدی کے مکان کو (جو پُرانے شہر میں واقع ہے) بلکہ اس کی دو منزلوں کو اندر سے ادل بدل کرکے بنایا ہے۔ جدید و قدیم کا دل چسپ جوڑ ہے۔ ابھی تعمیر تھوڑی سی جاری ہے۔ اور فرنیچر وغیرہ بھی لگایا جارہا ہے۔ خوش مذاق خاتون ہیں۔ یقیناً ہندوستان کے سفارت خانے کی طرح اسے بھی خوبصورت بنالیں گی۔ اس کے بعد ایک خاص ریسٹورینٹ میں لے گئیں۔ جو GOLDEN PRAM کہلاتا ہے۔ ایک کئی سو سال پُرانے تہہ خانے میں واقع ہے۔ دیواریں جیسے دھوئیں سے لپی ہوں۔ ہر چیز اب سے پانچ سو برس پہلے کی یاد دلاتی ہے۔ آرٹسٹ، سائنس داں اور (افسوس) کاروباری لوگ اور سیّاح آتے ہیں اور خوشی خوشی اسی امتیازی مقام پر کھانا کھانے کے اعزاز میں گراں قیمتیں ادا کرتے ہیں۔ اس کے بعد اسٹاک ہوم کی تھوڑی سی سیر کرائی۔ اور آج رات کو MY FAIR LADY کا سویڈش ڈراما دکھانے کی دعوت

دی ہے..... پچھلے چند روز میں تنہائی کا احساس (خصوصاً شام کے وقت) اس قدر ستاتا ہے کہ ان دونوں HUMAN تجربوں کی وجہ سے کافی تسکین سی ہوئی. کل سویڈن کا قیام ختم ہو جائے گا اور ایک اور سنگِ میل گزر جائے گا. لیکن اتنا اطمینان ہے کہ ناروے کے بعد لندن میں زہرہ اور حامدہ کی وجہ سے تنہائی کا پُرخلش احساس کم ہو جائے گا.

ناروے۔ ۱۱راگست

کل شام یہاں (اوسلو) پہنچا. جہاز اسٹاک ہوم سے گھنٹہ بھر بعد روانہ ہوا. دونوں مقاموں کے وقت میں ایک گھنٹہ کا فرق ہے. اور ایرپورٹ شہر سے کوئی پچاس میل کے فاصلے پر واقع ہے. جس میں گھنٹے بھر سے زیادہ لگتا ہے. اس طرح اڑان میں تو صرف ایک گھنٹہ صرف ہوا لیکن ہوٹل سے ہوٹل تک چار گھنٹے سے زیادہ لگے. یعنی بقول نجاری مرحوم کے گھوڑا کم اور دم زیادہ! پہنچتے ہی معلوم ہوا کہ سفیرِ ہند نے (جو ایک مہارانا آف کچھ (گجرات) ہیں). ڈنر پر فوراً ہی بلایا ہے. ان کے ہاں بعض جنوبی امریکہ کے سفیروں وغیرہ کی دعوت تھی. اس کے ضمن میں انھوں نے یہ فرض بھی ادا کر دیا! موسکو سے ان کے عزیز مہاراجہ آف کوٹا مع اپنے خاندان کے براہِ موسکو اسی وقت پہنچے تھے. ان کے ہاتھ مسٹر مین (سفیرِ موسکو) کا خط ملا کہ اپنے پروگرام میں روس کو ضرور شامل کرو کہ اس کے بغیر تمہارا مطالعہ نامکمل رہے گا..... (ابھی تک ان لوگوں میں "یور ہائی نس" وغیرہ کا تبادلہ بڑے اہتمام سے ہوتا رہتا ہے!).

مجھے یہاں کے ایک بہت مہنگے ہوٹل (برسٹل ہوٹل) میں ٹھیرایا گیا ہے. جہاں زیادہ تر امریکی سیاح پائے جاتے ہیں.

۱۵راگست

آج کا دن زیادہ تر سیر میں گزرا. مسٹر اور مسز NYHAMMER کے ساتھ اوسلو کے بعض

خاص فیچرز کی سیر کی جن میں یہاں کا عالی شان ٹاؤن ہال" یہاں کے بہت مشہور سنگ تراش VIGLAND کے جدید مجسموں کی نمائش (جس کے لیے خود اس سنگ تراش نے ایک بہت بڑا پارک اور باغ DESIGN کیا ہے)' پرانے VIKING جہاز (جو ہزار سال سے زیادہ کی تاریخی یادگار ہیں اور اس زمانے کی جہاز رانی پر روشنی ڈالتے ہیں) اور KON-TIKI کی مشہور EXPEDITION (جو کچھ سال ہوئے مشہور سیاح HEYARDAHB نے ترتیب دی تھی) کی نمائش شامل ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کی بعض قابلِ ذکر خصوصیتیں ہیں۔ ان سب ملکوں میں ٹاؤن ہال کی عمارتیں بہت شاندار پیمانے پر بنائی گئی ہیں۔ اور ان میں جاکر معلوم ہوتا ہے کہ گویا کسی بہت اچھے پارلیمنٹ ہاؤس میں آگئے۔

اوسلون کے ٹاؤن ہال میں ہر جگہ بڑی بڑی تصویریں ہیں (دیواروں پر یا CARPETING پر بنی ہوئی) جس میں اس کی تاریخ کے مناظر، شہر اور گاؤں کی زندگی کے مرقع اور عوام کی بے چارگی کے زمانے سے لے کر سوشل ویلفیر اسٹیٹ بننے تک کی منزلیں دکھائی گئی ہیں۔ VIGLAND کے تقریباً سینکڑوں، مجسمے ہیں۔ جو بچپن سے لے کر بڑھاپے تک کے مختلف دوروں کو جدید انداز میں پیش کرتے ہیں۔ مجسمے سب عریاں ہیں۔ لیکن ان میں بچوں کی اہمیت کو خاص طور پر نمایاں کیا گیا ہے۔ یہ شخص ضرور صاحبِ کمال ہوگا کیوں کہ اس نے علاوہ مجسموں کے سارا پارک فوارے، دروازوں کی جالیاں وغیرہ سب خود ڈزائن کی ہیں۔ باغ FORMAL انداز کا ہے۔ لیکن پس منظر وغیرہ بہت حسین ہے KON-TIKI کی سیاحت کی نمائش میں وہ جہاز دکھایا گیا ہے۔ جس میں HEYARDAHB نے اپنے اس نظریہ کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ قدیم زمانے میں۔ بہت ہی PRIMITIVE قسم کے جہاز سے پیرو PERU سے لے کر POLYNASION ISLANI تک جانا ممکن تھا اور ان دونوں مقاموں میں جن کے درمیان پورا بحرالکاہل حائل ہے۔ اور جن کا فاصلہ کوئی چار مہینے میں طے ہوا جو مشترک چیزیں اور مشابہت پائی جاتی ہے وہ اتفاقی نہیں بلکہ باہمی روابط اور آمد و رفت کا ثبوت ہے۔ یہ جہاز بالکل اسی قسم کا ہے۔ جیسا اس زمانے میں استعمال ہوتا تھا بس لکڑی، رسیاں اور ٹاٹ!

۲۶راگست۔ نیویارک

کل شام لندن سے نیویارک کے لیے روانہ ہوا۔ ہوائی اڈے پر زہرا، حامدہ، یعقوب، شوکت اور جنانکر رخصت کرنے کے لیے آئے تھے۔ (معلوم نہیں ہمیں اس قسم کی جزوی تفصیلات یادداشت میں لکھنے سے کیوں دل چسپی ہوتی ہے۔ لیکن یہ واقع ہے کہ کچھ مدت کے بعد اس سے پرانی یادیں تازہ ہوجاتی ہیں)۔ میں P.A کے بوئنگ BOEING جہاز سے سفر کر رہا ہوں۔ جو تیس سے پینتیس ہزار فٹ کی بلندی پر اُڑتا ہے اور شاید پانچ سو میل فی گھنٹہ کی رفتار ہے۔ کپتان نے بتایا کہ اس کی رفتار سورج کی رفتار سے دو تہائی ہے (یعنی؟) اور اسی کی وجہ سے جوں جوں ہم مغرب کی طرف اُڑیں گے دن لمبا ہوتا جائے گا۔ چناں چہ لندن میں صبح کے پانچ بجے کے لگ بھگ سورج نکلا ہوگا اور لندن کے وقت کے مطابق رات کے ایک بجے کے قریب غروب ہوا! ہم شام کے ۶½ بجے (لندن ٹائم) چل کر نیویارک کے ۹ بجے نیویارک پہنچ گئے۔ بادی النظر میں ۲½ گھنٹے دراصل کوئی ۸ گھنٹے کی اُڑان ہے۔ واقعاً زمین کی طنابیں کھنچ گئی ہیں۔ سوچتا ہوں کہ جب اُڑان کی رفتار سورج کے برابر ہو جائے گی (یعنی؟) تو شاید جس وقت لندن سے چلیں گے ٹھیک اسی وقت نیویارک پہنچ جائیں گے! خدا کی قدرت اور انسان کے دماغ سے کیا بعید ہے؟ لیکن سائنس کے ان تمام کرشموں کا ماحصل کیا ہے؟ کیا مکان و زماں کے تسخیر سے انسانی زندگی کی گتھیاں سلجھ جائیں گی کیا سائنس H.G.WELLS کے خیال کے مطابق انسان کی زندگی کو اطمینان اور فراغت سے بھر دے گی یا ہکسلے کی BRAVE NEW WORLD کی پیشین گوئی کے مطابق اس کو دوزخ کا نمونہ بنادے گی؟ اور اگر ان نئی فضاؤں کو جو انجانی دنیاؤں کا پتہ دیتی ہیں انسان کے خلاق، دماغ نے بھی طے کرلیا اور اس ریسرچ پر اربوں لگادیے تو یہ انسانی فلاح کی ضمانت ہوگی یا انسانی وسائل کو غیر اہم (یا کم سے کم انسان کی فوری ضرورتوں سے ہٹے ہوئے) مقصدوں کے لیے استعمال کرے گی!۔ لیکن جب اس قسم کے خیال ذہن میں گھوم رہے تھے تو میں نے جہاز میں سے مقامی ساڑھے

آٹھ بجے کے قریب دیکھا۔ (جب میری گھڑی میں ۱/۲ ۱ بجے صبح کا وقت تھا!) کہ تیس ہزار فٹ نیچے آدھا منظر تو سفید بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا اور آدھا ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے پگھلے ہوئے چاندی اور سونے کا ایک زبردست دریا بہہ رہا ہو اور اس میں وہ خاص مقام جہاں سورج ڈوبا تھا سُرخی کی شدت کی وجہ سے صاف نظر آرہا تھا، جیسے سورج نے ابھی ڈبکی لگائی ہے اور اُوپر چاند ہلال کی شکل میں خوب روشن تھا! یہ آرٹ اور سائنس کے تجربے کا شاید ایک اہم فرق ہے کہ سائنس کے بارے میں انسان بہت سے سوال اُٹھاتا ہے۔ انسانی زندگی پر اس کے اثر کے متعلق غور و فکر کرتا ہے۔ اس کے حسن و قبح پر نظر ڈالتا ہے۔ لیکن اگر کوئی جمالیاتی تجربہ براہِ راست حاصل ہو (جیسا کہ غروبِ آفتاب کا یہ منظر۔ جس کو نگاہِ تخیل کے سامنے لانے کے لیے مجھ سے کہیں زیادہ بہتر قلم یا کسی مصوّر کے موئے قلم کی ضرورت ہے) تو اس سے ایک فوری مسرّت اور ENRICHMENT کا احساس ہوتا ہے۔

باہر تو قدرت یہ حُسن بکھیر رہی تھی اور اندر لوگ کھانا کھا رہے تھے۔ سروس کوئی سات بجے کے قریب شروع ہوئی اور تقریباً ساڑھے نو بجے تک چلتی رہی! گویا زندگی کا ایک اہم مقصد بہت پرتکلف کھانا ہے۔ اور اس شان سے کہ گھنٹوں اس کی نذر ہو جائیں اور جتنا کچھ لوگوں کے سامنے بچ جائے اس کو اُٹھا کر پھینک دیا جائے، بغیر یہ سوچے ہوئے کہ دنیا میں کتنے لوگ ہیں جو عمر بھر بھوکے رہتے ہیں!...... ہوائی اڈے پر ڈاکٹر میکنزی وائس قونصل شہاب الدین اور مسز لڈوگ نے سواگت کیا..... میں نے وقت گزاری کے لیے کچھ اپنے نوٹ لکھے۔ اور اس کے بعد بنی (عارف) فنی (آصف) اور ہنی (سیما) کو ایک مشترک خط لکھا اور معلوم نہیں موڈ اور قلم کس طرف چل پڑا کہ اس کو ALICE IN WONDERLAND کے انداز میں لکھا۔ اندازہ نہیں کہ کس حد تک کامیابی ہوئی۔ اس قسم کی چیزیں بلکہ سنجیدہ مضامین وغیرہ لکھنے میں بھی، میری عادت اور طبیعت یہ ہے کہ اکثر اس کا پورا واضح خاکہ میرے سامنے نہیں ہوتا۔ (جیسے مثلاً عابد صاحب بناتے ہیں) بلکہ پہلے جملے سے دوسرا اور دوسرے سے تیسرا اور ایک خیال سے دوسرا خیال نکلتا آتا ہے۔ اس سے شاید روانی اور بے ساختگی تو پیدا ہوتی ہوگی۔ لیکن اس کی کمزوری یہ ہے کہ ربط اور نظم اتفاقی چیز ہو جاتی ہے.....

آج ۲۶؍کو اپنے پروگرام کے بارے میں INSTITUTE OF INTERNATIONAL EDUCATION سے مفصّل گفتگو کی۔ وارڈ سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے اتوار کا دن گزارنے کے لیے مدعو کیا ہے اور رات کو یہاں کے کونسل جنرل (مسٹر رائے) کے ہاں کھانا کھایا جن کی بیوی آغا لطیفی کی بھتیجی اور آصف فیضی وغیرہ کی قریبی عزیز ہیں۔ دونوں (اور ان کی ایک بھتیجی) بہت تپاک سے ملے اور بہت دیر تک مختلف چیزوں (لیکن زیادہ تر مولانا آزاد) کے بارے میں گفتگو ہوتی رہی۔ "ذکر اس پری وش کا"..... اگر سننے والے دل چسپی لیں تو گفتگو میں جان پڑ جاتی ہے۔

۲۷؍اگست

آج دن میں وراثت قدوائی ملنے آئے اور کھانے کے لیے اپنے ساتھ لے گئے۔ جہاں مسز قدوائی اور لڑکیوں سے ملاقات ہوئی۔ بہت تپاک سے ملیں اور سب کو بہت بہت پوچھتی رہیں۔ انسان خود کو حالات کے مطابق کس قدر ڈھال لیتا ہے۔ امریکہ کی زندگی میں بھی (انگلستان کی طرح) تقریباً سب لوگوں کو اپنے بیشتر کام خود اپنے ہاتھ سے کرنے پڑتے ہیں۔ بعض مجبوراً ایسا کرتے ہیں، بعض خوشی اور دل چسپی کے ساتھ۔ لیکن ہاتھ کا کام مزدوری پر کرانا اس قدر گراں ہے کہ بہت کم لوگ ایسا کرا سکتے ہیں۔ چنانچہ کھانا پکانا، مکان صاف کرانا، خریداری، گھر کی آرائش، چھوٹی موٹی مرمت سب "بیگم اودھ" بھی خود ہی کرتی ہیں۔ حالاں کہ اودھ کی روایات جن میں انھوں نے تربیت پائی ہوگی اس سے بالکل جدا ہیں۔ ساتھ ہی ملنے جلنے سے سامان کی خرید اور فراہمی وغیرہ کا سلیقہ بھی آجاتا ہے۔ جو ہندوستانی کسی دوسرے ملک میں اچھے خاصے عہدوں پر، بلکہ معمولی جگہ بھی کام کرتے ہیں۔ وہ اکثر اس قسم کی چیزیں خریدنے کی استطاعت رکھتے ہیں۔ جو ہندوستان میں زیادہ خوش حال لوگ بھی نہیں خرید پاتے ..... قدوائی صاحب کے ذریعہ یکم ستمبر سے ایک اپارٹمنٹ کا انتظام ہوگیا ہے۔ جو اس قدر اچھے حصّے میں تو واقع نہیں لیکن اس کے ساتھ ایک مختصر سا کچن ہے جس میں چاء وغیرہ بنا سکتے ہیں۔

شام کو گل پیٹرک GILPATRIC نے اپنے گھر بلایا تھا۔ ان کی بیوی تو کہیں باہر گئی ہوئی ہیں

لیکن چھوٹی بچی ملی تھی جو ایک حد تک میزبان کے فرائض انجام دیتی رہی...... میری جب کبھی اس شخص سے ملاقات ہوئی ہے۔ اس کی وسیع معلومات اور ذہن بیداری پر خوشی اور تعجب ہوتا ہے۔ راک فیلر فونڈیشن کے "انسانیت" کے شعبہ کا یہ اسسٹنٹ ڈائرکٹر ہے۔ اور اس کے سلسلے میں بہت غور و فکر کے ساتھ مناسب منصوبے تیار کرتا ہے۔ فونڈیشن نے اٹلی میں جھیل کومو COMO کے کنارے ایک بہت عالی شان ESTATE حاصل کی ہے۔ جو کسی امریکن خاتون نے فونڈیشن کو نذر کر دی ہے۔ اس میں ایک مختصر بین الاقوامی کانفرنس ان لوگوں کی مرتب کی تھی۔ جو تبّت کی کلچر اور علوم میں خاص نظر رکھتے ہیں مقصد میں سیاسیات کی آمیزش ضرور ہے۔ لیکن سارا منصوبہ ذہانت اور تخیل کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے۔ ہر ملک سے بہترین TIBETOLOGISTS اور بعض تبت کے عالموں اور فن کاروں کو جمع کر کے علوم تبّت میں مزید ریسرچ کا پروگرام بنایا گیا ہے۔ اس طرح ایک مختصر کانفرنس اٹومک انرجی کے پُرامن استعمال کی ترقی کے لیے ہونے والی ہے۔ ایک تیسری کانفرنس جو ان کے ذہن میں ہے وہ مغل تاریخ کے بارے میں ہوگی۔ جو دنیا کی تاریخ کا ایک بہت اہم اور مالا مال دور ہے۔ لیکن (بقول اس کے) ابھی تک اس کے مؤرّخوں نے GREAT WRITING بلکہ اس کے پورے مفہوم کو سمجھنے کا ثبوت بھی نہیں دیا... اس جگہ کا خاص استعمال ہوگا کہ اگر کوئی بڑے مصنّف یا آرٹسٹ یا سائنس داں اپنے کسی کام کی تکمیل ایک بہت خوبصورت، پُرامن اور پُرسکون ماحول میں کرنا چاہیں تو وہاں آکر اطمینان کے ساتھ ایسا کر سکیں۔ کسی ملک یا قوم کی قید نہ ہوگی۔ کھانے پر بہت سے مباحث پر گفتگو رہی۔ اور نیویارک کی عمارتوں وغیرہ کو زیادہ خوبصورت بنانے اور وہاں پھولوں کو عام کرنے کے سلسلے میں جو مختلف منصوبے اور تجویزیں ہو رہی ہیں اس کا گلیٹرک نے ذکر کیا۔ کہتا تھا کہ ہندوستان میں کبھی کسی کو یہ خیال کیوں نہیں آیا ہندوستانی "نالی" کے بارے میں، کہ اس کی تہذیب کا ایک اہم عنصر رہا ہے کوئی کتاب یا رسالہ لکھے!

اگلا دن اتوار کا تھا۔ اس روز دوپہر کے بعد WARD نے اپنے گھر آنے کی دعوت دی اور رات کو وہیں ٹھیرایا۔ یہ نیویارک سے ایک گھنٹے کے فاصلے پر رہتے ہیں۔ یہ مکان انھوں نے حال ہی میں خریدا ہے اور یہاں بھی وہی رنگ ہے کہ میاں، بیوی اور دو لڑکے مل کر

(جو تعطیل میں آئے ہوئے تھے) سارا کام مع باغ کی صفائی کے خود کرتے ہیں۔ گھر ایک چھوٹے سے قصبے میں واقع ہے جس کا نام RIVEREIDE ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جنگل کے بیچ میں نیو یارک کی شورش سے سینکڑوں میل دُور یہ لوگ رہتے ہیں۔ آنے جانے میں صبح شام دو گھنٹے ضرور صرف ہوتے ہیں" لیکن بہر حال صبح کے اخبار کو پڑھنے کا وقت تو نکلنا ہی ہوتا ہے۔" انھوں نے گرد و پیش کی سیر کرائی اور قریب کے ایک قصبے اسٹیفورڈ کا ایک مشہور گرجا دکھایا جو ابتدا میں سولھویں صدی میں بنا تھا لیکن حال میں اس مقام پر اور پُرانے گرجا کی چند باقی چیزوں کو استعمال کر کے ایک بہت ہی جدید انداز کی انوکھی عمارت بنائی گئی ہے۔ جس کی دیواریں اُوپر کو TOPER ہوتی ہوئی چھت بن جاتی ہیں اور اس میں کوئی لوہے کی GUIDER یا ستون نہیں ہیں۔ دیواریں محض سمینٹ کے مختلف شکل کے چوکھٹوں میں اٹلی کے بنے ہوئے پُرانے وضع کے رنگ برنگ کے موٹے شیشوں کے لاکھوں ٹکڑوں کی بنی ہوئی ہیں۔ ایک خاتون نے جو اس کا حال سمجھا رہی تھیں بتایا کہ ان دیواروں کے مختلف حصّوں میں جو PATTERNS بنے تھے ان میں سے ہر ایک کی ایک خاص علامتی اہمیت ہے جس سے عیسوی مذہب کے مختلف اُصولوں اور تاریخی واقعات کی تصویر مرتب ہوتی ہے۔ یہ سب تو میں اچھی طرح نہیں سمجھا لیکن اس میں شک نہیں کہ مذہبی عقیدت نے دنیا میں علاوہ اور چیزوں کے آرٹ کے بڑے بڑے شاہکار تیار کرائے ہیں اور جیسا کہ روم میں اندازہ ہوا تھا مغربی تہذیب میں مذہب اور آرٹ کا ایک خاص تعلق رہا ہے۔ یہ گرجا "میتھوڈسٹ" فرقے کا ہے۔۔۔۔ ایک دل چسپ فقرہ یہ ہوا کہ یہ ساری کہانی سنانے کے بعد' اور بہت احترام کے ساتھ' ان خاتون نے فرمایا کہ اس کی تعمیر میں ڈیڑھ ملین ڈالر (کوئی ستر پچھتر لاکھ روپیے) صرف ہوئے ہیں۔ AND WE HAVE GOT PLENTY CHENEL FOR THIS AMOUNT ایسے قائل کا کیا کرے کوئی!

نیو یارک کے قیام کے دوران میں بہت سے لوگوں سے ملاقات ہوئی اور مجوزہ اسکیم کے بارے میں دل چسپ بحث اور گفتگو رہی۔ بعض لوگوں سے فرداً فرداً بات چیت ہوئی اور بعض سے مجموعی طور پر۔ اس میں ٹیچرز کالج کے پروفیسروں کا ایک گروپ تھا جس کو ڈاکٹر

میکنزی نے لنچ پر جمع کیا تھا۔ (میکنزی حسب معمول بہت خاطر سے پیش آرہے ہیں۔ انھوں نے ایک WEEK END اپنے گھر بلا کر رکھا اور وقت خوش گوار طریقے پر بسر ہوا ورنہ ہوٹل کی تنہائی کھلتی) ایک گروپ فورڈ فونڈیشن کے متعلقہ اسٹاف کا اور ایک راک فیلر فونڈیشن کا ان کی اور عام طور پر دوسرے لوگوں کی رائے بھی یہ ہے کہ اس کام کو (کم سے کم ابتدا میں) جبری نہیں بنانا چاہیے اور آہستہ آہستہ جوں جوں تجربہ حاصل ہو اور اچھے لیڈر مہیا ہوں اسے پھیلانا مناسب ہوگا۔ اس بات پر بھی سب کا زور ہے کہ منصوبے ایسے ہونے چاہئیں جو در اصل نوجوانوں کی ہمت اور قوتِ عمل اور جوش کو اکسائیں۔ انھیں یہ محسوس نہ ہو کہ وقت گزاری کر رہے ہیں۔ مگر خیر یہ سب باتیں تو میری رپورٹ میں درج ہوں گی۔ انھیں اس ڈائری کا بارکیوں بناؤں! اس میں تو در اصل عام دل چسپی کی باتیں درج کرنی چاہئیں۔ لیکن بعض دفعہ "مفید اور ضروری" معلومات اور اس قسم کی باتوں میں بھی سخن گستری ہونے لگتی ہے۔ اس عرصے میں جن لوگوں سے اس کام کے سلسلے میں ملاقات ہوئی۔ ان میں ایک صاحب مارک MACCLONESKEY مجھے پسند آئے۔ یہ نیویارک یوتھ کمیشن کے صدر تھے اور جس روز میں ان سے ملا وہ ان کا RETIREMENT کا دن تھا "میرے پاس وقت ہی وقت ہے۔ جب تک دل چاہے بیٹھو اور باتیں کرو"۔ عمر ستر سال ہے۔ ذہنی اور جسمانی لحاظ سے تندرست اور کافی ACTIVE ہیں اور خیال اور اظہار کے طریقے میں ایک خاص قوت اور جدت پائی جاتی ہے۔ عام اندازِ خیال کے ساتھ بہنا پسند نہیں کرتے، نہ بنے بنائے جملوں کو ٹیکسیوں کی طرح استعمال کرتے ہیں۔ جن کے بھروسے عام طور پر لوگ گفتگو کی گاڑی چلاتے ہیں۔ (اسی زمانے میں ایک اور کافی نامور تعلیمی ماہر اور لیڈر سے ملاقات ہوئی جو اس دوسرے انداز کی گفتگو اور اس قسم کے خیالات کا اظہار کرتے ہیں!)۔ سناتے تھے کہ ایک دفعہ وہ کسی اچھے خاصے مشہور کلب میں تقریر کرنے گئے۔ جلسہ شروع ہونے کو تھا کہ صدر نے پوچھا دفعتاً بغیر کسی اشتعال کے DID YOU EVER HAVE BREAKFAST WITH GANDHI انھوں نے سر ہلایا کہ نہیں انھوں نے دوبارہ دریافت کیا انھوں نے متعجب ہو کر جواب دیا کہ عرض تو کر چکا ہوں کہ نہیں۔ آخر یہ سوال کیوں؟ کہنے لگے بعد میں بتاؤں گا۔ جلسے کے بعد کہا کہ بات یہ ہے کہ گزشتہ دو بالکل مختلف قسم کے مقرر

جو اس کلب میں تقریر کرنے کے لیے مدعو کیے گئے تھے۔ ان دونوں کا موضوع تھا "گاندھی کے ساتھ میرا ناشتہ" میں ڈر رہا تھا کہ کہیں تمہارا بھی یہی موضوع نہ ہو اور اس طرح HAT TRICK ہو جائے!..... امریکہ میں جو صدر کے انتخاب کی مہم جاری ہے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہنے لگے کہ ان لوگوں میں نہ کوئی خاص انفرادیت ہے نہ جدت ہے یہ تو مڈیسن اوینیو MADISON AVENUE کے بنے ہوئے اور صاف ستھرے کاغذ میں پارٹی کے PACK کیے ہوئے صدر ہیں (یعنی یہ دوسروں کی تیار کی ہوئی تقریریں کرتے ہیں اور دوسروں کے بتائے ہوئے خیالات اور پروگرام بیان کرتے ہیں) گویا ORGANIZATION MAN کی تفسیر ہیں۔ انھوں نے ہماری اسکیم پر گفتگو کرتے ہوئے یہ بھی کہا کہ اس قسم کے بڑے بڑے منصوبے چلانے میں جب بہت سے لوگوں اور جماعتوں اور محکموں وغیرہ کو شریک کیا جاتا ہے تو کام میں بجائے سہولت کے بعض دفعہ اور زیادہ رخنے پڑتے ہیں۔ فیصلہ کرنے کا فرض تو جس قدر کم لوگوں کے ہاتھ میں ہو اچھا ہے۔ انھوں نے اس فارمولے کو یوں بیان کیا۔

POWER APPLIED —— LARGE NO. OF INTERMADICERIES ART AS
RESISTANCE .... PRODUCT DELAYED OR OF INDEFFERENT QUALITY

اس تبصرے میں خاصی صداقت ہے اور ہماری حکومت کے طریقے کار میں تو اکثر ایسا ہوتا ہے۔

عادت کسی قدر تیزی کے ساتھ انسان پر قبضہ جمالیتی ہے! میرے کمرے میں ٹیلی وژن لگا ہے۔ رات کو تنہائی سے گھبرا کر کبھی کبھی اس کو چلاتا ہوں اور چوں کہ اس میں دیر تک فلم بھی دکھائے جاتے ہیں اور گاہے گاہے دوسرے اچھے پروگرام بھی ہوتے ہیں۔ اس لیے کئی دفعہ ایسا ہوا کہ ارادے کے خلاف بہت دیر تک سویا۔ اس میں ایک فلم دیکھا جس کا نام تھا غالباً GENERAL CUTZER جو شمال اور جنوب کی ریاستوں کی سول جنگ کے بارے میں ہے یہ کٹزر ایک بہت مشہور امریکی جنرل تھا اس زمانے کا، جس نے سارے قواعد کو توڑ کر اور بعض دفعہ اپنے سے اونچے عہدے داروں کے حکم کے خلاف اپنی رائے کے مطابق جنگ لڑی اور ہر دفعہ اس میں کامیابی حاصل کی۔ (اس کے بعد دو باتوں میں سے ایک ہی ہو سکتی تھی، تمہارا کورٹ

مارشل کیا جائے یا تمہارا عہدہ بڑھا کر تمھیں اعلاترین تمغہ دیا جائے. حکومت نے دوسرا طریقہ عمل اختیار کیا ہے"!) لیکن اصل بات قابلِ ذکر یہ ہے کہ اس نے امریکن ہندوستانیوں INDIANS کے لیڈر سے یہ سمجھوتا کیا تھا کہ وہ اس سے صلح کرلیں تو ان کے حقوق اور ملکیت کا احترام کیا جائے گا لیکن بعض بد دیانت امریکی سیاست دانوں نے سونا حاصل کرنے کے لالچ میں اس معاہدہ کی خلاف ورزی کی۔ اور باوجود جنرل کسٹر کے بیان کے کون کون با اثر سیاست داں اور کاروباری بددیانتی کرنے والے ان INDIANS کے ملک پر قبضہ کرنے کی اسکیم بنا رہے ہیں، ہائی کورٹ نے ان کو روکنے کی کوشش نہیں کی اور کہا کہ تم نے جو بیان دیا ہے وہ چشم دید شہادت نہیں بلکہ سنی ہوئی باتیں بیان کی ہیں کہ میں نے فلاں فلاں کو آپس میں یہ سازش کرتے ہوئے سنا۔ اس قسم کا بیان صرف اسی وقت باور کیا جاسکتا ہے۔ جب وہ کسی کا DYING DECLARATION ہو۔ چناں چہ جنرل کسٹر نے کوشش کر کے ایسی صورتِ حال پیدا کی کہ وہ اس جنگ میں شریک ہو کر عمداً مارا گیا اور اپنے سابق بیان کو بطور ایک DYING DECLARATION کے چھوڑ گیا! یہ ہے حقیقی جرأت اگر یہ کہانی ٹھیک ہو..... لیکن میں دراصل یہ بتا رہا تھا کہ ٹیلی ویژن کی عادت کس قدر جلد پڑجاتی ہے ۔ قدوائی صاحب کے ہاں معلوم ہوا کہ ان کی بیوی کبھی کبھی ٹیلی ویژن کے "لیٹ لیٹ شو" کو رات کے تین بجے تک دیکھتی ہیں۔ اس سے بھی دل چسپ اور تعلیمی لحاظ سے قابلِ عبرت بات یہ ہے کہ ان کی بچّی ٹونی مکّہ بازی کے فلم دیکھتی ہے۔ ان میں شریک ہونے والوں کی حیوانی اور خونی جنگ کو دیکھ کر اس پر سخت نفرت اور کوفت کی کیفیت طاری ہوتی ہے۔ اپنی آنکھوں کو بار بار بند کرتی ہے۔ لیکن جب میں نے کہا کہ اس خاص CHANNEL کو بند کر کے اور کچھ پروگرام دیکھو لیکن وہ اس پر راضی نہیں ہوئی!۔

ہمارے ہاں کے برخلاف یہاں بھی انگلستان کی طرح ہاتھ کا کام کرنے میں کسی کو عار نہیں۔ بڑے، بچے، مرد، عورتیں سب ہر طرح کا کام حسبِ ضرورت کرنے کو تیار رہیں اعلا تعلیم پر بہت خرچ ہوتا ہے اس لیے تقریباً سب طلبا ہی کچھ نہ کچھ کام کر کے ایک حصّہ خرچ کا خود اُٹھاتے ہیں۔ اور جن طلبا کے والدین آسانی سے خرچ اُٹھا سکتے ہیں وہ بھی اکثر

اس پر راضی نہیں ہوتے بلکہ اخبار بیچ کر، پڑوسیوں کے گھر کے سامنے سے برف صاف کرکے، برتن مانجھ کر ڈالر کماتے ہیں۔ اور کبھی کبھی تو اتنا بچا لیتے ہیں کہ ہائی اسکول سے نکلتے ہی موٹر خرید لیں! اپنے کام کے سلسلے میں سابق امریکن ایجوکیشنل کمشنر ڈاکٹر STUDEBAKER سے ملاقات ہوئی جو اپنے عہدے سے سبک دوش ہونے کے بعد ایک بہت بڑے پبلشنگ ہاؤس میں SCHOLESTIC MAGAZINE کے ایڈیٹر ہو گئے ہیں (یہ پبلشنگ ہاؤس اسکول کی مختلف جماعتوں کے لیے ایک درجن سے زیادہ تعلیمی رسالے اور سینکڑوں اسکول کی درسی کتابیں PAPER BACKS شائع کرتا ہے جس کی تیاری میں ماہرینِ تعلیم، کمپنی کے تنخواہ دار ملازم اور مشورتی حیثیت سے سینکڑوں استاد شامل ہیں جو اشاعت سے پہلے ان کتابوں کے مسودوں کو اپنے ہاں آزما کر دیکھتے ہیں اور پھر سالانہ کانفرنسوں میں ان کے بارے میں مشورہ دیتے ہیں)۔

انھوں نے بہ سبیلِ تذکرہ (بلکہ بغیر کسی عذر ہی کے!) بتایا کہ وہ کسی گاؤں میں ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوئے اور جب اسکول میں پڑھتے تھے تو اینٹیں ڈھونے کا کام کرکے فیس ادا کرتے تھے۔ پھر اس شخص کو جس کے ہاں کام کرتے تھے۔ ان میں دل چسپی پیدا ہو گئی تو اس نے راج کا کام انھیں سکھایا جس کو یہ کالج کے دورانِ تعلیم میں برابر کرتے رہے۔ سشن کے دوران میں بھی اور تعطیل میں بھی یہاں تک کہ انھوں نے اس میں باضابطہ پیشہ وری کا سرٹیفکیٹ حاصل کر لیا۔ جب کالج میں پروفیسر ہوئے اس وقت بھی تعطیل میں جا کر راج کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔ "جانتے ہو کیوں؟ علاوہ کام میں دل چسپی کے، لیکچرر کی تنخواہ سے زیادہ میں اس کام میں کما لیتا تھا۔ کام کی عزت میری ہڈیوں کے گودے میں پیوست ہے IT HAS BEEN LIVED IN THE MORROW OF MY BONES مجھ سے ایک مرتبہ کسی نے کہا کہ آخر سب لوگوں کو تعلیم دے کر کام کیسے چلے گا۔ سڑکوں پر جھاڑو کون دے گا اور اس کے لیے تعلیم کی کیا ضرورت ہے۔ میں نے جواب دیا کہ وہ اپنا کام کمر توڑنے والے طریقے سے کرنے کے بجائے بہتر آلات سے کرے گا۔ اور فرصت میں مجھ سے اور تم سے اہم سیاسی، سماجی اور تہذیبی معاملات پر گفتگو کرے گا۔ اس میں کیا برائی

ہے ..... لیکن ضروری یہ ہے کہ صرف کام کی عزت دل میں نہ ہو (یا اس کے ذریعہ روپیہ کمانے کی خواہش) بلکہ کام کرنے والوں کی عزت بھی ..... بعض دفعہ ہندوستانی طالبِ علم بھی، مالی حالات سے مجبور یا ماحول سے متاثر ہوکر ہر طرح کا کام کرتے ہیں۔ مثلاً جامعہ کے ایک اُستاد جن کو سب سے پہلے نیویارک پہنچ کر ایک جگہ سے دوسری جگہ پارسل ڈھوکر لے جانے کا کام ملا تھا جس سے پاؤں سوج گئے تھے اور اس کی وجہ سے انھیں اپنے پاؤں کے سائز سے زیادہ بڑے جوتے خریدنے پڑے۔ اتفاق سے ان دنوں ذاکر صاحب نیویارک آئے اور انھیں معلوم ہوا تو بہت خوش ہوئے اور خوشنودی کا اظہار کیا......

امریکہ کی عام EFFICIENCY کے بارے میں مجھے اور لوگوں کو مجموعی طور پر کافی خوش فہمی ہے۔ لیکن بعض دفعہ ایسے تجربے ہوتے ہیں کہ اس میں شک ہونے لگتا ہے مثلاً بعض دفتروں میں مَیں نے خاصی سہل انگاری دیکھی۔ خصوصاً مقررہ وقت سے باہر یا مقررہ مقدار سے زیادہ ہاتھ کا کام کرنے کے بارے میں مثلاً WEEK END پر کسی کام کا ہونا بہت مشکل ہے۔ چھٹی تو چھٹی ہے۔ اس میں کام کرنے کا کیا مطلب؟ اچھی ٹائپسٹ اور سکریٹری بہت مشکل سے ملتی ہیں۔ انسٹی ٹیوٹ کے ذریعہ دلیش مکھ کمیٹی رپورٹ کی مزید کاپیاں ٹائپ کرانی تھیں (یہ یوتھ نیشنل سروس کمیٹی کی رپورٹ ہے)۔ تین دن اسی بحث میں صرف ہوئے کہ ان پندرہ سولہ مضمون کا عکس لیا جائے یا انھیں چھپوایا جائے یا ٹائپ کرایا جائے اور کرے تو کون کرے۔ بیچ میں تین دن کی چھٹیاں تھیں۔ جو دفتر کے کام میں کیسے آتیں!

نہ معلوم امریکی قوم یہ بات کیوں محسوس نہیں کرتی کہ ایک دولت مند ملک کے لیے TIP کا عام دستور شایانِ شان نہیں؟۔ ہر شخص جو کسی سلسلے میں آپ کے لیے ہاتھ یا زبان بھی ہلائے۔ (مثلاً ٹیکسی کے لیے تالی بجائے) وہ TIP کی توقع کرتا ہے۔ اگر نہ ملے تو انداز یا بیان سے اظہارِ ناخوشی کرتا ہے۔ یہ مشرق کی "بخشش" کے لیے ہاتھ پھیلانے سے کس طرح مختلف ہے؟ فرق اتنا ہے کہ ہمارے ملکوں میں بہت غریب لوگ "بخشش" مانگتے ہیں۔ اور یہاں کا ویٹر بھی جو باہر کے اجنبی کے مقابلہ میں بعض دفعہ خوش حال ہوتا ہے۔ کبھی کبھی بھیک مانگنے والے بھی نظر پڑتے ہیں۔ ایک دفعہ ایک خوش پوش، تعلیم یافتہ نوجوان

نے ایک دل چسپ CONFIDENCE TRICK کے ذریعہ مجھ سے ۸۰ ڈالر حاصل کرنے کی کوشش کی۔ "میری کار خراب ہوگئی ہے اور ریل سے جانا ضروری ہے۔ مجھے یہ رقم دے دو۔ یہ میرا کارڈ ہے میں جاکر بھیج دوں گا" میں نے انھیں مشورہ دیاکہ وہ کار کسی گراج میں رکھاکر اس پر رقم قرض لیں اور جب میں نے ان سے پوچھاکہ کیا میں چہرے سے بہت زیادہ بے وقوف معلوم ہوتا ہوں۔ تو وہ روانہ ہوگئے! ایک اچھے ہوٹل میں جہاں میں ٹھیرا ہوا تھا میں نے ایک دفعہ جلدی میں ویٹر کو ایک ڈالر کے بجائے دس ڈالر دے دیے۔ یاد آیا تو میں نے اس سے واپس مانگے لیکن صاف انکار کر دیا (اور ثبوت میں وہ رجسٹر دکھایا جس میں ایک ڈالر وصول دکھایا تھا؟)۔ ویٹر اٹالین تھا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ وہ عام طور پر دیانت دار نہیں ہوتے۔

۴/ستمبر

آج صبح تو زیادہ وقت دیر میں اُٹھنے (رات کو دیر میں سویا تھا)، ناشتہ تیار کرنے اور کچھ کاغذات اور نوٹ مرتب کرنے میں گزارا اور دوپہر کے قریب ڈاکٹر میکنزی اپنے گھر لے آئے۔ یہ نیویارک سے باہر نیو جرسی میں (کوئی پندرہ بیس میل کے فاصلے پر) رہتے ہیں۔ اچھا صاف ستھرا وسیع اپنا ذاتی مکان ہے، شہر کے شور وشغب سے دور۔ ایک طرف یہ قصبہ جس میں مکان ایک دوسرے سے مؤدّب فاصلے پر ہیں اور دوسری طرف سرسبز جنگل۔ انھوں نے اور ان کی بیوی اور بیٹی نے بہت خلوص کے ساتھ ٹھیرایا اور رات کو ڈین اور مسز فشر کی (جو ہندوستان بھی جاچکے ہیں۔ اور ہمارے ہاں آئے تھے) میرے اعزاز میں دعوت کی۔ ان میں ہندوستان کے بارے میں چند INDIANGRAMS پڑھے جس سے وہاں کی بہت سی خبریں معلوم ہوئیں (چرچے یہی رہیں گے، افسوس ہم نہ ہوں گے!) اور بہت سے علمی اور سیاسی مسائل پر گفتگو ہوتی رہی۔ مجھے رہ رہ کر یہ خیال آتا ہے کہ (کم سے کم) جہاں تک اس تعلیمی حلقے کے لوگوں کا تعلق ہے کام کے دباؤ اور وقت کی تیزپائی کا احساس ان لوگوں میں اتنا نہیں جتنا ہمارے ہاں ہے۔ کام کرتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ فرصت اور RELAXATION کا لطف بھی اُٹھاتے ہیں۔ جینے کے سلیقہ کے بارے میں لکھتا اور تقریر کرتا رہا ہوں

لیکن غالباً یہ سلیقہ پایا نہیں۔ اس لیے کہ ہمیشہ سال بہ سال (اب تک کہ زندگی ختم ہونے آئی ہے) یہ کیفیت پیدا نہیں ہوسکی، نہ داخلی طور پر نہ خارجی طور پر۔ شاید عمر کے ایک حصے میں ایسا نہ ہونا ہی اچھا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن پھر ایک ایسی منزل آتی ہے جب کام کی کمی کی خواہش کے بغیر سکون اور امن کی کشش بیدار ہوتی ہے۔ جب آدمی اپنی مرضی کا کام، اپنی رفتار اور خواہش کے مطابق کرنا چاہتا ہے۔ لیکن حالات اور شاید طبیعت کے تقاضے ایسا نہیں کرنے دیتے...

یہاں ایک بہت مشہور سینما RADIO CITY ہے۔ جو راک فیلر پلازا کے وسط میں واقع ہے۔ ایک روز یہاں ایک فلم دیکھا جس کا نام ہے SONG WITHOUT END یہ جرمن کے مشہور COMPOSER، FRANK LESLY کی زندگی کی داستان ہے جس میں اس کی معاشقانہ زندگی کے ساتھ ساتھ اس کی میوزیکل GENIUS کا ارتقا دکھایا گیا ہے اور بہت سے اس کے اصل COMPRINTIONS بڑی خوبصورتی کے ساتھ فلم میں شامل کیے گئے ہیں۔ مجھے تو موسیقی میں کوئی نظر (یا کان؟) نہیں۔ نہ میں اس کی حسن شناسی کا دعویٰ کر سکتا ہوں۔ لیکن PIECES کو سُن کر یہ ضرور محسوس ہوا کہ اس کی ایک نہایت اثر آفریں اور نشاط انگیز دنیا ہے۔ جو ایک ماہرِ فن کی انگلیوں کی کنجی سے کھل جاتی ہے۔ یوں بھی اداکاری کے اعتبار سے DICK BOGEES اور فرانسیسی ماڈل LOPERCINE نے فلم میں اپنا پورا کمال دکھایا ہے۔

واشنگٹن

یہاں میرا قیام ایک ہفتے کے قریب رہا۔ سیفی صاحب نے (جو ہمارے سفارت خانے میں تعلیمی سکریٹری ہیں) اور ان کے شرکائے کار نے بہت تپاک سے سلوک کیا۔ اور قیام وغیرہ کا انتظام بھی معتدل تھا۔ سفیرِ ہند چھاگلہ صاحب سے ملاقات ہوئی لیکن بہت مختصر کیوں کہ وہ اسی روز میکسکو روانہ ہو گئے۔ لیکن دوسرے افسرانِ محکمہ نے پروگرام میں بھی مدد دی اور اپنے ہاں مدعو بھی کیا۔ یہاں آکر، کچھ حالات کے تقاضے سے، ہندوستانی افسروں میں خود اعتمادی کسی قدر زیادہ پیدا ہوجاتی ہے۔ ان کے علاوہ مسٹر روفنر RUFFENER نے (جو پہلے ہندوستان میں T.C.M. کے تعلیمی پروگرام کے ڈائرکٹر تھے اور اب صدر دفتر میں تمام تعلیمی پروگراموں کے انچارج ہیں)، یونسکو کے سابق ڈائرکٹر جنرل لیوتھر ایونس نے اور

ہمارے سابق تعلیمی افسر ڈاکٹر ہالڈر نے کھانے پر مدعو کیا جہاں بہت سے تعلیم کے کارکنوں سے ملاقات ہوئی اور مجوزہ اسکیم کے بارے میں تبادلۂ خیال ہوا، خصوصاً دفر کے ہاں کھانے پر مسٹر ہمفری سے ہندوستان اور امریکی تعلیم کے تقابل کے متعلق دل چسپ گفتگو رہی. ڈاکٹر ہالڈر اب VOICE OF AMERICA میں ہندوستانی پروگرام کے محکمہ میں ملازم ہو گئے ہیں۔ ان کی معرفت اس کے ڈائرکٹر کا پیغام ملا کہ وہ مجھے ریڈیو پر اس نیشنل سروس اسکیم کے بارے میں انٹرویو کرنا چاہتے ہیں. چناں چہ کوئی پندرہ منٹ تک انھوں نے اس ضمن میں انٹرویو کیا. جو بعد میں براڈ کاسٹ ہوگا میں نے اس میں بتایا کہ میں دنیا کا دورہ اس سلسلے میں کیوں کر رہا ہوں اور اس تجویز کا بنیادی تعلیمی مقصد کیا ہے.....

واشنگٹن .D.C میں شاید نصف سے زیادہ حبشی لوگوں کی آبادی ہے اور ہاتھ کا کام زیادہ تر وہی لوگ کرتے ہیں. ہوٹلوں اور دکانوں میں بھی انھیں کی تعداد زیادہ معلوم ہوتی ہے. سفید امریکی بہت سے واشنگٹن سے باہر مضافات میں رہتے ہیں. لیکن ان میں ایک یہ بات محسوس ہوتی ہے کہ اس علاقے میں جو انھیں آزادی اور ایک حد تک مساوات حاصل ہوتی ہے اس کو پُوری طرح ہضم کرنے میں انھیں وقت لگے گا اور یہ قدرتی بات ہے۔ ان میں ذرا SWANK کا مادّہ زیادہ معلوم ہوتا ہے. مثلاً دولت مند حبشی CADILLAC موٹر کی طرف دوڑتا ہے!

واشنگٹن میں امریکہ کی نیشنل ایجوکیشن ایسوسی ایشن .N.E.A کا صدر دفتر دیکھنے، اس کا مستعد اور مفید سکریٹری ڈاکٹر ولیم کار سے ملنے اور ان کے اور ان شرکائے کار کے ساتھ کھانا کھانے اور اسکیم پر بحث کرنے کا موقع ملا. ان لوگوں کی رائے بھی بحیثیت مجموعی اسکیم کو جبری طور کے بجائے اختیاری طور پر نافذ کرنا مناسب ہوگا..... کس قدر بڑا اور "دولت مند" دفتر ہے۔ اس ایسوسی ایشن کا، جس کی یہ نئی عمارت لاکھوں ڈالر میں تیار ہوئی ہے اور جس میں مختلف قسم کے کاموں اور تعلیمی منصوبوں کے لیے بہت سے الگ الگ محکمے ہیں. اس کے مقابلے میں ہماری .I.A.F.E.A کی عمارت اور دفتر اور کاموں کا پھیلاؤ بہت ہی محدود ہے. آخر ہمارے ہاں لوگ عزم کے ساتھ کام کیوں نہیں کرپاتے. امریکہ کی ایک چھوٹی سی ریاست ہے

پورٹو ریکو جو اس ملک کا سب سے زیادہ غریب حصّہ سمجھا جاتا ہے۔ ڈاکٹر کار نے مجھے بتایا کہ وہاں کی مقامی استادوں کی ایسوسی ایشن نے استادوں کے لیے جو اسپتال تعمیر کیا ہے اس پر ڈیڑھ کروڑ روپیے کی لاگت آئی ہے ! مانا کہ یہ ملک دولت مند ہے اور اس کے غریب حصّے بھی ہمارے مقابلہ میں زیادہ خوش حال ہیں لیکن یہ تمام رقم یا اس کا بیشتر حصّہ استادوں کے چندے سے آیا ہے جن کی تنخواہیں امریکہ میں بہت کم سمجھی جاتی ہیں....

۱۶، ستمبر

یہ ANTIOEL کالج ہے۔ جہاں میں آج تیسرے پہر پہنچا ہوں۔ اور کالج ہی کے مقامی ہوٹل ANTIOEL INN میں قیام ہے۔ یہ ایک چھوٹا سا گاؤں ہے آبادی تین ساڑھے تین ہزار کے قریب، طلبا کی تعداد سات سو لیکن کیسی خوش گوار، پُر فضا جگہ ہے۔ جہاں (بظاہر) سکون کی کیفیت ہے جس میں علمی کام دل جمعی کے ساتھ ہو سکتا ہے۔ شہر کی ضروری سہولتیں اس قسم کے گاؤں میں مہیا ہیں، بجلی، صفائی، ضرورت کی چیزیں، کتب خانہ یقین ہے کہ اسی "سکون" کے سمندر میں بھی افراد کی زندگی میں جذبات کے طوفان آتے ہوں گے اور زندگی کے المیے اور "طربیے" (کیا عجیب سا لفظ کمیڈی کے لیے !) کھیلے جاتے ہوں گے۔ لیکن اس قسم کے ماحول میں انسان اپنی زندگی کو شاید زیادہ کامیابی کے ساتھ اپنی خواہش کے مطابق ڈھال سکتا ہے۔ نیویارک جیسے شہروں میں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بے شمار تنکے ہیں جو طوفان کے اُوپر بے بسی کے ساتھ بہہ رہے ہیں گو ان میں بعض ایسے خوش فہم ہیں کہ "خس پندارد کہ ایں کشاکش با اوست!"

اس کالج میں ایک امریکی قسم کا مہاتما (کم سے کم نیم مہاتما) رہتا ہے۔ ڈاکٹر مارگن MARGAN جس نے زندگی میں بڑے بڑے کام کیے ہیں جن میں سے ایک T.V.A. کی صدارت ہے۔ یہ وہ AUTHORITY ہے جس کے زیرِ اہتمام ٹینسی کی وادی میں بجلی پانی کا ایک بہت بڑا منصوبہ چلایا گیا تھا۔ جس نے اس پس ماندہ علاقے کی قلب ماہیت کر دی ہے، نہ صرف اقتصادی بلکہ سماجی، ذہنی اور کلچرل اعتبار سے بھی ان کا شمار دنیا کے بڑے انجینیروں میں ہے لیکن ایک دن کے لیے بھی کسی انجینیرینگ کالج میں نہیں پڑھا! یہ ہمارے یونی ورسٹی کمیشن کے ممبر بھی رہے

ہیں!اور "دیہاتی یونی ورسٹی" کے بارے میں انھوں نے ہی نوٹ لکھا تھا۔ گزشتہ چالیس سال میں
انھوں نے اس کالج کو بنایا ہے اور اس کے ذریعہ اس سارے علاقے کی "ہمہ سمتی" خدمت کی
ہے۔ اس عرصے میں کالج کا بجٹ کوئی ہزار ڈالر سالانہ سے پونے دو ملین ڈالر سالانہ پر پہنچ
گیا ہے اور طلبا کی تعداد تیس چالیس سے ... تک۔ اس گاؤں میں غریب لوگ رہتے تھے۔
آبادی چودہ سو تھی۔ کوئی صنعت یا کامیاب کاشت کاری نہ تھی۔ اس کالج نے نہ صرف اعلا تعلیم
کا انتظام کیا بلکہ تعلیم اور عملی کام میں ایک زندہ رابطہ قائم کیا ہے۔ ہر طالب علم سال میں چھ ماہ
کے قریب کالج میں تعلیم حاصل کرتا ہے اور چھ ماہ کے قریب مختلف کارخانوں، دوکانوں، دفتروں
وغیرہ میں کام۔ تعطیل کا زمانہ کم کرکے اور تعلیم کی مدت ۴ سال سے ۵ سال بڑھا کر اب ایسا
انتظام ہے کہ ہر طالبِ علم یہاں سے علمی اور عملی دونوں قسم کی تربیت حاصل کرکے نکلتا ہے،
اپنا خرچ زیادہ تر خود اُٹھاتا ہے (عملی کام کی اُجرت اسے ملتی ہے) اور تعلیم کے فوراً بعد اسے
(بالعموم) سازگار کام یا ملازمت مل جاتی ہے۔ ساتھ ہی کالج کے CAMPUS اور گاؤں میں مارگن
کے مشورے سے بہت سی چھوٹی اور بعض بڑی صنعتیں شروع کی گئی ہیں۔ جو اس قسم کی چھوٹی
سی آبادی میں چل سکتی ہیں مثلاً ELECTRONIC آلات کا بنانا، پریس، بک مارک (جو اپنی قسم کے
بہترین ہیں اور سارے امریکہ میں اور باہر بھی مشہور ہیں)۔ یہ چھوٹی سی آبادی اب کوئی ۹ ملین
ڈالر (ساڑھے چار کروڑ روپیہ!) کا سالانہ کاروبار کرتی ہے۔ اس ساری ترقی میں کالج کا ہاتھ
صاف نظر آتا ہے (ضمناً یہ کہ اس طریقۂ تعلیم کی وجہ سے کالج دو چند طلبا کو بیک وقت تعلیم
دے سکتا ہے، آدھے کام پر، آدھے کلاس روم میں۔ آم کے آم اور گٹھلیوں کے دام!) گاؤں
میں صرف ۳ بے کار نوجوان ہیں لیکن مارگن اور ان کے خاندان کو (ان کے دونوں بیٹے بھی ان
کی قدروں اور دلچسپیوں میں برابر کے شریک ہیں) ان تین کی بھی فکر ہے۔ میں نے اکثر دیکھا
ہے کہ دراصل خلوص اور جذبے کے ساتھ کام کرنے والوں کو یہ فکر نہیں ہوتی کہ بہت بڑے
پیمانے پر ہزاروں لاکھوں آدمیوں کے لیے کیا کیا جائے۔ بلکہ وہ ہر فرد کو توجہ کا مرکز اور اہل سمجھتے
ہیں۔ ان کے بڑے لڑکے نے جب اپنا پریس شروع کیا تو اس میں تین کارکنوں کو بھرتی کیا تھا،
ایک لنگڑا نوجوان ایک سماج کی ٹھکرائی ہوئی لڑکی اور ایک شخص جو ٹراٹسکی کا پیرو ہونے کی وجہ

سے سوسائٹی میں مقبول نہ تھا۔ آج یہ پریس کامیاب ہے اور اس کے ملازم وغیرہ ہی اس کے ڈائرکٹر ہیں! دوسرا لڑکا معلم ہے اور ایک گاؤں میں ان لڑکوں کی مدد سے جو اس اسکول میں آئندہ داخل ہوں گے مدرسے کی عمارت بنوا رہا ہے! اس نے امریکن FRIENDS سوسائٹی کی طرف سے (یہ خاندان AMERICAN ہے) بچوں کا ایک کیمپ چلایا جس میں عمر ۱۱ سے ۱۲ سال تھی لیکن چھوٹے سے گروپ نے چند ہفتے کے اندر اسی گاؤں میں ٹیلی فون کے تار نصب کیے۔ جو کوئی کمپنی تجارتی حیثیت سے کرنے پر تیار نہ تھی! بہت سے عقل مند تو یہ کہیں گے کہ چھوٹے بچے ایسا کام کر ہی نہیں سکتے لیکن اگر حقیقت رائے سے ٹکرائے اور رائے غلط ثابت ہو تو اس کا کیا علاج!

میں نے کہا تھا کہ مارگن نیم مہا ما ہے۔ انھوں نے بہت سے طریقوں سے ملک کی خدمت کی ہے۔ بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ کیونٹی سروس لیمٹڈ .INC کے نام سے ایک جماعت قائم کی ہے جس کا کام سماج کی بہتری کی اسکیمیں چلانا ہے۔ ان میں سے ایک یہ تحریک ہے کہ چھوٹے چھوٹے قصبوں اور آبادیوں کی زندگی کو کس طرح زیادہ مفید، معنی خیز اور دل چسپ بنایا جا سکتا ہے اور بڑھتی ہوئی آبادی اور فرد کو نگل جانے والوں شہروں کی تحریک کو روکا جا سکتا ہے.... اس اسّی سال کی عمر میں بھی (یا اس سے زیادہ!) ان میں ذہنی بیداری اور انسانی ہمدردی کا چراغ روشن ہے اور جسم دماغ کا ساتھ دیتا ہے میرے منصوبے کے سلسلے میں بھی NATIONAL YOUTH SERVICE انھوں نے بہت دل چسپی لی اور مفید مشورے دیے اور مقامی جنگل دکھایا جس میں تیس سال قبل کے C.C.C کیمپ کے آثارِ قدیم اب بھی پائے جاتے ہیں۔ وہاں جنگل کو صاف کر کے پارک بنایا گیا، نہانے کے لیے حوض، کلینک کے لیے فرنیچر، سڑکیں وغیرہ! انھیں افراد کی زندگی سدھارنے میں شغف ہے۔ جس کے لیے محض بیرونی ماحول کی تبدیلی کافی نہیں۔ میں نے انھیں قرآن شریف کی یہ آیت سنائی کہ "ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتی یغیروا ما بانفسھم" تو بہت متاثر ہوئے۔ ان کے دوسرے لڑکے کو امریکن انڈین تہذیب سے بہت دل چسپی ہے۔ اور وہ ان قدیم امریکن باشندوں کی قدروں کا دل سے قائل ہے، ان کی رواداری، مذہب سے دل چسپی، نرمی، اصولوں میں پختگی، ان کے مذہب میں

خدا اور انسان کے درمیان پادریوں کے لیے جگہ نہیں بلکہ ہر شخص کا GREAT VOICE سے براہِ راست تعلق ہے۔ میں نے ان کے کتب خانے سے DRURY ALLEN کی نئی کتاب ناول ADVICES AND CONSENTS لے کر پڑھی جس میں واشنگٹن کانگریس اور امریکن سیاست پر بہت زبردست اور دل چسپ تبصرہ ہے جس میں اس کے تاریک اور روشن پہلوؤں کو اچھی طرح دکھایا گیا ہے۔ بہت لمبی کتاب ہے۔ آدھی اصل کتاب، آدھی READER'S DIGEST میں پڑھی۔

BERCO کالج ایک مشہور اور مذہبی معلّم رابرٹ فروسٹ کا کارنامہ ہے جو ۱۸۹۱ء سے ۱۹۲۹ء تک اس کالج کا پرنسپل تھا اور جس نے اس کی بنیاد خاص اصولوں کو پیشِ نظر رکھ کر ڈالی تھی۔ یہاں کے موجودہ ڈین لوئی سمتھ سے میری کئی مرتبہ پہلے کی ملاقات ہے۔ انھوں نے ہندوستان کے RURAL INSTITUTIONS کی تجویز کو بڑھانے میں کافی حصّہ اور دل چسپی لی۔ لیکن مجھے پوری طرح اندازہ نہ تھا کہ انھیں ہندوستان سے کس درجہ ہمدردی اور دل چسپی ہے۔ دونوں میاں بیوی پچاس میل ایرپورٹ تک مجھے لینے گئے اور واپسی پر وہاں پہنچایا اپنے ہاں دعوت کی، رسمی اور غیر رسمی۔ لوگوں سے ملاقات کرائی۔ کالج اور اس تمام علاقے کا حال بتایا، قصّے، کہانیاں، اقبال، اسلام، ہندوستان کا حال، خاندانی حالات دل چسپی سے سنے اور پوچھے۔ ان کی زندگی کی قدروں سے میں بہت متاثر ہوا اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ چھوٹا سا خاندان (میاں، بیوی ایک سیدہ کی ہم عمر لڑکی جولیا) ہمیشہ کے لیے دوست بن گیا ہے۔ کس قدر آسانی سے خلوص دوستی کو جیت سکتا ہے.... اس کالج کی عام فضا بھی "انٹی روک" کی طرح بہت خوش گوار اور رواداری کی ہے۔ اس کی INSPIRATION بھی ہے (میں نے اتوار کے روز ایک اثر آفریں چرچ سروس سنی جس میں تمام طلبا اور استاد شامل تھے۔ پروگرام خوب تھا البتّہ پادری صاحب نے تقریر میں طلبا کی تالیاں حاصل کرنے کے لیے ظرافت کو بھی دخل دیا)۔ ان کا موضوع تھا UNDER DEVELOPED AREAS لیکن خلافِ توقع یہ دنیا کے پس ماندہ علاقے نہیں بلکہ انسانی شخصیت کے بھلائے ہوئے یا پچھڑے ہوئے پہلوؤں کا ذکر تھا اور اس بات کی شکایت کہ افراد اپنی پوری ذمہ داری کا بار نہیں اٹھاتے۔ لیکن انھوں نے ہر کسی کی اپنی ذمہ داری پر زور دیا۔ یہ نہیں بتایا کہ ہم دوسروں کی بھلائی، برائی کے ذمہ دار بھی

ہیں!) لیکن کم سے کم ڈین سنتھ کی گفتگو سے اندازہ ہوا کہ وہ وسیع القلب ہیں اور دوسرے مذہبوں خصوصاً اسلام سے بھی دل چسپی رکھتے ہیں اور اقبال کو پڑھنا چاہتے ہیں اور (ایں دیوانہ را ہوئے بس است!)..... اس گاؤں کی آبادی بھی ساڑھے تین ہزار کے قریب ہے اور طلبا کی تعداد اندازاً پندرہ سو۔ کالج ہی نے اس گاؤں کو بنایا ہے۔ ابتدا میں رابرٹ فروسٹ کا پروگرام یہ تھا کہ گردو پیش کے پہاڑوں کے پس ماندہ لوگوں کو بیدار کیا جائے اور ان کے لیے خاص طور پر صنعتی تعلیم کا انتظام ہو۔ لوگ آتے اور چند ماہ یا چند سال رہتے، بغیر ڈگری کے اپنی ضرورت کی چیزیں سیکھتے اور واپس جاکر اپنے کام کو زیادہ اچھی طرح انجام دیتے۔ (ان کا حال سُن کر سرسیّد یاد آتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ انھوں نے مروّجہ نظامِ تعلیم کے ڈھانچے کے اندر اندر اپنا پروگرام چلایا تھا اور فروسٹ نے ابتدا میں کمیونٹی کی ضرورتوں کو مقدم سمجھا اور رفتہ رفتہ جیسے حالات بدلتے گئے اپنا نظامِ تعلیم بھی تبدیل کر دیا)۔ اس کالج میں بھی WORK EXPERIENCE تعلیم کا لازمی جزو ہے۔ ہر تعلیم پانے والا لازمی طور پر دو گھنٹے روز کسی نہ کسی قسم کا کام کرتا ہے (ہوٹل میں، فارم پر، دوکان میں، دفتر میں) ایک DEAN OF LABOUR تمام تر اسی کام کی تنظیم کے لیے مقرر ہے۔ کام سال بھر کے بعد بدلا جا سکتا ہے لیکن اگر کوئی طالبِ علم کام کرنا نہ چاہے تو داخلہ نہیں ملتا۔ غفلت کرے تو اسے کالج سے نکال دیا جاتا ہے۔ اس کالج میں بیشتر غریب طلبا آتے ہیں۔ اس لیے خرچ بہت ہی کم رکھا جاتا ہے یعنی کوئی ۲۰۰ روپیے ماہوار اور اس میں سے نصف کے قریب ہر طالبِ علم خود کما لیتا ہے۔ باقی کے لیے وہ تعطیل میں باہر کام کرتے ہیں اور چوں کہ وہ کام عام طور پر دن بھر کا ہوتا ہے۔ لہٰذا فیس وغیرہ سے زیادہ کما لیتے ہیں۔ اس طرح ان کی تعلیم پر ماں باپ کا شاید کچھ بھی خرچ نہیں ہوتا! ہمارے ملک میں نہ ایسے کام کے موقعے ہیں نہ طلبا اس طرح ہر قسم کا کام کرنے کو تیار ہیں... اس کالج میں شراب بالکل ممنوع (بلکہ گاؤں بھر میں) اور سگریٹ پینا محدود ہے۔ قصبے کی زندگی پر کالج کا کافی اثر ہے اور اس کی بیشتر ضرورتیں دودھ، انڈے، روٹی، طبّی دیکھ بھال، تعلیمی سہولتیں، بالغوں کی تعلیم اور ان کے لیے خاص کورس یہ سب چیزیں کالج ہی فراہم کرتا ہے۔ بانی کا موٹو ہی یہ تھا کہ کالج کا فرض ہے کہ اس علاقے کی تعمیرِ نو کرے..... حبشیوں کو ابتدا سے

داخل کیا جاتا تھا۔ ۱۸۶۲ء میں قانوناً اس کو ممنوع کر دیا گیا تھا (اور کس قدر دکھتا ہے میرا دل یہ دیکھ کر کہ (تاریخِ انسانی میں) انسان نے انسان سے کس درجہ بدسلوکیاں کی ہیں") اب دوبارہ وہ داخل کیے جاتے ہیں ــــ یہاں ایک صاحب مسٹر چرچل سے ملاقات ہوئی جن کی عمر ۸۶ سال کی ہے۔ وہ اور ان کی بیوی ۴۲ سال قبل تک ہندوستان میں تھے۔ اور احمد نگر میں کپڑا بنانے کا ایک مشہور کارخانہ چلاتے تھے۔ جس میں زیادہ تر کھڈیوں پر کام ہوتا تھا۔ لیکن انھوں نے ان چرخوں اور کھڈیوں میں بعض چھوٹی چھوٹی تبدیلیاں کر کے اور ان میں آلات لگا کر ان کی کارکردگی کو بہتر بنا دیا تھا اور ہندوستان میں بہت سے انعام پائے تھے۔ اب ان کا بہت بڑا کارخانہ ہے۔ جہاں ڈیڑھ سو کے قریب مزدور کام کرتے ہیں۔ اور بہت اچھا کپڑا تیار ہوتا ہے۔ اور ساری نگرانی اور انتظام اس عمر میں یہ دونوں میاں بیوی کرتے ہیں!

آج کل امریکہ میں کرشچیف کی آمد کی دھوم ہے۔ اور اس بات پر ہر جگہ چرچا اور بحث ہے کہ ان کے ساتھ کیسا سلوک کیا جائے اور نیویارک یا اس کے باہر گھومنے دیا جائے یا محض "سن ہائن" کے جزیرے میں کہ U.N.O. کا مقام ہے' محدود رکھا جائے اور پبلک کی طرف سے سیاہ جھنڈوں وغیرہ کی تجویزیں گرما گرمی کے ساتھ زیرِ بحث ہیں۔ آخر یہ بچوں کی سی حرکتیں کیوں؟ مجھے ریاست کنٹکی (جس میں یہ کالج واقع ہے) کے ایک اخبار میں یہ ایڈیٹوریل پڑھ کر خوشی ہوئی کہ امریکہ یو۔ این کے میزبان کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور اس کا فرض ہے کہ ہر وفد اور ہر شخص کا DIGNITY کے ساتھ خیر مقدم کرے اور چھوٹے پن کی حرکتیں نہ کرے۔ یہ اس قسم کی بات ہے جو ہمارے ملک میں پنڈت نہرو کے منہ سے فوراً نکلتی لیکن یہاں بہت سی خوبیوں کے ساتھ ایک خاص غیر پختگی اور تنگ نظری ہے جو ایک زبردست قوم کے شایانِ شان نہیں ــــ لیکن ابھی تک ان کے اخباروں اور عام پبلک میں ضبط اور متانت کا انداز پیدا نہیں ہوا۔ چناں چہ کیوبا کے DICTATOR CASTRO اور ان کی پارٹی کے بارے میں (جو یو۔ این کے جلسہ میں شریک ہونے آئی ہے) اور کمیونسٹ خیالات کی وجہ سے امریکہ میں بہت نامقبول بلکہ مقہور ہے۔ ان کے بارے میں نامہ نگاروں کی طرف سے ہر

قسم کی خراب اور ناشائستہ باتیں چھاپی جارہی ہیں۔ یہاں تک کہ وہاں پر روز عورتوں کا ایک سلسلہ جمع رہتا ہے جن کو یہ لوگ اپنے ہوٹل میں بُلا لیتے ہیں۔ ضمناً یہ کہ یہ وفد پہلے ایک "سفید" علاقے کے ہوٹل میں ٹھیرا تھا۔ لیکن اس ہوٹل کے لوگوں نے ان کے ساتھ بدسلوکی کی، جس کی وجہ سے وہ اب حبشی علاقہ "پارلم" کے ہوٹل میں منتقل ہو گئے ہیں!

بیریا کالج میں دو دن قیام کرنے کے بعد اور ڈین سمتھ کی مہمان نوازی سے بہت متاثر ہیں۔ ۱۱ر کو ٹسکی گی TUSKIGEE انسٹی ٹیوٹ پہنچا جو تمام تر حبشیوں کی درسگاہ ہے اور جس کو اس قوم کے ایک محبوب اور صاحبِ نظر لیڈر BOOKERT WASHINGTON نے اب سے ۸۰ سال قبل قائم کیا تھا۔ اس وقت جنوب کے اس پس ماندہ علاقے میں زیادہ تر حبشی غلام رہتے تھے۔ جن کو کچھ عرصے پہلے آزاد کیا گیا تھا وہ غریب تھے اور کوئی صنعت نہ جانتے تھے۔ گزارہ زیادہ تر زراعت پر تھا۔ جو سائنس سے بڑی حد تک بے نیاز تھی۔ اس زمانے میں ۹۰ فی صد کاشت کار تھے۔ اب ان کی تعداد گھٹ کر ۲۰ فی صدی پر آگئی ہے۔ یہ امریکہ کی تاریخ کا ایک اہم انقلاب ہے (جس سے ہندوستان کو بھی سبق لینا ہے اور سابقہ پڑ رہا ہے)۔ واشنگٹن کے سامنے اس قوم کی تعلیم تھی، مدرسے قائم کرنے تھے۔ اس نے ابتدا سے صنعت و حرفت کی تعلیم پر زور دیا اور ان کو اس قسم کے مفید کام سکھائے جیسے اینٹیں بنانا، (خود بھی اس صنعت میں اس نے دستگاہ حاصل کی)۔ کپڑا بُننا، لکڑی کا کام، ضرورت کے لیے خوراک کی فراہمی اور بہتر زراعتی طریقوں کا استعمال۔ اس کے علاوہ اس نے صحت کو بہتر بنانے کے پروگرام بھی جاری کیے۔ اس تعلیم میں کافی تعداد بالغ افراد کی ہوتی تھی جو آدھے وقت کام کرتے اور آدھے وقت تعلیم حاصل کرتے۔ اس کا مقصد ایک "ہمہ جہتی" تعلیم کا نافذ کرنا تھا۔ جس میں فوجی ورزشیں، موسیقی، باضابطہ کام اور چرچ جانا بھی کچھ شامل تھا ابتدا میں یہ بطور ایک VOCATIONAL HIGH SCHOOL کے چلایا گیا لیکن رفتہ رفتہ وقت اور قومی ضرورت کی رفتار کے مطابق اس میں تبدیلیاں ہوتی گئیں اور اب یہ ایک پورا کالج ہے جس میں ۲۲۰۰ کے قریب طلبا ہیں۔ یہاں بھی ہاتھ کے کام پر کافی زور ہے۔ اور ذہنی تعلیم کے ساتھ ساتھ عملی تعلیم دی جاتی ہے۔ میں کالج کے ہوٹل میں ٹھیرا تھا۔ اس میں

سب کام کرنے والے اور کام کرنے والیاں طلبا تھے جو DOMESTIC SCIENCE وغیرہ کی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ کالج کے طلبا میں ڈیڑھ سو دو سو ایسے ہیں جو بجائے ۴ سال کے ۵ سال میں کورس ختم کرتے ہیں جس میں تعلیم کے ساتھ ساتھ ملازمت کا انتظام بھی ہے۔ حکومت کی طرف سے کالجوں کے طلبا کے لیے قرض کا انتظام بھی ہے۔ ضرورت مند طلبا کو سالانہ ایک ہزار ڈالر تک قرضہ دیا جا سکتا ہے جس کو ملازمت مل جانے کے سال بھر بعد وہ قسطوں کے ذریعے ادا کر سکتے ہیں۔ جو لوگ معلمی کا پیشہ اختیار کرتے ہیں انھیں دس فی صدی سالانہ رقم معاف کر دی جاتی ہے۔ یہاں تین ہندوستانی استاد اور دو طلبا بھی ہیں۔ جنھوں نے مہمان نوازی کی..... لیکن یہاں آکر یہ اندازہ بھی ہوا کہ جنوب میں حبشیوں کے ساتھ کیسا سلوک کیا جاتا ہے۔ مقامی تعصب کا یہ حال ہے کہ گو کالج میں حبشی استادوں کے ساتھ ساتھ چند سفید استاد بھی ہیں (زیادہ تر غیر امریکی ؟) اور وہ آپس میں ملتے جلتے ہیں لیکن کالج CAMPUS کے باہر ان کی دنیا ایک علیحدہ دنیا ہے اور ان میں سماجی میل جول نہیں۔ ملتے ہیں تو چوری چھپے ! ان کے اسکول، ویٹنگ روم، بسیں وغیرہ سب جدا جدا ہیں "یہ سیاہ لوگوں کے لیے ہیں، یہ سفید فام لوگوں کے لیے"۔ جن کے دلوں کو تعصب نے سیاہ کر دیا ہے۔ کیا دل کا سیاہ ہونا، رنگ کے سیاہ ہونے سے بہتر ہے ؟ جگہ جگہ یہ نوٹس دیکھ کر مجھے ایک قسم کی ذلت کا احساس ہوتا تھا۔ چناں چہ ایرپورٹ پر میں نے سفید ویٹنگ روم کے بجائے سیاہ ویٹنگ روم کا رُخ کیا... لطف یہ ہے کہ حکومت اور ہائی کورٹ کا فیصلہ ہو چکا کہ اس قسم کی علیحدگی امریکی دستور کے خلاف ہے۔ لیکن جنوب کی ریاستوں نے ابھی تک اس فیصلے کی پوری تعمیل نہیں کی چناں چہ انھوں نے حبشی ووٹروں کا حق تلف کرنے کے لیے ٹسکی گی کالج کے علاقے کو میونسپل حدود سے باہر کر دیا ہے تاکہ کمیٹی میں ان کو اکثریت حاصل نہ ہو (ان کی آبادی "سفیدوں" سے ۶ گنا ہے اس گاؤں میں !)۔ ان کا نام رجسٹر کرنے میں روڑے اٹکائے جاتے ہیں ..... نیشنل سروس اسکیم کے ضمن میں ایک رات کھانے کے بعد بہت دل چسپ بحث چلی ایک پروفیسر "سقراط" کا پارٹ ادا کر رہے تھے۔ اور سوال اُٹھاتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ مستقبل کی تہذیب ہندوستان میں بھی صنعت و حرفت کی تہذیب PUSH BUTTON CIVILIZATION ہوگی۔

لہٰذا ہاتھ کے کام پر اس قدر زور کیوں؟ میں نے کہا کہ ایسا ہوا تو بڑے افسوس کا مقام ہوگا اور ہاتھ اور دماغ کی تربیت کا بہت قریبی تعلق ہے۔ گرما گرم بحث رہی لیکن بحیثیت مجموعی رائے میرے ساتھ تھی۔ ڈنر پر مذہب کے بارے میں چند خواتین سے تبادلۂ خیال ہوا۔ اور انھوں نے اسلام میں کافی دل چسپی کا اظہار کیا....

۲۴، ستمبر

کل رات کو دیر تک گھر خط لکھتا رہا۔ یویارک پہنچ کر، جب سفر سے واپس آتا ہوں، تنہائی کا احساس زیادہ شدید ہوجاتا ہے کیوں کہ "درمیانِ محفل تنہا ہستم" کی کیفیت ہوتی ہے۔ لیکن گزشتہ ہفتے بھر کے خطوط پاکر ذرا اطمینان ہوا اور رات کی تنہائی میں اپنے عزیزوں کو خط لکھنے سے ایسا معلوم ہوا کہ گویا ان سے باتیں کر رہا ہوں۔ ایک حد تک جو کچھ بھی لکھتا ہوں اس میں کوشش یہی ہوتی ہے (بلکہ اب تو یہ عادت سی ہوگئی ہے) کہ بات چیت تخاطب کے انداز میں لکھوں۔ اس میں "علمیت" کی شان پیدا نہیں ہوتی، نہ یہ خواہش ہے لیکن شاید دل چسپی کا عنصر بڑھ جاتا ہے۔

آج نرسنگ ہوم میں جانا طے ہوگیا ہے۔ گزشتہ کئی ماہ سے یہ شکایت ہے کہ تھوڑا سا چلنے سے ٹانگوں میں درد ہونے لگتا ہے۔ کام ٹھیرا دورہ اور فطرت کی ستم ظریفی کہ اس نے یہ "عذرِ لنگ" پیدا کر دیا ہے!۔ اِدھر یہ تکلیف زیادہ ہوگئی ہے اور چوں کہ چلنے کے سوا کوئی اور ورزش خارج از بحث ہے اسی لیے اس طرف توجہ ضروری ہے۔

کمرہ جو ملا ہے اس میں تین حضرات اور ہیں۔ جن کی اوسط عمر کوئی ستّر اور ۷۵ سال کے درمیان ہے۔ لہٰذا ان کی شکل وصورت اور انداز دیکھ کر یہ امید نہیں کہ ان کی وجہ سے کوئی تفریح یا دوسرا پت ہو۔ لہٰذا اپنا لکھنا پڑھنا اور اپنے خیالات اور جذبات کی دنیا کی سیر کا موقع ملے گا۔ دیکھیں کیسی گزرتی ہے!۔

۲۵ ستمبر

"ایک نرسنگ ہوم کی کھڑکی میں سے" کسی دل چسپ ناول کا نام ہو سکتا ہے۔ لیکن میرے ذہن میں اس وقت یہ نام اس لیے آیا کہ کل سے میں ایک نرسنگ ہوم کی کھڑکی میں سے، دنیا سے الگ، دنیا کی تاریخ کا ایک بہت ہنگامہ خیز مظاہرہ دیکھ رہا ہوں یعنی وہ پُر آشوب، امید افزا، امید شکن، رسہ کشی کا ڈراما جو آج کل U.N. میں ہو رہا ہے جہاں دنیا بھر کے وزیر اعظم اور مدبرین جمع ہیں اور روس اور امریکہ کی نہ ختم ہونے والی جنگ کی گرمی اور دوسری ساری دنیا کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی ہے۔ امریکہ اور روس دونوں ایک دوسرے کی تضحیک اور تذلیل اور ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوشش میں ہیں۔ امریکہ کا لہجہ کس قدر معتدل اور مدبرانہ ہے۔ روس کا لہجہ کرشچیف کی زبان سے کرخت اور بظاہر "اٹل" قسم کا ہے۔ لیکن دونوں کے مقاصد میں فرق بہت کم ہے۔ دنیا کے مستقبل کی دونوں کو فکر ہے لیکن وہ محض خط کا لفافہ ہے۔ خط کا مضمون ایک ہی ہے یعنی دنیا کو اپنے رنگ میں رنگنا، اس کو اپنی شباہت میں ڈھالنا (مگر میرا خیال ہے کہ روس کا طریقہ یہ ہے کہ بہت شدت کے ساتھ غراؤ، قوموں کے دل میں خوف اور اندیشہ پیدا کرو اور پھر کسی پُر اثر طریقہ پر کسی ایسے سمجھوتے کے لیے تیار ہو جاؤ جو پہلے سے ذہن میں موجود ہو۔ بہر حال اس میں شک نہیں کہ رومیوں کی سیاست آفرینی (؟) زار کے زمانے سے چلی آتی ہے اور امریکیوں سے زیادہ کامیاب ہے)۔ دوسرا مرکز خود یو۔ این کا مستقبل ہے۔ جس کو اور اس کے سکریٹری ہیمر شولڈ کو کرشچیف نے چیلنج دیا ہے اور کہا ہے کہ سکریٹری کو ہٹاؤ اور اس کے بجائے ایک تین ممبروں کی کونسل قائم کرو اور U.N. کو نیویارک سے نکالو جہاں بعض وفدوں کے آزادی کے حق کا احترام نہیں کیا گیا۔ تیسرا نقطہ مشترک ہے افریقہ کی نئی آزاد قوموں کا سواگت، (جو یو۔ این کی ممبر ہوئی ہیں اور جن کے ووٹ کے دام لگائے جا رہے ہیں!) خود اپنے مقاصد اور اغراض کی خاطر!! امریکہ ان کی اقتصادی مدد کا پھسلاوا دیتا ہے، روس پر ایشیائی اور افریقی قوم کو COLONIOLISM سے آزاد کرانا چاہتا ہے۔ کیوں کہ یہ زنجیر زیادہ تر فریقِ مخالف کی بنائی ہوئی ہے۔ لیکن خلوص نیت

نہ ہوتو اس کا اثر نہیں ہوتا اور وہ دونوں فریقوں میں مفقود ہے۔ پالیسی ہے۔ دل کے اندر انصاف کا گوہر نہیں چمکتا..... آج پنڈت جی یہاں پہنچے ہیں۔ خدا کرے ان کی آواز میں دلوں کو گداز کرنے کی قابلیت اور زور پیدا ہوجائے..... آج شام کو تقی صاحبان ملنے آئے اور ان کے بعد مسٹر اور مسز بروک جن کا اصرار ہے کہ اسپتال سے نکل کر چند دن ہمارے ساتھ ٹھیرو، ہمیں کوئی کام بتاؤ۔ کتابیں لائیں؟ پھل لائیں؟ اچھی چائے کا تھرمس بناکر لائیں؟ کس کو تمہاری طرف سے فون کریں؟ کوئی چیز ٹائپ کرانی ہے؟ کس کو پیغام پہنچانا ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ ایسے خلوص کے سامنے انسان ہتھیار ڈال دیتا ہے۔ اس میں خلوص دکھانے والے کا کچھ بہت خرچ نہیں ہوتا۔ لیکن بقول شیکسپیر کے افریقہ کی جن نئی نو آزاد قوموں کی حمایت حاصل کرنے کے لیے یو۔این۔او میں جدوجہد جاری ہے ان کے نام کیوں نہ لکھ دوں۔ ابھی تک تو یہ نام، سوائے بین الاقوامی دفتر والوں اور سیاست دانوں کے، کم لوگوں کو یاد ہوں گے۔ (شاید ان میں سے بھی بعض کو یاد نہ ہوں!) اور اسکول کے بچّوں کو بھی رفتہ رفتہ ہی ان سے شناسائی ہوگی (بے چارے بچّے جنھیں اب ۸۰، ۸۲ کے بجائے ۹۶ ریاستوں کے نام جغرافیہ کے سلسلے میں یاد کرنے ہوں گے!)

IT BLESSETH HIM/HER/THAT GIVES AND HIM THAT TAKES
TOGO, CYPRUS, CAMAROON, CENTRAL AFRICAN REPUBLIC, CHAD, DAHONEY, GABON, IVORY COST, MALAGASY, NIGER, SOMALI, UPPER VOLTA, CONGO REPUBLIC (BELGION), CONGO REPUBLIC (FRANCE),

۲۶؍ستمبر

پنڈت جی کل نیویارک پہنچے۔ آج اخبار میں ان کے ہوائی اڈّے کے انٹرویو کی (اور اچکن اور سُرخ پھول کی!) خبر تھی۔ کس قدر فرق ہے ان کے انک اور انسانیت کے لہجہ میں اور صدر امریکہ کے اندازِ خداوندی ("ہم سب ملکوں کو مالی مدد دے کر ان کی روح اور جسم کا علاج کرلیں گے") اور کرشچیف کی کڑک اور گرج میں (کہ "اگر ہماری بات نہ مانی جائے گی تو نہ دنیا چل سکے گی نہ ہم اس کو چلنے دیں گے")۔ پنڈت جی نے تو بس اتنا کہا کہ مجھے آنے

میں تامل تھا لیکن اس لیے آیا ہوں کہ شاید میری شرکت سے صورتِ حال میں کچھ تھوڑی بہت بہتری پیدا کرنے کی صورت بنے۔" اگر میری موجودگی سے ذرا سا فائدہ بھی پہنچنے کا امکان ہو تو میں دنیا کے پرلے سرے تک جانے کو تیار ہوں" اور یہ وہ شخص ہے جس کا سب کو انتظار ہے، جس کی قدر سب کے دلوں میں ہے۔ جس کی طرف مشرق اور مغرب کے نمائندوں کی نظریں ہیں اور جس کی قیادت کے لیے غیر جانب دار قومیں خود تیار ہیں! ۔ "کون کہہ سکتا ہے کہ میں مشرق اور مغرب میں MEDIATION کا فرض انجام دے سکوں گا"... کیا تہذیب ضبط وانک کا نام ہے! کیا بحیثیت پالیسی کے بھی یہ انداز عمل وسخن، قوت اور قیادت اور خداوندی کے دعووں سے بہتر نہیں ؟۔

آج نرسنگ ہوم کی کھڑکی میں سے ٹیلی ویژن کی آنکھ سے امریکہ کی صدارت کے دو امیدواروں KENNEDY اور نائب صدر NIXON کی بحث دیکھی جس کو دنیا بھر کے سامنے نشر کیا گیا تھا اور کہا جاتا ہے کہ ساٹھ ملین شخصوں نے سُنا۔ لیکن میں زیادہ متاثر نہیں ہوا۔ نہ تو آتش بازی تھی۔ نہ خلوص کی آگ جو سننے والوں کے دلوں میں جوت جگائے، نہ تقریر کا جادو۔ پہلے دونوں نے اپنی اپنی چند منٹ کی تقریر کی اور زور اس پر تھا کہ مقصد میں اختلاف نہیں، طریقۂ کار میں فرق ہے اور اس پر بہرحال اتفاق تھا کہ امریکہ انسانیت کا قائد ہے اور قیادت کی خداداد امانت اس کو اُٹھانی ہے! البتہ ڈماکریٹ امیدوار کنیڈی کا اس پر زیادہ زور تھا کہ ہمیں کمزوریوں کا بھی اعتراف کرنا چاہیے (جو ظاہر ہے ریپبلکن پارٹی کی حکومت کی دین ہیں) اور ان کو دُور کرنے کی کوشش ---- اس کے بعد چند اخباروں کی ایجنسی کے نمائندوں نے ہر ایک سے کچھ سوالات کیے جن کے انھوں نے جواب دیے اور کبھی کبھی ایک دوسرے کے جواب پر تبصرہ کیا۔ بحث مہذب تھی لیکن زور نہ تھا۔ نہ بیچ میں روک ٹوک نہ تھی۔ میرا خیال ہے کہ شاید کنیڈی کسی قدر بہتر امیدوار ہے مگر وہ نکسن کے مقابلے میں ذرا کم تجربے کار یا پختہ کار معلوم ہوتا ہے۔ اس میں خلوصِ نیت کچھ زیادہ نمایاں تھا۔

اِدھر U.N.O. کے کشتی گھر میں اور اس کے باہر سارے نیویارک میں قوموں کا دنگل

ہو رہا ہے۔ کیوبا کے "باغی کمیونسٹ" لیڈر CASTRO نے ۴½ گھنٹے تقریر کی SHADES OF KRISHNA MENON اور امریکہ کی زیادتیوں کا نامۂ اعمال پیش کیا۔ U.A.R. کے صدر ناصر نے ۱½ گھنٹے تقریر کی اور اخباروں کا بیان ہے کہ اچھا اثر پیدا کیا (لیکن لطف یہ ہے کہ تالیاں بھی پارٹی لائن کے مطابق بجتی ہیں)۔ ہیمرشولڈ (سکریٹری جنرل یو۔ این۔ او) جس کو روس نے چیلنج دیا ہے کہ وہ غیر جانب داری کے ساتھ ادائے فرض نہیں کر رہا ہے رفتہ رفتہ زیادہ قوموں کی تائید حاصل کر رہا ہے اور میرا خیال ہے کہ اس معاملہ میں اس کا رویّہ ٹھیک اور صاف رہا ہے ....

اسپتال میں انتظام بحیثیت مجموعی اچھا ہے۔ نرسوں اور ڈاکٹروں میں سفید و سیاہ دونوں ہیں! سفید زیادہ لیکن آپس میں سلوک برابری کا معلوم ہوتا ہے اور سیاہ لوگ اور نرسیں دوسروں سے دب کر کام نہیں کرتیں۔ نیچے کا کام کرنے والے (ATTENDANTS وغیرہ) سب ہی سیاہ ہیں۔ میرے تینوں ہم کمرہ جن کی عمر کا اندازہ لکھ چکا ہوں، ان سے خاصا تفریحی سلوک کرتے ہیں۔ جیسے اسّی یا ستّر برس کی عمر میں ان کے ساتھ FLIRT کرتے ہوں اور وہ بھی انھیں خوش مزاجی کے ساتھ HUMOUR کرتی ہیں!۔ میں نے ابتدا میں انھیں عمر کا حوالہ دے کر "نظری" کر دیا تھا۔ لیکن یہ ٹھیک بات نہ تھی۔ ان میں سے ایک مصنّف ہیں، ایک کاروباری آدمی ہیں (جو اپنے شرکائے کار اور ان کی محنت اور دیانت داری کی تعریف کرتے ہیں)۔ (ایک رات یہ حضرت پلنگ سے نیچے گر پڑے! شاید انھیں ہلکا سا فالج کا حملہ ہو چکا ہے۔ میں نے آوازوں کو سُن کر سمجھا کہ حسبِ معمول سرور خانہ ہمسایہ ہے یعنی نیند میں بول رہے ہیں اور خراٹے لے رہے ہیں لیکن بعد میں صورتِ حال کا اندازہ ہوا تو مدد کی اور نرس کو بلایا)۔ تیسرے صاحب جو اسّی کی منزل پار کر چکے ہیں، ہکلاتے ہیں اور چل پھر نہیں سکتے بغیر مدد کے۔ لیکن ان کے صاحبزادے ایک دن آئے اور انھوں نے "قومی اور بین الاقوامی صورتِ حال کے بارے میں بڑی معقول اور شریفانہ باتیں کیں۔ شاید یہودی ہیں لیکن یقین نہیں ..... بہرحال نتیجہ یہ ہے کہ ہر شخص اپنی جگہ پر ایک انفرادی حیثیت رکھتا ہے۔ میرے ان لوگوں سے کوئی خاص تعلقات نہیں۔ وہ بھی اکثر پڑھتے رہتے ہیں، میں بھی لکھتا پڑھتا ہی رہتا ہوں اور کیا کروں؟ بارہ بجے کے بعد ان کی بیویاں آجاتی ہیں جو شام تک رہتی ہیں۔ میں ان کے بجائے اپنے پیاروں کی

تصویر کو فریم میں لگا کر (دل ہی دل میں) مقابلہ میں پیش کرتا ہوں اور اپنے خیال میں ہر روز بازی جیت لیتا ہوں! اس عرصے میں، یعنی گزشتہ چار روز میں مسٹر اور مسز تقی اور ایک خاتون ملڈرڈ لوشسکی (آپا کی وساطت سے) ملنے آئیں اور اظہارِ خلوص کیا۔ مسٹر اور مسز بروک کی عنایت جاری ہے۔ ایک دن چائے اور بسکٹ اور پڑھنے کو کتابیں دوسرے دن ڈھیروں پھل (جن کو کمرے والوں میں اور نرسوں میں تقسیم کرنے سے یادش بخیر عزیزی کی یاد اور شدید ہوگئی اور اسپتال میں میری ساکھ بڑھ گئی) اور ایک لمبے مسودہ کی نقلیں ٹائپ کرا کے۔ ایسے قاتل کا کیا کرے کوئی؟

کیا بات ہے کہ ہر شخص وہ بننا چاہتا ہے جو وہ نہیں ہے؟ حبشی عورتیں اپنا رنگ صاف کرنا چاہتی ہیں اور سفید عورتیں دھوپ میں تپ کر، بدن پر دوائیں مل کر اسے سانولہ کرنے پر تُلی ہوئی ہیں۔ وہ اپنی آمدنی کا ایک خاصہ حصہ گھونگریالے بالوں کو سیدھا کرنے پر صرف کرتی ہیں اور یہ ان کو مختلف طریقوں سے گھونگریالے بال بنانا چاہتی ہیں! امریکہ کی مشین کی بنی ہوئی تہذیب میں اس درجہ یکسانیت (جس میں خوبیاں اور خرابیاں دونوں ہیں) کہ لوگ چھوٹی چھوٹی چیزوں میں تھوڑا سا فرق کر کے انفرادیت کی شان پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن اس انفرادیت کی جڑ بھی دل اور دماغ کی سرزمین میں نہیں بلکہ جزوی بیرونی تبدیلیوں کے اندر ہے۔ اس بازار میں انفرادیت کہاں ملتی ہے وہاں تو بھیس بدلنے کے لیے MASKS مل سکتے ہیں؟

اسپتال میں کوئی ہفتے بھر قیام رہا اور اس عرصے میں ان ستم ظریفوں نے ہر قسم کے ٹسٹ لے ڈالے۔ خون، قارورہ، اجابت، گردے، ہڈی کا گودا! (جس کے لیے ایک سرٹیفکیٹ پر دستخط کرنے پڑے کہ وہ نتائج کے ذمہ دار نہیں۔ صرف خیال ان کا ہے، ذمہ داری میری!)۔ B.M.R. وغیرہ وغیرہ.... لیکن نتائج منفی ہی منفی ہیں۔ یعنی انھیں خون کی کمی (یا اس کی کیفیت میں بہتری پیدا نہ ہونے کے) جو اسباب قرینِ قیاس معلوم ہوتے تھے وہ ثابت نہیں ہوتے۔ اب ان کا خیال یہی ہے کہ غالباً اسی شکایت کا سبب تھائی رائڈ کی کمی ہے (جو لندن کا ڈاکٹر پہلے ہی کہہ چکا تھا) اور اس کی تعداد بڑھائی ہوگی۔ جب خون بڑھے گا تو دورانِ خون

بہتر ہوگا۔ اور اس طرح ٹانگ کی تکلیف جاتی رہے گی (یعنی نومن تیل کی ضرورت ہے!)۔۔۔ ڈاکٹر MAC CORMATH (جو میرے معالج ہیں۔ اور جن کی گلپٹرک نے بہت تعریف کی ہے) بہت شرافت اور خلوص سے پیش آتے رہے۔ ایک دن بہ سبیلِ مزاح کہنے لگے کہ تمھیں یہاں ہفتے بھر کے قریب رکھا اور ایک گولی بھی دوا کی نہیں دی۔ ہمیں علاج کرنے میں نہیں، محض سائنٹفک تحقیق میں دل چسپی ہے! اسپتال کا انتظام بہت اچھا ہے۔ نرسیں اور اسٹاف فرض شناس اور خلیق ہیں۔ ان میں حبشیوں کی خاصی تعداد ہے اور وہ بغیر کسی امتیاز کے کام کرتے ہیں۔ اس اسپتال کے ساتھ ایک بہت بڑا ریسرچ سینٹر ہے۔ جہاں میڈیکل تحقیق کا کام بہت بڑے پیمانے پر برابر چلتا رہتا ہے اور کروڑوں روپیے کا بجٹ ہے۔ اسٹاف میں ایک ہندوستانی ڈاکٹر KALASAN ہیں جن کو ان کے خاص شعبے میں GASTRO-ENTERIOLOGY (مقابلتاً نوجوانی ہی میں) امامِ فن مانا جاتا ہے۔ ہر شخص ان کی بہت تعریف کرتا ہے۔ لیکن اس ستم ظریفی کا کیا علاج کہ ان کو ہندوستان میں کام کرنے کی اجازت نہیں مل سکتی کیوں کہ ان کے پاس ہندوستان کی کوئی مسلّمہ ڈگری (یعنی M.B.B.S.) یا انگلستان وغیرہ کی ایسی ڈگری نہیں جو انڈین میڈیکل کونسل نے تسلیم کی ہو اور چوں کہ امریکن کونسل ہندوستان کی ڈگری کو نہیں مانتی لہٰذا ہم یہاں کی ڈگری کو تسلیم نہیں کرتے! یہ شاید سیاست کے اعتبار سے تو ٹھیک ہی ہو لیکن عقل تو اس کو نہیں مانتی۔ لیکن عقل اور سیاست کا لازمی ساتھ کب رہا ہے؟ اس ضمن میں گلپٹرک نے سنایا کہ دو سال ہوتے وہ بہت سخت بیمار ہوئے اور کسی قسم کا انفکشن ہوا جس کا کوئی علاج معلوم نہ تھا۔ اسی اسپتال میں تھے کہ ایک شام کو ڈاکٹروں نے ان کا کیس ناقابلِ علاج تجویز کیا۔ اور ان کی بیوی وغیرہ کو بتا دیا گیا کہ وہ شاید رات گزار سکیں۔ لیکن چوبیس گھنٹے بھی زندہ نہیں رہ سکتے۔ مگر ریسرچ سینٹر میں اس خاص شعبے میں تحقیق جاری تھی۔ اور اسی شام کو ڈاکٹروں نے اس VIRUS کو ISOLATE کر کے اس کا علاج معلوم کر لیا اور خدا نے (ڈاکٹروں کو آلۂ کار بنا کر) ان کی جان بچا لی۔۔۔۔

WEEKEND کے لیے مجھے چھٹی مل گئی تھی۔ چناں چہ دن بھر کے لیے تقی اور مسز تقی اپنے ساتھ LONG ISLAND لے گیے جہاں آپا کی یاد بہت آئی۔ کھانا کھاتے، خریداری کرتے

اور آتے جاتے (اور کب ان کی یاد نہیں آتی رہتی!) اتوار کا دن مسٹر اور مسز بروک کے ہاں گزرا، پیر کے دن ٹیسٹ کے لیے واپس اور پھر چھٹی۔" جیسے گئے تھے ویسے ہی NEGATIVE ہو کر آگئے" لیکن اطمینان ہو گیا۔

.U.N کی افراتفری میں ایک سکون کا مرکز اور روشنی کا منارہ پنڈت جی کی ذات ہے۔ دنیا کے سارے ہی لیڈر اور سیاست کے مٹھ جمع ہیں جن میں ہر قسم کے لوگ ہیں لیکن ان میں سے بیشتر کو اسٹیج پر ڈراما کرنے کی فکر ہے۔ جس میں اپنی ذات اور اپنی قومی خودی کا جا اور بے جا مظاہرہ کیا جا سکے۔ اور بہت مشکل ہے۔ اس عالمی اسٹیج پر، جہاں کی ہر پھونک دنیا میں ریڈیو اور ٹیلی ویژن اور اخباروں کی وساطت سے طوفان کی طرح پھیل جاتی ہے اور مقرروں کی انانیت کو تسکین دیتی ہے، بہت مشکل ہے اس فضا میں ضبط اور اعتدال کو قائم رکھنا۔ امریکہ اور روس تو دنیا کی قیادت کے غم میں گھلے جاتے ہیں۔ چھوٹی قومیں اور نئی آزاد حکومتیں ابھی تک اپنی آزادی کا بوجھ کرامت کے ساتھ نہیں اُٹھا سکتیں اور ان کو دونوں بین الاقوامی BLOCKS اپنی اپنی طرف کھینچنے میں لگے ہوئے ہیں۔ کیوبا کے کمیونسٹ ڈکٹیٹر کسترو آئے اور انھوں نے اپنی حرکتوں سے اخباروں اور لوگوں میں کافی ہل چل پیدا کی اور ان کی غلط قسم کی بہت پبلسٹی ہوئی اور ساڑھے چار گھنٹے U.N. میں تقریر کر کے انھوں نے اپنے ایک کامیاب DEMAGOGUE ہونے کا ثبوت دیا۔ کرشچیف تو اپنی ذات سے ایک سرکس ہے، نرم اور گرم، کبھی دھمکی اور گالی گفتار اور کبھی ظرافت اور عقل کی باتیں (لیکن وہ بھی ایسے انداز میں کہ اس پر بورژوا نرم گفتاری کا الزام نہ آسکے!) میکملن نے بڑے مدبّرانہ انداز میں تقریر کی، ضبط و متانت کا ثبوت دیا اچھی باتیں کیں، جن کا انداز ان کی مدبرانہ اہمیت سے زیادہ نمایاں تھا۔ جس وقت کرشچیف نے بڑے زور شور سے اپنے سامنے کے ڈیسک کی گھونسوں سے مرمّت شروع کی اور اس کی تقریر کے دوران میں امریکہ، انگلستان وغیرہ کی پالیسی پر متعلق اور غیر متعلق اعتراض کیے تو اس تمام شورش کے جواب میں (بقول ایک صاحب کے) میکملن نے اپنی ایک بھوں کو خفیف سا اُوپر اُٹھا کر صرف اتنا کہا کہ اگر یہ واقعاً کچھ کہہ رہے ہیں تو مہربانی کر کے اس کا ترجمہ کیا

جائے! قومی حقائق میں بڑا فرق ہوتا ہے اور باوجود سب باتوں کے انگریز قوم میں اب بھی بعض خاص اور نمایاں صفات ہیں جو ان کی بین الاقوامی پوزیشن کو سنبھالے ہوئے ہیں ناصر اور ٹیٹو نے بھی اچھا اثر پیدا کیا اور سوکار نو صاحب نے اپنی شان دکھانے کی کوشش کی۔ تقریر کے دوران میں ایک بلند و بالا فوجی افسر زرق برق لباس میں ان کے پیچھے کھڑا ہر صفحہ کو جو ختم ہوتا تھا اُٹھا لیتا تھا۔ (وہ خود اس بوجھ کو شاید نہ اُٹھا پاتے!)۔

ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ اس بین الاقوامی سرکس میں پنڈت جی کی ذات میں ایک امتیازی شان یہ ہے کہ وہ اپنی ذات کا یا قوم کا پروپیگنڈا نہیں کرنا چاہتے بلکہ دراصل عالمی امن کی فکر میں ہیں۔ اور اسی سلسلے میں جس طرف سے (ان کے نزدیک) کوئی معقول بات کہی جاتی ہے اس کا سواگت کرتے ہیں، اپنی طرف سے معقول اور امن آفریں باتیں کہتے ہیں۔ اور قوموں کے نمائندوں کو بار بار، بڑی معقولیت اور اٹک کے ساتھ بتاتے ہیں کہ دھمکیوں اور جھڑکیوں اور گرمیٔ سخن سے صورتِ حال کو بدتر نہ بناؤ بلکہ کم سے کم اتنا کرو کہ گفت و شنید کا راستہ کھُلا رہے۔ نسلِ انسانی کو بچانا اپنے اپنے قومی مفاد اور برتری سے زیادہ اہم ہے۔ ان کی تقریر کا بہت اچھا اثر ہوا۔ بڑی توجہ سے اس کو سُنا گیا اور بہت سے امریکیوں نے تائید کے خط لکھے اور تار بھیجے۔ اخباروں میں بحیثیت مجموعی اس کا اچھا استقبال کیا گیا اگرچہ بعض نے ان کی غیر جانب داری اور ہر معاملے میں روس کی مخالفت نہ کرنے پر اعتراض کیا لیکن اس کی ان کو زیادہ پروا نہیں...... LIFE نے (جو بالعموم ہندوستان کے بارے میں معاندانہ رویہ ہی رکھتا ہے) ایک حالیہ اشاعت میں مختلف مدبرین پر تبصرہ کیا اور حسب معمول "غیر مغربی" لیڈروں پر اعتراض کیے اور پنڈت جی کے بارے میں لکھا HE MAY STRIKE ITS ALTITUDES OF POSING AS THE CONSCIENCE OF MAN-KIND لیکن واقعہ یہ ہے کہ مجھ سے بہت سے امریکن لوگوں نے فرداً فرداً یہ کہا کہ وہ دراصل ان کو "انسانیت کا ضمیر" سمجھتے ہیں اس دور میں۔ لہٰذا STRIKING THE ALTITUDES تو محض کھسیانو چنے والی بات ہے!

نیویارک سے روانگی سے ایک روز پہلے میں نے بہت سے امریکی دوستوں کو چائے پر بُلایا۔ جن سے اپنے کام وغیرہ کے سلسلے میں ملاقات ہوئی تھی اور سب بہت خوشی اور

آمادگی کے ساتھ شریک ہوئے۔ اس سے ایک روز قبل پنڈت جی کے ساتھ ناشتہ کرنے کا موقع ملا۔ اس میں مسٹر اور مسز ہوریس الگزنڈر بھی شریک تھے۔ میں نے دوران گفتگو میں کہا کہ U.N.O. میں بہت سے نمائندے اس طرح تقریر کرتے ہیں جیسے انھیں سب سوالوں کے جواب معلوم ہیں۔ لیکن یہ معلوم نہیں کہ وہ سب جواب غلط ہیں! کہنے لگے کہ یہی نہیں بلکہ بہت سے تو سوالوں کو جانے بغیر جواب دینے کو تیار ہیں!" کارلائل ہوٹل" میں ٹھیرے ہوئے ہیں اور بہت سے ملکوں کے لیڈروں کے برخلاف ان کے ہاں طمطراق نہیں خلوص ہے۔ دوران گفتگو میں ہوریس الگزنڈر نے اپنے تین سال کے پوتے کا قصہ سنایا جو اسٹیشن پر انھیں رخصت کرنے آیا تھا اور پلیٹ فارم پر کھڑا آسمان کو دیکھ رہا تھا جہاں چاند کبھی بادلوں کے پیچھے چھپ جاتا تھا کبھی باہر آجاتا تھا۔ چند منٹ دیکھنے کے بعد ایک دم کہنے لگا WHY DO'NT YOU MAKE UP YOUR MIND MOON, DO YOU WANT TO COME OUT OR HIDE YOURSELF پنڈت جی بہت محظوظ ہوئے۔ لیکن یوں زیادہ تر خاموش اور کسی قدر غمگین تھے۔ حال کے سانحہ کا ان پر خاصا اثر ہے (فیروز گاندھی کا اچانک انتقال)۔

روانگی سے ایک روز قبل کولمبیا یونی ورسٹی TEACHERS COLLEGE کے صدر PRESIDENT LASEWELL نے لنچ پر بلایا جہاں ایران کے وزیر معارف آغائے مہران بھی مدعو تھے۔ انھوں نے بتایا کہ میرے ۱۹۵۸ء کے LECTURES کا پریس اور ریڈیو پر اور کالج کے ٹرسٹیوں وغیرہ میں کافی چرچا رہا اور وہ خواہش مند ہیں کہ کسی شکل میں کالج سے میرا کوئی تعلق قائم رہے۔ لیکن ابھی تو مستقبل کی شکل علمِ الٰہی میں محفوظ ہے۔

امریکہ تو دو دفعہ پہلے آچکا ہوں۔ لہٰذا بہت سے مشاہدات تو تکرار رہی ہیں۔ لیکن کوئی کوئی بات قابلِ ذکر معلوم ہوتی ہے مثلاً یہ کہ ایک تحریک یہ چلی ہے کہ مصنوعی پھولوں کے بعد اب مصنوعی درخت ڈرائنگ روم وغیرہ میں آرائش کے لیے سجائے جائیں۔ (یہ چیز میں نے جاپان میں بھی دیکھی) ان درختوں پر موسم کے اعتبار سے بہار یا خزاں وغیرہ کے رنگ اور پھول دکھائے جاتے ہیں۔ گو مجھے پھولوں اور درختوں کے ساتھ مصنوعی ہونے کا تصوّر نہیں بھاتا لیکن بعض جگہ میں نے دیکھا کہ ان کا منظر (کم سے کم دُور سے) حسین معلوم ہوتا

ہے۔ ان درختوں کی قیمت ۵، ڈالر سے لے کر شاید دو سو ڈالر تک ہوتی ہے (لیکن امریکہ میں ڈالر کی حیثیت ہی کیا ہے؟)۔

ایک بات جس نے مجھے خاصا متاثر کیا وہ یہ ہے کہ یہ لوگ (یعنی جس حلیے اور قسم کے لوگوں سے میری ملاقات رہی) ایک دوسرے کی بُرائی اور چغل خوری سے پرہیز کرتے ہیں۔ کم سے کم میرے سامنے (شاید ایک کیس کے علاوہ) کبھی کسی شخص نے اپنے کسی شریکِ کار یا دوست یا جاننے والے کی بُرائی نہیں بلکہ بعض موقعوں پر میں نے دیکھا کہ وہ بہت فیاضی کے ساتھ دوسروں کی خدمت کا اعتراف کرتے ہیں۔ میں شکاگو میں امریکن کونسل آف ایجوکیشن میں شریک ہوا تھا جہاں اعلا تعلیم کے بعض مسائل زیرِ بحث تھے۔ اس جلسے میں ڈاکٹر ADEMS پندرہ سال تک کونسل کی صدارت کرنے کے بعد اپنے عہدے سے سبکدوش ہو رہے تھے۔ تمام لوگوں نے جس جوش اور خلوص کے ساتھ ان کے کام کو سراہا اس کا میرے دل پر بہت گہرا اثر ہوا۔ میں نے ان تقریروں میں کوئی ریاکاری یا تصنّع کی جھلک نہیں پائی بلکہ خلوص کی گرمی تھی۔ اسی طرح جب سابق کمشنر تعلیم ڈاکٹر سٹوڈ بیکر کو پبلشرز ایسوسی ایشن کی طرف سے رخصتی دعوت اور AWARD دیا گیا اس میں بھی بہت کھُلے دل سے ان کے کاموں کا اعتراف کیا گیا۔ برخلاف اس کے ہمارے ہاں ابھی تک اس معاملے میں خاصی تنگ دلی ہے اور علاوہ اپنے مشاہدے کے میں نے بعض غیر ملکی دوستوں سے بھی یہ سُنا کہ ہندوستانی ذرا سا موقع ملنے پر یا بہت معمولی واقفیت کے بعد ہی ان سے اپنے شرکائے کار اور ہم وطنوں کی شکایت اور تنقید شروع کر دیتے ہیں! مجھے تو ہمیشہ لوگوں کی اچھی باتوں کی تلاش میں لُطف آتا ہے۔ اور جب کسی میں واقعاً کوئی خوبی ہو تو اس کا دوسروں سے تذکرہ کرتے ہیں۔ لیکن بیشتر لوگ اس کو کمزوری یا سادہ لوحی خیال کرتے ہیں اور خرابیوں کی تلاش کرتے ہیں!۔

سفرِ رانچی

۱۹۶۱

۲۱ر فروری

بارہا سوچتا ہوں کہ باقاعدہ ڈائری لکھا کروں خواہ کتنی ہی مختصر ہو لیکن نہ معلوم کبھی یہ ارادہ باقاعدگی کے ساتھ پورا نہیں ہوتا۔ آج وقت کے سمندر کے بیچ میں سے شروع کرتا ہوں!

کل رات پٹنے سے روانہ ہو کر صبح رانچی پہنچا۔ بدانتظامی کی وجہ سے ریل تین گھنٹے دیر سے پہنچی۔ گلہ صرف بدانتظامی کا نہیں بلکہ یہ بھی ہے کہ لوگ اس قسم کی چیزوں کو بغیر احتجاج کے برداشت کر لیتے ہیں۔ گویا وقت کی قیمت نہیں۔ افراد کا اجتماعی نظام پر کوئی حق نہیں۔ EFFICIENCY قومی صفات کا لازمی جزو نہیں ...... راستے میں ایک صاحب ہم سفر تھے جو اینٹوں کے بھٹے کا کام کرتے ہیں۔ رہنے والے دہلی کے ہیں۔ کاروبار رانچی کے قریب ہے۔ کہتے تھے کہ یہاں کے ادیواسیوں کو جب ہفتے کے آخر پر مزدوری ملتی ہے تو وہ اس کو کئی دن تک شراب پینے میں خرچ کرتے ہیں (دوستوں، عزیزوں کو بھی مدعو کرتے ہیں!) اور جب تک وہ ختم نہ ہو جائے کام پر واپس نہیں آتے۔ لہٰذا باقاعدہ کام کی ضرورت ہو تو ان کو اس پر لگانا مشکل ہے.....

ایک اسٹیشن پر جو رانچی کے قریب ہے دیکھا کہ تیس چالیس عورتیں جو سردی میں ایک ہلکی سی ساڑھی کے سوا کچھ نہ پہنتی تھیں اور لنگڑوں کی طرح بچّوں کو گود میں لیے تھیں بیر اور مکئی کے دانے بیچ رہی ہیں لیکن خریدنے والا شاید ہی کوئی ہو۔ ان کے پاس اس کے سوا کچھ نہیں اور ان کے چہروں پر حسرت تھی کہ کوئی کچھ نہ خریدتا تھا..... سوچتا ہوں کہ سوسائٹی اور حکومت نے ان کو کیا دیا ان کے لیے کیا کیا۔ ان کی زندگی میں بھی فطری قوتوں اور جبلتوں کی بدولت المیہ اور بزمیہ ہوں گے لیکن ان میں سماج نے اور تعلیم نے کون سی صلاحیتیں بیدار کیں، کون سے شوق اُبھارے! مجھے رانچی کے وکاس ودیالیہ میں یومِ بانی کے موقع پر بحیثیت مہمانِ خاص کے بلایا گیا تھا۔ یہ پبلک اسکول ایک بہت مال دار کاروباری شخص مسٹر NAPONY نے قائم کیا ہے۔ جن کو تعلیم سے خاص دل چسپی معلوم ہوتی ہے۔ اس کے سکریٹری بہار کے ایک پُرانے کانگریسی کارکن پنڈت N. D. SHASTRI ہیں۔ اور پرنسپل بہار کے سابق ڈپٹی ڈائرکٹر تعلیمات ڈاکٹر D. B. SHASTRI اسکول کا ماحول مجھے اچھا خاصا معلوم ہوا۔ میں نے اپنی تقریر میں طلبا کو بتایا کہ آج کل کی نئی دنیا میں رہنے کے لیے ضرورت ہے کہ تعلیم لوگوں کے دل اور دماغ کی کھڑکیوں کو کھولے اور وہ اپنے اندر ایسی کلچرل اور علمی اور عملی دل چسپیاں پیدا کریں کہ بڑے ہوکر ان کی زندگیاں کھوکلی ثابت نہ ہوں۔ نیز یہ کہ تربیت کے دو بڑے سرچشمے ہیں جن سے ان کو فیض حاصل کرنا چاہیے۔ اچھے اور بڑے انسان اور اچھی اور بڑی کتابیں......

۲۲؍ فروری

آج A. N. SINHA INSTITUTE OF SOCIAL STUDIES میں مجھے تقریر کرنے کی دعوت دی گئی تھی۔ مجمع مختصر لیکن منتخب تھا اور متوجّہ! ایک شخص کو، جو کسی خاص مضمون میں ماہر نہ ہو موضوع کا انتخاب مشکل بھی ہے اور آسان بھی۔ میں نے اس موضوع پر تقریر کی کہ اس زمانے میں جو دنیا بن رہی ہے اس کی تعمیر میں کن لوگوں اور تحریکوں کا حصّہ ہے۔ اور اس کے لیے کس قسم کے دل اور دماغ کی ضرورت ہے۔ اور تعلیم میں کن قدروں پر زور دینے کی

ضرورت ہے میں نے ان میں سے خاص طور پر SOCIAL SENSITIVENESS کی طرف حاضرین کی توجہ دلائی اور کل اسٹیشن پر جو محرومی کا منظر دیکھا تھا اس کی طرف اشارہ کیا۔۔۔ڈاکٹر حمید (بمبئی والے) اور ان کی بیوی بھی یہاں مقیم ہیں وہ بہت دل چسپ آدمی ہیں. طباع' صاحب عزم و عمل اور ساتھ ہی "پندارِ حسن" (یعنی خس پندار و کہ کشاکش با اوست !) میں گرفتار......

ممالکِ اسلامیہ کے سفر

۱۹۶۱

قیامِ لاہور

۱۴ مئی سے ۲۱ مئی تک

اس دفعہ کوئی سات سال کے بعد لاہور آنا ہوا۔ ایک مقصد تو دوستوں عزیزوں سے ملاقات کرنا تھا اور دوسرا ضمنی مقصد پنجاب یونی ورسٹی کے پروفیسروں وغیرہ سے یونسکو کے اس منصوبے کے بارے میں گفتگو کرنا جس سے میرا فی الحال تعلق ہے یعنی یونی ورسٹیوں میں طلبا کے داخلے کے مسائل۔ یونسکو نے اس ضمن میں بین الاقوامی ماہرین کا ایک کمیشن بنایا ہے جو اس منصوبے کی تکمیل کی نگرانی کرے گا۔ اس میں نو ممبر شامل ہیں ڈاکٹر برجر (فرانس) صدر (جن کا ایک حادثے میں انتقال ہو گیا ہے) ڈاکٹر ذریک (بیروت)، ڈاکٹر موریشو (جاپان)، پروفیسر لورائیس (انگلستان)، ڈاکٹر ودلفل (امریکہ)، پروفیسر توردشکنوف (روس)،

ڈاکٹر ملاس (چلی)، ڈاکٹر تے ٹے را (برازیل) اور سیدین (ہندوستان)۔ اس کمیشن کا جلسہ بیروت ہو رہا ہے اگلے ماہ اور مجھ سے کہا گیا ہے کہ میں کراچی، لاہور اور طہران یونی ورسٹی سے راستے میں ان مسائل پر گفتگو کروں۔ یہ ہے لاہور آنے کی ایک منصبی غرض۔ لیکن پہلے سے بھی ارادہ تھا کہ وہاں جاکر دوستوں اور عزیزوں سے ملوں۔

عزیز اور سیدہ میرے ساتھ تھیں۔ سب نے بہت خلوص اور گرم جوشی کے ساتھ سواگت کیا۔ کئی جگہ جلسوں میں (خلاف مرضی!) تقریریں کرنی پڑیں۔ لٹریری لیگ، علی گڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن میں، مجلسِ فکرونظر میں، ایڈمنسٹریٹو اسٹاف کالج وغیرہ میں۔ تقریر کا ایک موضوع تھا "صحیح قدروں کی ترویج قومی زندگی میں" اور دوسرا ایک نئی دنیا کے لیے نئے انسان کی تربیت نئی دنیا کے تقاضے، اسٹاف کالج میں ADMINISTRATION کے بنیادی اصولوں سے بحث کی تھی اور اس بات پر زور دیا تھا کہ ان میں انسانی ہمدردی اور سمجھ داری کا رنگ غالب ہونا چاہیے۔ باتیں غیر معمولی نہ تھیں۔ لیکن لوگوں نے بظاہر کافی پسند کیا اور میں نے اس قسم کی باتوں اور اصولوں کو بیان کرنے میں حتی الامکان مصلحت کے بجائے صداقت سے کام لیا اور قومی زندگی کی تعمیر کے اصولوں پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی۔ بعض دوستوں کا اصرار تھا کہ اب جو کچھ کرنا اور کہنا ہے وہ اسی ملک میں آکر کرنا چاہیے لیکن میں نے یہ عرض کیا کہ یہ درست نہیں۔ ہندوستان میں کام کرنے کے بہت موقع ہیں۔ اور جس قدر جہاں مشکلیں زیادہ ہوں اسی قدر وہاں "تلخ ترنوا" کی ضرورت ہے۔ آخر ۴ کروڑ مسلمانوں کو چھوڑ کر اپنے لیے ساحلِ عافیت تلاش کر لینا کہاں تک جائز ہے؟۔

ایک پریس کے نمائندے تشریف لائے اور کہا کہ میں SCRIPT کے بارے میں دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ آپ کی رائے میں ہمیں کیا پالیسی اختیار کرنی چاہیے۔ میں نے کہا کہ میرا خیال ہے کہ اُردو رسمِ خط تو بطور ایک مشترک رسمِ خط کے سب کو سیکھنا چاہیے لیکن دوسری تمام زبانوں اور ان کے رسمِ خط کو ترقی دینے اور سیکھنے کی سہولتیں ان زبانوں کے بولنے والوں کو ملنی چاہئیں۔ میں نے یہ بھی کہا کہ کسی ملک کی تمام بڑی زبانیں در اصل قومی زبانیں ہیں، اسی معنی میں کہ وہ قوم کی دولت ہیں۔ کسی اقلیت کو یہ احساس نہ ہونا

چاہیے کہ اس کو دبانے کی کوشش کی جا رہی ہے. ثقافتی معاملات میں فراخ دلی اور رواداری سے بڑھ کر کوئی بہتر اور دانش مندانہ پالیسی نہیں. اس بیان کو بعض لوگوں نے پسند کیا لیکن بعض نے اعتراض کیا کہ اسی اصول کی آڑ لے کر لوگ پنجابی، سندھی وغیرہ کے لیے بھی قومی زبان کا درجہ مانگیں گے. میں نے کہا کہ میں اصول کو صحیح سمجھتا ہوں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ سب زبانیں "سرکاری" زبانیں ہوں گی. باہمی لین دین اور کاروبار کی سرکاری زبان اور چیز ہے اور "قومی زبان" دوسری چیز "مکتبہ فرینکلن" کے منیجر حامد علی خاں (جو ایک زمانے میں ہمایوں میں کام کرتے تھے) اس پر خاص کر کے معترض تھے مجھے بالآخر یہ کہنا پڑا کہ پریس نے مجھ سے میری رائے دریافت کی تھی، ان کی رائے نہیں!

میں نے دیکھا کہ بحیثیت مجموعی جن لوگوں کو پانی پت سے (یا دوسری جگہوں سے) میں جانتا تھا ان کی مالی حالت پہلے سے بہتر ہے. ان میں سے بیشتر نے اپنے COMPENSATION وغیرہ کے مطالبات حاصل کر لیے ہیں اور چوں کہ مطالبات کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا تھا (بالعموم) لہٰذا وہ مکانوں اور زمینوں وغیرہ کے اعتبار سے فائدے میں رہے ہے. ان میں سے بعض کے بچّوں کو ولایت میں تعلیم پانے کا موقع ملا اور اکثر کو اچھی یا معمولی نوکریاں مل گئی ہیں. یہی بات میں نے کراچی میں بھی دیکھی. مثلاً بعض نوجوان پانی پت کے جو COST ACCOUNTANT وغیرہ ہو کر آئے ہیں دو تین ہزار روپیے ماہوار کماتے ہیں لیکن دو باتوں سے ذرا تکلیف ہوئی. ایک تو بعض بہت ہی متدین لوگوں نے جائداد کے مطالبات کے بارے میں حق گوئی کے بجائے جھوٹ سے کام لیا (دنیا کی خاطر روح کا سودا؟) اور دوسرے جب کسی سے پوچھتا تھا کہ فلاں کا کیا حال ہے، وہ کیسا کام کر رہا ہے تو پہلا جواب یہ ملتا تھا کہ وہ اس قدر کما رہا ہے یعنی زندگی کی کامرانی اور کامیابی کا معیار روپیہ کی یافت ہے. نہ علم، نہ خدمت، نہ شرافت!

بعض خاندانوں سے مل کر خوشی ہوئی مثلاً ملک فضل حق مرحوم اور سیّد تجمّل حسین مرحوم کی اولاد نے نہ صرف اچھی دنیاوی ترقی کی ہے بلکہ نیک نامی حاصل کی ہے اور (ڈاکٹر) ذکی حسن کی شہرت کراچی میں بحیثیت ڈاکٹر اور بحیثیت ایک شریف اور سیر چشم انسان کے اچھی ہے..... مگر بالعموم لوگ ایک دوسرے کی چغل خوری کرتے ہیں، حسد کرتے ہیں، کلمۂ خیر

کہنے میں بخل اور بدگوئی میں سخاوت کرتے ہیں! ہم لوگوں سے ہر شخص محبت اور خلوص سے ملا۔ لیکن آپس میں مراسم اچھے نہیں۔ یہ بات میں نے ہندوستان اور پاکستان میں بارہا نوٹ کی ہے کہ (برخلاف دوسرے ملکوں کے) لوگ ایک دوسرے کی اچھائی کرنے یا اچھی باتوں کو تلاش کرنے کے عیب جوئی کے عادی ہیں۔ میں نے شاید ہی کسی انگریز یا امریکی کو (خصوصاً جو لوگ علمی اور تعلیمی میدان میں کام کرتے ہیں) ایک دوسرے کی بُرائی کرتے سُنا ہے۔ اور کس قدر تاکید ہے۔ ہمارے مذہب میں کہ "اپنے دوستوں اور عزیزوں کا گوشت نہ کھاؤ!"

قیام کے دوران میں وقار عظیم کے ساتھ جا کر کتابوں کی دکانیں دیکھیں۔ عزیز کا ہر دوکان والے کو یہ فرمان تھا کہ عورتوں کی لکھی ہوئی کتابیں پیش کرو! اندازہ ہوا کہ کتابیں خاصی تعداد میں شائع ہو رہی ہیں۔ لیکن علمی اور سنجیدہ کتابوں کی کمی ہے۔ مکتبہ فرینکلن (جو ایک امریکی ادارہ ہے یا کم سے کم ڈالر کا کرشمہ ہے) ترجمے بھی شائع کر رہا ہے۔ بعض ناشروں سے اس بارے میں بھی تذکرہ ہوا کہ وہ میری کچھ چیزیں شائع کرنا چاہتے ہیں۔ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی سے ملاقات ہوئی۔ وہ اپنی تالیفی کوششوں میں لگے ہوئے ہیں اور آج کل مولانا حالی کی ایک مبسوط لائف کے لیے مواد فراہم کر رہے ہیں۔ ادبی دنیا والے صلاح الدین احمد صاحب نے حیاتِ جاوید کا ایک نیا اڈیشن شائع کیا ہے۔ محکمۂ تعلیم کے ادارہ مطبوعات کے ڈائرکٹر (زیدی) نے یہ بھی درخواست کی کہ میں انھیں کوئی چیز شائع کرنے کے لیے دوں۔ خیال ہے کہ اگر ان کو منظور ہو تو FAITH OF AN EDUCATIONIST ان کی نذر کروں۔

اسلامیہ کالج کے پرنسپل نے بھی اپنے اسٹاف سے ملاقات کرنے کو بلایا تھا دعوت کے بعد تقریر کی ناگزیر درخواست۔ مجھے اور تو کچھ خیال نہیں آیا لیکن میں نے اس بات پر زور دیا کہ کسی قوم میں اہلِ فکر کا کیا مقام اور کیا فرض ہے اور اچھی قدروں کی تفسیر اور اشاعت ہی ان کا اصلی کام ہے۔ اگر یہ قدریں معرضِ خطر میں ہوں تو ان کو باوجود رائے عامہ یا حکومت کی مخالفت کے مضبوطی کے ساتھ پیش کرنا چاہیے۔ سیاست کا میدان کارزار یا کاروبار کی منڈیاں اس فرض کو ادا نہیں کر سکتیں۔

امرتسر پر سفر کے دوران میں "ڈال ڈال پات پات" کے مصنف برہم ناتھ دت سے

ملاقات ہوئی۔ یہ ایک صوفی منش انسان ہیں۔ جن کے اس مجموعۂ خطوط پر میں نے مقدمہ لکھا ہے ان کے اندازِ فکر میں میں نے نہایت صالح قدروں کی جھلک دیکھی ہے اور اندازِ بیان شگفتہ اور پختہ پایا ہے۔ تقسیمِ ہند کی قیامت بھی ان کی انسانی دوستی کو ایک ذرہ برابر متاثر نہیں کر سکی۔ کس قدر کم ہیں اس قسم کے لوگ۔ اب ان دونوں ملکوں بلکہ دنیا میں اسی وجہ سے (گو میں ان سے پہلی دفعہ ملا ہوں) میرے دل میں ان کی بہت قدر ہے۔

شیخ محمد اسماعیل پانی پتی ملنے آئے۔ ان سے معلوم ہوا کہ وہ ایک مفصل سوانح حیات مولانا حالی کی مرتب کر رہے ہیں۔ یہ کام اب تک کسی چوٹی کے ادیب کو کرنا چاہیے تھا لیکن نہیں ہوا۔ مصداق کی "یادگارِ حالی" نے ایک حد تک اس کمی کو پورا کیا تھا۔ لیکن وہ دراصل اس مفصل اور مستند لائف کی تمہید ہے۔ شیخ صاحب میں اس کام کی تخلیقی صلاحیت تو نہیں لیکن امید ہے وہ محنت اور سلیقے کے ساتھ جو مواد بھی مل سکے گا اس کو ترتیب ضرور دے سکیں گے۔

یونی ورسٹی کے اربابِ حل و عقد، صدر محکمہ جات اور کالج کے پرنسپلوں سے گفتگو کی اور یونی ورسٹی میں داخلے کے جو مسائل وہاں درپیش ہیں ان کے بارے میں تبادلۂ خیال کیا۔ اندازہ ہوا کہ یہاں بھی صورتِ حال سے عام بے اطمینانی ہے۔ نالائق طلبا بڑی تعداد میں داخل ہوتے ہیں۔ پچاس ساٹھ فی صدی اور بعض دفعہ اس سے بھی زیادہ ایف، اے اور بی اے وغیرہ کے امتحانوں میں فیل ہوتے ہیں۔ ہر ذہین اور ہوشیار طالبِ علم کو اعلا تعلیم ملنے کا انتظام نہیں ہے۔ وظیفے کم ہیں اور عام ذہنی معیار خراب۔ لیکن یہ سب کچھ جاری ہے، لوگ اس پر ناخوش ہیں۔ لیکن اس کا علاج نہیں ہوتا!۔

(کراچی) ۲۲ مئی تا ۲۸ مئی

لاہور سے واپسی پر ایک ہفتے ٹھیرتا ہوا کراچی پہنچا اور یہاں چھ روز قیام رہا آپا کے ہاں جن کا وجود اور محبت زندگی کی نعمتوں میں سے ہے۔ یہاں بھی لاہور کی طرح بہت سے عزیزوں اور دوستوں سے ملاقات ہوئی۔ اور سب بہت تپاک سے ملے۔ یونی ورسٹی

کے اساتذہ اور مقامی کالجوں کے پرنسپلوں سے گفتگو رہی جس میں پنجاب کی صورتِ حال ہی کو دہرایا گیا سوائے اس کے کہ کراچی میں آبادی کے بڑھ جانے اور اس کے صدر مقام بن جانے سے بعض خاص مشکلیں اور پیچیدگیاں پیدا ہوگئی تھیں جن سے حکومت اور یونی ورسٹی ابھی تک عہدہ برآ نہیں ہوسکی۔ کالجوں میں اکثر داخلے بغیر کسی پالیسی کے ہوتے ہیں اور فیس بڑھانے کی وجہ سے بہت سے پرائیویٹ کالجوں کو تعداد کم کرنے کی ہمت یا خواہش نہیں ہوتی!۔

کراچی یونی ورسٹی اپنے نئے "کیمپس" میں پہنچ گئی ہے۔ ابھی تو تعمیر کا سلسلہ بہت کچھ باقی ہے لیکن امید ہے کہ جب سارا منصوبہ مکمل ہوجائے گا تو یہ ایک اچھی یونی ورسٹی بن جائے گی۔ ہاشمی صاحب ابھی تک وائس چانسلر ہیں (لیکن عنقریب ان کی جگہ اشتیاق حسین قریشی آنے والے ہیں)۔ وہ تپاک سے ملے اور بہت خلوص سے اپنی تعریف کرتے اور کارنامے گناتے رہے۔ اسٹاف میں زیادہ تر سینیر لوگ علی گڑھ کے ہیں۔ ان میں سے چند اپنے کام میں اچھے معلوم ہوئے۔ ان کی تنخواہیں ہندوستان سے زیادہ ہیں اور ایک دل چسپ جدت یہ ہے کہ اگر کوئی پروفیسر کوئی مستند مقالہ یا کتاب شائع کرتا ہے تو اس کو دو سالانہ اضافے تنخواہ میں دیے جاتے ہیں! ایک ادارہ تصنیف و ترجمہ بھی ہے جس میں خاصا کام ہو رہا ہے۔

میں نے جامعہ تعلیمِ ملّی کو بھی جاکر دیکھا جس نے گزشتہ چند سال میں ڈاکٹر محمود حسین کی نگرانی میں کافی ترقی کی ہے۔ وہاں سجّاد صاحب (آرٹسٹ) سے ملاقات ہوئی جنھوں نے اس عرصے میں جامعہ کے لیے بیس کے قریب مشاہیرِ عالم کی روغنی تصویریں بنائی ہیں (جن کے بارے میں ان کی رائے مجھ سے زیادہ بہتر ہے!) اور ایک عدد ڈیڑھ سالہ بچّے کے باپ ہوگئے ہیں۔ ان کو تصویریں بنانے کا خاصا کام مل جاتا ہے جس سے ان کی مالی حالت بہتر ہے۔ جامعہ کے اساتذہ سے اس بارے میں گفتگو رہی کہ مسلمانوں کو ہندوستان اور پاکستان میں کیا کرنا چاہیے اور ساتھ ہی یہ سوال کہ آیا ہندوستان میں ان کا کوئی مستقبل ہے یا نہیں۔ آخری سوال کا جواب میں نے وہی دیا جو دوسرے موقعوں پر دیا ہے یعنی یہ خود مسلمانوں کی سیرت، ان کی تعلیم، ان کی کوشش پر منحصر ہے۔ چار کروڑ لوگوں کی قسمت کا

فیصلہ کوئی دوسری جماعت نہیں کرسکتی۔ اگر ان میں اکلِ حلال اور صدق مقالی کی صلاحیت ہوگی اور وہ جرأت کے ساتھ اپنے مذہب اور تہذیب کی اسلامی اور انسانی قدروں کی سیوا کریں گے تو کوئی قوت ان کو مستقل طور پر نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ اگر وہ شکست خوردگی کو شعار بنالیں گے اور خیرات کا منہ دیکھیں گے تو کوئی قوت انھیں ایک زندہ اور کارگزار جماعت نہیں بنا سکتی۔ دراصل دونوں ملکوں میں مسلمانوں کا طرزِ عمل یہی ہونا چاہیے کہ وہ ایک اچھی زندگی کا نمونہ دنیا کے سامنے پیش کریں۔

کراچی میں ایک صاحب ہیں پیر حسام الدّین (جو فلپین کے سفیر راشدی صاحب کے بھائی ہیں۔ لیکن بہت اچھے آدمی ہیں) وہ لکھنے پڑھنے والے آدمی ہیں۔ ایک اچھی ذاتی لائبریری کے مالک ہیں۔ انھوں نے دعوت پر بلایا اور بہت سے مقامی مشاہیر اور بعض شعرا کو مدعو کیا۔ ان میں ماہر القادری صاحب کا کلام اچھا تھا اور حفیظ صاحب کا جلوت و خلوت میں یہ اصرار کہ تم صرف اقبال کی تعریف کرتے ہو میری کیوں نہیں کرتے! میں نے مجبور ہوکر کہا کہ "بات یہ ہے کہ میں موحد ہوں!" مجھے اس بات پر اکثر تعجب ہوتا ہے کہ لوگ اس درجہ خوش فہمی میں کیوں مبتلا رہتے ہیں اپنے بارے ہیں!

ایک روز آپا کے طفیل آفتاب احمد صاحب (سابق I.C.S.) کے ہاں دعوت ہوئی یہ ذکیہ (مسز اختر حسین سفیر پاکستان در ایران) کے بھائی ہیں اور اس طرح عزیز کے خالہ زاد بھائی ہوئے۔ ان کی والدہ باجی بیگم کی بہن ہوتی ہیں۔ ان کا قصّہ دل چسپ ہے۔ دو سال ہوئے انھیں (SCREENING) کے سلسلے میں ملازمت سے علیحدہ کر دیا گیا تھا۔ انھوں نے کچھ عرصے کے بعد (بیان کیا جاتا ہے) اس سازش میں حصّہ لیا جو حکومت کو اُلٹنے کے لیے کی گئی تھی اور جس میں پاکستانی فوج کے کئی بڑے افسر شریک تھے۔ دوسرے لوگوں کے ساتھ انھیں بھی دس سال کی قید کی سزا ہوئی لیکن چند ہفتے ہوئے انھیں حکومت نے (دوسرے لوگوں کے ساتھ) رہا کر دیا۔ اب یہ ایک خاصے عالی شان مکان میں رہتے ہیں۔ خوب پارٹیاں دیتے ہیں۔ لیکن ان کی نگرانی اب بھی کی جاتی ہے۔ ان کی قید کے زمانے میں راحت نے ان کی بیوی کی بہت مدد کی اور خود ان کو بھی تکلیف نہیں ہونے دی۔ اس سے ان کی انسانی ہمدردی اور ایک

حد تک جرأت کا ثبوت ملتا ہے۔ ان سے غالباً کہا گیا کہ بیگم آفتاب کی دست گیری نہ کریں۔ لیکن انھوں نے جواب دیا کہ ان پر کوئی الزام نہیں ہے اور ایسی حالت میں ان کو اس سے منع نہیں کیا جاسکتا کہ وہ ان کی دوستانہ مدد کریں۔

بھائی حامد نے ایک بہت سلیقے کا اور خوبصورت مکان بنا کر جرمن سفارت خانے کے سکریٹری کو کرایہ پر دے دیا ہے۔ معقول کرایہ آتا ہے۔ یہ بھی اسی بات کا ثبوت ہے جس کا میں نے لاہور کے سفر میں ذکر کیا تھا یعنی ہندوستان سے آئے ہوئے بہت سے مہاجرین کی اقتصادی حالت پہلے سے بہتر ہے۔ پانی پت میں رہنے والے اس زمانے میں اس قسم کے مکان بنانے کا خیال بھی نہیں کر سکتے تھے!

سفرِ ایران۔ ۲۸ مئی سے ۴ جون تک

ایران تین سال کے بعد آنا ہوا اور ہر دفعہ جب شعر و ادب، ذوقِ سخن، خوش باشی اور طباعی کے اس ملک میں آنا ہوتا ہے دل اس کی طرف کھنچتا ہے۔ آدابِ مجلس میں، شیریں کلامی میں، شگفتگی میں یہ لوگ اپنی نظیر آپ ہی ہیں لیکن زندگی کے مسئلے صرف ان صفات سے حل نہیں ہوتے۔ مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی ہیں اور وہاں ابھی بہت گنجائش ہے آہ و فغاں کرنے کی!۔

کراچی سے صبح کے پونے دس بجے روانہ ہوا اور بوئنگ جہاز سے (جو جیٹ پلین ہے) مقامی وقت کے اعتبار سے گیارہ بجے پہنچ گیا۔ شاید کُل وقت سفر میں تین گھنٹے کے قریب لگا ہو۔ طیّ الارض کے یہ معجزے اب اس قدر پیش پا افتادہ سے ہو گئے ہیں کہ انسان کا ذہن ان کا عادی ہو گیا ہے۔ اور اس غیر معمولی اور بے اندازہ سائنٹفک قوت اور علم کا اندازہ نہیں کر پاتا جس کی بدولت یہ ممکن ہو گیا ہے۔ ۱۹۳۱ء میں جب پہلی مرتبہ آیا تھا تو دہلی سے براہِ کوئٹہ، دزداب، مشہد، طہران تک پہنچنے میں صرف سفر میں غالباً سات آٹھ دن لگے تھے۔ اگر یہ "مہینے کے راستوں کا پلوں میں کٹنا" نہیں ہے تو کیا ہے؟ لیکن دوسری طرف دیکھیے تو اس سفر کا مطلب محض قطع مسافت ہے۔ روانگی اور ورود کے

بیچ میں نہ زمین سے تعلق ہوتا ہے نہ لوگوں سے ربط۔ نہ کسی قسم کے تعلیمی تجربات ہوائی جہاز میں ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کسی کلب کے آراستہ کمرے میں بیٹھے ہوں۔ جہاں کے دوسرے ممبروں سے ملاقات بھی نہیں۔

ایران میں جب کبھی آنا ہوتا ہے ذہن پر اثرات کا ایک عجیب سا MOSAIC تیار ہوتا ہے۔ ایک طرف تو جیسا میں نے اُوپر ذکر کیا ان لوگوں میں ایک خاص مجلسی کشش اور شیرینی ہے اور بات چیت کا انداز ایسا دل کش ہے کہ اس کی تعریف کرنی ہوتی ہے۔ یہاں بقول ایک صاحب کے "ہر شخص خانم اور آغا" ہے۔ مزدور اور جاروب کش سے بھی انھیں لفظوں کے ساتھ اور اسی قدر خوش اخلاقی سے خطاب کریں گے۔ "قربانت شوم" (جس کو یہاں بول چال کے اختصار میں " غربم " کہتے ہیں) نہ صرف تکیۂ کلام ہے بلکہ اس انداز سے ادا کرتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر فوراً ان کو اس خوفناک ارادے سے نہ روکا گیا تو یہ یقیناً قربان ہو جائیں گے۔ (گو ظاہر ہے کہ اس قسم کا ارادہ ان کے حاشیۂ خیالی میں بھی نہیں ہوتا!)۔ پھر ادب اور شاعری نے جن اصطلاحوں اور شیریں لفظوں سے آگاہ کیا ہے وہ ان کی زندگی میں چاروں طرف سنائی اور دکھائی دیتی ہیں۔ مثلاً ایک ہی نواح میں میں نے کوچہ گُل، کوچہ مینا، گلستانِ کاخ کے نام کی گلیاں دیکھیں اور غالب کو "آرائشِ خمِ کاکُل" کی جو حسین تشبیہہ سوجھی تھی وہ "سلون آرائشِ کاکُل" کی شکل میں ہر حجّام کی دوکان کا نام ہے! اس طرح اخباروں کے نام سے بھی طباعی اور خوش مذاقی ظاہر ہوتی ہے۔ مثلاً مہرِ ایران، صدائے مردم، ندائے سپہر، نور و ظلمات، مرد مبارز یا کیہان (بمعنی کائنات جو انگریزی اور فارسی دونوں میں نکلتا ہے اور ایک اعلا معیار کا روز نامہ ہے جس میں علیحدہ بین الاقوامی خبروں کو پیش کرنے کے طہران اور ملک کی روز مرّہ کی زندگی اور واقعات کی خبریں بھی ایک دل چسپ یا سبق آموز طریقے پر پیش ہوتی ہیں)۔ اخباروں کے ذکر پر خیال آیا کہ آج کل سیاسی بحث و مباحثہ اور جماعتوں کی باہمی کش مکش کا بازار خاصا گرم ہے اور حکومت کو جدید اصلاحیں رائج کرنے میں کافی محنت اور کاوش کرنی پڑے گی۔ اندازہ کیا جاتا ہے کہ موجودہ وزیرِ اعظم علی امینی کو اس ضمن میں کامیابی ہوگی۔ ان کا پروگرام کافی AMBITIONS ہے۔ اس کا سب سے بڑا عنصر گوزمین

کی بہتر تقسیم ہے جو ہر ملک میں (مع ہمارے!) ایک بہت کٹھن مرحلہ ثابت ہوا ہے۔ ایران کے وزیرِ زراعت حسن عسر نجانی ایک قابل اور سخت گیر قسم کے آدمی ہیں۔ (باندازِ مرارجی ڈیسائی!) جن کا پروگرام یہ ہے کہ بڑی بڑی جائدادوں اور زمینوں کو، خواہ وہ حکومت کی ہوں یا دولت مند افراد کی، کاشت کاروں میں تقسیم کر دیا جائے تاکہ ان لوگوں کا معیارِ زندگی کچھ بہتر ہو اور دل لگا کر کام کرنے کی بدولت پیداوار میں اضافہ ہو۔ (شاید ۱۵ سال قبل شاہ ایران نے شاہی زمینوں کی تقسیم کا اعلان کیا تھا۔ لیکن معلوم نہیں اس پر کہاں تک عمل درآمد ہوا ہے...... گزشتہ سال مجلس نے ایک قانون بھی اس بارے میں پاس کیا ہے)۔ گزشتہ دس سال کی کوشش ابھی تک معلق رہی ہے۔ زمین کا معاوضہ ۱۵ سال کے پونڈوں کی شکل میں مالکوں کو دیا جائے گا۔ اور بھی دل چسپ باتیں عسر نجانی نے کہیں۔ "اپنا روپیہ پیرس اور اوپرا کے عیش خانوں میں صرف کرنے کے لیے باہر بھیجنے کی کوشش نہ کرو۔ ان کو یہیں صنعت وحرفت کی ترقی میں لگاؤ۔ اپنے گاؤں میں واپس جا کر اس بات کی کوشش نہ کرو کہ کسان پہلے کی طرح تمھاری بندگی اور تعظیم وتکریم کریں۔ طلبا کو چاہیے کہ وہ گاؤں میں جا کر کسانوں کی خدمت کریں"۔ اس بارے میں اس ماہ کی زراعتی کانفرنس میں جو مفصل رزولیوشن پاس ہوا اس میں اس مسئلے کے ہر پہلو سے بحث کی گئی ہے (لیکن سوال یہ ہے کہ یہ طباع قوم جو بہت اچھی تقریریں کر سکتی ہے اور ریزولیوشن "بنا سکتی" ہے ان پر عمل کرنے کی عملی صلاحیت اور استقلال بھی رکھتی ہے یا نہیں؟)...... اس زراعتی اصلاح کے علاوہ ایران کی سب سے بڑی مشکل اور سب سے کٹھن مسئلہ ملک کی زندگی اور طرزِ رہائش میں کفایت کی اسپرٹ پیدا کرنا اور عام بددیانتی اور رشوت ستانی کی روک تھام ہے جو ایک مرضِ مزمن بن کر رہ گئی ہے۔ اور جس کی وجہ سے آج کل حکومت بہت سے سول اور فوجی حکام پر عدالت میں مقدمے چلا رہی ہے۔ صنعتی پالیسی کے بارے میں حکومت کا اندازِ خیال یہ ہے کہ بجائے بہت بڑے منصوبے چلانے کے مثلاً فولاد کی ساخت کے، چھوٹے اور منجھولے پیمانے پر صنعتیں اور دست کاریاں رائج کی جائیں۔ بڑی بڑی عالی شان عمارتیں بنانے کا جو خبط چلا آتا ہے اس کی روک تھام کی تجویز بھی ہے۔

سرکاری ملازم اس وقت بہ یک وقت تین تین مختلف جگہوں سے تنخواہ پاتے ہیں۔ اس طریقے کو بند کرنے کا خیال ہے لیکن اس میں بعض دل چسپ رکاوٹیں ہیں۔ مثلاً پروفیسروں کی تنخواہیں ناکافی ہیں اور ان کے معیارِ زندگی کے مقابلے میں بالکل ہی کم۔ مجھے بتایا گیا کہ ایک یونی ورسٹی کے اچھے تعلیم یافتہ "ولایت پاس" استاد کو بعض دفعہ وہی تنخواہ ملتی ہے جو وہ اپنے یا اپنے کالج کے شوفر کو دیتا ہے یعنی کوئی ۶۰۰ ریال۔ اب وہ اس کمی کو کیسے پورا کرے۔ یہ استاد ایک ہی وقت میں کئی کام اور کرتے ہیں۔ مثلاً اکنامکس کے پروفیسر ڈاکٹر فرمان فرمایاں استاد کی حیثیت سے چھ سو یا آٹھ سو ریال کماتے ہیں اور مکتبہ فرنیکلن سے ترجمے اور ادبی مشورے کی تین ہزار ریال تنخواہ پاتے ہیں! یونی ورسٹی کے وائس چانسلر جو ایک قابل ڈاکٹر ہیں پریکٹس کرتے ہیں، کلینک چلاتے ہیں۔ کئی کمپنیوں کے ڈائرکٹر ہیں اور اس طرح اپنے وسیع خاندان کی پرورش اور تعلیم کا خرچ اُٹھاتے ہیں۔ ایک دوسرے سائیکولوجی کے پروفیسر (ڈاکٹر صناعی) بحیثیت PSYCHOLOGIST کے کام کرتے ہیں۔ اس لیے کم سے کم تعلیم میں ایسے لوگوں کی خدمات حاصل کرنے کے لیے جو اپنی پوری توجہ اور وقت علمی کاموں میں صرف کریں تنخواہیں بڑھانے کی ضرورت ہوگی۔ ممکن ہے اسی قسم کی پالیسی دوسرے محکموں میں بھی رائج کرنی ہو لیکن یہ طریقہ بہرحال زیادہ مفید ہے۔

ایرانیوں کے موجودہ پروگرام پر نظر ڈالتا ہوں تو ایک دل گرمائے خیال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جس قسم کی چیزیں قوم کو بنانے اور ان کی سیرت کو مضبوط کرنے کے لیے آج کہی جا رہی ہیں ان کو پچاس سال قبل والد مرحوم نے خاص طور پر ایران کے لیے اپنی تقریروں، تحریروں اور عصرِ جدید کے کالموں کے ذریعہ ایرانیوں کے سامنے پیش کیا تھا اور وہ باتیں آج بھی اتنی ہی مناسب اور اہم ہیں جتنی اس وقت تھیں مثلاً قوم کے کیرکٹر کی اصلاح کے بغیر آزادی اور جمہوریت حاصل نہیں ہو سکتی۔ اعتدال اور کفایت کی جڑوں کو مضبوط کرنا چاہیے، بجائے دوسروں پر سہارا لینے کے خود اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا چاہیے اور بجائے ہر بات کا الزام دوسروں پر رکھنے کے اپنی اخلاقی اور عملی ذمہ داری کو خود قبول کرنا چاہیے (ایک اخبار نے اس ذہنیت کو VOODO PHOBIA کا نام دیا ہے۔ یعنی جو کچھ برائی ہوتی ہے وہ انگریز یا روسی یا کوئی اور قوم

کراتی ہے!) ملک سے فضول خرچی کا خاتمہ ہونا چاہیے اور زندگی میں سادگی پیدا ہونی چاہیے۔ جماعتی اور حکومتی زندگی میں جہاں کہیں رشوت ستانی اور بددیانتی ہو اس کو توڑنا چاہیے۔ ان باتوں کو ملک کی زندگی اور سیرت کا جزو بنانا آج بھی سب سے بڑا قومی منصوبہ ہے۔

یہاں کا اسکول آف سوشل ورک جاکر دیکھا۔ اس کی ڈائرکٹر ڈاکٹر ستارہ فرمان فرمایاں ہیں جو قاچاری خاندان سے تعلق رکھتی ہیں اور ایک کانفرنس کے سلسلے میں ہندوستان آچکی ہیں۔ (یہ ایک بڑا نامور خاندان ہے جو باوجود معزول شاہی خاندان ہونے کے تعلیم کے میدان میں بہت ممتاز ہے۔ ان کے باپ کے ۳۲ لڑکے اور لڑکیاں ہوئیں جن میں سے شاید ۱۸ یا ۲۰ نے امریکہ وغیرہ سے ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں لی ہیں اور تعلیم اور دوسرے شعبوں میں کام کر رہے ہیں۔ موجودہ وزیرِ اعظم علی امینی ان کے چچا ہیں اور سابق وزیرِ اعظم مصدق بھی ان کے قریبی عزیز ہیں۔ علی امینی کی والدہ ایک بہت غیر معمولی اور مدبر خاتون بیان کی جاتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ موجودہ شاہی خاندان اور اس خاندان میں زیادہ "محبت ضائع نہیں ہوئی" اور شاہ نے علی امینی کو وزارت اس لیے سپرد کی ہے کہ اس کے بغیر چارہ نہ تھا!)۔ اس اسکول میں تیس کے قریب لڑکے اور لڑکیاں تعلیم پاتی ہیں اور ڈائرکٹر کو ملک کی سماجی خرابیوں کا شدید احساس ہے جو وہ ان طلبا میں بھی پیدا کرنا چاہتی ہیں ..... دو تین سال قبل طہران کے یتیم خانوں کی حالت بہت ہی شرمناک تھی۔ بچوں کی صحت بالکل خراب تھی۔ ان کی خوراک کا روپیہ منتظمین کے پیٹ میں جاتا تھا۔ ہر طرح کی بددیانتی کا دور دورہ تھا۔ اس کام کی ذمہ داری بہت لڑنے جھگڑنے کے بعد ڈاکٹر فرمایاں اور ان کے اسکول نے لے لی۔ (اس کے صلے میں ان کے خلاف پروپیگنڈہ ہوا کہ یہ تو بہائی ہیں!) اور چھ مہینے کے اندر اندر بچے پہچانے نہ جاتے تھے۔ (میں نے ان کی تصویریں دیکھی ہیں؛ انتظام سے پہلے اور اس کے ۶ ماہ کے بعد کی!)۔

ہندوستان کی تعریف اور اس کے کاموں کی قدردانی یہاں بھی سننے میں آئی۔ مثلاً ڈاکٹر فرمایاں نے وہاں کے سوشل ورک کی بہت تعریف کی (میں نے اسکول کے طلبا کو اپنے مختصر سے لیکچر کے دوران میں بتایا تھا کہ کچھ تو سوشل ورک کی ہندوستان میں قدیم روایات ہیں اور کچھ گاندھی جی کی تحریک نے اس کو بہت مضبوط اور منظم کیا تھا)۔ اس طرح ہمارے سیاسی

اور سماجی نقطۂ نظر اور پروگراموں کی ڈاکٹر محمود صناعی نے تعریف کی۔ یہ تعلیم اور سائیکولوجی اور تحلیلِ نفسی کے ماہر ہیں۔ یونی ورسٹی میں پڑھاتے ہیں۔ کتابیں لکھی ہیں (جن میں سے ایک تعلیم وتربیت پر ہے) اور صاحبِ طرز ادیب اور شاعر ہیں۔ میرے ایران آنے سے چند روز پہلے (یا شاید انھیں دنوں میں) ایک بہت بڑا پبلک جلسہ کوئی پچاس ہزار یا زیادہ آدمیوں کا ہوا تھا جس میں علی الاعلان یہ مطالبہ کیا کہ ایران کو پنڈت نہرو کی طرح ایک " غیر جانبدارانہ NEUTERAL پالیسی بین الاقوامی معاملات میں اختیار کرنی چاہیے اور کسی BLOCK کا ضمیمہ نہیں بننا چاہیے۔ اور یہ تو بہت لوگوں سے سننے میں آیا (ایران، بیروت وغیرہ میں) کہ ہم پنڈت نہرو کو دنیا کا سب سے بڑا سیاست داں سمجھتے ہیں۔

ان دنوں میں بہت سے لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ یونی ورسٹی کے پروفیسر اور عمائدین، بعض ادیب و شاعر، ہندوستان اور پاکستان کے سفارت خانوں کے بعض اراکین (سفیرِ ہند تو راشد علی بیگ ہیں اور سفیرِ پاکستان اختر حسین چھتاری حال ہی میں یہاں آئے ہیں (آیا ابھی تک نہیں پہنچیں) اور ہندوستانی سفارت خانے سے برکات احمد جو کہ دہلی کے ایک ذہین افسر ہیں اور پاکستان کے حمید احمد عرفانی جو فارسی شاعری اور ادب میں کافی ذوق رکھتے ہیں اور اہلِ ایران سے بہت مسحور ہیں۔ اقبال اور شاعر جلیل بہار دونوں پر کتابیں لکھی ہیں اور اپنی فارسی رباعیات بھی شائع کی ہیں) مجھے یہ معلوم کرکے اب تک تعجب ہے کہ ایرانی اپنی زبان دانی اور شاعری کے مقابلے میں اب بھی ہندوستانی شاعری بلکہ اقبال کے کلام کو بھی بہت معمولی سمجھتے ہیں۔ میرا تو یہ خیال تھا کہ گزشتہ تیس سال میں اس بارے میں فضا بہت بدلی ہے اور ایک حد تک جو ایرانیوں کے مضامین میں نے دیکھے یا تقریریں سنی ہیں اور کم سے کم کبھی کبھی ایرانیوں کو اقبال کا کلام زبانی لیکن بہت شوق سے پڑھتے سُنا ہے اس سے اس خیال کی تصدیق ہوتی ہے۔ لیکن عام طور پر بیان کیا جاتا ہے کہ منہ پر اقبال کی تعریف کرتے ہیں۔ بعد میں کہتے ہیں کہ بہت معمولی اور پیش پا افتادہ کلام ہے! بلکہ اس سلسلے میں دمشق میں اپنے قونصل جنرل سفرانی صاحب (برادر ڈاکٹر باری حسن) سے بھی بحث ہوئی۔ ان کو اصرار ہے کہ (گو وہ فارسی نہیں جانتے!) لیکن اقبال کی فارسی شاعر

کی حیثیت سے کوئی جگہ نہیں۔ جو کچھ ہے اُردو ہی میں ہے۔ برخلاف ایران کے پاکستانی سکریٹری سفارت عرفانی ان کو بہت بلند مقام دیتے ہیں۔ میرا تو یہ عقیدہ پختہ ہو جاتا ہے کہ اقبال نے فکرِ صحیح کی بہت اعلا قیادت کی ہے......

یونی ورسٹی کلب کے ماہانہ ڈنر میں مجھے بلایا گیا تھا۔ یہ ایک بہت پُرفضا اور شان دار عمارت ہے (اس میں ایک مرتبہ پہلے بھی آیا ہوں) جو ہماری یونی ورسٹیوں کے خیال میں بھی نہیں آسکتی۔ ساز و سامان، رہنے کے کمرے، روشنیوں کی آراستگی۔ دعوت کا پُر تکلّف اہتمام کوئی پانچ سو مرد عورتوں کے لیے اور آخر میں ایک مشہور مغنیہ "خاطر پروانہ" (کیا نام ہے!) کا گانا جو بہت خوش آواز تھا..... معلوم نہیں ان چھوٹے چھوٹے ملکوں کو یہ فراغتیں کیسے نصیب میں آتی ہیں اور یہ مقدّم ضرورتوں پر ان تکلفات کو کیوں اور کیسے ترجیح دیتے ہیں؟ زندگی کے مادّی معیار کو بلند رکھنا، خواہ اس کی استطاعت ہو یا نہ ہو، خوش پوشی، خوش خوراکی، آراستگی، ان چیزوں پر زور ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہمارے ملکوں میں زندگی کا بوجھ اور الم لوگوں پر بہت شدید، ضرورت سے زیادہ شدید ہے اور زندگی میں خوش باشی کا بھی ایک مقام ہے لیکن حدوں کا تعیّن ضروری ہے ورنہ بس افراط ہے یا تفریط......

موجودہ فارسی ادب کی تحریکوں پر ایک انگریز نقّاد کا اخبار میں ایک دل چسپ مضمون پڑھا۔ نقاد کا نام ہے گریگوری لیسما اور اس نے بتایا ہے کہ ادب کی کن صنفوں میں ترقی ہوئی ہے۔ اور ہو رہی ہے۔ اور کون سی ابھی پس ماندہ ہیں۔ اس نے۔ جو صورتِ حال بیان کی ہے وہ امید افزا ہے۔ میں نے دو کانوں میں بھی دیکھا کہ کافی کتابیں شائع ہوئی ہیں جن میں مکتبہ فرینکلن (ایک امریکی امداد کا ادارہ) اور دوسرے اداروں کے ترجمے بھی شامل ہیں۔ لیکن کتابوں کی خریداری اب تک ہندوستان کی طرح بہت محدود ہے۔ لیسما کا بیان ہے کہ سب سے زیادہ شائع ہونے والی کتابیں اب بھی کلاسیکی ادب کی تصانیف ہیں۔ خصوصاً شعرائے قدیم جن کی جگہ ہر ایرانی کے دل میں ہے اور قرآن مجید ...... ایک کتاب فروش نے حال میں تول کر کتابیں فروخت کرنے کا طریقہ شروع کیا ہے۔ کہتا ہے کہ کیا اعتراض ہے۔ اگر سونے کو

تول کر بیچنے سے اس کی عزت کم نہیں ہوتی تو کتابوں کی کیوں بے قدری ہو؟ بلکہ اس طرح لوگ زیادہ کتابیں خریدنے لگے ہیں اور ان کو ایک حد تک گھر کی روزمرّہ کی خرید و فروخت کا جزو شمار کرتے ہیں۔ بہرحال کتابوں کے الماریوں میں خراب ہونے سے بدرجہا بہتر ہے!

اپنے منصبی کام کے سلسلے میں یونی ورسٹی کے اراکین اور پروفیسروں وغیرہ سے گفتگو رہی۔ بہت اخلاق اور دل چسپی سے بات چیت کرتے رہے لیکن (الّا ما شاء اللہ) مجھے یہ اندازہ نہیں ہوا کہ انھیں مسائل کی سنجیدگی اور بنیادی اہمیت کا پورا احساس ہے۔ کچھ صورتِ حال سے مطمئن معلوم ہوتے ہیں۔ تعلیمی معیار بہت معمولی بیان کیا جاتا ہے لیکن یہ سوال کسی نے نہیں اُٹھایا۔ دس پندرہ روپے ماہوار کے وظیفے خیال کر لیتے ہیں کہ ہونہار طلبا کو خاطر خواہ مدد مل رہی ہے۔ استاد پورے وقت کام نہیں کر سکتے۔ امتحانوں کے نتائج اطمینان بخش نہیں ہیں۔ قانون میں طلبا کی کثرت ہے۔ لیکن تعلیم یافتہ بے کاری کی وہ شدّت نہیں جو ہمارے ملک میں ہے۔

معصومہ قم کی زیارت کے لیے قم گیا۔ یہ جناب امام رضاؑ کی خواہر محترمہ کا مزار ہے۔ طہران سے ۸۰ میل کے قریب۔ یہاں خاصی رونق ہے۔ زیارت پڑھی لیکن چوں کہ بس کھڑے کھڑے جانا ہوا تھا اس لیے ایک سیّاح کی سی ذہنی کیفیت رہی۔ دل بھر کر حضورِ قلب کا موقع نہیں ملا۔ ایسی ہی صورت شاہ عبدالعظیم کی زیارت کے موقع پر ہوئی۔

ایک پارسی کمپنی نے "طہران پارس" کے نام سے ایک بہت خوش فضا بستی طہران سے دس بارہ میل پر بنائی ہے۔ جہاں پانی، تالاب، پہاڑوں کا پس منظر، صاف ستھرے مکان مل جل کر ایک بہت اچھا سماں پیدا کرتے ہیں...... آغائے مترجم نظام اور ان کے اہلِ خاندان اور احباب سے بھی دوبارہ ملاقات ہوئی۔ اور شعر خوانی کا لطف ناگزیر! اب ۸۴ برس کی عمر میں زیادہ قوت ان کی زبان میں سمٹ کر آگئی ہے!

(لبنان) ۴ جون سے ۱۵ جون تک

طہران کے سفر سے فارغ ہو کر بیروت آیا۔ یہ لبنان کا پہلا سفر ہے اور مجھے یہ

چھوٹا سا، خوبصورت ملک اور اس کے لوگ بحیثیت مجموعی پسند آئے۔ طہران سے کوئی ڈھائی گھنٹے کا فاصلہ ہے۔ آبادی ہی کیا ہے کوئی پندرہ لاکھ، دہلی کے نصف سے کچھ ہی زیادہ! اس میں مسلمانوں اور عیسائیوں کی آبادی برابر برابر ہے۔ کل وادی، مع اپنے خوش منظر پہاڑوں کے، کوئی ایک سو بیس میل لمبی اور تیس پینتیس میل چوڑی ہے۔ ۱۹۴۳ء سے ایک آزاد ریپبلک ہے۔ چھوٹے ملکوں میں جہاں بعض لحاظ سے محرومیاں ہیں وہاں آسانیں اور سہولتیں بھی ہیں اور سوچتا ہوں تو بعض دفعہ خیال آتا ہے کہ (ان کے فائدے نقصان سے زیادہ ہیں) ملک کی ترتیب تنظیم زیادہ آسان ہے۔ معیارِ زندگی کو بغیر پہاڑ کاٹے اور جوئے شیر نکالے بلند کیا جا سکتا ہے۔ چناں چہ یہاں کا معیار ہمارے ہاں سے یقیناً زیادہ ہے۔ مجھے بتایا گیا کہ ایک بالکل بے ہنر مزدور کی مزدوری ایک ڈالر سے کم نہیں ہوتی روزانہ اور ذرا کام سیکھا ہوا ہو مثلاً معمار تو وہ دو ڈالر روز آسانی سے کما لیتا ہے۔ (اس کا مقابلہ ہمارے ہاں کی فی کس آمدنی سے کیجیے جو تین سو روپے سالانہ سے کم ہے)۔ لوگوں میں تعلیم اور جدید اندازِ خیال کے مطابق روشن خیالی اور بیداری یقیناً زیادہ ہے۔ کوئی شخص پھٹے پُرانے کپڑے پہنے شاید ہی نظر پڑا ہو۔ دو وقت کھانے کو سب کو میتسر ہے۔ مغربیت کا بہت چلن ہے۔ عورتیں اور مرد دونوں شہروں اور قصبوں میں یوروپی لباس پہنتے ہیں۔ رنگ ان کی طرح صاف ہیں اور ذاتی ذہنیت کا سامان اسی اہتمام کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ دوسرے مشرقِ وسطیٰ کے ملکوں کی طرح زندگی سے لطف اُٹھانے کا سلیقہ زیادہ اور "بارِ زندگی کا احساس" کم ہے۔

قیام کے آخری دن ڈاکٹر زریق اور ڈاکٹر کورانی کی دعوت پر (ایک تاریخ کے پروفیسر ہیں اور ہماری یونسکو کمیٹی کے صدر اور دوسرے شعبۂ تعلیم کے) ایک لڑکیوں کے ہائی اسکول (اہلیہ اسکول) کے تقسیم اسناد کے جلسے میں گیا۔ پروگرام سب عربی میں تھا۔ اس میں لڑکیوں کا گانا تھا جس کے ساتھ موسیقی کے آلات بھی تھے، ٹیگور کے ایک خطبہ کا عربی ترجمہ تھا جس میں انھوں نے اقوامِ عالم کو اخوّتِ انسانی کا پیغام دیا تھا (ترجمہ بہت فصاحت کے ساتھ ایک ڈپلوما یافتہ لڑکی نے پڑھا)، ایک بیان خلیل جبران کا تھا اور پھر (عیسائی) ہیڈ

مسٹریس کا خطبۂ سواگت جونئی ڈپلوما یافتہ لڑکیوں کو انھوں نے دیا، ایک دریائے فصاحت تھا کہ بہہ رہا تھا، عربی خطابت کی اصلی شان۔ چند روز پہلے دنیا کی خواتین کا ایک "مقابلۂ جمال" بیروت میں ہوا تھا، اس کی بہت شہرت تھی اور ظاہر ہے کہ لڑکیوں کو دل چسپی۔ ہیڈ مسٹریس نے اس ہماہمی کو موضوع بنا کر بتایا کہ انسانی جمال کے بارے میں میرا کیا تصور ہے اور میں اپنی لڑکیوں میں جمالِ سیرت کا کیا حسین عکس دیکھنا چاہتی ہوں۔ لیکن دنیا میں مجھے چاروں طرف کیا دکھائی دے رہا تھا۔ کم سے کم میں تو اس تقریر سے بہت متاثر ہوا...... تقسیم اسناد کے جلسے میں لڑکیاں سب سفید فراکوں، سفید اونچی ایڑی کے جوتوں میں تھیں اور ہاتھوں پر سفید دستانے تھے جن کو وزیرِ تعلیم سے مصافحہ کرنے کے لیے بڑی شان سے اُتارتی تھیں۔ دیکھنے میں ہماری لڑکیوں سے زیادہ پختہ اور SOPHISTICATED معلوم ہوتی تھیں لیکن مجھے یہ اندازہ ہوا کہ درحقیقت اندر سے ان میں سے بیشتر خاصی نروس تھیں۔ اسکول میں پورا ڈسپلن تھا۔ اعزاز حاصل کرنے والی لڑکیوں کے لیے دل کھول کر تالیاں بجائی گئیں اور ایک لڑکی جو کھڑی تھی خاص طور پر "خوش آمد" کیا گیا۔ آدھی سے زیادہ لڑکیاں عیسائی تھیں اور صرف بیروت ہی نہیں بلکہ شہر اور ملک سے باہر کی طالبات بھی تھیں۔

قیام کے دوران میں یونسکو کمیشن کے جلسے ہوئے اور مسئلے کے مختلف پہلوؤں اور طریقۂ کار پر مفصل بحثیں ہوئیں۔ لوگوں کا عام اندازہ یہ تھا کہ میں نے اس میں خاصا مفید حصّہ لیا، جس کا انھوں نے فرداً فرداً اعتراف کیا۔ کچھ سہولت محض اس وجہ سے ہوجاتی ہے کہ دوسرے غیر زبان داں ممبروں کی نسبت (یعنی جن کی مادری زبان انگریزی نہیں) زبان بہتر آتی ہے۔ اس عرصے میں چوں کہ ان سب لوگوں کے ساتھ ایک ہی جگہ رہنے کا اتفاق ہوا (بیروت سے دس بارہ میل باہر، بردمانا کی پہاڑی پر پارک ہوٹل میں) اس لیے ان سب سے خاصی ملاقات اور دوستی ہوگئی۔ سب سے زیادہ کمیٹی کے صدر ڈاکٹر C.K. ZURAYK پسند آئے۔ یہ امریکن یونی ورسٹی آف بیروت میں تاریخ کے "ممتاز پروفیسر" ہیں۔ اس سے پہلے اس یونی ورسٹی کے قائم مقام صدر V.C. اور دمشق یونی ورسٹی کے ریکٹر V.C. رہ چکے ہیں اور شاید امریکہ میں لبنان کے وزیر بھی رہے ہیں۔ اچھے عالم ہیں۔ عرب تاریخ (اسلامی اور

مسیحی) بخوبی جانتے ہیں۔ دل وسیع ہے۔ تعصب بالکل نہیں معلوم ہوتا۔ مہمان نوازی (جو ان کا منصبی فرض نہ تھا) انھوں نے اس قدر خندہ پیشانی سے کی کہ ہر ممبر کی ہر ضرورت اور کام کا خیال رکھا۔ یہاں تک کہ خود ان کی بیوی اور ان کی دو تین عزیزوں اور دوستوں نے یہ ذمہ داری لی کہ وہ خریداری کرنے والوں کو خود بازار لے جاکر خریداری کرائیں گی۔ علم اور شرافت اور مجلسی تواضع کا یہ امتزاج مجھے بہت اچھا معلوم ہوا اور خیال ہوا کہ کاش میں بھی (اور ہم سب) ایسا کر سکیں۔ کرتے تو شاید ہم لوگ بھی ہیں لیکن دوسرے کاموں کی مصروفیت وغیرہ کی وجہ سے ذرا فرض سمجھ کر۔ اتنی آمد نہیں آتی (سوائے چند لوگوں کے لیے جن سے بہت خصوصیت کے مراسم ہوں) آپا میں بھی یہ صفت بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔ قیام کے دوران میں یہاں کی چاروں یونی ورسٹیوں کو دیکھا۔ امریکن یونی ورسٹی اور جیسوئٹ یونی ورسٹی جو کافی قدیم ہیں اور نیشنل یونی ورسٹی اور عرب یونی ورسٹی جو حال ہی میں قائم ہوئی ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ منظم اور باأثر امریکن یونی ورسٹی ہے جو اب بھی لوگوں میں کافی مقبول ہے اور جس نے معلمین میں قابل عرب اور امریکن پروفیسروں کو جمع کیا ہے۔ میرا اندازہ ایسا ہے کہ انھوں نے حتی الامکان خود کو سیاسی ریشہ دوانیوں سے الگ رکھا ہے اور شاید اسی میں ان کی نیک نامی کا راز ہے۔ اس میں علاوہ مقامی مسلمانوں اور عیسائی طلبا کے دوسرے عرب ممالک اور ہندوستان، پاکستان، افریقہ، یورپ وغیرہ کے طلبا شامل ہیں۔ مجھے بتایا گیا کہ یونی ورسٹی میں تقریباً ۲۸۰۰ طلبا میں انسٹھ قوموں اور تقریباً پچیس مذہبی عقائد کے لوگ شامل ہیں! پروفیسروں اور دوسرے معلموں کی تعداد ۴۸۰ ہے۔ تنخواہیں معقول دی جاتی ہیں اور ان کی اچھی سماجی حیثیت ہے۔ (سنہ ۱۸۶۶ء میں جب یہ کالج شروع ہوا تو صرف سترہ طالب علم تھے!) یہاں بہت سے پروفیسر ایسے ہیں جو ایک سے زیادہ یونی ورسٹیوں میں کام کرتے ہیں۔ سالانہ فیس پچاس ڈالر ہے اور اتنی ہی رقم امتحان کی فیس کے طور پر دینی ہوتی ہے (برخلاف اس کے امریکہ کے پرائیویٹ کالجوں میں پانچ سو ڈالر سے لے کر دو ہزار ڈالر سالانہ تک محض تعلیمی فیس کے دینے پڑتے ہیں!)۔ ساتھ ہی (غالباً T.C.M. فنڈ سے کوئی سولہ سو طلبا کا خرچ یونی ورسٹی خود اُٹھاتی ہے۔

بیروت میں وزیرِ تعلیم کے ساتھ برسٹل ہوٹل میں لنچ کھایا اور اگلے روز امریکن یونی ورسٹی کے قائم مقام صدر کے ساتھ یونی ورسٹی کے ALUMNI کلب میں۔ یہ کلب پُرانے طلبا اور ممبرانِ اسٹاف کے لیے ہے اور دوسرے امریکی اداروں کی طرح خاصا شان دار ہے۔ رہائش کے کمرے بھی ہیں۔ (دمشق سے واپسی پر میں دو روز کے لیے وہاں مقیم رہا۔ کوئی پچاس روپیے روز چارج کیے) شہر میں بڑے بڑے ریستوراں بہت سے ہیں اور ہر وقت "مفت خوروں" سے بھرے رہتے ہیں۔ سوچتا ہوں کہ اتنے بہت سے لوگوں کے پاس اتنا روپیہ اور وقت لٹانے کو کہاں سے آجاتا ہے۔ شاید ابتدائی تربیت کا اثر ہے (جس میں اصولِ کفایت کو بڑا دخل تھا) کہ اس قسم کا شخصی اور قومی اسراف، جو مشرقِ وسطیٰ کے ملکوں میں عام ہے، بُرا معلوم ہوتا ہے۔

بیروت سے دمشق جاتے ہوئے راستے میں بعل بک کے مشہورِ عالم کھنڈر دیکھے جہاں کئی تہذیبوں کے بہت پُرانے نقشِ قدم پائے جاتے ہیں یعنی فنیقی مندر، رومی مندر جس میں JUPITER، VENUS BACHCHUS کے مندر ہیں اور ساتھ ہی ایک عیسائی گرجا اور مسجد جامع العمری' کے کھنڈر ہیں جو غالباً مندروں کے پُرانے ستونوں وغیرہ سے بنائی گئی تھی۔ بعل بک جس کا یونانی نام ہیلیو پولیس بھی ہے دنیا کے قدیم ترین شہروں میں سے ہے۔ اس کا کمال یہ ہے کہ یہ تمام عمارتیں نہایت عظیم الشان ستونوں اور پتھروں سے بنائی گئی ہیں جن کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ اس زمانے میں جب بڑے بڑے بوجھ اُٹھانے کے لیے کوئی مشین اور آلات نہ تھے، یہ کام کس طرح ہوا ہوگا۔ علاوہ اس مسجد کے، جو حضرت عمرؓ کے زمانے میں بنی تھی یہاں صلاح الدین ایوبی کے قلعے کی دیواریں وغیرہ بھی قائم ہیں۔ یہ مقام دمشق اور بیروت کے وسط میں ہے اور سیاحوں کی مقبول زیارت گاہ ہے۔

بعل بک سے آگے چل کر دمشق کے راستے میں ایک بہت پُرفضا مقام ZOHIA آتا ہے جہاں پہاڑی سے ایک سرد اور شیریں چشمہ نکلتا ہے جس کے کنارے پر ایک خوبصورت اور شان دار ریستوراں بنایا گیا ہے جو JORRMETS لوگوں کی مشہور آماج گاہ ہے۔ یہاں کمیشن کے ممبروں کو لبنان کے ڈائرکٹر آرکیالوجی نے لنچ پر مدعو کیا تھا وہ لنچ ڈیڑھ بجے

سے چار بجے شام تک چلتا رہا۔ اس سے زیادہ لمبا (اور شاید پُرتکلف) لنچ کھانے کا تجربہ مجھے عمر بھر نہیں ہوا۔ لیکن میں نے دیکھا کہ وہاں کے لوگوں کے لیے جو کئی سو کی تعداد میں چشمے کے کنارے بیٹھے اس پیٹ پوجا میں مصروف تھے، یہ کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ ان میں سے بعض پارٹیاں ہم سے پہلے وہاں پہنچ چکی تھیں۔ اور جس وقت ہم واپس آئے وہاں موجود تھیں! کون کہتا ہے کہ کھانا زندہ رہنے اور ذکر کرنے کے لیے ہے!۔

دمشق

دمشق دو روز کے لیے گیا۔ دمشق جس کے ساتھ واقعہ کربلا کی یادیں وابستہ ہیں، جہاں یزید کا دربار تھا اور امام حسینؓ کے خاندان کو اسیروں کی حیثیت سے لایا گیا۔ جہاں سر حسینؓ کو طاق میں رکھا گیا جو اب بھی مسجد امیہ میں دیکھا جا سکتا ہے اور تخیّل کو جھنجھوڑتا ہے، جہاں امام زین العابدین نے اس نئے قافلے کی سالاری کی اور ان کا حجرۂ عبادت اب بھی زائرین کو اپنی طرف کھینچتا ہے، جہاں جناب زینب نے اپنی قیادت اور جرأت کا مظاہرہ کیا جو دنیا کی عورتوں کے لیے ایک اعلا اور بہت آفریں نمونہ ہے! "ستہ زینب" یعنی جناب زینب کا مزار دمشق کے شہر سے بارہ پندرہ میل باہر ہے۔ پہلے صرف روضہ تھا کوئی قابلِ ذکر عمارت نہ تھی اور ظاہری اعتبار سے مزار کس مپرسی کے عالم میں تھا۔ اب اس کی باقاعدہ تعمیر ہو رہی ہے جس میں کافی روپیہ پاکستان کے حبیب بینک کے مالک نے لگایا ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ان کو دمشق میں اطلاع ملی کہ ان کے بچّے کو POLIO ہو گیا ہے۔ انھوں نے منّت مانی کہ اگر اس کو شفا ہو جائے گی تو وہ روضے کی ازسرِنو تعمیر کرائیں گے۔ خدا نے دُعا قبول کی اور وہ اب اس منّت کو پورا کر رہے ہیں....

دمشق میری توقع سے زیادہ شان دار شہر ثابت ہوا۔ بہت بڑی بڑی کشادہ سڑکیں، عالی شان عمارتیں، موٹروں کی ریل پیل، قہوہ خانوں اور ریستوراں کی بہتات، لوگ شکل و صورت، رنگ، ڈھنگ لباس میں زیادہ تر "مغربی نژاد"۔ شام کی آبادی لبنان سے تقریباً تین گنی یعنی کوئی پینتالیس لاکھ ہے۔ لیکن تعلیم اتنی عام نہیں۔ ایک یونی ورسٹی دمشق میں

ہے اور دوسری کی ابتدا حلب میں ڈالی جارہی ہے جہاں میڈیکل فیکلٹی پہلے سے تھی۔ طلبا کی تعداد ..... کے قریب ہے۔ جن میں اندازاً ..... لڑکیاں ہیں۔ اس وقت یونی ورسٹی شہر کے اندر ہے اور اس کی ضرورتوں کے لیے کافی جگہ نہیں۔ لیکن اس کے قریب ہی حال میں وزارتِ دفاع نے بہت سا علاقہ خالی کردیا ہے جس میں نئی عمارتوں کے بنانے کی تجویز ہے۔ ایک چارسو بستروں کا اسپتال اور میڈیکل کالج شہر سے کچھ باہر بنایا گیا جو تعمیر اور سازوسامان کے اعتبار سے عربی ممالک میں سب سے اچھا سمجھا جاتا ہے۔ جو مریض مفت داخل کیے جاتے ہیں ان کے لیے بھی ہر قسم کا بہت اچھا انتظام ہے اور پونے چارسو "بستر" ایسے ہی مریضوں کے لیے ہیں۔ لیکن مجھے بتایا گیا کہ تعلیم کا معیار ابھی تک قابلِ اطمینان نہیں۔ غالباً اور ملکوں کی طرح نمائش زیادہ اور معیاری کام کم ہے۔

وزیرِ تعلیم اور ان کے افسروں سے بھی کئی گھنٹے گفتگو رہی انھوں نے اپنے ہاں کے تعلیمی نظام کی خصوصیات وغیرہ بیان کیں اور ہمارے سوالوں کا جواب دیا۔ وزیرِ تعلیم جن کا نام اس وقت ذہن میں نہیں ایک معقول اور باخبر آدمی ہیں اور انھیں اپنے تعلیمی حالات سے بخوبی آگاہی تھی (گو ان کے اعداد و شمار میری سمجھ میں نہیں آئے!)۔ وہ پہلے ایک پرائمری اسکول میں ٹیچر تھے، پھر ثانوی مدرسے میں مقرر ہوئے اس کے بعد مزید تعلیم کے لیے (غالباً) یورپ بھیجے گئے اور واپسی پر عربی کے پروفیسر مقرر ہوئے دمشق یونی ورسٹی میں۔ کچھ عرصہ ہوا صدرِ حکومت نے ان کو ان کی قابلیت کی بنا پر وزیرِ تعلیم مقرر کیا ہے۔ غیر جمہوری نظام میں بھی اس قسم کی ترقی کے مواقع پیدا ہوجاتے ہیں!۔

وائس چانسلر یونی ورسٹی اور ان کے رفقائے کار سے بھی گفتگو رہی اور اعلا تعلیم کے مسائل پر تبادلۂ خیال ہوا۔ ابھی تک یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ تعلیم کے معیار اور طلبا کے انتخاب وغیرہ پر اربابِ اختیار نے کافی غور و خوض کیا ہے، نہ ان کی دقتِ نظر کا کوئی خاص ثبوت ملا۔ لیکن تعمیری تجویزیں ضرور IMPRESSIVE ہیں۔ میڈیکل کالج کا اوپر ذکر کرچکا ہوں۔ اس کے علاوہ CITE UNIVERSITOWNO بنانے کی تجویز ہے۔ جہاں طلبا کے لیے ہر قسم کی رہائشی سہولتیں ہوں گی۔ اور ان کے غیر نصابی مشاغل کے لیے عمدہ انتظامات

کیسے جائیں گے۔ دمشق میں زین العابدین (سفرانی) کے ہاں قیام رہا۔ تو وہاں کونسل جنرل ہیں اور ڈاکٹر ہادی حسن کے سب سے چھوٹے بھائی ہیں۔ اپنے سب بھائیوں کی طرح ذہین لیکن قدرے ECCENTRIC ہیں۔ کہنے لگے مجھے تم سے گلہ ہے کہ تم نے اپنی کتاب IQBAL'S EDUCATIONAL PHILOSOPHY میں اقبال کے لیے APOLOGIA پیش کیا ہے اور جب میں نے اس رائے کو چیلنج کیا تو انھوں نے اس کے جواب میں باصرار یہ کہا کہ اقبال صرف اُردو کے شاعر ہیں۔ فارسی کے شاعر نہیں اور تم نے ان کے فارسی کلام میں سے اقتباسات دیے ہیں! پوچھا کہ آپ کو فارسی سے کیا شکایت ہے، کہا میں نہ فارسی جانتا ہوں نہ جاننا چاہتا ہوں، کم سے کم اقبال کی فارسی کو نہیں مانتا اور نہیں پڑھتا۔ میں نے کہا یہ تو جناح صاحب والی بات ہوئی کہ بنیادی تعلیم کی تجویز بہت مہمل ہے"۔ "آپ نے کبھی اس کو ملاحظہ کیا ہے"۔ "نہیں، نہ میں کسی ایسی چیز کو دیکھنا یا پڑھنا چاہتا ہوں جس کا تعلق کانگریس سے ہو!"۔ اقبال پر ایران میں یا باہر جو لوگ اعتراض کرتے ہیں ان میں (میرے خیال میں) یا تو زبان کی SNOBBERY اور احساس برتری ہے یا اس کے خیالات کی گہرائی کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں۔

سفرانی کے ہاں ان کی بہن، بیگم ڈاکٹر حیدر علی خاں اور ان کی دونوں لڑکیوں کلثوم اور ملیحہ سے ملاقات ہوئی جو بہت تپاک اور محبت سے ملیں اور انھوں نے خاصی خاطر کی۔ جس روز شام کو پہنچا وہاں ایک جلسہ ٹیگور کی یادگار (صد سالہ برسی کے موقع پر) ہو رہا تھا اور اگلے روز میری روانگی کے بعد ان کا ڈرامہ "چترا" عربی میں ہونے والا تھا۔ اسی طرح بیروت میں ایک ایسی ہی تقریب ہوئی تھی۔ معلوم ہوتا ہے ٹیگور کا عربی ممالک میں بھی خاصا اثر ہے۔ کم از کم تعلیم یافتہ حلقوں میں، اور ان کی کئی کتابوں کا ترجمہ عربی میں ہو چکا ہے۔

بیروت

دمشق سے واپسی پر ایک روز کے لیے بیروت میں ٹھیرا۔ اس عرصے میں دوبارہ ڈاکٹر زوریق کی مہربانی سے لُطف اندوز ہوا، حبیب کرانی کے خاندان سے ملا اور ان سے مختلف تعلیمی مسائل پر تبادلۂ خیال ہوا۔ وہ چاہتے ہیں کہ عرب ممالک وغیرہ کے لیے امریکی

مالی امداد کے ذریعہ ایک تعلیمی ریسرچ سینٹر قائم کریں۔ ایک اور پروفیسر کولازیادے NICOLA ZEADEH سے ملاقات ہوئی جو عرب تاریخ کے پروفیسر ہیں اور ان کا خاص مضمون شمالی افریقہ کا علاقہ (ٹیونس، مراکو، الجیریا، لیبیا وغیرہ) ہے۔ جس کے بارے میں اچھی معلومات رکھتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ یہ سارے ملک مختلف تہذیبوں کی گزرگاہ رہے ہیں اور ان کے اثرات اب تک ان کی زندگی اور کلچر میں پائے جاتے ہیں۔ اور ان کی اسلامی میراث میں بھی پیوست ہو گئے ہیں...... ٹیونس کے ایک شخص کا ذکر کیا جن کے مزار پر لوگ بہت عقیدت سے آتے ہیں اور ان کو صاحبِ "برکت" سمجھتے ہیں۔ تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ ان کی عزت کا ابتدائی سبب یہ ہے کہ انھوں نے اس خاص علاقے میں پہلی مرتبہ پانی فراہم کر کے باقاعدہ زراعت کی بنیاد ڈالی تھی۔ میں نے ان سے کہا کہ "برکت" کا مفہوم اسلامی فکر کے مطابق محض مذہبی برکت (یعنی عیسائی اصطلاح GRACE کا مرادف) نہیں بلکہ جو شخص زندگی کو کسی اچھے معنی میں سیراب کرے، اس میں وسعت یا معنویت پیدا کرے وہ بھی صاحبِ برکت ہے......

۱۵/ جون۔ واپسی وطن

آج بیروت سے صبح کے ساڑھے سات بجے کے قریب روانہ ہو کر مقامی وقت کے اعتبار سے چھ بجے شام کو بمبئی اور پونے دس بجے رات کو دہلی پہنچا اور اپنے عزیزوں اور پیاروں کے پاس پہنچ کر اس دل چسپ سفر کا خاتمہ ہوا۔ زندگی انھیں محبت کے مراسم کے طفیل چلتی ہے ورنہ ؎

عدم کی راہ کٹ جاتی کبھی کی　　　مگر یادِ عزیزاں راہ زن ہے!

۱۵/ جون سے ۲۵/ جولائی

آج کل کچھ خانہ بدوشوں کی سی زندگی ہے۔ انسان کی زندگی میں مکان کی بھی خاصی اہمیت ہے جس کا میں نے کبھی پوری طرح اعتراف نہیں کیا! چوں کہ اب تک زندگی میں کم و بیش

اچھے مکان ملتے رہے اس لیے ان کی کوئی خاص قدر یا اہمیت محسوس نہیں کی۔ اب کہ سرکاری مکان چھوڑ دیا ہے۔ علی گڑھ کا مکان فروخت ہو چکا اور جامعہ کا مکان بننے کی نوبت نہیں آئی تو یہ ضرورت محسوس ہوئی ہے۔ ان دنوں میں کچھ وقت ذکیہ کے ہاں، رات کا سونا مہدی کے مکان کی چھت پر اور بعض دفعہ نارتھ ایونیو کے فلیٹ ۱۸۸ میں جو رکمنی دیوی آرنڈیل کی مہربانی کی وجہ سے ہمارے استعمال میں ہے۔ عزیز اس خانہ بدوشی سے بہت دل گرفتہ سی ہیں اور جائز بھی، لیکن میں کہتا ہوں کہ زندگی سے لطف اُٹھانا اور اس میں معنی پیدا کرنا یا نہ کرنا بالکل ان خارجی حالات پر منحصر نہیں کر دینا چاہیے بلکہ اطمینان اور خوشی کے سرچشمے اپنی ذات کے اندر اور کام کے اندر بھی تلاش کرنے چاہئیں۔ کہتا یہ ہمیشہ رہا ہوں کہ آج کل تجربے سے نہ صرف یہ معلوم ہوا کہ مادّی حالات ناسازگار ہوں تو یہ بات کتنی مشکل ہے۔ بلکہ یہ بھی کہ اسی وقت اس اصولِ حیات کو خلوص کے ساتھ برتنا اور مضبوطی کے ساتھ پکڑنا کس قدر ضروری ہے ..... بہرحال خدا اس منزل سے بھی گزار دے گا۔ اصل بات یہ ہے کہ کرامت کے ساتھ گزارے۔

ان دنوں دو کتابیں پڑھیں۔ ایک جسٹس اولیور وینڈل ہومز کی سوانح عمری 1. YANKEE FROM OLYGOPUS BY CATHERINE BRWEN جو امریکہ کی عدالتِ عالیہ کے ایک نامور اور قانون آفریں جج تھے۔ اور ایک ٹیگور کے ذاتی حالات کی بہت دل چسپ ڈائری 2. TAGORE BY THE FRIENDS BY MACTIOYE DEN جو ان کی ایک عزیز میتری دیوی نے لکھی ہے۔ ٹیگور نے اپنی زندگی کے آخری تین سالوں میں کئی مہینے ان کے گھر میں، جو شہر سے دُور ایک جنگل میں واقع تھا، صرف کیے تھے۔ انھوں نے ان کی دل چسپ گفتگو، ان کی ظرافت، ان کی انسانیت کے تاثرات کو ایک بے تکلف انداز میں محفوظ رکھا اور پہلے ان کو بنگالی میں اور حال میں انگریزی میں شائع کیا۔ اس کتاب سے ٹیگور کی ایک بڑی دل کش تصویر مرتب ہوتی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے دماغ کی طباعی اور جولانی، ان کی فطرت سے اثرپذیر ہونے کی صلاحیت، ان کے انسانوں سے دل چسپی آخری عمر تک باقی رہی..... عجیب بات ہے (یا شاید عجیب نہیں ہے) کہ یہی صفات جسٹس ہومز میں بھی نوّے برس کی عمر تک قائم رہیں۔ ان کا دل بوڑھا ہوا نہ دماغ بلکہ اپنی اسّیویں

سال گرہ پر وہ سوچتے تھے کہ آخر میں کس لحاظ سے بڑھاپے کا شکار ہوں۔ واقعہ یہ ہے کہ جب تک انسان کے دل و دماغ جوان ہیں اور ان کے تار عالمِ انسانی کے دُکھ سکھ اور زندگی کے تانے بانے کے ساتھ لرزش کرتے ہیں محض سالوں کا گزرنا کوئی خاص معنی نہیں رکھتا۔

سفرِ کشمیر

۱۹۶۱

۲۱/جون کو حکومتِ کشمیر کی دعوت پر سری نگر آیا۔ اس کی خواہش ہے کہ مجھے اپنے مشیرِ تعلیم کی حیثیت سے کشمیر میں بلائے۔ اس بارے میں وزیرِ تعلیم (صادق صاحب) اور وزیرِ اعظم (بخشی صاحب) سے گفتگو ہوئی۔ دونوں اس بارے میں خاصے KEEN معلوم ہوتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ مجھے یہاں کے حالات سے (گزشتہ تجربے کی وجہ سے) کافی واقفیت ہے اور خود حکومت اور عام لوگوں کو میری نیت اور دیانت داری پر بھروسہ ہے۔ اس لیے مجھے آجانا چاہیے۔ ان کی گفتگو سے اندازہ ہوا کہ گزشتہ سالوں میں یہاں تعلیمی معیار بہت گر گیا ہے۔ توسیع بہت تیزی کے ساتھ اور سیاسی مصالح کی بنا پر ہوئی ہے۔ اور بعض کام کرنے والوں نے دیانت داری اور فرض شناسی کو بالکل بھلا دیا ہے۔ ہر معاملے میں سیاست کا دخل بہت زیادہ ہوگیا ہے اور ذاتی مفاد کو بہت اہمیت دی جاتی ہے۔ اس لیے کام خاصا مشکل ہے اور میرے لیے کہنا مشکل ہے کہ ان حالات میں کہاں تک کامیابی ہوسکتی ہے۔ لیکن ان کے اصرار اور خود کشمیر کے ساتھ جو وابستگی رہی ہے اس کے پیشِ نظر میں نے وعدہ کرلیا ہے کہ میں کچھ عرصے تک کام کرنے کو تیار ہوں۔ (ضمناً انھوں نے یہ بھی بتایا، جو مجھے پہلے سے معلوم تھا کہ وہ مجھے وائس چانسلر کی حیثیت سے بُلانے پر بہت مصر تھے لیکن اس وقت میں فارغ نہ تھا)۔

چند روز کے بعد وزیرِ تعلیم کی دعوت پر میں دوبارہ پرنسپلوں کی انتخابی کمیٹی پر صدارت کرنے کے لیے دوبارہ سری نگر گیا تو وہاں اس خیال کی تائید ہوئی کہ اس عرصے میں بیشتر ہیڈ ماسٹر وغیرہ (جو انٹرویو میں شریک تھے) تقریباً پیشہ ورانہ حیثیت سے ناخواندہ ہوگئے ہیں اور ان میں سے اکثر گزشتہ دس سال میں پڑھی ہوئی دو چار تعلیمی کتابوں کے نام بھی نہیں گنا سکے۔ مجھے بتایا یہ گیا کہ جس زمانے میں میں یہاں ڈائرکٹر کی حیثیت سے کام کرتا تھا، قدر فرض شناس اور تعلیمی دل چسپی لینے

والے اُستادوں کی تھی، اب خوشامد اور سیاست کا دور ہے۔ لہٰذا کام کیوں کیا جائے۔ اگر ہم قومی سیرت کو بنا اور سنوار نہ سکیں گے تو یہ کشتی کیسے پار لگے گی؟۔

۲۷ر جولائی

۲۷ر کو وزیرِ اعظم (پنڈت نہرو) سے ملاقات ہوئی۔ بہت تپاک اور خلوص سے ملے۔ ایران، بیروت وغیرہ کے سفر کا حال پوچھتے رہے۔ میں نے انھیں بتایا کہ والدِ مرحوم نے ۱۹۱۱ء میں ایران کے سیاسی، سماجی، اقتصادی اور اخلاقی حالات کا تجزیہ کیا تھا وہ بنیادی طور پر آج بھی بالکل ٹھیک ہے بلکہ موجودہ حکومت نے ایک حد تک اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے...... انھوں نے میری کتاب "آندھی میں چراغ" کا ایک حصّہ (جس کا کچھ تعلق ان سے بھی تھا) دل چسپی سے سُنا۔ کشمیر جانے کے خیال کی انھوں نے تائید کی لیکن مشورہ یہ دیا کہ فی الحال ایک سال کے لیے قبول کر لو.....

میں نے اپنی کتاب "آندھی میں چراغ" تو ایران وغیرہ جانے سے پہلے تقریباً مکمل کر لی تھی۔ اب واپس آکر باقی چند باب بھی لکھ لیے ہیں۔ (یہ وہی بدنصیب کتاب ہے جو ایک دفعہ ۱۹۴۷ء میں لکھی تھی لیکن اسی سال ملک کے سیاسی انقلاب کے ضمن میں جو طوفان آیا اور آگ لگی اس میں وہ لفظی معنی میں خالی پبلشنگ ہاؤس کے ساتھ نذرِ آتش ہوگئی۔ یعنی اس کی لکھی ہوئی کاپی جل گئی!) اس کی اشاعت انڈین اکیڈمی (پبلشر مسٹر ساہنی) کر رہی ہے جس نے ایک کتاب "شبنم شبنم" بہت دیدہ زیب انداز میں چھاپی ہے۔ اس کا موضوع زندگی کی صحیح اور شریف قدروں کا مطالعہ اور ان اثرات کا تجزیہ ہے جو ان قدروں کی بقا کے لیے خطرہ کا موجب ہیں۔ یہ مطالعہ تین حصّوں میں تقسیم ہے۔ (۱) اقدارِ ابدی (بعض مذہبی رہنماؤں کی تعلیم کی روشنی میں) (۲) صحبتِ اہلِ صفا (بعض مشاہیر اور ذاتی عزیزوں اور دوستوں کی زندگی میں ان قدروں کی تلاش (۳) مستقبل کی پرچھائیاں (بعض تحریکوں کا مطالعہ)۔ ۱۹۴۷ء کے مسودہ کے مقابلے میں غالباً یہ زیادہ مربوط اور معنی خیز ہے۔ اس طرح شاید "مصلحتِ الٰہی" اس کے ضائع ہوجانے ہی میں تھی!۔

میں آج کل یونسکو کی طرف سے اس PROJECT کی نگرانی کر رہا ہوں جس کا مقصد ہے ہندوستان میں یونی ورسٹی کے داخلوں کے مسائل پر تحقیقات کرکے ان کے بارے میں صحیح صورتِ حال اور اصلاح کی صورتیں پیش کریں۔ ہمارے ہاں اس بارے میں صورتِ حال ابھی تک بہت غیر واضح اور مختلف یونی ورسٹیوں میں مختلف ہے۔ اعلا تعلیم کے بارے میں ابھی تک جمہوریت اور بہتر معیار کی رسہ کشی میں ہم یہ بھی طے نہیں کرپائے ہیں کہ اعلا تعلیم کن لوگوں کو دینی چاہیے!۔

اب کشمیر جانے کا وقت قریب آگیا ہے۔ اپنے قریبی عزیزوں اور بچیوں کو اس دُوری کا کافی احساس ہے۔ اور اسی طرح ہمیں بھی۔ لیکن زندگی میں یہ دُوری نزدیکی کا کھیل ایسا ہے کہ اس سے مفر نہیں۔ اس کا جذباتی اثر تو ظاہر ہے لیکن شاید اس بات کا تجربہ بھی ضروری ہے کہ نسلِ نو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا سیکھے اور ماں باپ پر بہت زیادہ انحصار نہ کرے۔ اس زمانے میں یہ بھی احساس ہوا کہ خلوص سے ملنے والے دوستوں کی تعداد کم ہوتی ہے۔ دہلی جیسی جگہ میں بعض لوگ تو اپنی مصروفیتوں اور مشاغل کی وجہ سے مل ہی نہیں پاتے۔ اور بعض ایسے ہیں جن کا تعلق محض منصبی حیثیت کی وجہ سے قائم ہوتا ہے، جب وہ نہ رہے تو یہ رشتہ بھی ٹوٹ جاتا ہے۔ چناں چہ وزارتِ تعلیم میں کچھ ایسے دوست اور ساتھی ہیں جو بہت خلوص سے ملتے رہے اور غالباً قدر کرتے ہیں اور بہت سے ایسے جن سے کوئی خاص مراسم بعد میں قائم نہیں رہے، زیادہ تر اس وجہ سے کہ وہ نظر دیکھنے والے ہیں اور نظر ایک کم نظر اور تنگ نظر کی!۔

اس عرصے میں کئی کتابیں پڑھیں۔ چند کے نام یاد ہیں ARBERRY: DISCOURSES OF RUMI (RECENTLY TRANSLATED FROM RUMI) (اس میں رومی کے خیالات کا بہت اچھا چربہ ملتا ہے۔ ان کو ایران کے پروفیسر فیروز نفر نے مرتب کیا ہے) THE DIARY OF INDIAN MUTINY (ایک انگریز کی ہم عصر ڈائری جو تصویر کا دوسرا پہلو یعنی انگریزوں کے مظالم کو بھی انصاف کے ساتھ دکھاتی ہے) ERICH FROM: ART OF LOVING (محبت کا حقیقی مفہوم)۔

اِشاریہ

الف

خ

د

ڈ

ز

س

ش

غ

ف

ق

ک

ن

و

ہ

ی